بیانِ غالب

باقر

بیانِ غالب

شرح

دیوانِ غالب

از

جناب آغا محمد باقر صاحب ایم اے
ایم او ایل

بفرمائش
شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور

بار پنجم ۲۰۰۰ [redacted] ۱۹۴۸ء

عالمگیر پریس لاہور میں باہتمام حافظ محمد عالم پرنٹر چھپا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

مجھے مدت دراز سے دیوان غالب کے مطالعہ کا شوق ہے اور میں اس بات کو کلام غالب کا معجزہ خیال کرتا ہوں۔ کہ یہ شوق کسی عنوان کم نہیں ہونے پاتا بلکہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ میں صفائی سے عرض کرنا چاہتا ہوں۔ کہ نہ تو میں غالب کو کسی خاص نقطۂ نظر سے سمجھنے کا دعویدار ہوں۔ اور نہ دیگر شارحین کی طرح ان کی زبان اور طرزِ بیان پر نکتہ چینی کرنے کے لئے اس میدان میں گامزن ہؤا ہوں۔ میں تو غالب کے دلدادوں میں سے ایک دلدادہ ہوں۔ اور ان کے کلام کو روحانی مسرت اور قلبی تسکین کا بہترین ذریعہ خیال کرتا ہوں۔ میں نے ہمیشہ ایک طالب علم کی حیثیت سے دیوان غالب کا مطالعہ کیا ہے اور یہ شرح اسی مطالعہ کا نتیجہ ہے۔

کلام غالب کے نکات سے لطف اندوز ہونے کے لئے میں نے یادگار غالب مصنفہ مولانا حالی، شرح حسرت موہانی۔ طباطبائی، سہا، نقد دیوان غالب مصنفہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری۔ بیخود۔ آسی۔ شوکت میرٹھی اور سعید وغیرہ کو سامنے رکھ کر دقتِ نظر کے ساتھ مطالعہ کیا اور آخر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر ایک ایسی جامع شرح تیار کی جائے۔ جو دیوان غالب کے طلبا کو بیک وقت مختلف شرحوں کی چھان بین سے مستغنی کر دے۔ تو یقیناً ایک بہت بڑی ادبی خدمت ہوگی۔ ایک مدت تک اس نیک تجویز کو عملی جامہ پہنانے میں یہ خیال مانع رہا۔ کہ کہیں ایسا کرنے سے دیگر شارحین کو کسی قسم کا مالی نقصان نہ پہنچے۔ جب اس وقت کا حل سمجھ میں آیا تو میں نے اس شرح

کی تکمیل کا مصمم ارادہ کر کے کام شروع کر دیا۔ اور مدد ایزدی سے اس کو مکمل کر کے آرام کا سانس لیا۔

اس شرح کی تالیف سے میرا مطلب صرف اس قدر رہے کہ دیوانِ غالب کی شرح پڑھنے والوں کو اگر بالتفصیل نہیں تو مجملاً اس قدر ضرور معلوم ہو جائے کہ مختلف شارحین نے غالب کے ہر شعر کو کس نقطۂ نظر سے دیکھا ہے اور اس کے مفہوم میں کیا کیا موشگافیاں کی ہیں۔ چنانچہ جن اشعار پر شارحین نے اختلاف کیا ہے میں نے کوشش کی ہے کہ مختصراً ان کے نقطۂ نظر کو پیش کر دیا جائے تاکہ پڑھنے والا آسانی سے سمجھ جائے کہ اس شعر کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہے۔ طوالت کے خوف سے میں نے اختصار کو مدِنظر رکھا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ خیال سامنے رہا ہے کہ کوئی ضروری بات نظر انداز نہ ہونے پائے۔ اس لئے مؤدبانہ گذارش ہے کہ اگر دیگر شارحین کی شرح سے پورا پورا استفادہ منظور ہو۔ تو ان کی اصلی شرح دیکھنی چاہیئے۔ کیونکہ میں نے عموماً ان کے اختلافی پہلو کو اخذ کیا ہے۔ اور بیشتر مطالب کو جو ان کی شرح کی مابہ الامتیاز خصوصیات میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ نظر انداز کر دیا ہے۔

میری شرح کا مطالعہ کرتے وقت یہ بات خاص طور پر یاد رکھنی چاہیئے کہ جس شرح پر تمام شارحین متفق ہیں۔ اس کے تحت میں یہ لکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی کہ تمام شارحین متفق یا ہم خیال ہیں۔ نیز جہاں کسی شعر کی شرح لکھنے کے بعد کسی شارح کا کوئی مختلف مفہوم درج کیا گیا ہے تو اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ باقی شارحین میرے ہم خیال ہیں اور محض اسی شارح کو مجھ سے اور دیگر شارحین سے اختلاف ہے۔ اسی طرح جہاں چند شارحین ایک خیال

پر متفق ہیں۔ اور باقی دو دوسرے خیال پر مجتمع۔ وہاں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے ہاں طوالت سے بچنے کے لئے ایسے شارحین کا نام درج نہیں کیا جو میرے ہم خیال ہیں۔ گویا جن شارحین کا نام اختلافی شرحوں کے تحت میں نظر نہ آئے۔ ان کو میرا ہم خیال تصور کرنا چاہیئے۔

مولانا حالی کی شرح کو میں نے مقدم خیال کیا ہے۔ جس شعر کی شرح انہوں نے تحریر فرمائی ہے۔ اس کو اسی طرح درج کر دیا ہے۔ بعض اشعار کی انہوں نے نہایت مختصر شرح لکھی ہے۔ ایسے مقامات پر میں نے خود وضاحت کرنے کی جسارت کی ہے۔ بیخود اور سعید مولانا حالی کی شرح نقل کرنے میں میرے پیش رو ہیں۔ اس لئے جہاں حالی مرحوم کی شرح درج ہو۔ وہاں ان دونوں شارحین کے ناموں کو مقدر خیال کرنا چاہیئے۔

میری شرح کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ میں غالب پر تخریبی نکتہ چینی کرنا سوءِ ادب خیال کرتا ہوں۔ اس لئے میں نے عموماً اس سے گریز کیا ہے ہاں جن اشعار کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کی معنوی اور لفظی خوبیوں پر باالتزام اور مسلسل روشنی ڈالی ہے۔ گویا میرا مطمح نظر ادب کے مطالعہ سے روحانی اور قلبی تفریح ہے نہ کہ طعن و طنز اور بدمزگی۔

میں آخر میں پھر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ موجودہ شرح طباطبائی۔ آسی۔ سہا۔ سعید۔ بیخود۔ حسرت اور مولانا حالی کی شرحوں کو پیشِ نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ اور میرے خیالات کی پختگی ان کی تہ دل سے ممنون ہے۔

محمد باقر

۲۹۔ مئی ۱۹۳۹ء

ردیف الف

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا ۱ کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
کاوکاوِ سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ ۲ صبح کرنا شام کا لانا ہے جُوئے شیر کا
جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیئے ۳ سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے ۴ مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

(۱) نقش ...... صورت، تصویر۔ فریادی ...... فریاد کرنے والا شوخیٔ تحریر ...... بیدادِ تحریر۔ کاغذی پیرہن ...... ایران میں دستور تھا کہ دادخواہ کاغذ کا جامہ پہن کر حاکم کے سامنے جاتے تھے پیکر ...... جسم۔ مرزا صاحب نے اس شعر کی شرح ایک خط میں خود بیان فرمائی ہے۔ ایران میں رسم ہے کہ دادخواہ (فریادی) کاغذ کے کپڑے پہن کر حاکم کے سامنے جاتا ہے جیسے مشعل دن کو جلانا۔ خون آلود کپڑا بانس پر لٹکا کر لے جانا۔ بس شاعر خیال کرتا ہے کہ نقش کس کی شوخیٔ تحریر کا فریادی ہے جو صورتِ تصویر ہے۔ اس کا پیرہن کاغذی ہے۔ یعنی ہستی اگرچہ مثل تصاویر اعتبار محض ہو موجب رنج و ملال و آزار ہے (۲) اب طباطبائی سعید آسی) اب ملاحظہ فرمایئے کہ اس شعر سے شارحین نے کیا کیا نتائج اخذ کئے ہیں۔

سعید :- انسان کی بے بود ہستی اور کشش حیات کا نقشہ الفاظ میں کھینچا گیا ہے۔ حاصل شعر کا یہ ہے کہ ہستی خواہ وہ کسی چیز کی بھی ہو باعثِ تکلیف و رنج ہے۔ حتیٰ کہ تصویر تک بھی جو کہ صرف ایک ہستی محض ہے۔ بزبانِ حال فریاد

کررہی ہے کہ مجھ کو ہستی کر کے کیوں رنج ہستی میں مبتلا کیا۔ جیسا کہ اس کی کاغذ پیرہنی سے ظاہر ہے۔

آسی و سہا ـــ مولانا روم نے اسی مفہوم کو ان اشعار میں ادا کیا ہے

بشنو از نے چوں حکایت مے کند ۔ وز جدائی ہا شکایت مے کند

کز نیستان تا مرا ببریدہ اند ۔ از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

مطلب یہ ہے کہ اصل سے جدا ہونے کے بعد اضطراری کیفیت پیدا ہونا ضروری ہے، نے جب نیستان سے جدا ہوتی ہے تو اس میں فریاد کرنے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جب تصویر کاغذ پر بنائی جاتی ہے تو وہ اپنے کاغذی لباس کی بدولت نقاش کی شوخی تخلیق کی زبانِ حال سے فریاد کرنے لگتی ہے۔

بیخود ـــ ہر پیکرِ تصویر" سے مراد جملہ حیوانات، جمادات اور نباتات سے ہے اور یہ ساری چیزیں فنا ہونے والی ہیں۔ جب موجوداتِ عالم کا یہ حال ہو تو نقشِ ہستی کا اپنی بے ثباتی پر فریادی ہونا شاعر کے تخیل بلند اور غیر معمولی جدت کا ثبوت کامل ہے۔

طباطبائی ـــ کاغذی پیراہن پہننے کا رواج نہ کہیں دیکھا ہے اور نہ کہیں سنا ہے۔ جب تک اس شعر میں کوئی ایسا لفظ نہ ہو جس سے فنا فی اللہ ہونے کا شوق اور ہستی اعتباری سے نفرت ظاہر ہو۔ اس وقت تک اسے بامعنی نہیں کہہ سکتے۔ مصنف کی غرض یہ تھی کہ نقش تصویر فریادی ہے ہستی بے اعتبار اور بے توقیر کا اور یہی سبب ہے کاغذی پیرہن ہونے کا۔ شعر میں ہستی، بے اعتبار کی گنجائش نہ ہو سکی اس سبب سے قافیہ مزاحم تھا اور مقصود تھا مطلع کہنا۔ اس لئے ہستی کے بدلے شوخی تحریر کہہ دیا۔ شعر بے معنی ہے۔

طباطبائی کے سوا تمام شارحین اس شعر کو بامعنی بتلاتے ہیں۔ کاغذی پیرہن پہننے کے رواج کے ثبوت میں یہ اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں:۔

تا کہ درتن قدر از دست تو پر بود قلم
(بابا افغانی) کاغذ پیرہن از دست قدر باد مراد

کاغذی جامہ پوشید و بہ بارگاہ آمد
(کمال اسمٰعیل) زادۂ خاطرِ من تا بدہی داد مرا

۲۔ کاو کاوِ.... کاوش و کاہش۔ لفظی تکرار نے جستجو اور سعی پیہم کا مفہوم پیدا کر دیا ہے سخت جانی.... بیحد رنج والم، جوئے شیر.... فرہاد نے شیریں کو حاصل کرنے کے لئے نہر کھود دی تھی۔ تلمیح ہے۔ صبح کرنا شام کا.... شب ہجر کو گزارنا۔ شب ہجر کی مصیبتیں نہ پوچھو، فرقت کی رات کو صبح کرنا اتنا ہی مشکل اور دشوار تھا جتنا فرہاد کا کوہِ بے ستون کھود کر جوئے شیر کا قصر شیریں تک لانا مشکل تھا جوئے شیر اور سفیدی صبح میں جو مناسبت ہے اس سے شعر کا مرتبہ بلند ہو گیا ہے۔

شاعر نے سخت جانی کی وجہ سے اپنے آپ کو کوہ کن سے، شب ہجر کی تاریکی اور سختی کو پہاڑ کاٹنے اور جوئے شیر لانے سے اور سپیدۂ سحر کو جوئے شیر سے تشبیہ دی ہے۔

۳۔ جذبہ.... کشش۔ شوق.... قتل ہونے کا شوق۔ دم شمشیر.... تلوار کی دھار اور دھار نہ باہر ہوتی ہے — میرے شوقِ شہادت کی اس سے بڑھ کر اور کیا کشش ہو گی کہ تلوار کے سینے سے اس کا دم بھی باہر آ گیا ہے یعنی وہ میرے قتل کے لئے اتنی بے اختیار ہو گئی ہے۔ کہ اس کا دم اس کے سینے سے باہر نکلا پڑتا ہے۔ اور یہ میرے شوق شہادت کی کشش ہے۔

۴۔ آگہی..... علمیت عقل۔ دام شنیدن بچھانا ..... سننا اور سمجھنا
مدعا..... مطلب، مفہوم عنقا..... معدوم ــ جس وقت ہم گفتگو کرتے ہیں۔ اس وقت چاہے عقل کتنی ہی سمجھنے کی کوشش کیوں نہ کرے لیکن وہ ہمارے مفہوم کو نہیں پہنچ سکتی۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے اشعار عنقا صفت ہیں وہ دام شنیدن میں نہیں آسکتے گویا سراسر اسرار ہیں۔

۵۔ آتش زیر پا..... بے قرار، بیتاب۔ موئے آتش دیدہ..... اگر بال کو آگ کے سامنے رکھیں تو جل کر بل کھا جاتا ہے اور حلقۂ زنجیر سے مشابہ ہو جاتا ہے میں زنجیروں میں بھی ایسا بے قرار اور مضطرب ہوں کہ سوز دل کی گرمی سے میرے پاؤں کی زنجیروں کا ہر حلقہ جلے ہوئے بال کی طرح کمزور ہو گیا ہے حلقہ ہائے زنجیر پا کو موئے آتش دیدہ سے تشبیہ دینا مرزا صاحب کا کمال ہے اور ان کا جنونِ عشق مسلم کہ وہ قید و بند سے بھی کم نہیں ہوتا۔ بلکہ زنجیریں بھی گرمیٔ عشق سے جل کر راکھ ہو جاتی ہیں۔ سعید لکھتے ہیں کہ جلے ہوئے بالوں میں ایک قسم کی بدبو پیدا ہو جاتی ہے۔

(۲) جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار ۱ صحرا اگر بہ تنگیٔ چشم حسود تھا
آشفتگی نے نقش سویدا کیا درست ۲ ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا
تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ ۳ جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا
لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز ۴ لیکن یہی کہ رفت گیا اور بُود تھا
ڈھانپا کفن نے داغِ عیوب برہنگی ۵ میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسدؔ
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

۱۔ بروئے کار نہ آیا..... مقابلے میں نہ آیا۔ تنگیٔ حسود..... حاسد بہت

تنگِ نظر ہوتے ہیں۔ اور وہ کسی کو دیکھ نہیں سکتے، یا ان کی نظروں میں کوئی نہیں چجتا۔ مگر...... شاید ــــ شاید صحرا بھی باوجود اپنی وسعت کے چشمِ حاسد کی طرح تنگ تھا کہ اس میں سوائے قیس (مجنوں) کے کوئی دوسرا عاشق صحرا نوردی کے لئے نکل سکا۔ مجنوں کے سوا کوئی اور صحرا نورد پیدا ہونے کا الزام صحرا کی تنگ چشمی پر لگایا گیا ہے۔

۲- آشفتگی...... پریشانی۔ نقش سویدا...... دل پر ایک سیاہ رنگ کا تل ہوتا ہے۔ سویدا کیا درست...... یعنی سیاہی کو دور کر دیا۔ دُود...... دھواں ــــ سویدا کو داغ دل اور آشفتگی کو دود سے تشبیہ دے کر کہتے ہیں۔ کہ میری آشفتگی اور پریشانی نے داغ سویدا کو درست کر دیا یعنی اسے صاف کر دیا اس داغ کی وجہ سے دل میں اکثر دھوآں نکلا کرتا تھا۔ اب دھوآں نکل جانے کے بعد دل کا داغ دُود ہو گیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ داغ دل کا سرمایہ یا حاصل محض دھواں تھا۔ وہ دھوآں نکل گیا اور دل صاف ہو گیا۔ سعید لکھتے ہیں کہ دل کا داغ دنیا کی مکروہات میں دل لگانے سے پیدا ہوا تھا۔ اور بیخود کا خیال ہے کہ یہ داغ پریشان حالی میں افشائے راز کے خوف سے آہیں ضبط کرنے کا نتیجہ ہے حسرت جس طرح دھوئیں سے داغ پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح آشفتہ خاطری اور پریشانی کے دُود سے دِل میں داغ سویدا کی صورت قائم ہوتی ہے (طباطبائی۔ آسی بیخود)

۳- قاعدہ ہے۔ جن خیالات اور معاملات کا اثر دل ودماغ پر پڑتا ہے وہی ہمارے خواب میں بھی آتے ہیں اور ہم عالمِ خواب میں اپنی الجھنوں کو سلجھاتے ہیں لیکن جب آنکھ کھل جاتی ہے تو ہمارے خیالات پھر وہیں آ جاتے ہیں جہاں وہ حقیقتہً ہوتے ہیں۔ اور اس تمام خوابی کشمکش سے کوئی فائدہ اور نقصان

مرتب نہیں ہوتا۔

سہاؔ کا خیال ہے کہ معاملہ کے لوازمات ہیں من و تو کا مفہوم ادا کیا ہے یعنی من و تو کا انحصار خوابِ ہستی کے اوہام پر تھا۔ جب فنافی الذات ہوئے تو جیسے تھے ویسے ہی رہے۔

سعیدؔ لکھتے ہیں۔ دنیاوی زندگی ایک فریب نظر تھی۔ جب اسرار کے پردے اٹھے۔ تو معلوم ہوا کہ عالمِ حیات کا سارا انتظام محض ایک خواب تھا۔ اور سود و زیاں کی کوئی حقیقت فی نفسہٖ نہ تھی۔

طباطبائیؔ و بیخودؔ اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ کہ عیش اور رنج کا زمانہ گذر جانے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی انسان یہ سب باتیں خواب میں دیکھتا ہو۔ اور آنکھ کھل جانے پر ان کے اثر اور نقائص فوراً طبیعت سے زائل ہو جائیں۔

آسیؔ کی شرح سب سے علیحدہ ہے، کہتے ہیں۔ میرا خیال خواب میں تجھ سے کچھ معاملہ کر رہا تھا۔ جس میں میرا فائدہ تھا یا نقصان مگر آنکھ کھلتے ہی وہ طلسم ٹوٹ گیا نہ نقصان باقی رہا نہ فائدہ ہیں تھا۔ اور وہی کنجِ تنہائی۔

ہم۔ یہ رفت گیا اور بُود تھا ۔۔۔ پہلے بچوں کو آمدنامہ پڑھایا جاتا ہے اور وہ مصدر اور ان کی ماضیاں معنوں کے ساتھ اس طرح یاد کرتے ہیں۔ کہ رفتن جانا رفت گیا، مکتب غم دل ۔۔۔۔ مکتب عشق ہیں ابھی تک مکتب غم میں مبتدی ہی ہوں۔ اور میرا سبق رفت گیا'' اور بود تھا'' ہے مکتب غمِ دل ہیں رفت و بود کا سبق یاد کرنے سے کبھی دل پاس ہونے اور پھر جاتے رہنے کی طرف دماغ منعطف ہوتا ہے ۔اور اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ مکتبِ عشق کا طالب علم مدت دراز سے ابتدائی درجے ہیں پڑا ہے ۔ اور ابھی تک اسگلے درجے ہیں نہیں جا سکا۔ لفظی رعایات بہت خوب ہیں چونکہ رفت و بود دونوں

ماضی کے صیغے ہیں۔ اس لئے اِن سے ظاہر ہوتا ہے کہ کبھی دل عیش و فراغت سے تھا۔ اور اب مسرت و انبساط سے بالکل محروم ہے۔ آسی لکھتے ہیں۔ کہ دفت و بود کو بار بار پڑھنے سے ایک ابتدائے جنون کی کیفیت کا پتہ چلتا ہے۔

۵۔ ننگِ وجود ...... وجودِ ہستی کے لئے باعثِ عار۔ ہر لباس ہیں...

مختلف زمانوں اور اوضاع زندگی میں میرا وجود دامنِ انسانیت پر ایک بد نما دھبہ تھا۔ میں نے اپنے عیوب کو چھپانے کے لئے طرح طرح کے لباس، اور طریقے اختیار کئے۔ لیکن پھر بھی میرے عیوب ہر لباس میں عریاں ہی نظر آتے رہے۔ آخر جب زندگی ختم ہوئی اور میرا وضعی لباس اتار کر مجھ کو کفن پہنایا گیا۔ تو پھر میرے وہ عیوب ڈھک گئے۔ جو لباسِ انسانیت پر ایک بدنما دھبہ تھے۔ اور ایامِ زندگی میں کسی صورت چھپائے نہ چھپتے تھے۔

سُہا لکھتے ہیں۔ وجود سے مراد وجود مطلق ہے۔ گویا میں ہر عالم میں وجودِ مطلق کے لئے عار تھا۔ سعید۔ کا خیال ہے۔ جب تک انسان پر انسانیت کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اس وقت تک وہ اپنے آپ کو ان کمزوریوں سے محفوظ نہیں رکھ سکتا، جو اس کی عین فطرت ہیں۔ یہ معائب اسی وقت دور ہوتے ہیں جب انسان لباسِ زندگی کو چاک کر کے کفن پوش ہو جائے۔

بیخود ـــــ میں وہی انسان ہوں جس کو ملائک نے سجدہ کیا۔ دنیا میں آنے کے بعد میری وہ وقعت و عزت، میرے اعمال و افعال کی وجہ سے باقی نہ رہی۔ البتہ مرجانے کے بعد کفن نے اِن داغوں کو چھپالیا۔

طبا طبائی اور آسی ـــــ ننگِ وجود ہونے کو برہنگی سے تعبیر کیا ہے۔ فقط لفظ بالتشابہ شاعر کے ذہن کو ادھر لے گیا۔ ورنہ ننگ وجود اس جگہ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔

۶۔ تیشہ......... کلہاڑی۔ سرگشتہ خمار..... دیوانہ، مدہوش نشہ سے رسوم وقیود...... انسان کی خود پیدا کردہ (غیر فطری) پابندیاں بطور طنز کہتے ہیں۔ اسد فرہاد فطرت پرست عاشق نہ تھا۔ بلکہ وہ غیر فطری رسوم وقیود میں محو تھا۔ اس لئے اپنے سر پر تیشہ مار کر مرا۔ اگر وہ شیریں کے عشق صادق کے نشے سے سرگشتہ ہوتا۔ تو اپنے آپ کو تیشہ مار کر ہلاک نہ ہوتا یہ تو صاحب عقل جانتے ہیں۔ کہ تیشہ سر پر لگنے سے انسان مر سکتا ہے۔ اس کو چاہیئے تھا۔ کہ وہ ایک آہ جانگداز کھینچتا اور جان سے گزر جاتا۔

۷۔ کہتے ہو نہ دینگے ہم دل اگر پڑا پایا	۱ دل کہاں کہ گم کیجیے ہم نے مدعا پایا
عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا	۲ درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا
دوستدار دشمن ہے اعتماد دل معلوم	۳ آہ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا
سادگی و پرکاری بیخودی و ہشیاری	۴ حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا
غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل	۵ خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا
حال دل نہیں معلوم لیکن اسقدر یعنی	۶ ہم نے بارہا ڈھونڈھا تم نے بارہا پایا

شور پند ناصح نے زخم پہ نمک چھڑکا

(۷) آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

۱۔ ہم نے مدعا پایا...... ہم تمہارا مطلب سمجھ گئے۔ اگر کسی کی کوئی گمشدہ چیز کسی اور کو مل جاتی ہے تو وہ چھیڑنے کے لئے کہتا ہے۔ اگر ہمیں مل گئی تو ہم نہیں دیں گے۔ اگر کسی چیز کو لینے کی نیت ہوتی ہے تو ازراہ شوخی اسے چھپا دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ اگر تمہاری چیز ہمیں مل گئی۔ تو ہم نہیں دینگے یہی معصومانہ شوخی اس شعر میں ہے کہ محبوب دل اڑا کر عاشق سے کہتا ہے اگر ہمیں تمہارا دل کہیں پڑا ہوا مل گیا تو ہم نہیں دیں گے۔ عاشق کہتا ہے کہ

میں سمجھ گیا دل تو تمہارے پاس ہی ہے اگر میرے پاس ہوتا تو میں تمہاری آرزو پوری کرنے کے لئے اسے کہیں ادھر اُدھر پھینک دیتا۔ اور تم اسے لے لیتے۔ بس اب تم ازراہِ شوخی کہہ رہے ہو کہ اگر ہمیں مل گیا۔ تو ہم نہیں دیں گے۔

۲۔ درد کی دوا ...... دردِ زندگی کی دوا یعنی عشق۔ درد بے دوا ... عشق شاعر کا خیال ہے۔ کہ زندگی بغیر عشق کے بدمزہ اور بیکار ہے گویا اگر عشق نہ ہو۔ تو زندگی ایک درد ہے۔ کہتے ہیں کہ جب عشق کا مزہ لگا۔ تو زندگی میں لطف آیا۔ کیونکہ غمِ عشق میں غمِ دنیا کو بھول گئے۔ گویا ہمیں دردِ زندگی کی دوا مل گئی مگر یہ درد ایسا ہے جس کا کوئی اُتار نہیں۔ گویا عشق دردِ بے دوا ہے ؎

شد طبیب ما محبت منتش بر جانِ ما — محنتِ ما، راحتِ ما، دردِ ما، درمانِ ما (ظہوری)

مرحبا اے عشق خوش سودائے ما — اے طبیبِ جملہ علت ہائے ما (مولانا روم)

۳۔ دوستدار دشمن ...... رقیب کا خیر خواہ۔ اعتمادِ دلِ معلوم ..... دل پر بھروسہ نہیں رہا۔ نہ ہمارے نالہائے دلِ محبوب تک پہنچتے ہیں اور نہ آہیں کچھ اپنا اثر دکھاتی ہیں اس بے اثری سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہمارا دل رقیب کا خیر خواہ ہے۔ ورنہ ہماری آہ جا لگتی اپنا اثر ضرور دکھاتی۔ اور ہمارے نالے ان تک ضرور پہنچتے۔ (طبا طبائی)

سعید۔ چونکہ معشوق دشمن کا خیر خواہ ہے اس لئے دل کو اس پر اعتماد نہیں رہا یہی وجہ ہے۔ کہ آہ بے اثر ہے۔ اور نالہ نارسا کیونکہ وہ صدقِ دل سے نہیں نکلتے۔

بیخود۔ محبوب ہمارا دشمن ہے اور دل اس کا دوست ہے۔ اب ہم دل پر خاک بھروسہ کر سکتے ہیں۔ اسی لیے اس کے نالہ و آہ میں تاثیر نہیں۔ دل کی دشمنی

کا خوب ثبوت دیا ہے۔ (آسی ۔ حسرت)

۴ ۔ سادگی ۔۔۔۔ بھولا پن ۔۔۔۔ پرکاری ۔۔۔۔ چالاکی ۔ بیخودی ۔۔۔۔ بے پروائی ۔ ہشیاری ۔۔۔۔ خبرداری ۔ حسینانِ جہاں دیکھنے میں بڑے سادہ اور غفلت شعار نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کے بھولے پن پر نہ جانا چاہیئے وہ حقیقتاً بڑے عیار اور ہشیار ہیں ۔ اور ان کی سادگی اور تغافل شعاری محض اس لئے ہے کہ وہ اپنے چاہنے والوں کی جرأت کو آزمائیں اور دیکھیں کہ عاشق کتنے پانی میں ہیں۔ یا کتنی محبت رکھتے ہیں ۔ (حسرت)

اہل حُسن کی ظاہری سادگی اور بے پروائی سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ اپنے مشتاقوں کی جرأت کو آزمائیں اور یہ دیکھیں کہ اِن کو سادہ سمجھ کر ارباب اشتیاق جرأت گستاخی تو نہیں کرتے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس قسم کی سادگی کو درحقیقت پرکاری اور بے خودی کو ہشیاری سمجھنا چاہیئے (سعید تقریباً یہی)

بیخود و طباطبائی ۔ کیسے پیچیدہ خیال کو کس حسن و خوبی سے بیان کیا ہے نشست الفاظ کی تعریف نہیں ہوسکتی ۔ عشاق کا دل دیکھنے کے لئے معشوقوں کا بھولا پن ہوا کرتا ہے ۔ درحقیقت یہ بھولا پن خاص ہوشیاری اور عین چالاکی ہے

[redacted] جب موسم بہار آیا ۔ تو غنچے کھلنے لگے ۔ ان کو دیکھ کر ہمارا دل پھر خون ہوگیا اور خود فراموشی کا عالم طاری ہوگیا ۔ طبی اصول کے مطابق موسم بہار میں تجدید جنون ہو جایا کرتی ہے ۔ اسی کی طرف اشارہ ہے (سعید)

حسرت ـــــ غنچے کو دیکھ کر ہم کو اپنا دل گم گشتہ و خون شدہ یاد آگیا کہ اس کی بھی یہی ہیئت تھی ۔ (سعید ۔ بیخود ۔ آسی ۔ طباطبائی)

سہاـــ "غنچہ کھلنا" سے نرالی بات کرنا یا فتنہ پیدا کرنا اور خون کیا ہوا سے کشتہ حسن اور مبتلائے عشق مطلب لیتے ہیں اور کہتے ہیں آج پھر وہی فتنہ بیدار

ہوا۔ اور ہمارا دل جاتا رہا۔

۶۔ اپنی خود فراموشی دکھائی ہے۔ کہتے ہیں ہمیں اپنے دل کا کچھ حال معلوم نہیں۔ کہ وہ کہاں گیا اور کیا ہوا۔ لیکن اس قدر ضرور معلوم ہے۔ کہ ہم تم دونوں نے مل کر جب کبھی اسے ڈھونڈھنے کی کوشش کی تو وہ اکثر تم ہی کو ملا۔ پس ظاہر ہوا۔ کہ میرے دل کو تم سے خاص لگاوٹ ہے اس لئے ہمارے دل کا حال کچھ تمہیں ہی معلوم ہوگا۔ ہمیں تو کچھ پتہ نہیں۔

۷۔ شور اور نمک میں رعایت لفظی ہے۔ پند... نصیحت۔ نمک چھڑکا... تکلیف دی۔ آپ... یعنی ناصح، بطور طنز استعمال کیا ہے۔ ناصح کی نصیحتوں نے میرے زخموں پر نمک کا کام کیا۔ یعنی ان کے منع فرمانے سے میرے دل کو سخت تکلیف پہنچی۔ کوئی آپ سے ذرا دریافت کرے۔ کہ کسی کو تکلیف پہنچا کر آپ کو کیا لطف حاصل ہوا۔ (سعید)

طباطبائی: مصنف نے مزہ کو قافیہ کیا اور ہائے مختفی کو الف سے بدلا۔ اردو کہنے والے اس قافیہ کو جائز سمجھتے ہیں۔ لیکن فارسی والے مزہ اور اژدہا کا قافیہ نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ ہائے مختفی کو کبھی حرف روی ہونے کے قابل نہیں جانتے۔ (آسی) شور پند سے نمک چھڑکنا قابل ناز ہے۔ نمک۔ شور۔ مزہ وغیرہ میں تناسب الفاظ ہے۔ نمک چھڑکنے سے لطف اٹھانا مراد ہے (بیخود)

(۴) دل مرا سوز نہاں سے بے محابا جل گیا ۱ آتشِ خاموش کے مانند گویا جل گیا

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں ۲ آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا ۳ میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں ۴ کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

دل نہیں تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار ۵ اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
(۶) دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دُنیا جل گیا

۱۔ سوزِ نہاں .... سوزِ دل، آتشِ عشق۔ بے محابا .... بے خوف۔ آتش خاموش وہ آگ جو بظاہر نظر نہ آئے لیکن اندر ہی اندر سُلگتی رہے لفظی رعایات قابل داد ہیں۔ میرا دل آتشِ عشق سے جو میرے دل کے اندر چپکے چپکے سلگ رہی تھی جل کر راکھ ہوگیا۔ اور اس طریقہ سے جلا کہ آگ لگنے کی کسی کو خبر تک نہ ہوئی۔

۲۔ آگ .... آتشِ عشق۔ گھر .... خانہ دل عشق کے آغاز میں میرے خانہ دل میں ہر وقت یار کی یاد اور شوقِ وصل کے خیالات موجزن رہتے تھے لیکن عشق کی آگ نے بھڑک کر خانۂ دل اس طرح پھونک ڈالا کہ اب نہ تو ذوقِ وصل باقی ہے اور نہ یاد دوست، انسان کی فطرت ہے۔ کہ جب وہ انتہا درجہ مایوس اور نا امید ہوتا ہے تو اس کو کوئی امید اور توقع باقی نہیں رہتی۔ سہاؔ ــــ عشق کے اس مقام کی طرف اشارہ ہے۔ جب امید و یاس، وصل و ہجر، یادِ محبوب غرضیکہ کسی جذبے کا احساس باقی نہیں رہتا اور یہ وہ مقام حیرت و عالم فراموشی ہے۔ کہ اس کے بعد انا المحبوب اور انا الحق کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔

طباطبائیؔ ــــ یعنی رشک کی آگ ایسی تھی کہ معشوق کو دل سے بھلا دیا۔ اور اس کا غیر سے ملنا دیکھ کر ذوقِ وصل جاتا رہا۔ گھر سے دل اور آگ سے رشک رقیب مراد ہے۔

۳۔ اے غافل میں عدم کے مقام سے آگے نکل گیا ہوں۔ ورنہ جب میرا مقام عدم میں تھا۔ اور وہاں میں نے آہِ آتشیں کھینچی تو اس کی آگ سے

عنقا کے پر جل گئے۔ شعر میں خوبی یہ ہے کہ عنقا ایک معدوم پرندہ ہے۔ گویا وہ مقام عدم میں رہتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جب میں اس مقام میں تھا تو میری آہِ آتشین سے عنقا کے پر جل جاتے تھے۔ یعنی فنا فی العدم ہو جانے پر بھی میری آہ میں اس قدر گرمی تھی۔ بقولِ حسرت اپنی نیستی کے بیان میں مبالغہ کیا ہے۔

سہا ——— پہلے میری آہ کا اثر یہ تھا۔ کہ اس سے بال عنقا جلتا تھا اور اب تو بالِ عنقا بھی نہیں جلتا۔ گویا پہلے اگر اتنی تاثیر تھی تو اب وہ بھی نہ رہی اور میری بے اثری اور بے ثباتی اور نیستی اس حد تک پہنچ گئی۔ کہ عدم سے بھی گذر گئی ہے۔ یا جب میں عدم میں تھا۔ تو میری آہِ آتشین سے بالِ عنقا جلتا تھا۔ اور اب نہیں جلتا یا بالفاظِ دیگر یہ کہ آہِ آتشین میں کوئی تاثیر نہ تھی۔

بیخود ——— مطلب یہ ہے کہ میں نے ابتدائے تعلیم فنا میں شہرتِ عنقا کو مٹا دیا تھا جس کو معدوم ہونے کی ایک سب سے زیادہ دلیل سمجھا جاتا ہے غافل سے مراد وہ لوگ ہیں۔ جو نزقیاتِ انسانی کو نہیں سمجھ سکتے۔

طبا طبائی ——— یہ کہنے سے کہ میں عدم سے بھی باہر ہوں یہ حاصل ہوتا ہے کہ میں نہ موجود ہوں نہ معدوم ہوں اور نقیضین مجھ سے مرتفع ہیں۔ شاید ایسے ہی اشعار پر دلی والے کہا کرتے تھے۔ کہ غالب بے معنی شعر کہتے ہیں۔ "پرے" لکھنؤ میں متروک ہے لیکن دلی میں بولا جاتا ہے۔

۴۔ عرض کیجیے ... ظاہر یا بیان کیجیے۔ جوہر اندیشہ ... سوچنے کا جوہر میں اپنی طبیعت کی گرمی کا کیونکر اظہار کروں۔ بس یوں سمجھ لو کہ میں نے محض دشتِ صحرا کا خیال کیا تھا کہ اس میں بھی آگ لگ اٹھی۔ ظاہر ہے اگر وہاں پہنچ جاتے تو قیامت ہی برپا ہو جاتی۔

طباطبائی ــــــ یہ مبالغہ غیر عادی ہے۔ کہ طبیعت میں ایسی گرمی ہو۔ جس چیز کا خیال آئے وہ چیز جل جائے۔ عرض کو لوگ جوہر کے ضلع کا لفظ سمجھتے ہیں لیکن جوہر کے مناسبات میں سے عرض بہ تحریک ہے نہ بسکون۔

۵۔ کار فرما ..... حاکم یعنی دل۔ داغوں کو چراغوں سے تشبیہ دی ہے چراغاں اظہارِ مسرت میں بہت سے چراغ روشن کرنا۔ قدیم زمانے میں ملزم کے سر میں چند گہرے زخم ڈال کر ان میں شمعیں روشن کر دیتے تھے افسردگی جلنا اور داغ وغیرہ متناسب الفاظ ہیں میرے سینے پر جو داغ ہیں تم ان کو کیا دیکھتے ہو۔ اگر میرا دل جو اس چراغاں یا داغوں کی بہار کا کار فرما تھا سوزِ عشق سے جل نہ جاتا۔ تو پھر تمہیں اس چراغاں کی کیفیت دکھاتا۔ آسی لکھتے ہیں دل میں اتنے داغ تھے کہ اب دل مٹ گیا۔ اور بجائے دل چند داغ باقی رہ گئے۔

۶۔ طرزِ تپاک ..... یعنی ظاہری تپاک اور محبت۔ اے غالب اب میں ہوں۔ اور افسردہ دلی کی آرزو ہے یعنی شگفتگی اور زندہ دلی سے میں متنفر ہوں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا دل اہلِ دنیا کے ظاہری تپاک اور باطنی نفاق سے جل کر خاک ہو گیا ہے۔

آسی لکھتے ہیں۔ اس شعر میں نکتہ یہ ہے کہ جب دل جل گیا ہے۔ تو اب آزردگی کی آرزو ہے۔ کیونکہ جلنے کے بعد افسردگی پیدا ہوتی ہے۔

۵۔ شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا ۱ قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا
زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب ۲ تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا
بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل ۳ جو تری بزم سے نکلا وہ پریشاں نکلا
دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد ۴ کام یاروں کا بقدرِ لبِ دنداں نکلا

اے نو آموز فنا ہمت دشوار پسند ۵ سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالبؔ

(۶) آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

۱۔ شوق.... عشق۔ ہر رنگ.... ہر طرح سے۔ رقیب.... دشمن سروسامان۔ آرائش۔ تکلفات۔ الفاظ متناسب ہیں۔ عشق جس رنگ میں بھی ہو۔ وہ تکلفات اور سازوسامان کا دشمن ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ مجنوں کی تصویر دیکھئے چونکہ اس کو عشق تھا۔ اس لیے اس کی تصویر بھی ہمیشہ عریاں ہی کھینچی جاتی ہے۔

بیخودؔ — رنگ عشق ایسا واقع ہوا ہے کہ قیس کو تصویر کے لباس میں بھی اُس نے عُریاں رکھا۔ رنگ تصویر بھی قیس کی عریانی کا پردہ نہ بن سکا۔ ہر رنگ کے معنی عشق ہیں، جنون میں، عریانی ہیں، تصویر کے رنگ ہیں، الغرض ہر رنگ میں عشق دشمن ناموس ہی رہا۔ اور مرزا صاحب نے بھی اسے عریاں ہی دکھایا۔

طباطبائیؔ — ہر رنگ محاورہ نہیں، ہر طرح ہونا چاہیئے تناسب لفظی کے لئے محاورہ چھوڑ دینا مناسب نہیں۔

۲۔ پرافشاں.... بھڑ بھڑاتا ہوا بیتاب۔ یہ لفظ تیر کے متناسب ہیں۔

غالبؔ — زخم تیر کی توہین بہ سبب ایک رخنہ ہونے کے اور تلوار کے زخم کی تحسین بہ سبب ایک طاق سا کھل جانے کے ہوتی ہے۔ تیر نگی دل کی داد کیا دینا۔ وہ تو تنگیٔ دل سے گھبرا کر پرافشاں اور سراسیمہ نکل گیا۔

بیخودؔ — رشکِ دل نے تیر کی خلش سے سینے کو بچا دیا۔ اور وہ اس طرح کہ دل نے سینے کے رشک سے جس میں یار کا تیر چوک کر جا لگا تھا۔ جان دے دی البتہ تیر یار نے دیکھا کہ دلِ عاشق بغیر زخم کے مر گیا میری ضرورت باقی نہیں رہی۔

ترک تعلق کر کے سینے سے نکل گیا۔ تنگ دلی سے رشک کے عربی معنی مقصود ہیں۔
اور پرافشاندن کے معنی ترک تعلق کردن۔

آسی ـــــ تنگ دل رنجیدہ کو کہتے ہیں۔ یہاں لفظ کے معنی کا فائدہ اٹھایا ہے۔ یعنی میرا دل تنگ تھا اور اس میں زخم فراخ۔ مگر اسی زخم نے میری تنگ دلی کی داد نہ دی۔ کہ میں نے اس تنگ دلی کے باوجود اتنا بڑا زخم کھایا۔ اور یہی سلوک میرے ساتھ تیر نے کیا کہ وہ پرافشاں میرے دل سے نکلا یعنی تیر کو ایسے موقع پر افشانی نہ کرنی چاہیئے تھی۔ بلکہ میری تنگ دلی پر نگاہ رکھنی چاہیئے تھی۔ (طبا طبائی)

۳۔ بوئے گل، نالۂ دل (آہ) دود چراغ وغیرہ میں پریشانی کی خاصیت ہے مرزا صاحب نے ان کی پریشانی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ چاہے پھولوں کی مہک ہو (کہ اس کو تو پسند کرتا ہے) اور خواہ نالۂ دل مہجور یا شمع محفل کا دھواں ہو غرض جو بھی تیری محفل میں جاتا ہے وہ وہاں سے پریشان ہی ہو کر نکلتا ہے اور یہ تیری بیدادگری کا ثبوت ہے (سعید۔ آسی)

طبا طبائی:۔ تیری بزم سے نکلنا پریشانی کا باعث ہے۔ **بیخود** ـــــ یہ سب چیزیں پریشان ہونے کی خاصیت رکھتی ہیں۔ شاعر ان پر رشک کرتا اور کہتا ہے کہ ان کی پریشانی کا باعث ہوا نہیں ہے۔ بلکہ یہ بھی تجھ پر عاشق ہو کر تیری بزم سے نکلتی ہیں۔ اس لئے پریشان ہیں۔

۴۔ مائدہ ..... دستر خوان بقدر ..... قابلیت کے مطابق، کام .....
مطلب۔ میرے حسرت زدہ دل کے دستر خوان پر لذت درد کے کھانے چنے ہوئے تھے میرے دوستوں نے اپنے لب و دنداں کی قوت کے مطابق میرے دستر خوان درد سے درد کا ذائقہ چکھ لیا۔ گویا ہر شخص بقدر استعداد متاثر ہوا۔ (سعید و حسرت)

بیخود و طبا طبائی ــــــ میرے دستر خوان پر لذت ورد کی کمی نہ تھی۔ لیکن یاروں کو ان کی قابلیت کے موافق حصہ نہ ملا۔

آسی ــــــ بقدر لب و دنداں کے معنی کم کے ہیں یعنی دوست میرے مائدہ درد پر ہونٹ ہی کاٹتے رہے۔ بہت کم غم کھایا۔

۵۔ نو آموز۔ مبتدی۔ ہمت دشوار پسند۔۔۔۔ میری ہمت دشواریوں کو پسند کرتی ہے۔ یہ کام۔۔۔ یعنی درس فنا۔ اے میری مشکل پسند ہمت فنا کے مدارج جو نہایت ہی مشکل سمجھے جاتے ہیں۔ تو ابتدائے تعلیم ہی میں آسانی سے سیکھ گئی۔ گویا فنا کے مقامات طے کرنے میں تجھے کوئی دقت پیش نہ آئی۔ چونکہ ہمت دشواریوں کو پسند کرتی ہے۔ اس لئے اب سخت مشکل آ پڑی ہے کہ میں کونسا مشکل کام اس کے لئے تجویز کروں۔۔۔ گویا ہمت دشوار پسند کے لئے کوئی فنا سے زیادہ مشکل کام چاہیئے۔ مطلب یہ کہ ہم سمجھتے تھے۔ جان دینا بہت مشکل کام ہے۔ مگر دیکھ لیا ہے کہ وہ بھی آسان نکلا۔

۶۔ طوفان قطرہ۔ شعر متناسب الفاظ ہیں۔ اے غالبؔ! میرے دل میں پھر دوبارہ گریہ کا ایک طوفان اٹھا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہلی گریہ وزاری میں جو قطرہ باقی رہ گیا تھا وہ طوفان ثابت ہوا۔ (آسی۔ سہا۔ سعید)

بیخود ــــــ پہلی بار تو میں نے اس جوش کو اس قدر ضبط کیا تھا۔ کہ دریائے گریہ کا ایک قطرہ بھی آنکھ سے نہ نکلنے دیا۔ افسوس ہے اب اس نے طوفان کی صورت اختیار کر لی یعنی رفتہ رفتہ عشق نے ظاہر ہو جانے کا سامان پیدا کر لیا۔

طبا طبائی۔ (۱) گریہ پر میرا ضبط ایسا غالب تھا۔ کہ میں اسے قطرہ سے کمتر سمجھتا تھا۔ اب وہ طوفان بن کر مجھ پر غالب آگیا (۲) میرے ہم خیال۔

۲- دھمکی میں مر گیا جو نہ باب نبرد تھا ۱ عشق نبرد پیشہ طلبگار مرد تھا

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا ۲ اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں ۳ مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

دل تا جگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب ۴ اس رہگزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہ عشق کی ۵ دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

احباب چارہ سازیٔ وحشت نہ کر سکے ۶ زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

یہ لاش بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

۱- باب نبرد...... قابلِ جنگ۔ لائق میدان، بہادر عشق نبرد پیشہ... ...عشق جو مردِ میدان (بہادر) کا طالب ہوتا ہے۔ جو شخص کہ میدان عشق میں نبرد آزمائی کرنے کے قابل نہ تھا۔ وہ عشق کی ایک دھمکی سے مر گیا۔ یعنی عشق کی تاب نہ لا سکا۔ بات یہ ہے کہ عشق نبرد پیشہ ہے۔ وہ اس مردِ میدان عاشق کو پسند کرتا ہے جو عشق کی مصیبتوں کو برداشت کر سکتا ہے اگر عاشق میں ہمت مردانہ نہ ہو۔ تو مصیبت کا خوف عشق کو باطل کر دیتا ہے۔

بیخود ـــــــ "دھمکی میں مر گیا" فرہاد کی طرف اشارہ ہے، اور یہ کہ ہم نے دھمکی میں آ کر فرہاد کی طرح جان نہیں دی۔ بلکہ مصائب کا ہمیشہ مردانگی کے ساتھ مقابلہ کیا۔

۲- موت کا کھٹکا..... موت کا خوف۔ اڑنے سے پیشتر..... رنگ اڑنے سے پہلے یعنی بوقتِ مرگ۔ قاعدہ یہ ہے کہ انسان دنیا کے لہو ولعب میں موت کو بھول جاتا ہے لیکن شاعر کہتا ہے چونکہ ہر وقت موت کا احساس تھا۔ اس لئے میرا رنگ پہلے ہی زرد ہو گیا تھا۔ گویا جانکنی کے وقت موت کے

خوف سے میرا رنگ زرد نہیں ہوا تھا۔ بقول بیخودؔ میں نے اپنے آپ کو فنا ہونے سے پیشتر فنا کر دیا تھا۔ اس بیان کا لطف کچھ اہلِ تصوف ہی اُٹھا سکتے ہیں۔ اس زمین میں ایسا بلند شعر کہنا مرزا ہی جیسے مسلم الثبوت اور ماہرِ فن کا کام تھا۔

۳۔ ابھی فردِ فرد تھا ...... میں ابھی ناتجربہ کار تھا۔ وفا ...... عشق۔ میرے خیالاتِ عشقیہ ابھی پختہ نہ ہوئے تھے۔ گویا میں مکتبِ عشق میں ابھی مبتدی ہی تھا۔ کہ میں نے عشق کی کتابیں باقاعدہ تالیف کرنی شروع کر دی تھیں مطلب یہ ہے کہ ابتدائے عشق ہی میں میری کیفیت پختہ کار عاشقوں کی سی تھی۔

بیخودؔ —— ابتدائے عشق میں جبکہ میں وفاداری کے متعلق نسخوں کی تالیف کر کے ادویۂ وفا کے خواص و مزاج قائم کر رہا تھا۔ مجھ پر ستم کا آغاز ہو گیا اور میری دوا کے نسخے ناتمام رہ گئے۔

۴۔ دل تا جگر ...... دل سے لے کر جگر تک۔ آگے ...... کسی زمانے میں کبھی گرد تھا ...... ہیچ تھا۔ رہگذر ...... دل سے جگر تک۔ اب میرے دل سے لے کر جگر تک خون ہی خون ہے یعنی میرا دل و جگر خون ہو گیا ہے اور ساحلِ دریائے خون کا منظر پیش کرتا ہے لیکن کبھی ان مقامات پر وہ کیف آور بہاریں تھیں۔ کہ ان کے سامنے جلوۂ گل بھی ہیچ تھا۔ بقول طباطبائی۔ کسی زمانے میں ہم بھی بدل شگفتہ اور رنگین رکھتے تھے۔ اور اب خاطر افسردہ و غمگین رہتے ہیں۔"

بیخودؔ —— انقلابِ زمانہ کی کس قدر سچی اور پُر اثر تصویر کھینچی ہے۔

۵۔ غمِ عشق کی کشمکش اور مصیبت سے عاشق کو کبھی خلاصی نہیں ہوتی۔ اگر دل جس کی بدولت عاشق کشمکش میں مبتلا ہوتا ہے چلا جائے تو پھر بھی اس

مصیبت سے نجات نہیں ہوتی۔ کیونکہ دل کے جاتے رہنے کا غم پیدا ہو جاتا ہے حسرت نے میر کا یہ شعر سند میں پیش کیا ہے ۔

غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا ۔ دل کے جانے کا نہایت غم رہا

آسی لکھتے ہیں۔ دل کے درد سے مراد دل کے مٹ جانے کا درد ہے ورنہ اگر دل کا درد بمعنی دل میں درد کہیں گے تو شعر بے معنی ہو جائے گا۔ دل نہیں ہے اور دل میں درد ہے یعنی چہ ؟

۶- چارہ سازی ..... علاج۔ وحشت ..... وحشتِ عشق ۔ بیاباں نورد ..... آوارۂ دشت ۔ احباب نے میری وحشت کو کم کرنے کے لئے مجھے قید خانہ میں بند کر دیا ۔ تاکہ میں جنگلوں میں مارا مارا نہ پھروں، اور جوشِ جنوں (عشق) زیادہ نہ بڑھے، اگرچہ میں زنداں میں تھا۔ لیکن میرا خیال اسی طرح بیاباں نوردی میں مصروف تھا۔ اس لئے اِن کا علاج کبھی کامیاب نہ ہو سکا ۔

مجھے اسیر کریں یا مری زباں کاٹیں ۔ مرے خیال کو بیڑی پہنا نہیں سکتے

۷ یہ بے کفن لاش اسد خستہ جان کی ہے۔ خدا مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا ۔ کہ اس کی لاش بھی بے کفن ہے یعنی وہ جب تک زندہ رہا تکلفات سے آزاد رہا ۔ اور اب مر کر بھی گور و کفن کی قیود سے آزاد ہے ۔

بیخود ۔ جملہ دعائیہ نے عجب لطف پیدا کر دیا ہے ۔

آسی ۔ آزاد مرد سے فائدہ اٹھا کر لاش کو بے کفن کیا ہے اور یہ محاورہ نہایت برمحل صرف ہوا ہے ۔

۷ شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا ۱ تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

بہ فیضِ بیدلی نومیدیٔ جاوید آساں ہے ۲ کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریِ قاتل ۳ کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

جراحت تحفہ الماس ارمغاں داغِ جگر ہدیہ
۴ مبارکباد اسدؔ غمخوارِ جانِ دردمند آیا

۱۔ شمارِ سبحہ...... تسبیح کے دانوں کو شمار کرنا۔ تسبیح میں سو دانے ہوتے ہیں۔
——— مرغوب آیا...... پسند آیا۔ بتِ مشکل پسند...... وہ محبوب جس کو مشکلات پسند ہوں۔ بہ یک کف بردن صد دل...... ایک جھپٹے میں سو دل اڑا لینا۔ میرے مشکل پسند محبوب کو تسبیح پڑھنا اس لئے پسند ہے۔ کہ اس میں اس کی حسبِ خواہش ایک ہی وار میں سو سو دل اڑا لینے کی مشابہت پائی جاتی ہے۔

آسیؔ:۔ اس شعر میں تعقید ہے۔ کہ ظاہرہ ایسے مضمون کو کوہ کندن و کاہ برآوردن سے زیادہ وقعت نہیں دی جا سکتی۔ بت کی صفت مشکل پسند اس واسطے سے رکھی ہے کہ تسبیح بت کے لئے ایک مشکل اور فعل غیر معتاد ہے۔ طرزِ ادا میں بے تکلفی اور بندش میں چستی ہے۔

۲ فیضِ بے دلی...... ناامیدی کی بدولت۔ نومیدیٔ جاوید...... ہمیشہ کی ناکامی پے در پے مایوسیوں اور ناکامیوں سے ہم بالکل ناامید اور بیدل ہو گئے ہیں۔ اس بے دلی کی بدولت دوامی ناامیدی کا برداشت کر لینا ہمارے لئے معمولی سی بات ہے۔ قاعدہ ہے کہ جب انسان بالکل مایوس ہو جاتا ہے۔ تو پھر بڑی سے بڑی ناکامیابی بھی اس کے دل پر کوئی اثر نہیں کرتی۔ اور کشاکش کو ہمارا عقدۂ مشکل "پسند آ گیا ہے۔ اگر اسے ہمارا عقدہ مشکل پسند نہ ہوتا۔ تو اس کو سلجھایا جاتا۔ یعنی اب کشائش نہ ہوگی۔

طباطبائی ——— یعنی دنیا کی طرف سے جو بے دلی و بے دماغی ہم کو ہے

اس کی بدولت صدمۂ نومیدی دیاس کا اٹھا لینا ہم کو سہل ہے ہمیں دنیا
پر خود رغبت نہیں ہے۔ کشود کار کی امید ہو تو گیا اور نا امیدی ہو جائے تو گیا
پہلے مصرعہ کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا عقدۂ مشکل کشایش کو پسند آگیا ہے
یعنی اب کبھی اس کی کشایش نہ ہوگی۔ اس سبب سے کہ کشایش کو ہمارا عقدہ
ہی رہنا پسند ہے اور پسند اس سبب سے ہے کہ ہم کو پہلے ہی سے ایسی بے
نیازی کشایش کو کیوں نہ پسند آئے۔ (سعید)

حسرت: کشایش نے اپنا عمل کرنے کے لئے ہمارے عقدۂ مشکل نومیدی
جاوید کو پسند کیا اور ہماری مشکل آسان ہو گئی۔ اس طور پر کہ ہم کو دنیا کی جانب
سے جو بے دلی پیدا ہو گئی ہے اس کے سبب سے صدمۂ نومیدی جاوید کا
برداشت کرنا آسان ہو گیا ہے کیونکہ غایت بے دلی کی حالت میں امید و
ناامیدی یکساں ہو جاتی ہے۔

بیخود: جب ہم نے یہ سمجھ لیا کہ ہمارا عقدۂ دشوار لاینحل ہے تو امید
عقدہ کشائی اٹھ گئی ناامیدی کی صورت میں ہمیشہ کو تسکین خاطر
حاصل ہو گئی۔

آسی: (۱) کشایش نے ہمارے دل کو جو بصورت عقدہ ہے، پسند
کیا اور اس کو لے لیا اور ہم سے ہمیشہ کے واسطے جدا کر دیا۔ (۲) میرے
ہم خیال۔

۲۲۔ ہوا ۔۔۔۔ شوق آئینہ ۔۔۔۔ اظہار۔ بے مہری ۔۔۔ ستمگری بخوں
غلطیدن ۔۔۔ خون میں تڑپنا۔ ستم شعار محبوب کا باغ میں سیر گل سے
لطف اندوز ہونا۔ اس کی بے مہری اور ستم شعاری کا ثبوت ہے کیونکہ وہ سیر
گل کے لئے باغ میں نہیں جاتا۔ بلکہ اسے بسملوں کا خون میں لوٹتے ہوئے

دیکھنے کا شوق ہے۔ اور یہ تماشا اسے باغ میں دیکھنے کا خوب موقع ملا ہے جہاں سُرخ سرخ پھول شاخوں سے گر کر اور ہوا سے اڑ کر اِدھر اُدھر لوٹتے پھرتے ہیں اور بسمل بخون غلطیدن کا نظارہ پیش کرتے ہیں۔ تشبیہات نہایت عمدہ ہیں رنگ گل سے خون اور پھولوں کا ہوا سے ہلنا بسمل کا خون میں لوٹنا وغیرہ الفاظ بھی مناسب اور قابل تعریف ہیں۔

۴۔ جراحت.... زخم۔ الماس.... ہیرا۔ ارمغاں.... تحفہ۔ ہدیہ.... تحفہ۔ غمخوار جانِ دردمند عشق۔ اے اسد مبارک ہو تمہاری دردمند جان کا غمخوارِ عشق، آیا ہے اور تمہارے لئے جراحت، الماس و داغِ جگر کے تحفے تحائف لایا ہے، عاشق کے لئے یہ چیزیں تحفہ اس لئے ہیں کہ عشق میں درد اور کرب پیدا کرنے والی چیزیں مرغوب ہوتی ہیں، الماس کی خصوصیت یہ ہے کہ اگر کوئی ہیرا چاٹ لے تو اس کے دل و جگر زخمی ہو جاتے ہیں اور اگر ہیرے کا سفوف زخم پر لگ جائے تو زخم میں بے حد تکلیف ہوتی ہے بطور حسرت ایسے ہدیوں پر مبارکباد دے کر اپنی ایذا دوستی کا اظہار کیا ہے۔

بیخود —— (۱) میرا غمخوار جو دوست کو سمجھانے کے لئے گیا تھا کہ وہ مجھ سے ملے وہ یہ تحفے لے کر آیا۔ یعنی خود ہی عاشق ہو گیا ہے (۲) میرے ہمخیال طبا طبائی۔ (۱) میرے ہمخیال (۲) غمخوار سے ناصح مراد ہے اور مبارکباد تشنیع کی راہ سے ہے۔

آسی :۔ غمخوار سے مراد ناصح لے کر فرماتے ہیں۔ ناصح کے یہ تحفے یعنی گفتگو میرے لئے رنجیدہ ثابت ہو گی۔

۸۔ دہر میں نقشِ وفا وجہ تسلی نہ ہوا ۱ ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

سبزۂ خط سے ترا کاکُلِ سرکش نہ دبا یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا ۱

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں ۳ وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
دل گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی ۴ گر نفس جادۂ سرمنزلِ تقویٰ نہ ہوا
ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی ۵ گوش منت کشِ گلبانگِ تسلی نہ ہوا
کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجے ۶ ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا
مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ ۷ ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

۱۔ دنیا میں لفظِ وفا استعمال تو بہت کیا جاتا ہے لیکن کبھی اصلی معنوں میں استعمال نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے اس بے معنی استعمال اور خالی ذکرِ وفا سے عاشقِ صادق کی تسلی خاطر نہیں ہو سکتی۔ اس لئے یہ وہ لفظ ہے کہ جس کو کبھی اپنے معانی کا شرمندۂ احسان نہ ہونا پڑا۔ شاعر کا مقصود یہ ہے کہ جب دنیا میں اصلی وفا نہیں تو صرف نقشِ وفا سے تسلی خاطر کیونکر ہو سکتی ہے۔

بیخودؔ ــــ جو لوگ وفاداری سے نقشِ وفا قائم کرتے ہیں۔ وہ اپنا وقت بیکار ضائع کرتے ہیں اس لئے نقشِ وفا اہلِ وفا کے لئے موجبِ تسلی خاطر نہیں ہوتا ہمیشہ اہلِ وفا دنیا کے دستور کے مطابق جفا کے مستحق قرار دیئے جاتے ہیں شاعر مصرعہ ثانی سے اپنے دل کو تسلی دیتا ہے۔

طباطبائی ــــ لوگ دنیا میں وفا کر کے تسلی چاہتے ہیں جب وفا کر کے تسلی نہ ہوئی تو لفظِ وفا بے معنی رہ گیا۔ حاصل یہ کہ وفاداریٔ عشاق بے معنی بات ہے

۲۔ کاکلِ سرکش۔۔۔۔ لہراتی ہوئی یا بے قابو زلف۔ زلف کو افعی سے تشبیہہ دی ہے۔ سبزۂ خط۔۔۔۔ آغازِ خط۔ زمرد سے تشبیہہ دی ہے۔ زمرد۔۔۔ ایک قسم کا سبز قیمتی پتھر ہے۔ جس کو دیکھ کر سانپ اندھا ہو جاتا ہے۔ حریف۔۔ مقابل۔ تیرا زمرد بن سبزۂ خط افعی زلف پر کچھ اثر انداز نہیں ہوتا۔ اس کے اثر سے تیری سیاہ ناگوں جیسی زلفوں کی ایذا رسانی ختم ہونی چاہیئے تھی مطلب یہ ہے کہ باوجود خط نکل آنے کے تیری

زلفوں کی دلکشی اور حسن میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔

۳۔ اندوہِ وفا..... غمِ وفا میں نے چاہا تھا کہ میں مر جاؤں تاکہ مجھے وفاداری کی مصیبتوں اور رنج و غم سے نجات مل جائے۔ لیکن افسوس کہ وہ یارِ ستمگر میرے مر جانے پر بھی رضی نہ ہوا۔ کیونکہ اسے مجھ جیسا وفا شعار کوئی اور عاشق نظر نہ آتا تھا اور میری وفاداری دیکھئے کہ میں نے یہ ستم بھی بہ طیبِ خاطر برداشت کر لیا۔ بقولِ نجود۔ طباطبائی۔ معشوق کو اپنی رسوائی اور بدنامی کے اندیشے سے میرا مر جانا بھی گوارہ نہیں ہوا۔

طباطبائیؒ ــــــ لفظی اور معنوی خوبیاں اس شعر میں بہت ہیں۔ کثرتِ اندوہ، علاج میں درماندگی، اس پر بھی دل آزاری و جفاکاری، ایسی حالت میں معشوق کی مرضی پر شاکر رہنا۔

۴۔ گذرگاہ ..... راستہ۔ نفس ..... سانس جادہ ..... راستہ تقویٰ ..... پرہیزگاری۔ سرِ منزل۔ اگر میرا سانس منزلِ پرہیزگاری کا راستہ نہ بنا تو کچھ مضائقہ نہیں یعنی اگر میں متقی اور پرہیزگار نہ ہوا تو نہ سہی، میرا دل جام و شراب کی گذرگاہ تو ہے ..... چلو میں رند ہی سہی۔ کچھ نہ کچھ تو ہوں۔ بقول نجوو۔ رندی اور پرہیزگاری کو برابر تصور کیا گیا ہے۔

۵۔ منت کش ..... ممنون۔ گلبانگ ..... دلکش آواز میں ترے وعدۂ وصل نہ کرنے سے بھی خوش ہوں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر تو وعدۂ وصل کرتا۔ تو میرے دل کو اس سے تسلی ہوتی اور میرے کان وعدۂ وصل کی آواز کے ممنون ہوتے۔ خدا کا شکر ہے۔ کہ تو نے کبھی وعدہ نہ کیا اور میرے کان وعدہ کی تسلی بخش آواز کے کبھی ممنون نہ ہوئے۔

۶۔ ہم اپنی بدنصیبی اور محرومِ القسمتی کی کس سے شکایت کریں وہ تو عدو سے

گذر گئی ہے۔ ہماری آخری خواہش یہ تھی کہ ہم مر ہی جائیں لیکن قسمت کی محرومی دیکھئے کہ ہمیں موت بھی نہ آئی۔ موت ایسی چیز ہے جو کشور میں مانگے ہی مل جاتی ہے لیکن ہم اس سے محروم رہے۔

۷۔ جنبش لب ..... حرکتِ لب۔ حریف ..... مد مقابل۔ دم عیسیٰ ...
حضرت عیسیٰ قم باذن اللہ کہہ کر مردوں کو زندہ کر دیتے تھے۔ غالب اس قدر نحیف و ناتواں تھا۔ کہ وہ عیسیٰ کی جنبش لب کا صدمہ بھی برداشت نہ کر سکا عیسیٰ نے قم باذن اللہ کہنے کے لئے اپنے ہونٹوں کو حرکت دی۔ گویا زندہ کرنے کے کلمات ادا بھی نہ کرنے پائے تھے کہ غالب مر گیا اور حضرت عیسیٰ جو اس کو زندہ کرنے آئے تھے۔ وہی اس کی موت کا باعث ہو گئے (سب شارحین متفق ہیں)۔

آسی :۔ (۱) میرے ہم خیال (۲) اپنا لب ہلایا تھا۔ کہ دعا کریں اسی میں چل بسا (۳) عیسیٰ کو بلانے کی نوبت ہی نہ آئی تھی (۴) عیسیٰ کو بلانے کے لئے جو لب ہلائے۔ اسی میں خاتمہ ہو گیا۔

۹ ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا ۱ وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا
بیاں کیا کیجئے بیدادِ کاوش ہائے مژگاں کا ۲ کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیح مرجاں کا
نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو ۳ لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا
دکھاؤں گا تماشہ دی اگر فرصت زمانے نے ۴ مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سرو چراغاں کا
کیا آئینہ خانہ کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے ۵ کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا
مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ۶ ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا
اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشہ کر ۷ مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا
خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں ۸ چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا
ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے ۹ دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ ۱۰ سبب کیا خواب میں آ کر تبسم ہائے پنہاں کا

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا ۱۱ قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالب ۱۲ کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

۱۔ ستائش گر...... مداح ۔ باغِ رضوان...... باغِ جنت ۔ طاقِ نسیان ...... وہ طاق جس میں کوئی چیز رکھ کر بھول جائیں ۔ بالائے طاق رکھنا بمعنی ترک کرنا ۔ طاقِ نسیان پر رکھنا اور بھی زیادہ مبالغہ پیدا کرتا ہے بہشت کو تحقیراً گلدستہ کے ساتھ تشبیہ دی ہے لطف یہ ہے کہ گلدستہ سجاوٹ کے لئے طاق ہی پر رکھا جاتا ہے تشبیہ بالکل اچھوتی ہے ۔ طباطبائی کہتے ہیں ۔ اس شعر میں معنوی خوبی نہیں حسنِ بیان و بدیع سے تعلق ہے ۔

زاہد جس باغِ جنت کی اس قدر تعریفیں کرتا ہے وہ ہم جیسے بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا ایک گلدستہ ہے گویا ہمارے نزدیک جنت کی توقیر کچھ بھی نہیں ۔ ہم تو اسے طاقِ نسیان میں رکھ کر بھول جاتے ہیں ۔ بقول آسی بہشت کی تحقیر اسی کے مناسب لفظ گلدستہ سے کی گئی ہے ۔ اور پھر بھی اس کو باعثِ زینت قرار دیا گیا ہے ۔ چونکہ خود کو بیخود کہا ہے اس لیئے اس کو طاقِ نسیان پر رکھا ہے ۔

حسرت ۔ ہم بیخودی کے ایسے خوشگوار عالم میں ہیں جس کے مقابلہ میں ہم نے جنت کو بھی فراموش کر دیا ہے ۔

۲ ۔ مژگان ...... پلکیں ۔ مژگاں کو سوئی سے تشبیہ دی ہے ۔ کاوشِ مژگاں ...... یعنی چھیدنا ۔ مرجان ...... مونگا ۔ سرخ رنگ کا ہوتا ہے اس کو قطرۂ خون سے تشبیہ دی ہے ۔ مرجان تسبیح میں ڈالا جاتا ہے ۔ میں مژگانِ یار کی کاوشیں کیا بیان کروں ۔ ان کی کاوشوں سے میرا ہر قطرۂ خون تسبیحِ مرجان کا دانہ بن گیا ہے

یعنی میرے قطراتِ خون کو مژگانِ یار نے دانہ مرجان کی طرح چھید ڈالا ہے ظاہر ہے ہر قطرۂ خون کو چھیدنا بڑا کاوش کا کام ہے۔

سُہا ـــــ قطراتِ خون دانے ہوتے ہیں اور مژگان رشتہ جن سے ایک تسبیح تیار ہو گئی ہے۔

بیخود ـــــ مژگانِ یار کی کاوش نے قطرۂ خون آنسو بنا دیا۔ جنہوں نے مسلسل جمع ہو کر تسبیح مرجان کی صورت اختیار کر لی ہے۔

۳۔ سطوت۔۔۔ رعب نیستاں۔۔۔ وہ مقام جہاں نے اُگتی ہے اور نے میں سے نالہ نے نکلتا ہے۔ دانتوں میں تنکا لینا۔۔۔ اظہارِ عجز کرنا ہوا رشِہ نیستاں کا۔۔۔ نے یا (نسری) بن گیا۔ قاتل محبوب کا رعب بھی میرے نالوں کو روک نہ سکا۔ ان کی یا رعب شخصیت کو تسلیم اور اپنی عاجزی کا اظہار کرنے کے لئے جو تنکا میں نے دانتوں میں لیا تھا وہ نے بن گیا اور نالے کرنے لگا۔

آسی ـــــ تنکا نیستان کا ریشہ بن گیا یعنی اس نے سینکڑوں نے پیدا کر دیں جس سے نالہ کشی اور بھی بڑھ گئی۔

۴۔ سر و چراغاں۔۔۔ چراغوں کو ایسے طریقے سے رکھنا کہ سرو کی صورت پیدا ہو جائے۔ تخم۔۔۔ بیج۔ تماشا۔۔۔ سیر۔ اگر مجھے زمانے نے مہلت دی تو میں تم کو ثابت کر کے دکھا دوں گا۔ کہ میرے دل کا ہر داغ سرِ و چراغاں کا بیج ہے یعنی ہر داغ دل سے سرو چراغاں پیدا ہو جائے گا۔ بالفاظِ دیگر ہر داغِ دل سے اتنی شرر باری ہو گی کہ بہت سے سرو چراغاں نظر آئیں گے۔

آسی ـــــ بہت اچھا شعر ہے۔ باریکی یہ ہے۔ کہ میرا عشق روز افزوں ہے۔ "دی اگر فرصت زمانے نے" سے مایوسی کا اظہار ہوتا ہے۔

۵۔ آئینہ خانہ۔۔۔ شیش محل جس مکان میں ہر طرف آئینے ہی آئینے ہوں۔

شبستان ..... وہ مقام جہاں اوس پڑی ہو جس طرح آفتاب کے سامنے شبنم نہیں ٹھہر سکتی۔ اور تمازتِ آفتاب سے بہ جاتی ہے۔ اسی طرح آئینہ خانہ تیرے جلوہ کی تاب نہ لا سکا۔ جب تو نے آئینہ خانہ میں اپنا جلوہ دکھایا تو ہر آئینہ شبنم کی طرح پانی ہو کر بہ گیا۔

سہتا - (۱) ہم خیال (۲) پر تو خورشید سے شبنم کا ہر قطرہ چمک اٹھتا ہے۔ اسی طرح تیرے جلوہ سے آئینہ خانہ جگمگا اٹھا (۳) سارے آئینہ کی جلا ماند پڑ گئی۔

سعید - سہتا کے دوسرے معنی بھی لکھتے ہیں (اسی) تیرے جلوے نے آئینہ خانہ کا وہ نقشہ بنا دیا جو دھوپ شبنم کا بنا دیتی ہے۔ بعض حکماء کا قول ہے کہ شبنم آفتاب سے پیدا ہوتی ہے۔ اور آفتاب ہی اس کو جذب کر لیتا ہے۔ یعنی آئینہ خانہ تیرے جلوے کی تاب نہ لا سکا۔

۲۔ مضمر ..... پوشیدہ تعمیر ..... بنانا، مراد بقا۔ خرابی ... تخریب فنا ہیولیٰ ..... اصل (مادۂ ہر شئے۔ خونِ گرم .... سرگرمی، کوشش۔ اس شعر میں شاعر نے ایک مسئلہ طب سے استفادہ کیا ہے۔ اطباء کہتے ہیں کہ حرارت غریزی باعثِ زندگی انسان ہے۔ خون تحلیل ہو کر حرارت غریزی میں تبدیل ہوتا ہے پھر یہی حرارت غریزی خون کو تحلیل کرتی ہے۔ تاکہ دوسرے قوئ کے لئے غذا بہم پہنچے۔ غرض وہ نتیجہ تحلیل خون بھی ہے اور خود بھی خون کو تحلیل کرتی ہے اور دونوں عملوں کے توازن سے ہستی انسان قائم رہتی ہے۔ اسی کو شاعر کہتا ہے کہ میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی یعنی میں وہ دہقان ہوں جس کی سرگرمی خود اسی کے خرمن کے لئے برق کا کام کرتی ہے (خرمن کو جلاتی ہے) گویا میرا وجود ہی میری فنا کی دلیل ہے۔ کہ اس میں فنا ہونے کی : یقیناً قدرت نے پوشیدہ رکھی ہے،

سعید ———— دہقان کا خون گرم باعث خرابی ہے۔ پیدائش خرمن، دراصل بجلی کا ہیولیٰ ہے۔ یعنی نما خود اس کی فنا کا باعث ہے۔ کیونکہ نہ خرمن پیدا ہوتا نہ بجلی گرتی۔ خون کو بہ لحاظ حدت برق سے تشبیہہ دی ہے۔

۷۔ اُگا ہے سبزہ..... اگر گھروں میں گھاس اُگ آئے تو ویرانی کا پیش خیمہ سمجھا جاتا ہے۔ تماشہ کر..... سیر دیکھ۔ تماشہ کردن (۱) میرے گھر کی ویرانی ذرا ملاحظہ فرمایئے۔ کہ اس میں ہر طرف گھاس اُگ آئی ہے اور میرا دربان جو غیر لوگوں کو اندر آنے سے روکنے کے لئے نوکر رکھا گیا تھا۔ وہ اب گھاس نوچتا پھرتا ہے بیچارا گھاس نہ نوچے تو اور کیا کرے۔ ویرانی کی وجہ سے گھر میں تو کوئی آتا نہیں۔ اس کو اپنی نوکری کی فکر ہے۔ اس لئے اسباب ویرانی کو دُور کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس قسم کی گھاس سبزہ بیگانہ کہلاتی ہے۔ گویا دربان اس کو بیگانہ سمجھ کر نکالتا پھرتا ہے۔ بیخود کہتے ہیں۔ اگر ویرانی کو مخاطب کیا جائے تو لطف سے خالی نہیں۔ آسی سبزۂ بیگانہ کے معنی بیچ میں نہیں لاتے۔ اس کے بغیر شعر میں شعریت پیدا نہیں ہوتی۔

۸۔ خوں گشتہ..... خون شدہ۔ وہ آرزوئیں جن کا خون ہوگیا ہو۔ یعنی پوری نہ ہوئی ہوں۔ چراغ مردہ..... بجھا ہوا چراغ۔ بے زبان..... چراغ کی لَو کو زبان سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ اس لئے بجھے ہوئے چراغ کو بےزبان کہا ہے میری خاموشی میں لاکھوں خون گشتہ آرزوئیں پوشیدہ ہیں۔ گویا میں گورِ غریباں کا بجھا ہوا چراغ ہوں یعنی میری بے زبانی گورِ غریباں کے بجھے ہوئے چراغ کی طرح لاکھوں خون گشتہ آرزوؤں کی دلیل ہے۔

سب شارحین متفق ہیں۔ بجھے ہوئے چراغ کو بے زبان آدمی اور خون گشتہ آرزوؤں کو گورِ غریباں کے ساتھ مشابہت دینا نہایت خوب ہے۔

سعید ـــــ گورِ غریباں میں بجھے ہوئے چراغ کو دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے۔ کہ نہ معلوم مدفونین کی رجو اس قدر بے کس ہیں کہ اِن کی قبروں پر کوئی چراغ جلانے والا بھی نہیں، کیسی کیسی آرزوؤں کا خون ہوا ہوگا۔ بقول آسی مضمون نہایت حسرتناک الفاظ میں ادا ہوا ہے۔

۹۔ پرتو...... عکس۔ ہنوز...... ابھی، اس لفظ سے ظاہر ہے کہ خیال جاتا رہا ہے۔ لیکن اس کا پرتو باقی ہے جس کی وجہ سے دل کے تنگ و تاریک حجرہ میں کچھ روشنی ہے۔ دل افسردہ...... خانۂ دل جس میں رخیال یار جاتے رہنے سے) افسردگی طاری ہے۔ حجرہ...... تنگ و تاریک کوٹھڑی، گویا دل افسردگی سے حجرۂ زنداں بن گیا ہے۔ حجرۂ یوسف جس حجرہ میں یوسف کو قید کیا گیا تھا۔ وہ نہایت تنگ و تاریک تھا۔ لیکن اُن کے حسن کے نور سے وہ منور ہو گیا تھا۔ پرتوِ خیال یار کو حضرت یوسف کے پرتوِ حسن سے اور اپنے دل افسردہ کو حجرۂ زندانِ یوسف سے تشبیہ دی ہے۔ میں ابھی اپنے محبوب کو بالکل نہیں بھولا۔ اب تک خیالِ یار کا عکس دل میں باقی ہے۔ اور فقط اس پرتو سے میرا افسردہ دل حضرت یوسف کا حجرہ زندان بن گیا ہے کہتے ہیں حضرت یوسف کے نورِ حسن سے تنگ و تاریک حجرہ بقعۂ نور بن گیا تھا۔

سعید ـــــ حضرت یوسف کا پرتو ان کے آزاد ہونے کے بعد بھی زنداں میں رہ گیا تھا۔ اسی طرح حجرۂ دل میں پرتو خیال یار باقی ہے۔

آسی ـــــ ہنوز سے معلوم ہوتا ہے کہ عاشق نے خود خیالِ یار کو رخصت نہیں کیا۔ بلکہ وہ افسردگی دل سے جاتا رہا۔ جو ستم ہائے محبوب کا نتیجہ ہے۔ افسردگی کے معنی ٹھٹھر جانا اور سکڑ جانا ہے۔ اس لئے دل میں جگہ باقی نہ رہی۔ افسردہ ہونے سے حجرہ کی مشابہت بہت ہے۔

۱۰۔ تبسم ہائے پنہاں ..... زیرِ لب مسکراہٹ، جس کا اثر محض ہونٹوں پر ظاہر ہو۔ تبسم حجاب آمیز۔ عاشق نے محبوب کو خواب میں تبسم ہائے پنہاں کرتے دیکھا ہے۔ اور وہ اس خواب سے اس نتیجہ پر پہنچا ہے۔ کہ محبوب آج رقیب کی بغل میں سو رہا ہے۔ اسی وجہ سے وہ خواب میں حجاب آمیز تبسم کرتا ہوا دکھلائی دیا ہے۔ ورنہ وہ ستم شعار میرے خواب میں آنا اور تبسم ہائے پنہاں کرنا، غیر ممکن ہے (حجاب آمیز مسکراہٹ وصل کا پتہ دے رہی ہے)

بیخود۔ طباطبائی تو رقیب کی بغل میں سویا ہوا ہے۔ اور وہ تیری حجاب آمیز مسکراہٹ مجھے خواب میں نظر آ رہی ہے۔

۱۱۔ لہو پانی ہونا ... رونا۔ خیال ہے کہ خون پانی ہو کر آنسو کی صورت اختیار کرتا ہے۔ قیامت ہے ... انتہائی مصیبت ہے۔ سرشک آلود ہونا ... آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ تیری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبانے سے کتنے عشاق کا لہو پانی ہو کر آنکھوں کے راستے بہ گیا ہوگا یعنی انہیں کس قدر تکلیف پہنچی ہوگی۔ تیری آنکھوں میں آنسو آ جانے۔ تیرے چاہنے والوں کے لئے قیامت سے کم نہیں۔

سعید (۱) تیرے غم میں معلوم نہیں کتنے حرماں نصیبوں کا خونِ جگر آنسو بنکر آنکھ کے راستے نکلا ہوگا تب کہیں تیری آنکھیں سرشک آلود ہوئی ہیں (۲) میرے ہم خیال۔

بیخود کس کس عاشق کا لہو پانی کی طرح تو نے بہایا ہوگا۔ اب ان بیکناہوں کی یاد تجھ کو رلا رہی ہے۔

طباطبائی ۔ مژگانِ معشوق جو ہمیشہ عشاق کے دل و جگر میں کھٹکا کرتی ہیں اس کا آنسو وہی آنسو ہے جو عشاق کے دل میں پیدا ہو کر آنکھوں کی طرف جا یا

جانتے ہیں اور تیری مژہ پر آنسو ہونا اس کی علامت ہے کہ عاشق کا لہو پانی ایک ہو گیا۔
حسرت ۔۔۔ تیری جفا سے کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا جس کی ندامت کے باعث تیری آنکھیں سرشک آلودہ ہیں (۲) میرے ہم خیال۔

۱۲۔ نظر میں ہے ۔۔۔۔ بھولا نہیں ہوں۔ پیش نظر ہے۔ جادہ ۔۔۔۔۔۔۔۔ راستہ
شیرازہ۔ جزبندی، اجزا کو اکٹھا سی دینا، اجزائے پریشان ۔۔۔ بکھرے ہوئے جزو اے غالب جادہ راہِ فنا ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے ہے، گویا اسے میں کبھی نہیں بھولتا۔ کیونکہ میرا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا کے اجزائے پریشان رشتہ فنا میں منسلک ہیں مطلب یہ ہے کہ دنیا کی تمام چیزیں چاہے ان میں کتنا ہی تباین اور اختلاف کیوں نہ ہو فنا ہو کر ایک ہو جاتی ہیں۔ گویا رشتہ فنا میں تمام اوراق عالم سلے ہوئے ہیں

۱۰۔ نہ ہوگا یک بیابان ماندگی سے ذوق کم میرا ۱ حباب موجۂ رفتار ہے نقش قدم میرا
محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بیدماغی ہے ۲ کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

۱۔ یک بیابانِ ماندگی ۔۔۔۔۔ اتنی تھکان جو ایک بیابان کی آوارگی سے پیدا ہو۔ یعنی بہت زیادہ تھکان۔ ذوق ۔۔۔۔ ذوقِ صحرانوردی۔ حباب ۔۔۔ بلبلا۔ موجہ ۔۔۔۔۔ موج۔ رفتار کو موج اور نقشِ قدم کو حباب سے تشبیہ دی ہے۔ کثرت ماندگی سے بھی میرا ذوق صحرانوردی کم نہ ہوگا کیونکہ میرا نقش قدم موجۂ رفتار کا حباب ہے۔ موج اور حباب کا ذوقِ روانی کسی صورت میں کم نہیں ہوتا۔ بلکہ موج جس قدر آگے بڑھتی ہے حباب پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں مٹتے ہیں پھر بن جاتے ہیں اور موج کے ساتھ رہتے ہیں۔ اسی طرح میری کثرت ماندگی صحرانوردی میں مانع نہیں ہو سکتی بلکہ میں کثرت ماندگی کے باوجود آگے بڑھتا چلا جاؤنگا
• **بیخود**۔ جس طرح موجِ آب آگے بہنے کی غرض سے ابھرتی ہے اسی طرح میرا نقش قدم آگے بڑھنے کا شوق رکھتا ہے۔

۲۔ بے دماغی ۔۔۔۔۔ بیزاری۔ نفرت۔ ناک میں دم آنا ۔۔۔ بیزار ہونا۔ تنگ ہونا

یہ محاورہ خوب برمحل صرف ہوا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ مجھ کو چمن سے بہت دلچسپی تھی۔ لیکن اب یہ حالت ہوگئی ہے کہ بوئے گل سے بھی میرا دل بیزار ہے اور میں اس سے گھبراتا ہوں۔ بتقاضائے فطرت انسانی اکثر اوقات مایوسی اور افسردگی کی وجہ سے مرغوب اور دلپسند چیزوں سے بھی نفرت و بیزاری ہوتی ہے۔

سبب:۔ وفور عشق سے یہ بدماغی پیدا ہوجاتی ہے۔

نتیجہ:۔ انقلاب زمانہ سے محبت نے نفرت کی صورت اختیار کرلی ہے۔

۱۱۔ سراپا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی ۱ عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا
بقدر ظرف ہے ساقی خمار تشنہ کامی بھی ۲ جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

۱۔ سراپا رہن عشق..... ہمہ تن مبتلائے عشق۔ ناگزیر..... مجبور، ناچار، ناگزیر۔ الفتِ ہستی..... جان کو عزیز رکھنے پر مجبور رہوں۔ حاصل..... خرمن۔ انجام عشق کو برق اور ہستی کو خرمن سے تشبیہ دی ہے۔ میں سراپا رہن عشق ہوں۔ یعنی مبتلائے عشق ہوں۔ مگر لطف یہ ہے کہ پھر بھی اپنی جان کو عزیز رکھنے پر قدرتاً مجبور رہوں۔ پس میری مثال اس شخص کی سی ہے جو برق کی پرستش کرتا ہے۔ اور جب برق اس کے خرمن پر گر کر خرمن کو جلا ڈالتی ہے تو پھر اس کے جل جانے کا افسوس بھی کرتا ہے

حسرت:۔ میں طاعت گزار ہوں برق عشق کا، اور طالب ہوں فنا کا لیکن ساتھ ہی اس کے چونکہ الفت ہستی فطرت انسانی میں داخل ہے۔ اس لئے جان بھی عزیز ہے پس میں حاصل یعنی ہستی کا افسوس کرتا ہوں جس سے میرے کمال شوق فنا میں کسی قدر نقص بھی نمودار ہے۔ مختصر یہ کہ میں موت کا طلبگار ہوں اور اپنی ایسی زندگی پر افسوس کرتا ہوں جس پر موت کو ترجیح ہے۔

۲۔ بقدر ظرف..... حوصلے کے مطابق۔ تشنہ کامی..... پیاس، خمار..... نشہ کا آثار۔ خمیازہ..... جمائی۔ نشہ اُترنے کی نشانی۔ جب نشہ ٹوٹتا ہے تو آدمی

بار بار جمائیاں اور انگڑائیاں لیتا ہے۔ ساحل کی کجی کو انگڑائی کی صورت میں دکھلایا ہے۔ اے ساقی ہر شخص کو بقدر حوصلہ تشنہ کامی ہوا کرتی ہے مگر میرا ظرف بہت بڑا ہے۔ حد یہ ہے کہ دریائے شراب بھی مجھے سیر نہیں کر سکتا بس یوں سمجھ لے اگر تو دریائے شراب ہے تو میں اس دریائے شراب کا ساحل ہوں اور ساحل کی یہ خاصیت ہے کہ باوجود نزدیکی و فیاضی دریا کے وہ کبھی سیر نہیں ہوتا۔ بلکہ ٹیڑھا ہو ہو کر انگڑائیاں ہی لیا کرتا ہے کہ اس کا نشہ ٹوٹ رہا ہے اور اسے اور شراب کی ضرورت ہے اس لئے اگر تو بافراط شراب پلا سکتا ہے تو میں بھی ساحل ہوں گویا میرا ظرف تیری دریا دلی کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے (۲) یا یہ کہ جس قدر تیرا حوصلہ شراب پلانے میں بڑھا ہوا ہے اسی قدر میرا ظرف بھی بڑا ہے۔ آسی نے پہلے معنی لکھے ہیں اور باقی شارحین دوسرے معنی لکھتے ہیں۔

۱۲ محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا ۱ یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے ۲ یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز ۳ میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا وگرنہ میں ۴ طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے ۵ ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز ۶ ناخن پہ قرض اس گرہِ نیم باز کا

تاراج کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسد
۷
سینہ کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

۱۔ محرم ۔۔۔۔ واقف۔ نوا ۔۔۔ آواز۔ پردہ ۔۔۔ پردۂ ساز جس میں سے نغمہ پیدا ہوتا ہے۔ ساز ۔۔۔ آلۂ موسیقی۔ حجاب ۔۔۔ پردہ۔ پردہ کو ساز کے ساتھ مناسبت لفظی ہے۔ اے شخص چونکہ تو راز کے نغموں سے ناآشنا ہے اس لئے

تو نغمۂ حقیقت کو نہیں پہچان سکتا۔ اگر تو چشم حقیقت بیں سے دیکھے تو تجھ کو ہر چیز پردۂ ساز کی طرح نغمہ خیز اور اسرارِ غیبی کو ظاہر کرنے والی دکھائی دے لیکن چونکہ تو نغمۂ راز سے نابلد ہے اس لئے پردۂ ساز تیری آنکھوں کے سامنے پردے (اوٹ) کا کام دیتا ہے۔ اور تو اس سے لطف اندوز ہی نہیں ہو سکتا۔

۲۔ رنگ شکستہ...... اڑا ہوا رنگ۔ صبح بہار...... موسم بہار میں صبح کے وقت پھول کھلتے ہیں اور اسی وقت خوبانِ جہاں انگڑائیاں لیتے ہوئے اٹھتے ہیں نیز جب سو کر اٹھتے ہیں تو نیند کے خمار سے طبیعت سست اور رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے سستی دُور ہو جانے کے بعد طبیعت شگفتہ ہوتی ہے۔ یہ منظر غالب کے دوسرے مصرعے میں پیش کیا گیا ہے کہتے ہیں جب محبوب خواب ناز سے اٹھتا ہے۔ تو اس کا اڑا ہوا رنگ صبح بہار کے رنگ اڑنے کا منظر پیش کرتا ہے۔ یہی وہ وقت ہے جس وقت ایک طرف کلیاں کھلتی ہے اور دوسری طرف معشوقوں کے گلہائے ناز شگفتہ ہوتے ہیں۔

سعید: (۱) عاشق کا رنگ شگفتہ دیدنی ہے اور چونکہ اسے معشوق بہ نیری بو سے ہے۔ اس لئے تجھے اپنے اس کارنامے پر ناز کرنا چاہیئے۔ (۲) محبوب تیرا یہ رنگِ شکستہ قابل دید ہے اور تجھے اپنے اندازِ محبوبی کو بر سرِ کار لانا چاہیئے۔

بیخود: ــــــ میرا اڑا ہوا رنگ میرے دوست کی صبح بہار نظارہ ہے اور وہ یہی وقت تو ہے جب اس کے گلہائے ناز کھلا کرتے ہیں۔ اے معشوق صبح کے وقت میرے منہ پر ہوائیاں اڑتی ہوئی دیکھ کر تو بھی اپنے ناز و انداز کے پھول کھلانے میں مصروفِ ناز و انداز ہو جا۔

آسی: ــــــ نظارۂ معشوق نے میرا رنگ اڑا دیا ہے۔ اور وہ رنگ پریدہ مثل صبح بہار اور پھولوں کا کھلنا لازم و ملزوم ہیں اور وہ پھول ناز معشوق کے

پھول ہیں یعنی معشوق جب اپنے نظارہ سے میرا رنگ اڑتا ہوا دیکھے گا تو اس کو اپنے حسن ادا پر ناز ہوگا۔ آسی۔ طباطبائی کے ہم خیال ہیں۔ طباطبائی نے اسقدر اور لکھا ہے کہ میرے منہ پر ہوائیاں اڑتے ہوئے اور رنگ چھٹتے ہوئے دیکھ کر وہ سرگرم ناز ہوگا۔ یعنی میرا رنگ اڑ جانا وہ صبح ہے جس میں گلہائے ناز شگفتہ ہوں گے۔

حسرت۔ شب وصل کی صبح کو محبوب کا رنگ شکستہ "صبح بہار نظارہ" ہے یعنی اس کی دلپذیری قابل دید ہے۔ اس لئے گلہائے ناز کے شگفتہ ہونے کا یہی خاص وقت ہے۔

۴۔ صرفہ.... فائدہ۔ طعمہ.... لقمہ۔ نفس جانگداز.... جان کو پگھلا دینے والی آہ۔ آہ کو ضبط کرنے ہی میں فائدہ ہے ورنہ ایک ہی آہ جانگداز میرا خاتمہ کر دے۔ طباطبائی اپنی ناتوانی و نقاہت اور اپنی آہ کی شدت وحدت کا بیان مقصود ہے۔

۳م۔ نظرہائے تیز تیز.... غضب آلود نگاہیں۔ مژہ ہائے دراز.... لمبی لمبی پلکیں۔ تو غضب آلود نظروں سے غیر کو دیکھتا ہے۔ اور مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ کہ تیری مژہ ہائے دراز کا غیر پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ اس طرح دیکھنے سے تیری مژگان دراز کو مفت میں تکلیف ہوتی ہے۔ اور اس تکلیف سے میرا دل کڑھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خشم آلود نگاہوں سے بھی تو مجھ ہی کو دیکھ لیتا۔ مژہ ہائے تیز تیز.... الفت بھری نظریں۔ تیری نازک مژگان کو رقیب کے پتھر جیسے دل کو چھیدنے سے تکلیف ہوتی ہوگی۔ ان کے لئے تو میرے جیسا نرم دل چاہیئے۔

بیخود۔ جو لطف و عنایت کی نگاہیں تو غیر پر کرتا ہے۔ اُن سے میرے دل

تو میں رشک و حسد پیدا ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تیرا عشق رشک کی برچھیاں میرے دل میں چبھوتا ہے۔

آسی :- تو غیروں کو تیز نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس سے میرے اوپر برچھیاں چلتی ہیں۔ یا ہر وقت تیری پلکوں کے عشق کا دکھ اٹھاتا ہوں۔ اور تو غیروں کو دیکھتا ہے۔ ہائے علامت جمع ہے، بطور کلمہ تاسف بالکل غلط ہے۔

طبا طبائی دونوں صورتوں کو صحیح بتاتے ہیں۔

۵۔ بساط.... فرش۔ شیشہ باز.... بخود۔ شعبدہ باز بوتل کو اچھالتے ہیں پھر اس کو اپنے جسم پر لیتے ہیں۔ اور اس طرح ناچتے ہیں کہ بوتل جسم پر پھرتی رہتی ہے اور زمین پر گرنے نہیں پاتی۔ طباطبائی۔ مرد شعبدہ باز اس کو کہتے ہیں جو شعبدہ دکھاتے وقت ہاتھ کو اور سر کو ہلاتا ہے۔ آسی ہندوستان کے نٹ اور کنچنک بھی برتن میں پانی بھر کر سر پر رکھ کر ناچتے ہیں اور وہ گرنے نہیں پاتا شراب میں اس قدر جوش پیدا ہوا کہ شیشے خود بخود گردش میں آگئے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے فرش کا ہر گوشہ شیشہ باز کا سر ہے۔ کہ اس پر شراب کے لبریز شیشے گردش و رقص کر رہے ہیں محفل مے نوشی کا نقشہ بہت خوب کھینچا ہے

۶۔ کاوش.... کریدنا، کھودنا۔ گرہ نیم باز.... دل کو گرہ سے تشبیہ دی ہے معلوم ہوتا ہے۔ کہ گرہ دل کو پہلے تھوڑا بہت کھولا جا چکا ہے۔ میرا دل جو تنگی و گرفتگی عشق سے گرہ ہو کر رہ گیا ہے دل ناخن پر کاوش کے اس طرح تقاضے کر رہا ہے۔ کہ اس گرہ کو بالکل کھول ڈال نیم باز نہ رہنے دے یعنی مزید کاوش کر ان تقاضوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ناخن ابھی اس کا مقروض ہے۔

آسی (۱) میرے ہم خیال (۲) گرفتگی سے اگرچہ دل گرہ ہو کر رہ گیا لیکن پھر بھی کاوش سے باز نہیں آتا۔ اور میں برابر اسکو ناخن سے کھودے جاتا ہوں۔

(۳) دل میں جو ابھی تھوڑا سا زخم ہے۔ اس کو اور بھی بڑھانا چاہتا ہے۔

بیخود۔ یار کی گرہ بندِ قبا ہم سے آدھی کھل سکی۔ اس جرم میں ہمارا دل ہم سے کاوش کا تقاضا کر رہا ہے۔ اور ناخن پر ابھی تک گرہ کا قرضہ باقی ہے بہتر ہے کہ ہم اپنے دل کو اس ناخن سے کہ جس سے بندِ قبا پورا نہ کھل سکا۔ کرید کر زخمی کر لیں۔ اس سے زیادہ اس ناکامی کا بدلہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

۷۔ تاراج کرنا..... برباد کرنا۔ لوٹنا۔ دفینہ.... پوشیدہ خزانہ۔ غمِ ہجراں..... غمِ جدائی۔ اسد کا سینہ جس میں کہ گہر ہائے راز محفوظ تھے کاوش غمِ ہجراں نے اس کو لوٹ لیا یعنی غمِ جدائی نے اس کو کھود کھود کر نکال لیا اور برباد کر دیا۔ آسی اور طباطبائی کا خیال ہے۔ کہ اس بیان سے یہ مقصود ہے۔ کہ غم نے رسوا کر دیا۔

۱۳۔ بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا
رکھیو یارب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا ۱

شب ہوئی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا
اس تکلف سے کہ گویا بتکدے کا در کھلا ۲

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا ۳

گو نہ سمجھوں اس کی باتیں گو نہ پاؤں اس کا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا ۴

ہے خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا ۵

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا ۶

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا ۷

کیوں اندھیری ہے شبِ غم ہے بلاؤں کا نزول
آج ادھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا ۸

کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال
نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا ۹

اس کی امت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالب گنبدِ بے در کھلا۔ ۱۰

۱۔ اشعار کا دفتر کھلا... مشاعرہ جاری ہو گیا۔ گنجینۂ گوہر... مراد بزمِ شعرا یا محفلِ شہنشاہ۔ ان مشاعروں کی طرف اشارہ ہے جو قلعۂ معلّےٰ میں ہوا کرتے تھے بہادر شاہ کے مذاقِ سخن اور مجمعِ شعرا کے لحاظ سے بزمِ شہنشاہ کو گنجینۂ گوہر کہا ہے۔ رکھیو در کھلا..... آباد رکھیو۔ شہنشاہ کی محفل میں پھر شعرا اپنا اپنا کلام پڑھ رہے ہیں۔ اس مشاعرے کی تجدید سے مسرور ہو کر دعا مانگتے ہیں کہ یارب اس مخزنِ گوہرِ سخن کو ہمیشہ آباد رکھنا۔

طباطبائی۔ بزمِ شاہی جو گنجینۂ گوہر ہے۔ تو محض اس سبب سے ہے کہ میرے اشعار کا وہاں دفتر کھلا ہے۔ اور یہ دُعا ہے کہ الٰہی اس در کو آباد رکھ اور اس کا فیض جاری رکھ۔

۲۔ انجم رخشندہ..... چمکتے ہوئے ستارے منظر... سماں.... تکلف .... شان۔ بتکدہ ... بت خانہ میں چراغ روشن ہوتے ہیں ستاروں کو چراغ سے تشبیہ دی ہے۔ یا ستارے ہی بتوں سے مشابہ ہیں۔ رات ہو گئی۔ پھر چمکنے والے ستارے نکل آئے۔ اور یہ ستارے اس تکلف اور شان سے برآمد ہوئے ہیں۔ جیسے بتکدے کا دروازہ کھلتا ہے بتکدے یا کسی معبد کا دروازہ جس شان سے کھولا جاتا ہے۔ وہ ظاہر ہے۔ مطلب صرف اس قدر ہے کہ رات ہوئی اور ستارے بڑی آن بان سے نمودار ہو گئے

بیخود۔ لکھتے ہیں رات ہو گئی۔ بزمِ سخن منعقد ہونے کا وقت آ گیا۔ انجم رخشندہ (اشعار) کا منظر کھل گیا اور (انجم رخشندہ) اشعار ایسے آراستہ ہیں کہ معلوم ہوتا ہے۔ ڈھلے ہوئے بت سامنے رکھ دیئے ہیں۔ جو منہ سے بول رہے ہیں۔

۳۔ دشنۂ پنہاں..... خنجر چھپا ہوا۔ نشتر... جنوں کو دُور کرنے کے

لئے نشتر سے فصد کھولی جاتی ہے۔ دوست ... دوست نما دشمن۔ اگرچہ میں دیوانہ ہوں لیکن پھر بھی میں دوست نما دشمن کو خوب پہچانتا ہوں۔ اس لئے اس کے دھوکے میں نہیں آتا۔ میں سمجھتا ہوں۔ اُس نے مجھے دکھلانے کے لئے ہاتھ میں نشتر لے رکھا ہے۔ تاکہ میں سمجھوں۔ کہ میرے جنون کا علاج فصد کھول کر کرنا چاہتا ہے لیکن درحقیقت اس کا ارادہ مجھے قتل کرنے کا ہے اور اُس نے اپنی آستین میں خنجر چھپا رکھا ہے۔ کہ اس بہانے سے موقع پاتے ہی مجھے قتل کر ڈالے۔ مطلب یہ ہے کہ میں فریب سے جان دینا نہیں چاہتا باوجود دیوانہ ہونے کے ظاہری دوست اور پوشیدہ دشمن کو پہچانتا ہوں۔

۴۔ بھید پانا ... راز کو جاننا۔ وہ پری پیکر کھلا ... بے تکلف ہو گیا اگرچہ میرے لئے یہ نہایت تکلیف دہ ہے کہ میں اس کی باتیں نہیں سمجھ سکتا اور اس کا راز نہیں پا سکتا لیکن پھر بھی یہ کونسی کم خوشی کی بات ہے۔ کہ وہ پری وش محبوب مجھ سے بے تکلف ہو گیا ہے۔ آئندہ خود بخود مجھ کو رازداری کا موقع مل جائے گا۔

۵۔ حُسنِ عمل ... نیک کام کرنا۔ خیال حُسن ... تصورِ معشوق۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے۔ کہ اعمال نیک کی بدولت نیک لوگوں کی قبروں میں جنت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اور وہ عذابِ قبر سے محفوظ رہتے ہیں خیالِ حُسن یعنی تصورِ محبوب بھی حُسنِ عمل (نیک اعمال) کا ہم پایہ ہے۔ کیونکہ خیالِ حُسن سے میری قبر میں جنت کا دروازہ کھل گیا ہے۔ گویا حسنِ یار کے تصور کی بدولت میں عذابِ قبر سے محفوظ ہوں۔ اور عذاب قبر سے وہی لوگ بچ سکتے ہیں جو دنیا میں نیک کام کرتے ہیں لہٰذا خیالِ حُسن حُسنِ عمل ہوا۔

سہا حسرت۔ طباطبائی۔ تصورِ چہرۂ معشوق سے قبر میں باغ بہشت دکھلائی

دے رہا ہے۔ کیونکہ اس کے چہرے میں باغ کی سی رنگینی ہے تو گویا تصورِ حسن اور حسنِ عمل کا ایک ہی ثمرہ ہے۔

بیخود۔ میں خیالِ حسنِ یار (معشوق حقیقی کے تصور میں ایسا محو ہو گیا ہوں۔ کہ اس کو حسنِ عمل (عبادت) خیال کرتا ہوں، اور اس خیال کی بدولت میری قبر میں جنت کی کھڑکی کھل گئی ہے۔ یعنی میری بخشش ہو گئی ہے۔

آسیؔ (۱) میرے ہم خیال (۲) میں عشق کی بدولت دنیا کے جھگڑوں سے علیحدہ اور ہمیشہ ظلم و ستم سہتا رہا۔ اب مرنے کے بعد بھی وہی خیال ہے تو انہی وجوہات سے خیالِ حسن حسنِ عمل بن گیا اور اسی کا یہ بدل ہے۔

۲ ہے وہ عالم..... وہ کیفیت۔ منہ پر کھلنا..... زیب دینا۔ نقاب... پردہ۔ زمانۂ قدیم میں نقاب مذکر بولا جاتا تھا۔ اب دہلی والے مؤنث بولتے ہیں۔ گورے گورے چہرے پر کالی کالی زلفیں بہت بھلی معلوم ہوتی ہیں لیکن غالب اپنے محبوب کی تعریف اس طرح کرتے ہیں۔ کہ باوجود چہرے پر نقاب ہونے کے اس کے حسن کا وہ عالم ہے۔ کہ ہم نے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ سبحان اللہ۔ اس شوخ کے چہرے پر نقاب زلفوں سے بھی زیادہ خوبصورت معلوم ہوتی ہے دیکھا ہی نہیں اور منہ پر کھلا کے معنوں نے شعر میں جدت اور حسن پیدا کر دیا ہے

بیخود۔ معشوقِ حقیقی کا حسنِ دلفریب باوجود اس قدر پردوں کے جو ظہور تجلیات قلب عشاق پر کر رہا ہے۔ اس کی صفت بیان نہیں ہو سکتی۔

۳ بکمالِ مہربانی سے اس نے مجھ سے کہا کہ تمہیں میرے در پر پڑے رہنے کی اجازت ہے۔ یہ سن کر میں نے اپنا لپٹا ہوا بستر کھولنا شروع کیا۔ لیکن اس کی شوخی دیکھئے جتنی دیر میں میں نے لپٹا ہوا بستر کھولا (یعنی بہت ہی جلدی) وہ اپنے الفاظ سے پھر گیا۔ اور مجھے اپنا بستر لپیٹنا پڑا۔ اپنی خانہ بدوشی۔

محبوب کی وعدہ خلافی اور تلون مزاجی اور اس کی طبیعت کی شوخی اور ستم ظریفی کا خوب پُر لطف نقشہ کھینچا ہے۔

۸۔ شبِ غم.... شبِ ہجر۔ بلاؤں کا نزول... مصیبتیں نازل ہونا۔ اختر.... ستارہ۔ آج شبِ غم تاریک کیوں ہے؟ اس کا سبب یہ ہے۔ کہ آسمان سے مصیبتیں زمین پر نازل ہو رہی ہیں اور تاروں نے ان اترنے کا تماشہ دیکھنے کے لئے اپنی آنکھیں آسمان کی طرف کرلی ہیں۔ اسی لئے روئے زمین پر تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ شب غم کی تاریکی اور بلاؤں کے نزول سے گھبرا کر کہتے ہیں۔ کہ کیا آج ستاروں کی آنکھیں آسمان ہی کی طرف دیکھتی رہیں گی۔ اور سطح زمین کو اپنی روشنی سے منور نہیں کریں گی یعنی کیا یہ بلائیں ساری رات نازل ہوتی رہیں گی۔ اور ستارے تمام رات ان کے تماشے میں محو رہیں گے بجز دیگر شارحین سے اس قدر زیادہ لکھتے ہیں۔ اگر روشنی ہوتی اور میں ان بلاؤں کو آسمان سے اترتے ہوئے دیکھ سکتا تو شاید کچھ اپنی حفاظت کی تدبیر کرتا۔ آسی کہتے ہیں۔ مصنف اعتراضاً کہتا ہے۔ کہ شبِ غم اسقدر تاریک کیوں ہے، حالانکہ آج بلائیں نازل ہو رہی ہیں۔ اور دیدۂ اختر کو بھی ادھر ہی کو کھلا رہے گا جس سے تاریکی نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ازراہِ اعتراض اعتراض ہے نہ کہ بطریق سوال۔

۹۔ غربت.... مسافری۔ حوادث.... آفات ارضی وسماوی۔ مراد خبر مرگ۔ نامہ کھلا...... دستور تھا۔ کہ جس خط میں کسی عزیز کی خبرِ مرگ ہوتی تھی اُسے کھلا ہوا ہی روانہ کرتے تھے۔ میں مسافری میں کیسے خوش رہ سکتا ہوں جبکہ حادثات کا یہ عالم ہے۔ کہ وطن سے جو خط آتا ہے وہ اکثر کھلا ہوا ہی ہوتا ہے یعنی اس میں کسی نہ کسی عزیز کی موت کی خبر درج ہوتی ہے۔ آسی دیکھے

معنی یہ ہیں۔ کہ میرے عزیز اور دوست مجھے کھلے ہوئے خط بھیجتے ہیں۔ یعنی مجھے رازداری کے قابل نہیں سمجھتے۔

۱۰۔ اُمت میں ہوں .... پیرو ہوں۔ کام بند رہیں .... ناکامیاب ہو رہیں۔ گنبد کے در کھلا .... یعنی آسمان۔ شبِ معراج سے کنایہ ہے کہ جب رسول مقبول عرش پر تشریف لے گئے۔ تو آسمان اُن کے لئے کھل گئے تھے۔

اے غالب میرے کام کیونکر بند رہ سکتے ہیں۔ میں تو اس کی اُمت میں ہوں جس کے لئے آسمان کا بے در گنبد کھل گیا تھا۔ گویا میری کامیابی حضرت رسول کی اُمت میں ہونے کی وجہ سے یقینی ہے۔

۱۲۔ شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا ۱ شعلۂ جوالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا
واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام ۲ گریہ سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا
واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال ۳ یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا
جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آبجو ۴ یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا
یاں سرِ پرشور بے خوابی سے تھا دیوار جو ۵ واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا
یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بیخودی ۶ جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا
فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا ۷ یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

ناگہاں اس رنگ سے خونابہ ٹپکانے لگا
دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

۱۔ برقِ سوزِ دل .... تپشِ قلب کی بجلی۔ زہرہ آب تھا .... پتہ پانی ہو گیا تھا یعنی سخت ہیبت زدہ تھا۔ شعلۂ جوالہ .... گردش کرنے والا شعلہ۔ شعلۂ لرزاں۔ گرداب .... بھنور — رات کو میرے دل کی گرمی اور ہیبت سے ابر کا پتہ پانی پانی ہو گیا تھا۔ اور اس پانی میں جو بھنور پڑتے تھے وہ میرے دل کی تاثیر

سے شعلہ ہائے لرزاں معلوم ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ شب ہجر میں پانی اور آگ کا ایک طوفان اُٹھ رہا تھا۔

۲۔ کرم ..... کرم کرنے یعنی تشریف لانے۔ عناں گیر ..... مانع۔ خرام .... چلنا یعنی تشریف لانا۔ پنبۂ بالش ..... تکیہ کی روئی۔ کفِ سیلاب ...... سیلاب کے جھاگ ـــــ اُدھر اُن کو میرے گھر تشریف لانے میں بارش کا عذر تھا اور اِدھر میری یہ حالت تھی کہ اُن کے انتظار میں تکیے پر سر رکھے اس طرح رو رہا تھا۔ کہ آنکھوں سے آنسوؤں کے دریا بہ گئے تھے۔ اور میرے تکیئے کی روئی اس سیلاب میں کفِ سیلاب معلوم ہوتی تھی۔

سعید (۱) معشوق نے بارش کا تو بہانہ کیا لیکن میری حالت کو نہ دیکھا۔ جو اس کے نہ آنے سے زار ہو رہی تھی۔ اس لئے اس کو آنا ملتوی نہ کرنا چاہیئے تھا۔

آسی (۱) میرے ہم خیال (۲) کفِ سیلاب تکیہ کی روئی تھی۔ یعنی روئی کا تکیہ بہا بہا پھرتا تھا (۳) سیل میں اس قدر جھاگ تھے۔ کہ روئی معلوم ہوتی تھی۔

خود آرائی ..... بناؤ سنگار، آرائش۔ موتی پرونا .... بہت زیادہ آرائش کرنا۔ تارنگہ نایاب تھا ..... دکھائی نہ دیتا تھا ـــــ وہ تو یونہی آرائش اور بناؤ سنگار میں موتی پرو رہے تھے۔ یعنی حد درجہ مصروف تھے۔ اور اِدھر انتظار میں ہماری یہ حالت تھی کہ روتے روتے کثرت گریہ کے باعث نظر بھی نہ آتا تھا۔ یعنی ہم نے تارِ نگاہ میں اتنے دُرِ اشک پروئے تھے۔ کہ تارِ نگہ بالکل چھپ گیا تھا۔ اس شعر میں تشبیہ نہیں دی گئی۔ بلکہ دو متشابہ چیزوں کا ذکر کر دیا ہے۔ جو کمالِ فن ہے۔ اس کے علاوہ دوسری خوبی یہ ہے کہ جو کچھ محبوب کر رہا ہے وہی عاشق بھی کر رہا ہے۔ عاشق کی اشکباری اور معشوق کی خود آرائی کی تصویر خوب کھینچی ہے۔

۴۔ باغ میں سُرخ سُرخ پھول اس کثرت سے تھے۔ کہ ان کے عکس نے ابجو میں چراغاں کر دیا تھا لیکن یہاں ہمارا یہ حال تھا۔ کہ اشکبار آنکھوں سے خالص خون کے نالے بہے چلے جاتے تھے۔ گویا آبجو کے مقابلہ میں چشم تر تھی۔ اور شاخہائے گل کے جواب میں پلکوں پر لہو کی بوندیں۔ قطرات اشک رنگین کی گل سے تشبیہہ بہت خوب ہے۔

۵۔ سر پُر شور۔۔۔ سر شوریدہ، پُر از سودا۔ بے خوابی۔۔۔۔ نیند نہ آنا دیوار جُو۔۔۔۔ (سر ٹکرانے کے لئے) دیوار ڈھونڈھتا تھا۔ فرق ناز۔۔۔ سر پُر غرور بالش۔۔۔۔ تکیہ کم خواب۔۔۔۔ ایک قسم کا قیمتی کپڑا ـــــ نیند نہ آنے کی وجہ سے میرا پُر از سودا سر دیوار کی تلاش میں تھا۔ کہ اس سے ٹکریں مار کر بیہوش ہو جائے۔ اور ادھر محبوب اپنا سرِ ناز کم خواب کے تکیہ پر رکھے۔ کمال ناز سے محوِ خواب تھا۔ بیخوابی اور کم خواب کی رعایت خوب ہے۔

۶۔ نفس۔۔۔۔ آہ۔ بساط۔۔۔۔ فرش۔ احباب۔۔۔۔ احباب محبوب یعنی رقیب ـــــ ادھر ہماری بزم بے خودی میں ہماری آہ کی شمع روشن تھی اور ادھر محبوب کی محفل میں ان کے احباب کے لئے پھولوں کا فرش بچھا ہوا تھا یعنی ہماری یہ حالت کہ صدمۂ فراق سے ہم بیخود ہو رہے تھے۔ اور ادھر محبوب رقیبوں کے جلسہ میں عیش اڑا رہا تھا۔

۷۔ فرش سے تا عرش۔۔۔۔ زمین سے آسمان تک۔ طوفان۔۔۔۔ کثرتِ جوش موجِ رنگ۔۔۔۔ عیش و عشرت۔ سوختن کا باب۔۔۔۔ سوختن کی پوری گردان ان کی محفل میں فرش سے لیکر عرش تک عیش و نشاط کا ایک طوفان تھا جس مار رہا تھا۔ اور یہاں محض جلنا ہی جلنا ہے۔

آسی و طبا طبائی (۱) دوسرا پہلو یہ بھی نکلتا ہے۔ کہ یہاں کا زمین و آسمان آگ

لگاؤ بننے کے قابل تھا۔

۴۔ اس رنگ سے.... اس طرح سے، غزل کی طرف اشارہ ہے۔ خونبانہ .... خالص خون، یعنی درد خیز اشعار۔ کاوش ناخن.... کاوش غم۔ لذت یاب .... لذت کش ــــ یکایک میرا دل جو کاوشِ غم سے لذت یاب ہو چکا تھا ــ اس طرح سے یعنی اشعارِ ذیل کی صورت میں خونناب ٹپکانے لگا۔ گریز کا بالکل نرالا ڈھنگ ہے۔

۵۔ نالۂ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا ۱ تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر گو بیتاب تھا

مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے ۲ خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں ۳ پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں ۴ ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالمتاب تھا

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے ۵ کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا ۶ انتظارِ صید میں اک دیدۂ بیخواب تھا

میں نے روکا رات غالبؔ کو وگرنہ دیکھتے

اُس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

۱۔ انداز اثر.... اثر۔ نایاب.... مفقود۔ سپند.... کالا دانہ جو نظر بد کو دور کرنے کے جلاتے ہیں۔ رات کو میرے نالۂ دل میں بالکل اثر نہ تھا۔ وہ اگرچہ سخت بیتاب تھا لیکن اس بیتابی اور جلنا بزمِ وصلِ غیر کو نظر بد سے بچانے کے لئے کالے دانے کا کام دے رہا تھا۔ گویا میری بیتابی اور تپشِ دل کا اثر الٹا تھا۔

۲۔ مقدم سیلاب.... آمد سیلاب۔ نشاط آہنگ.... خوش و مسرور۔ سازِ صدائے آب.... جل ترنگ، چینی کے سات پیالوں میں پانی بھر کر لکڑی سے

انہیں بجاتے ہیں۔ سیلاب کے آنے سے میرا دل بہت ہی مسرور تھا کیونکہ اس کی آمد سے خانہ بربادی اور کلی تباہی کی توقع وابستہ تھی۔ اس تمنا کے پورا ہونے کی خوشی میں صدائے آب اور مکان کی دریا بُردگی کی آواز سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے میرا گھر جلترنگ کا ساز تھا۔ صدائے آب" اور "آہنگ" سے شعر میں خوب لطف پیدا ہو گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عاشق اپنی بربادی سے مسرور ہوتے ہیں۔ صدائے آب اور مکان کی دریا بردگی سے جو آواز پیدا ہوتی ہے اس میں اس کو جل ترنگ کے نغموں کا لطف آتا ہے۔

۳۔ نازش... فخر۔ خاکستر نشینی... خاک نشینی، بربادی۔ اندیشہ... خیال سنجاب... ایک جانور ہے جس کی کھال کے پوستین بنائے جاتے ہیں۔ اور رنگ اس کا خاکی ہوتا ہے یہ پوستین بہت قیمت پاتے ہیں۔ ہمرنگی سے بستر سنجاب اور خاکستر نشینی میں رعایت پیدا ہو گئی ــــ میں جن ایام میں خاک نشین تھا۔ اس زمانہ میں قناعت کی بدولت خاک نشینی پر مجھ کو جس قدر فخر و غرور تھا وہ بیان نہیں کر سکتا۔ یوں سمجھ لو۔ کہ میرے پہلوئے خیال کو بسترِ مرگ پر بستر سنجاب کی سی راحت ملتی تھی۔ اس بیان سے اپنی قناعت اور مشکل پسندی کا اظہار مقصود ہے نیز یہ بھی ظاہر ہوتا ہے۔ کہ خاک نشینی میں بھی انسان کبر و غرور سے خالی نہیں رہتا۔

طباطبائی۔ میں خاک نشین تھا۔ مگر میرا دل قناعت کے فخر و ناز کے سبب سے فرشِ سنجاب پر لوٹ رہا تھا۔

آسی۔ خاک نشینی کے ایام کا فخر و ناز کیا بیان کروں کہ اس زمانہ میں ہر وقت یہ خیال رہتا تھا۔ کہ کبھی ہم بھی بستر قاقم و سنجاب پر بیٹھے اور اس طرح سے خیالِ عیش نصف عیش بنا ہوا تھا۔ مگر افسوس کہ اب وہ زمانہ نہ رہا۔ یہ معنی اندیشے کے لفظ

سے پیدا ہوئے ہیں۔

۴۔ کچھ نہ کی.... کچھ نہ کیا۔محروم رکھا۔جنونِ نارسا... عشقِ ناقص یا بے اثر رُوکش... بدمقابل ــــ افسوس کہ میرے عشقِ ناقص نے مجھے اکتساب تابندگی سے محروم رکھا اور نہ یہاں تو خاک کا ہر ذرہ آفتابِ عالمتاب کا بدِ مقابل تھا۔اگر ہمارا عشق یاوری کرتا۔تو ہم بھی باوجود ذرۂ بے مقدار ہونے کے آفتاب عالمتاب کی طرح چمکتے، یعنی عشقِ نارسائی کی بدولت ہم خاک کے معمولی ذرہ سے بھی کمتر رہے یا یہ کہ اگر عشق ہم کو جلا کر خاک کر دیتا۔تو ہماری خاک کا ہر ذرہ آفتاب عالمتاب کا ہم پایہ بن جاتا۔

طباطبائی و بیخود۔جنونِ نارسا (عشقِ ناقص) نے ہم کو اکتسابِ فیض رتجلیات انوارالٰہی و اتحادِ معشوق) سے محروم رکھا، ورنہ دنیا کا ہر ذرہ اکتسابِ نور سے رشکِ آفتاب بنا ہوا تھا۔

آسی (۱) میرے جنون نے نارسائی کی اور حدِ جنون کو نہ پہنچ سکا ورنہ جنون کے مقام کا ہر ذرہ رشکِ خورشید تھا (۲) جس مقام پر جنون پہنچ چکا تھا اس مقام کا ذرہ بھی روکشِ آفتاب تھا۔

۵۔ باب.... کتاب کا ایک حصہ۔ دروازہ۔سرچشمہ منبع پتہ نہیں آج کیا بات ہے۔کہ تجھے اپنے اسیروں (عاشقوں) کی پرواہ نہیں۔ورنہ کل تو اس قدر بے پرواہ نہ تھا۔بلکہ تیرا دل مہر و وفا کا سرچشمہ تھا، اور تو اُن کا خاص طور پر خیال رکھتا تھا۔بیخود نے باب کے معنی دروازے کے لئے ہیں۔آسی کو باب پر اعتراض ہے کہ یہ اردو میں مستعمل نہیں۔خالص فارسی ہے

۶۔ صید.... شکار، دام.... جال۔ دیدۂ بیخواب.... کھلی ہوئی آنکھ حلقۂ دام کو دیدۂ بیخواب سے تشبیہہ دی ہے اور وجہ شبہ یہ ہے کہ چشمِ بیخواب حلقۂ دام

کیطرح کھلی رہتی ہے بہت خوب تشبیہہ ہے ـــــ تو ان ایام کو ذرا یاد کر جب تیرے دام کا ہر حلقہ شکار کے انتظار میں چشم بخواب کیطرح کھلا رہتا تھا یعنی تو ہر وقت عشاق کا خیال رکھتا تھا۔ کہ میں کس طرح اور کیونکر ان کو اپنے دام میں پھنساؤں۔

۲۔ کفِ سیلاب ...... وہ جھاگ جو طوفان خیز پانی میں تیرتے پھرتے ہیں ـــــ سیل گریہ ..... طوفان اشک ـــــ میں نے رات غالب کو رونے نہ دیا اگر وہ روتا تو پھر تم دیکھتے کہ اس کے سیلاب گریہ میں آسمان کفِ سیلاب کی طرح تیرتا پھرتا۔ گویا کثرتِ اشک باری سے اس قدر طوفان آتا۔ کہ آسمان کو بھی جھاگ کی طرح بہا لے جاتا سیل گریہ آسمان تک پہنچ جاتا۔ اور اس کے تھپیڑوں سے آسمان کفِ سیلاب کی طرح بہتا۔

۲۲۔ ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب ۱ خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا
اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو ۲ توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا
گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں ۳ جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگزار تھا
موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال ۴ ہر ذرہ مثلِ جوہرِ تیغ آب دار تھا
کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب ۵ دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

۱۔ ودیعت ..... امانت ۔ امانت ہمیشہ واپس کرنی پڑتی ہے ۔ دینا پڑا حساب ..... یعنی آنکھوں سے خون بہانا پڑا۔

حالی یعنی آنکھوں سے اس قدر خون جاری رہتا ہے کہ گویا جگر میں جتنا خون تھا۔ وہ مژگان یار کی امانت تھی۔ اور اس لئے اس کے ایک ایک قطرے کا حساب اسی طرح دینا پڑے گا جس طرح امانت کا حساب دینا پڑتا ہے بقول سعید سوائے مژگانِ یار کی خلش کے کسی اور کی محبت میں خونِ جگر آنکھوں سے رواں نہیں کیا جا سکتا۔

آسی نے دوسرا مفہوم یہ لکھا ہے: حساب لینے میں غضب پایا جاتا ہے۔ یا حساب اس وقت دینا پڑتا ہے جب کوئی بدنظمی ہوتی ہے میں بیقراری میں بہت سا خون بہا چکا تھا۔ مگر اس کے بعد بھی اس کی یاد غمزہ کی کاوش اور محبت نے مجھے چین نہ لینے دیا۔ اور جتنا میں خون رو چکا تھا، اتنا ہی پھر خون رلایا۔ اس احتساب میں مجھے بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ شعر بطریق افسوس تھا

۲- یک شہر آرزو ..... وہ شہر جس میں آرزوئیں آباد ہوں یعنی بے حد آرزوئیں

آئینہ تمثال دار ..... وہ آبدار آئینہ جس میں عکس نظر آتے ہیں یعنی میرا دل

ـــــ تو نے میرے دل کے آبدار آئینے کو توڑ ڈالا۔ اس میں تو آرزوؤں کا ایک شہر آباد تھا۔ تو نے اس کو توڑ کر میری ہزاروں آرزوؤں کا خون کر دیا۔ اس لیے اب میں ہوں، اور ایک شہر آرزو یعنی آئینہ تمثال دار کی بربادی کا غم ہے۔ بقول حسرت، تو نے ایک دلشکنی کر کے میری ہزاروں آرزوؤں کا خون کر دیا

سعید۔ تو نے میرے دل کے آئینہ کو جس میں تیری صورت نظر آتی تھی توڑ ڈالا۔ تو میری سینکڑوں تمناؤں کا خون ہو گیا۔

بیخود۔ تو نے آئینہ اس حالت میں توڑا جب تو اس میں اپنا منہ دیکھ رہا تھا گویا تو تماشائی تھا اور میں یہ موقع غنیمت جان کر تجھ کو دیکھ رہا تھا۔ میرے دل میں ہزاروں تمنائیں اور آرزوئیں جوش مار رہی تھیں۔ تیرے غرور حسن نے یہ گوارا نہ کیا کہ تو اپنا ثانی دیکھتا۔ تو نے آئینہ توڑ ڈالا۔ اور اس کے ٹوٹ جانے سے میری تمام آرزوئیں خاک میں مل گئیں۔ گویا آرزوؤں کا ایک شہر تیرے آئینہ توڑنے سے برباد ہو گیا۔

طباطبائی۔ آئینہ میں ایک ہی عکس نظر آتا ہے۔ لیکن جب اسے توڑ ڈالا تو ہر ٹکڑے میں وہی پورا عکس دکھائی دیتا ہے۔ یہاں پر ہر عکس کو دیکھ کر ایک

ایک آرزو کا خون ہوتا ہے۔ غرضیکہ جس آئینہ میں معشوق کے عکس و تمثال کا جلوہ تھا۔ اس کے ٹوٹنے سے ایک شہر آرزو کا خون ہو گیا ہے۔ آسی اس شرح کو غلط قرار دیتے ہیں۔

۳- جاں دادہ..... کشتہ، ہوا..... شوق —— جب میں زندہ تھا۔ تو مجھے کوچہ گردی کا بہت شوق تھا۔ اور یہی شوق میری موت کا باعث ہوا اس لئے میری لاش کو اب گلی کوچوں میں کھینچے پھرو۔ تاکہ مرنے کے بعد بھی میری آرزو پوری ہوتی رہے۔

طبا طبائی۔ ہوا کے معنی آرزو اور رہگذر سے مراد رہگذر معشوق۔

سعید۔ چونکہ میں نے سرِ رہگذر معشوق کی آرزو میں جان دی ہے۔ اس لئے میری نعش کو گلیوں میں گھسیٹے پھرو۔ تاکہ اسی طرح میری آرزو پوری ہو جائے

بیخود نے طبا طبائی کی شرح پر یہ اضافہ کیا ہے۔ کہ اس طرح رفتہ رفتہ لوگ میری نعش کو معشوق کی گلی میں لے جائیں گے اور میرا مدعا حاصل ہو جائے گا۔

آسی۔ مجھے بڑا شوق تھا۔ سڑکوں اور شاہراؤں کی ہوا کھاتا پھروں — جیسا کہ اکثر امراء شام کو ہوا خوری کے لئے نکلتے ہیں۔ نواب مرنے پر یہ سزا دو کہ میری لاش کوچوں میں کھینچے پھرو۔ اور اس طرح سے میری نازک دماغی اور شوق کو لوگوں پر ظاہر کر کے دنیائے ناپائدار اور اس کے شوقوں سے عبرت دلاؤ۔ کہ کبھی یہ ایسا نازک دماغ تھا، اب اتنا مجبور ہے یا یہ کہ میری حالت زندگی میں بھی مجنونوں کی تھی۔ بعد مرگ بھی وہی ہو۔ آسی جاں دادہ کی جگہ دلدادہ لکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے ہوا کے معنی آرزو نہیں لینے چاہئیں۔ کیونکہ دلدادہ کے معنی آرزو مند ہیں۔ اس طرح سے دلدادہ بیکار ہو جاتا ہے۔

۴ سراب ... ایک خاص قسم کی ریت ہے جو دُور سے پانی معلوم ہوتی ہے۔ پیاسا اس کی طرف جاتا ہے۔ پانی کی امید میں بڑھتا چلا جاتا ہے اور آخرکار پیاس سے ہلاک ہو جاتا ہے جوہرِ تیغ ... تلوار کے خطوط۔ مجھ سے دشتِ وفا کا حال نہ پوچھو۔ وہ تو موجِ سراب کی طرح مہلک ہے اور پیاسے (وفا پرست) کو دھوکا دے کر ہلاک کر دیتا ہے یوں سمجھ لو کہ دشتِ وفا کا ہر ذرہ جوہرِ تیغ کی طرح آبدار ہے بھلا دشتِ وفا میں گامزن ہو کر کوئی کہاں تک بچ سکتا ہے مطلب یہ ہے کہ وفا جان لئے بغیر نہیں رہتی آسی (۱) ہمخیال (۲) مجھے اپنی وفا سے کیا کیا امیدیں تھیں یعنی جذب کی توقع اور معشوق کی جانب سے بھی وفا کی امید مگر وہ سراب نکلا اور میری وفا بیکار رہی اور دشتِ وفا کے ذرہ ذرہ نے مجھے قتل کر دیا۔

۵ ۔(۱) ناتجربہ کاری کی وجہ سے غمِ عشق کو ہم کچھ کم خیال کرتے تھے لیکن جب حقیقتاً عشق میں کمی ہوئی تو دُنیا کی تمام آفتوں نے گھیر لیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ دنیا کی تمام آفتیں اور آفتِ عشق برابر ہے (۲) عشق دنیا کے غموں سے کہیں زیادہ ہے کہ عشق کے مقابلے میں کوئی اور آفت نہیں آتی نیچر۔ طباطبائی نے آخری مفہوم لکھا ہے۔ اور سعید و آسی نے دونوں مفہوم۔ بہرحال آخری مفہوم بہتر ہے

۶ ابسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا ۱ آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی ۲ در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا
وائے دیوانگیِ شوق کہ ہر دم مجھ کو ۳ آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا
جلوہ ازبسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے ۴ جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا
عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ ۵ عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا
لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط ۶ تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا

عشرت پارۂ دل زخم تمنا کھاتا ۷ لذتِ ریش جگر غرق نمکداں ہونا
کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ ۸ ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا
حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

۱۔ انساں ہونا..... حقیقی صفات انسانی پیدا کرنا۔ بسکہ..... بہت زیادہ —— حالی۔ بادی النظر میں یہ ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے مگر غور سے دیکھا جائے تو بالکل اچھوتا خیال ہے۔ دعوے یہ ہے کہ دنیا میں آسان سے آسان کام بھی دشوار ہے اور دلیل یہ ہے کہ آدمی جو عین انسان ہے —— اس کا بھی عین انسان بننا مشکل ہے یہ منطقی استدلال نہیں ہے۔ بلکہ شاعرانہ استدلال ہے جس سے بہتر ایک شاعر استدلال نہیں کر سکتا۔

آسی چونکہ ہر کام کا آسان ہونا مشکل ہے لہذا ہر آدمی بھی آدمی نہیں کہا جاسکتا۔ طبا طبائی۔ کمالِ انسانیت کے مرتبہ پر پہنچنا سہل نہیں ہے

۲۔ خرابی..... ویرانی۔ بربادی۔ کاشانہ..... جھونپڑا۔ درودیوار سے ٹپکنا ..... ظاہر ہونا۔ بیاباں..... بالکل ویران۔ الفاظ بہت ہی مناسب لائے ہیں —— میری گریہ زاری کا مدعا یہ ہے کہ میرا گھر ویران ہو جائے چنانچہ اس گریہ و زاری کے اثر سے میرے گھر کے درودیوار سے ویرانی ٹپکتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ گھر اس نحوست سے کوئی دن میں بالکل ویران ہو جائیگا

۳۔ ہائے..... افسوس۔ دیوانگی شوق..... جنونِ عشق۔ اُدھر..... معشوق کی طرف..... مجھ کو اپنے عشق کے دیوانہ پن پر افسوس آتا ہے کہ اس کے تقاضے سے میں بار بار تیری طرف جاتا ہوں اور پھر آپ ہی آپ حیران و پریشان ہوتا ہوں کہ میں یہاں کیوں آیا۔ کیونکہ رسائی وہاں تک ممکن نہیں بقول آسی یہ شوق

تھا یعنی جنون تھا کہ تیرے کوچے میں ہزار بار گئے اور ہزار بار آئے ۔

طباطبائی ہر دم یعنی ہر مرتبہ سانس لینے سے میں اس مبداء حیات وجود کی طرف دوڑتا ہوں اور اپنی نارسائی سے حیران ہو کر رہ جاتا ہوں ۔

بیخود ۔ بار بار معشوق حقیقی کا مشتاق جمال ہو کر اپنی خودی سے گذر جاتا ہوں اور نارسائی کی وجہ سے حیران ہو کر سوچتا رہ جاتا ہوں کہ میں کہاں اور اسکا دیدار کہاں

۴ ۔ جلوہ ... حسن یار ۔ تقاضائے نگہ ... تقاضائے دید ۔ جوہر آئینہ ۔ آئینہ فولادی مراد ہے ۔ وہ خطوط جو صیقل کرتے وقت پڑتے ہیں مژگان آئینہ بننا چاہتے ہیں چونکہ یار کا جلوۂ حسن بہت ہی زیادہ تقاضائے دید کرتا ہے اس لئے اس کے حکم کی تعمیل میں آئینہ آنکھ اور اس کے جوہر (خطوط) پلکیں بن جانا چاہتے ہیں ۔ آئینہ کو آنکھ اور اس کے خطوط جوہر کو مژگان سے تشبیہہ دی ہے ۔

سُہا و سعید ۔ مژگان ہونا سے آنکھ بننا مراد ہے یعنی جوہر آئینہ شوقِ تماشا میں یہ چاہتا ہے کہ مژگان (آنکھ) بن جائے ۔

آسی (۱) چونکہ اس کا جلوہ ہر ایک سے تقاضائے نگہ کرتا ہے جب آئینہ میں اس کا عکس پڑا ۔ تو اس کے جوہر میں یہ خاصیت پیدا ہو گئی ۔ کہ وہ مژگانی کرنے لگا یا اس کے جلوہ کے اثر سے مژگان بن گیا (۲) ہمخیال

۵ ۔ عشرت ... مسرت ۔ اہل تمنا ... عشاق ۔ عید نظارہ ... نظارہ کی عید ۔۔۔ قتل گاہ میں عشاق کی خوشیوں کا حال نہ پوچھ ۔ وہ قتل گاہ میں شمشیر یار کو عریاں دیکھ کر شوقِ شہادت سے زیادہ مسرور ہو گئے جیسے انہوں نے عید کا چاند دیکھ لیا اور ان کیلئے عید نظارہ آ گئی ۔ مصنف کا کمال یہ ہے کہ خیال خود بخود شمشیر اور ہلال کی تشبیہہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے

طباطبائی۔ لفظ ہلال تنگی وزن سے نہ آسکا اور شعر کا مطلب ناتمام رہا مطلب یہ ہے۔ کہ عشاق کو شمشیر عریاں دیکھ کر ایسی مسرت حاصل ہوتی۔ کہ ہلال عید کا نظارہ دکھائی دیا یہ آسی کہتے ہیں۔ عید نظارہ ترکیب مقلوب ہے مصنف نظارۂ ہلال عید کہنا چاہتا تھا۔

۶۔ خاک ..... قبر۔ لے گئے داغ تمنا ... آرزو پوری نہ ہوئی۔ افسوس لے گئے۔ بصد رنگ گلستان ہونا ..... ہر طرح سے تم باغ کی طرح شاداب رہو ـــــ افسوس کہ ہم تو دنیا سے نامراد گئے اور داغ آرزو اپنے دل میں لے گئے۔ اب خدا کرے۔ تم ہمیشہ خوش و خرم رہو اور باغ کی طرح پھولو پھلو حسرت وسعید لکھتے ہیں۔ کہ معشوق پر طنز ہے۔ طباطبائی ـــــ باغ باغ ہونا محاورہ ہے گلستان ہونا۔ غالب کا تصرف ہے۔

۷۔ عشرت ..... عیش، راحت۔ پارۂ دل ..... دل کا ٹکڑا یعنی دل۔ زخم تمنا کھانا ..... آرزو پوری نہ ہونا۔ زخم بمعنی رنج۔ ریش جگر ..... زخم جگر۔ غرقِ نمکدان ـــــ زخم پر نمک چھڑکنے سے تکلیف ہوتی ہے۔ غرق نمکدان ہونے سے انتہائی تکلیف مراد ہے ـــــ ناکامی اور محرومی کا زخم کھانا دل کے لئے عین راحت ہے! اور زخم جگر کا نمکدان میں غرق ہو جانا۔ اس کے لئے انتہائی لذت کا باعث۔ مطلب یہ ہے۔ کہ عشاق ایذا دوست ہوتے ہیں۔ سہا۔ بیخود۔ پارۂ دل سے دل کا ہر ٹکڑا مراد لیتے ہیں۔

۸۔ زود پشیمان ..... جلد پشیمان ہو جانے والا ـــــ اس نے مجھے قتل کرنے کے بعد ظلم سے توبہ کر لی۔ ہائے وہ جلد پشیمان ہو جانے والا کس قدر جلد پشیمان ہوا ہے۔ کاش اس نے قتل کرنے سے پہلے ظلم سے توبہ کی ہوتی۔ اب توبہ کرنے سے کیا فائدہ؟ زود پشیمان کے طنزیہ استعمال سے خوب لطف پیدا ہو گیا ہے

طباطبائی۔ لہو دیکھتے ہی رحم آگیا۔ کہ میں نے یہ کیا کیا۔ نہ غصہ آتے دیر لگی اور نہ پشیمان ہوتے۔ ممکن ہے۔ زود پشیمان طنز سے کہا ہو۔ یعنی جب کام اختیار سے باہر ہو چکا ہے۔ جب رحم آیا۔ کیا جلد پشیمان ہوئے (بیخود)

آسی پہلا مفہوم وہی ہے جو میں نے لکھا ہے۔ دوسرا مفہوم یہ پیدا کیا ہے۔ میں تو قتل ہو ہی چکا تھا۔ اب رقیبوں کی باری آئی تھی۔ کہ اس نے بہت جلد پشیمان ہو کر قتل کرنے سے توبہ کر لی۔

۹۔ اس چار گرہ کپڑے کی قسمت پر افسوس ہے۔ جو بد قسمتی سے عاشق کا گریبان بن گیا۔ کیونکہ وہ جنون عشق کے ہاتھوں ہمیشہ تار تار رہے گا۔ وصل میں معشوق از راہ شوخی چاک کر دے گا۔ اور ہجر میں عاشق خود اس کی دھجیاں اڑا دے گا۔ آب حیات میں لکھا ہے کہ جب قمار بازی کے جرم میں قید تھے۔ تو کپڑے اس قدر میلے ہوئے۔ کہ جوئیں پڑ گئیں۔ غالب جس دن قید سے چھوٹے۔ کرتہ پھاڑ کر وہیں پھینک دیا اور اس موقعہ پر یہ شعر پڑھے۔

حسرت کا خیال ہے۔ کہ شعر تو بہت خوب ہے۔ لیکن دونوں مصرعوں میں قسمت کی تکرار نے بے لطفی پیدا کر دی ہے۔

۱۸ شب خمار شوق ساقی رستخیز اندازہ تھا ۱ تا محیط بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

یک قدم وحشت سے درس دفتر امکاں کھلا ۲ جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

مانع وحشت خرامیہائے لیلے کون ہے ۳ خانۂ مجنون صحرا گرد بے دروازہ تھا

پوچھ مت رسوائی انداز استغنائے حسن ۴ دست مرہون حنا، رخسار رہن غازہ تھا

نالۂ دل نے دیئے اوراق لخت دل بباد ۵ یادگار نالہ اک دیوان بے شیرازہ تھا

۱۔ خمار۔۔۔ نشہ کا اتار۔ شوق ساقی۔۔۔ انتظار ساقی۔ رستخیز اندازہ۔۔۔۔۔۔
قیامت کی مانند۔ محیط بادہ۔۔۔ خط ساغر۔ جہاں تک شراب ہو۔ خمیازہ۔۔۔۔۔۔

انگڑائی ،صورت خانہ .... بتکدہ ۔ رات کو ساقی کے شوق انتظار میں قیامت کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی ۔ یہ کیفیت اس قدر بڑھی تھی ۔ کہ شراب بھی بری طرح خمار کی وجہ سے شیشے میں انگڑائیاں لینے لگی تھی ۔ اور اس طرح سے ایک بتکدہ خمیازہ یعنی انگڑائیوں کے صورت خانے کا منظر پیدا ہو گیا تھا ۔ مطلب یہ ہے ۔ کہ ہر شے ساقی کی آمد کی منتظر تھی ۔ اور انتظار کی کوفت سے انگڑائیاں لے رہی تھی ۔ شراب کے جوش کو انگڑائی سے تشبیہ دینا نادر خیال ہے بسمل اس شعر کو مہمل قرار دیتے ہیں بیخود دیکھتے ہیں ۔ کہ انگڑائی لینے میں ہاتھ بلند ہو کر آپس میں مل جاتے ہیں یہی شکل زنجیر کی ہے نظاہر ہے ۔ یہ تشریح مزید وضاحت چاہتی ہے ۔

طباطبائی :۔ رات کو میرے شوق نے قیامت برپا کر رکھی تھی اور شوق میں بے لطفی و بے مزگی جو تھی ۔ اس وجہ سے اسے خمار سے تشبیہ دی ۔ اور یہاں سے لب کردریائے بادہ تک میرے خمیازہ کا صورت خانہ بنا ہوا تھا یعنی میں نے خمار میں ایسی ایسی لمبی انگڑائیاں لیں جن کی درازی محیط بادہ تک پہنچی ۔ غرض یہ ہے کہ انگڑائی لیتے ہیں جو ہاتھ پاؤں پھیلتے تھے ۔ وہ گویا شراب کو ڈھونڈھتے تھے ۔ (آسی)

۲ ۔ یک قدم وحشت ..... تھوڑی سی وحشت ۔ دفتر امکان ..... دنیا جادہ ...... راستہ ۔ دو عالم دشت ..... دشت دو عالم ، کثرت ویرانی ـــــ تھوڑی سی وحشت سے دفتر امکان کی کل حقیقت مجھے معلوم ہو گئی ۔ گویا جادہ وحشت دشتِ دو عالم کے اجزاء کا شیرازہ تھا ۔ کہ اس میں عالم بقا و فنا دونوں منسلک تھے ۔ مدعا یہ ہے کہ بغیر وحشتِ عشق کے حقائق دو عالم معلوم نہیں ہوتے ۔

طباطبائی ـــــ ممکنات نے اپنے مبداء سے ایک ذرا سی وحشت دمغائرت جو کی تو عالم امکان موجود ہو گیا ۔ اور اس وحشت کا ایک قدم جس جادہ پر پڑا

گویا وہ اوراق دو صد دشت کا شیرازہ تھا۔ اس سبب سے کہ وحشت میں قدم جب اُٹھے گا۔ دشت ہی کی طرف اُٹھے گا۔ اور عارف کی نظر میں تمام عالم امکان ویران ہے، دو عالم دشت کی ترکیب میں مصنف نے دشت کی مقدار کا پیمانہ عالم کو بنایا ہے۔

۳۔ مانع ۔۔۔۔۔۔ روکنے والا۔ وحشت خرامی ۔۔۔۔۔۔ دیوانہ وار پھرنا صحرا گرد ۔۔۔۔۔ جنگلوں میں پھرنے والا۔ خانہ بے دروازہ یعنی صحرا ــــ مجنوں کا گھر تو بے دروازہ تھا یعنی وہ جنگل میں رہتا تھا۔ کسی کو اس تک پہنچنے میں روک ٹوک نہ تھی۔ پھر معلوم نہیں۔ کیوں لیلےٰ اتقاضائے وحشت مجنوں تک نہ پہنچ سکی۔ اور کون سی چیز اُس کی ملاقات میں مانع ہوئی طباطبائی لکھتے ہیں۔ کہ صحرا گرد مجنوں کی صفت ڈال کر اُس کے گھر کا پتہ دیا ہے۔

بیخود۔ لیلےٰ کئی مرتبہ محمل میں سوار ہو کر مجنوں کے پاس گئی لیکن ساربان کی غمازی اور پاس عصمت کے خوف سے نہ ملی۔ مرزا صاحب اسی قصے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

آسی۔ مجنوں ایسے گھر میں قید تھا جس میں کوئی دروازہ نہ تھا۔ اور اس سبب سے وہ کہیں آجا نہیں سکتا تھا۔ مگر لیلےٰ جس کے گھر میں دروازہ تھا وہ وحشت خرامی کر سکتی تھی۔ اس کو کون مانع تھا۔ اس پر جذب مجنوں کا اثر ہونا چاہیئے تھا۔

۴۔ رسوائی ۔۔۔۔۔ بدنامی۔ استغنا ۔۔۔۔۔ بے احتیاج۔ بے نیازی ــ مرہون ۔۔۔۔ ممنون۔ حنا ۔۔۔ مہندی۔ غازہ ۔۔۔ گلگونہ ــــ حسن کی بے نیازی کی شان یہ ہونی چاہیئے تھی کہ وہ غازہ اور حنا سے بے نیاز ہوتا پس یہ جو اُٹھو

میں مہندی، رخساروں پر غازہ ملا گیا۔ اس سے استغنائے حسن ثابت نہیں ہوتا بلکہ اِن چیزوں کا استعمال حسن کے اندازِ استغنا کی رسوائی اور بدنامی کا موجب ہے کیونکہ ہاتھ مہندی کا اور رخسار غازہ کا مرہونِ منت ہے۔ اور زیر بارئ احسان استغنا کی رسوائی کا باعث ہے۔

۵۔ اوراق لختِ دل..... یعنی دل کے ٹکڑے اُن کو ورقوں سے تعبیر کیا ہے۔ برباد دادن... پریشان و برباد کرنا۔ بے شیرازہ..... ورق ورق پریشان میرے نالۂ دل نے اوراقِ دل کو پریشان و برباد کر دیا۔ افسوس کہ یہی منتشر دیوان میرے نالے کی یادگار تھا۔ گویا دل ایک دیوان تھا اور لخت خانۂ دِل اس کے اوراق منتشر تھے جن کو آخرکار نالۂ دل نے پریشان کر کے برباد کر دیا۔ آسی۔ طباطبائی پارہ ہائے دِل کو اوراق سے پھر اوراق کو دیوان بے شیرازہ سے تشبیہہ دی اور نالہ کو شاعر فرض کیا ہے جس نے اپنی یادگار کو آپ برباد کر دیا۔ بیخود۔ مضامین عالی (دل کے ٹکڑے) جو نالۂ دِل کی صورت میں زبان سے نکلے تھے۔ ان کو میرے جوشِ طبع نے اوراقِ دل بنا کر ہوا میں اڑا دیا یعنی میرے اچھوتے خیالات کو عالم میں پھیلا دیا۔ اب جو میں نے خیال کر کے دیکھا۔ تو یادگارِ نالہ ایک دیوان بے شیرازہ تھا۔ یعنی موجودہ دیوان۔

۱۹۔ دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا ؛ ۱ زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا ؛
بے نیازی حد سے گذری بندہ پرور کب تلک ۲ ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے کیا ؛
حضرت ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ ۳ کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا ؛
آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں ۴ عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا ؛
گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا یوں سہی ۵ یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا ؛
خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں ۶ ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا ؛

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا؟

۱۔ غمخواری..... علاج معالجہ سعی..... کوشش ـــــ میرے دکھ کے علاج معالجہ میں میرے احباب کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ فرض کیا۔ انہوں نے یہ سوچتے ہوئے کہ میں زخم کو نوچ نہ سکوں میرے ناخن کاٹ دیئے اور زخم دل پر مرہم لگا دیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جب تک یہ زخم بھرے گا کیا اس وقت تک میرے ناخن نہ بڑھ آئیں گے۔ اور کیا میں دوبارہ زخم کو نہیں نوچ سکوں گا مطلب یہ ہے کہ ناخن بڑھ آنے پر میں زخم کو پھر خراب کر دوں گا۔ اور اس طرح ان کی کوششیں بیکار ضائع جائیں گی۔

اپنی ایذا دوستی کا اظہار کیا ہے۔

۲۔ بے نیازی..... بے توجہی۔ بے پرواہی۔ حد سے گزری... حد سے زیادہ یعنی بہت زیادہ ہو گئی۔ کیا..... یعنی کیا کہا ـــ بندہ پرور آپ کی بے نیازی بہت ہی زیادہ ہو گئی۔ کیا، آخر یہ سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔ کہ ہم تو اپنا حالِ دل سنائے جائیں گے۔ اور آپ بار بار کہے جائیں گے کہ کیا کہا۔ یعنی آپ کب تک تجاہل عارفانہ فرمائیں گے۔

بیخودؔ۔ کیا سے دو معنی پیدا ہوتے ہیں (۱) استفسار یعنی تجاہلِ عارفانہ۔ (۲) طنز یعنی تو نے جو کچھ کہا جھوٹ کہا۔

۳۔ دیدہ و دل فرشِ راہ... یعنی بسر و چشم۔ شوق سے، میری سر آنکھوں پر تشریف لائیں ـــ حضرت ناصح اگر تشریف لاتے ہیں تو شوق سے تشریف لائیں۔ میں ان کے راستے میں دیدہ و دل بچھاؤں گا۔ گویا ان کا پرتپاک خیر مقدم کروں گا۔ لیکن خدارا کوئی مجھے یہ بات سمجھا دے۔ کہ وہ مجھے کیا سمجھائیں گے۔

مطلب یہ ہے کہ میرا جذبۂ عشق پند و نصیحت سے فرو نہیں ہو سکتا۔ گویا میں محبت کے معاملہ میں بے اختیار ہو چکا ہوں۔ اس لئے اِن کی نصیحت سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

بیخود۔ از راہِ شوخی پہلے مصرعہ میں حضرت ناصح کا پڑپڑاک خیر مقدم ہے اور دوسرے میں ان کی فہمائش کو اس حقارت سے بیان کیا جاتا ہے کہ وہ مجھے کیا سمجھا سکتے ہیں۔ یعنی اِن کی ہستی ہی کیا ہے؟۔

۴۔ کفن باندھنا۔۔۔۔ شہادت کے لئے تیار ہو جانا۔ عذر۔۔۔۔ بہانہ۔ آج میں قاتل کے پاس سر پر کفن باندھ کر اور تلوار لے کر جاتا ہوں جب میرے پاس کفن بھی ہوگا اور تلوار بھی تو پھر وہ قتل کرنے میں کوئی بہانہ نہیں کر سکیں گے۔ یعنی یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ قتل کرنے کو تلوار نہیں ہے۔ یا کفن نہیں ہے بقول بیخود کفن باندھنے سے یہ لطف پیدا ہو گیا ہے۔ کہ مجھ سے بڑھ کر اور کون سر فروش ہو سکتا ہے۔

۵۔ اگر ناصح نے ہمارا جنونِ عشق کم کرنے کے لئے ہم کو قید کر دیا ہے۔ تو کچھ مضائقہ نہیں۔ دیکھنا یہ ہے۔ کہ کیا اس طرح قید کرنے سے جنونِ عشق جاتا رہے گا، مطلب یہ ہے کہ قید و بند سے جنونِ عشق دور نہیں ہو سکتا ظاہر ہے کہ قید و بند دشت نوردی کو مانع آسکتا ہے۔ لیکن اندازِ جنونِ عشق کو نہیں روک سکتا۔ بیخود۔۔۔ ناصح کسی کو قید نہیں کرتا۔ اس کے بار بار سمجھانے اور مجبور کر کے پاس بٹھانے کو قید سے تعبیر کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ناصح کے سامنے بھی اپنے خیال میں مستغرق رہتے ہیں۔

۔ خانہ زاد۔۔۔۔ غلام۔ گرفتارِ وفا۔۔۔۔ پابندِ وفا ۔۔۔ ہم شروع زمانہ سے خانہ زاد غلام ہیں۔ اس لئے ہم زنجیر توڑ کے نہیں بھاگ سکتے۔

اور ہم قید سے یوں نہیں گھبرا سکتے۔ کہ پابندِ وفا ہیں یعنی جو شخص خانہ زاد زلف اور پابندِ وفا ہو۔ اس کے لیئے زنجیر و زنداں باعث فرار و پریشانی نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اس قسم کے مصائب اٹھانے کا عاشق پہلے ہی سے عادی ہوتا ہے۔ نیز زنجیر و زنداں عاشق کے نزدیک الفت نوازی اور وفاداری کا انجام ہیں پھر ان سے گھبرانا کیا؟

٧۔ مورد ...... بستی۔ آبادی، یعنی دہلی، غم الفت ..... غم عشق ــ دہلی میں اب غم الفت کا بھی کال پڑ گیا ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ ہماری غذا ہی غم الفت ہے۔ اگر اب ہم اس بستی میں رہے تو پھر کیا کھائیں گے۔ یعنی بھوکے مر جائیں گے۔ اس لیئے اب ایسی جگہ چلیئے جہاں غم الفت بافراط ملے یعنی عشق کرنے کے لیئے محبوب بکثرت ہوں۔ آسی کہتے ہیں قحط ایک بات ہے یعنی اگر معشوق نہیں تو دیگر عزیز و اقارب کا غم کھانے کو نہیں ملتا۔ گویا الفت محض عشق نہیں بلکہ باہمی تعلقات مراد ہیں۔ سہا کا بھی تقریباً یہی خیال ہے

٨۔ یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا ۱ اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا ٢ کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا
تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا ٣ کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو ٤ یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح ٥ کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا
رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا ٦ جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے ٧ غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے ٨ مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا ٩ نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا ۱۰ جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا ۱۱

۱۔ ہماری تقدیر ہی میں نہ تھا۔ کہ ہم وصل یار سے لطف اندوز ہوتے۔ اگر ہم مر نہ جاتے اور جیتے رہتے تو ہم کو وصل یار کا مزید انتظار کرنا پڑتا چونکہ انتظار موت سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ اس لئے اچھا ہی ہوا۔ کہ ہم مر گئے اور انتظار وصل یار کی تکلیف سے نجات پا گئے۔

۲۔ خیال یہ ہے کہ عاشق کے لئے وعدۂ وصل انتہائی خوشی کا باعث ہے۔ اور اس سے عاشق صادق کو شادی مرگ ہو جانا چاہیئے کہتے ہیں ہم تیرے وعدۂ وصل پر بھی اگر زندہ رہے تو تجھ کو یہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ ہم نے تیرے وعدۂ وصل کو جھوٹ جانا۔ اگر ہم اسے جھوٹ نہ جانتے تو یقیناً شادی مرگ ہو جاتے۔
آسی کہتے ہیں (۱) ہم تیرے وعدہ کر لینے سے جیئے تو تو نے یہ سمجھ کر جھوٹ جانا۔ کہ اگر سچا۔ سے وعدہ کا اعتبار ہوتا تو تجھے شادی مرگ ہو جاتی۔ (۲) متفق۔
طباطبائی (۱) ہم نے جو یہ کہا کہ فقط وعدۂ وصل سن کے ہم مرنے سے بچ گئے تو تم نے جھوٹ جانا (۲) ہمخیال۔

۳۔ نازک... نزاکت۔ بودا.... کمزور۔ استوار.... مضبوط جانا..... ہم نے جانا ـــــ ہم نے تمہاری نزاکت سے جان لیا کہ تم نے بودا عہد باندھا تھا۔ اگر وہ مضبوط ہوتا تو تم جیسے نازک شخص سے ہرگز ٹوٹ نہ سکتا کس خوبصورتی سے معشوق کو عہد شکنی کے الزام سے بچا کر اپنے دل کو تسلی دی ہے۔

۴۔ تیر نیم کش..... وہ تیر جس کو آدھی کمان کھینچ کر یعنی آہستہ سے چھوڑ دیا

جائے مراد تیر مژگان جس کو کمانِ چشم سے پورے زور سے نہیں نیم وا چشم سے چھوڑا گیا ہے۔ خلش ... چبھن ــــ وہ تیر مژگان جو تو نے کمالِ بے پروائی کے ساتھ نیم کش کمانِ چشم سے میرے جگر پہ مارا ہے اس کی کیفیت کو میرے دل سے دریافت کرلے۔ یعنی مجھے اس سے بہت ہی لطف حاصل ہوا ہے۔ اگر تو اسے پورے زور سے چھوڑتا تو وہ جگر کے پار ہو جاتا اور اس طرح سے میں لذتِ خلش سے محروم رہ جاتا۔ مطلب یہ ہے کہ کام تمام ہونے میں لطف نہیں بلکہ خلش میں زیادہ لطف ہے۔ اس لیئے تیرِ نیم کش کی تعریف کی ہے۔

بیخود۔ معشوق تیر نیم کش سے شرماتا ہے۔ اور مرزا صاحب اس کی تعریف کر کے شرمندگی دور کرتے ہیں۔ طباطبائی لکھتے ہیں۔ جو کا داؤ وزن سے ساقط ہے اور یہ درست بلکہ فصیح ہے لیکن اس کے ساقط ہو جانے سے دو جیم جمع ہو گئے۔ اور تنافر پیدا ہو گیا۔ لیکن خوبیٔ مضمون کہ ایسی باتوں کا کوئی خیال نہیں کرتا۔

۵۔ قاعدہ ہے عشق میں نصیحتیں بُری معلوم ہوتی ہیں۔ کہتے ہیں یہ کیسی دوستی ہے۔ کہ دوست نصیحتیں کرتے ہیں۔ اگر وہ حقیقتاً میرے سچے دوست تھے۔ تو نصیحتوں سے انہیں میرا دماغ پریشان کرنے کی بجائے میرے دکھ کا علاج کرنا چاہیئے تھا۔ ظاہر ہے، دردِ عشق کا علاج وصلِ محبوب ہے

۶۔ رگِ سنگ ..... پتھر میں جو لکیریں ہوتی ہیں ان کو رگِ سنگ کہتے ہیں وہ لہو ... خون بکثرت ــــ پتھر میں شرارے پوشیدہ ہیں۔ کہتے ہیں اگر شرارۂ سنگ شرارِ غم کی طرح ہوتا تو رگِ سنگ سے اس قدر لہو جاری ہوتا۔ کہ پھر کسی طرح بند نہ ہوتا۔ یعنی غم ایسی چیز ہے کہ پتھر بھی اسے برداشت نہ کرتا۔ گویا یہ ہمارا ہی جگر ہے کہ ہم غم کو چھپائے ہوئے ہیں۔ اگر یہ پتھر میں ہوتا۔

تو اس میں سے بھی لہو جاری ہو جاتا۔ اور ایسا لہو جاری ہوتا۔ کہ وہ کسی طرح نہ تھمتا۔

۷۔ جاں گسل .... جان کو گھلانے والا۔ شاعر کا خیال ہے کہ انسان کا دل رنج و غم کا مرکز ہے۔ اس لئے دل کبھی اس سے خالی نہیں ہوتا —— اگرچہ غم جان کو گھلانے والا ہے۔ لیکن دل کی ایذا دوستی کی وجہ سے کوئی اس سے بچ نہیں سکتا۔ اس لئے اگر غم عشق ہمارے دل میں نہ ہوتا۔ تو پھر اس کی جگہ غم روزگار ہوتا۔ بہرحال ہمیں غم عشق غنیمت ہے۔ کیونکہ اگر یہ نہ ہوتا۔ تو ہم دنیا بھر کے غموں میں مبتلا ہوتے۔ اب تو صرف ایک غم عشق ہے۔

۸۔ میں کس سے کہوں۔ کہ شب غم کیا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ شب غم بہت ہی بڑی مصیبت ہے۔ اس میں انسان بار بار موت کی تکلیف اٹھاتا ہے۔ اور پھر بھی نہیں مرتا۔ اگر میں ایک مرتبہ مرجاتا۔ تو مجھے اس عذاب سے نجات مل جاتی۔ شب غم کے مصائب کو موت سے زیادہ بتایا ہے۔ جملہ شارحین اس شعر کو حد تحسین سے باہر بتاتے ہیں۔

۹۔ ہم زندگی میں تو عشق کی بدولت بدنام ہی تھے۔ لیکن مرنے کے بعد بھی ہم رسوا ہوئے۔ کیونکہ نہ تو کوئی ہمارا جنازہ اٹھانے والا تھا۔ اور نہ کسی کو مزار بنانے کا خیال تھا۔ اور یہ ہماری رسوائی کی آخری حد تھی۔ اس سے تو بہتر یہ تھا۔ کہ ہم دریا میں غرق ہو جاتے۔ کہ جنازہ اٹھانے اور مزار بنانے کی تکلیفات سے ہماری رسوائی نہ ہوتی۔ اور ہماری رسوائی اور بیکسی کی کسی کو ہوا تک بھی خبر نہ ہوتی۔ بمقتضائے عشق صاد ق نشان مزار کو بھی باعث رسوائی قرار دیا ہے۔

۱۰۔ یگانہ و یکتا .... خدائے واحد و بے مثال۔ دوئی کی بو .... دوئی کا شائبہ دوچار ہوتا۔ دکھائی دیتا —— خدائے بیمثال یگانہ و واحد ہے اس لئے

اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ اگر اس میں ذرا سی بھی دوئی ہوتی۔ تو کہیں نہ کہیں وہ ضرور دکھائی دیتا۔

سہا۔ دیکھنے میں وہی چیزیں آسکتی ہیں جو ابعاد ثلاثہ زمان و مکان اور اشارات میں مقید ہوں۔ لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ۔

آستی۔ لَوْ کَانَ فِیْهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا یعنی اگر آسمان اور زمین میں سوائے خدا کے چند خدا ہوتے تو ضرور فساد ہوتا۔ چونکہ طبیعتیں یا اختیارات مجتمع نہیں ہو سکتیں۔ اگر وہ صلح کرنے کی کوشش کریں تو صلح نہیں ہو سکتی کیونکہ صلح دو برابر والوں میں نہیں ہو سکتی۔ ایک غالب ہوگا اور دوسرا مغلوب۔ اور جو مغلوب ہوگا وہ خدا نہیں۔

۱۱۔ اے غالبؔ تصوف کے جن مسائل کو تو نے بیان کیا ہے۔ یہ ایسے مسائل ہیں اگر تو بادہ خوار نہ ہوتا۔ تو ہم تجھ کو ولی سمجھتے۔ کہتے ہیں جب بادشاہ نے یہ مقطع سنا تو فرمایا۔ کہ بھئی ہم تو جب بھی ایسا نہ سمجھتے۔ مرزا نے کہا۔ حضور تو اب بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ مگر یہ اس لئے ارشاد ہوا ہے۔ کہ میں اپنی ولایت پر مغرور نہ ہو جاؤں۔

۱۲۔ ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا ۔ ۱ ۔ نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
تجاہل پیشگی سے مدعا کیا ۔ ۲ ۔ کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا
نوازش ہائے بیجا دیکھتا ہوں ۔ ۳ ۔ شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا
نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں ۔ ۴ ۔ تغافل ہائے تمکیں آزما کیا
فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے ۔ ۵ ۔ ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا
نفس موجِ محیطِ بیخودی ہے ۔ ۶ ۔ تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا
دماغِ عطر پیراہن نہیں ہے ۔ ۷ ۔ غمِ آوارگی ہائے صبا کیا

دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر ۸ ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا
محابا کیا ہے میں ضامن ادھر دیکھ ۹ شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا
سُن اے غارتگرِ جنسِ وفا سُن ۱۰ شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا
کیا کس نے جگرداری کا دعوےٰ ۱۱ شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا
یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں ۱۲ یہ کافر فتنۂ طاقت رُبا کیا

بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
۱۳ عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

۱۔ نشاط.... اُمنگ، نشاطِ کار، کام کرنے کی اُمنگ۔ کیا کیا.... کس قدر زیادہ۔ حالی۔ دنیا میں جو کچھ چہل پہل ہے۔ وہ صرف اس یقین کی بدولت ہے کہ یہاں رہنے کا زمانہ بہت تھوڑا ہے۔ یہ انسان کی ایک طبعی خصلت معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر فرصت قلیل ہوتی ہے۔ وہ اسی قدر زیادہ سرگرمی سے کام کو سرانجام کرتا ہے اور جس قدر زیادہ مہلت ملتی ہے اُسی قدر کام میں تاخیر اور سہل انگاری زیادہ کرتا ہے پس اگر موت نہ آیا کرتی اور ابد الآباد تک زندہ رہنا ہوتا تو جینے میں کوئی مزہ نہ آتا۔ کیونکہ نہ تو یہ جوش و سرگرمی ہوتی اور نہ دنیا میں یہ چہل پہل نظر آتی۔ سعید، حسرت، بیخود۔

طباطبائی:۔ (۱) رقیب بوالہوس کی ہوس کو نشاطِ کار و لطفِ وصل نگار حاصل ہے۔ اب ہمارے جینے کا مزا کیا رہا۔ ہوس سے مراد محبت رقیب لیتے ہیں (۲) دنیا میں انسان کو ہوا و ہوس سے رہائی نہیں۔ اگر مرنا نہ ہوتا تو اس طرح کے جینے میں کچھ مزا نہ تھا۔ یعنی حاصل زندگی مرنا ہے۔

۲۔ تجاہل پیشگی.... جان بوجھ کر انجان بننا۔ کیا ہم کیا؟.... بار بار کیا کیا کہنا۔ جیسے کچھ سمجھے نہیں۔ تم جو جان بوجھ کر انجان بنے جاتے ہو۔ اور

بار بار کیا کہتے ہو۔ آخر تمہارا اس سے مطلب کیا ہے ملے معشوق سراپا ناز میری ہر بات پر کیا؟ کیا؟ کب تک کہے جاؤ گے یعنی کب تک تم تجاہلِ عارفانہ سے مجھے ٹالتے رہو گے اور میری بات نہ سمجھو گے۔

۳۔ نوازشہائے بیجا..... بے محل مہربانیاں رقیب پر شکایت ہائے رنگین محبت بھری شکایتیں —— آپ جو اغیار پر بے محل مہربانیاں کرتے ہیں۔ تو ان کو دیکھ کر میں از راہِ محبت تم سے شکایتیں کرتا ہوں آپ مجھ سے اِن رنگین شکایتوں کا گلہ کیوں کرتے ہیں ع۔ کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ جب تم رقیب پر مہربانیاں صرف کرتے ہو تو میری شکایتوں کا کیوں برا مانتے اور اِن کا گلہ کرتے ہو۔

تشریح: (از نجمیاں رضا) میں آپ کی نوازشیں جو غیروں پر ہوتی ہیں دیکھتا ہوں خود غم و غصہ سہتا ہوں پھر اس حال میں اگر آپ میری شکایتیں رنگین الفاظ میں سنتے ہیں تو آپ اُن کا گلہ کیا کرتے ہیں

سہا۔ آپ کے التفاتِ غیر متوقع کی خوشی میں بھول ہی گیا گزشتہ بے مہریوں کی کیا شکایت کروں

۴۔ نگاہِ بے محابا..... بے تکلف و بے حجاب نظر۔ تغافل تمکین آزما ..... چشم پوشی جو عاشق کا صبر آزمانے کے لئے کی جائے —— میں چاہتا ہوں کہ تم میری طرف بے تکلفانہ اور بے حجابانہ دیکھو۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم میرے صبر کا امتحان لینے کے لئے تغافل اور چشم پوشی سے کام لیتے ہو آخر یہ کیوں؟ یاد رہے جس طرح سے میرا جامِ صبر ہرگز نہیں چھلک سکتا یعنی مجھ تاکہ میں بے تاب ہو کر تڑپ اٹھوں۔

۵۔ فروغ ..... روشنی۔ شعلۂ خس ..... وہ شعلہ جو تنکا جلنے سے اٹھتا ہے

اور فوراً ہی بجھ جاتا ہے۔ یک نفس … پل بھر، بہت تھوڑی دیر ہوس … اہلِ ہوس یعنی ہوس پرست رقیب ـــــ اہلِ ہوس کی محبت شعلۂ خس کی طرح ہے۔ کہ دم بھر سے زیادہ قایم نہیں رہ سکتی۔ بھلا ایسے لوگوں کو ناموسِ وفا کا کیا پاس ہو سکتا ہے۔ یعنی رقیب کی محبت دو چار دن کی ہے اس پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ لوگ وفا کی لاج نہیں رکھ سکتے۔

۶۔ نفس … سانس۔ محیطِ بیخودی … بحرِ بیخودی۔ تغافل ہائے ساقی … ساقی کا شراب نہ پلانا ـــــ جذبۂ عشق کی وجہ سے ہمارا سانس دریائے بیخودی کی موج ہے یعنی ہر سانس کے ساتھ ہم بیخود و مست ہو جاتے اور اپنے آپ سے گذر جاتے ہیں۔ ساقی ہماری طرف سے تغافل کرتا ہے اور ہمیں شراب نہیں پلاتا تو ہم کو اس کی تغافل شعاریوں کی کیا شکایت ہو سکتی ہے۔ شراب سے اصل مقصد بیخود ہو جانا ہے۔ اور ہم پہلے سے مست ہیں۔ پھر ساقی کا گلہ کیا؟

حسرت و طباطبائی ـــــ صورت ہی دیکھ کر مست ہو جاتے ہیں وہ شراب نہ دے تو کیا شکایت۔ بیخودی (۱) ہم مستِ الست ہیں (۲) ہم اپنے حال میں مست ہیں۔ ہمیں دنیا کے ہست و بود کا کیا غم۔ سعید میرے اور حسرت کے ہم خیال ہیں۔

۷۔ دماغ نہیں … برداشت نہیں۔ پسند نہیں عطرِ پیرہن … خوشبوئے لباسِ یار ـــــ اگر صبا پیراہنِ یار کی خوشبو کو چاروں طرف پریشان کرتی پھرتی ہے تو ہمیں اس کا کیا غم ہے۔ غم تو اس وقت ہوتا جب ہم اس سے لطف اندوز ہو سکتے یعنی ہم اسے سونگھ سکتے بیخود۔ ہم بوئے یار کو سونگھنے والے ہیں۔ ہمارا دماغ عطرِ پیراہنِ یار کی خوشبو جس پر غیروں نے عطر ملا ہے

پسند نہیں کرتا صبا اگر کوچہ رقیب سے عطر پیراہن کی خوشبو لیکر آئی ہے تو ہم اس کو کیا کریں۔ آوارگی کا لفظ بتا رہا ہے کہ صبا کوچہ رقیب سے آئی ہے۔ طباطبائی واستی۔ اگر مجھے پیراہن کے بسانے کا دماغ ہوتا تو صبا کی آوارگی کا غم ہوتا کہ یہ بوئے گل کو پریشان کیوں کرتی پھرتی ہے۔ اگر یہ جمع رہتی تو پیراہن بسانے کے کام آتی۔ مگر مجھے پیراہن بسانے ہی کا دماغ نہیں ہے تو صبا کی اس حرکت کا کیا غم کروں گویا جسے ہوس دنیا نہ ہو اسے بیوفائی دنیا کا کیا غم ہے

۹۔ دل ہر قطرہ۔۔۔۔ ہر قطرہ کا دل۔ ساز۔۔۔۔ باجہ۔۔۔ انا البحر۔۔۔۔۔ میں دریا ہوں ــــــ ہر قطرہ کا دل ساز انا البحر ہے یعنی ہر قطرہ کے سازِ دل سے انا البحر کا نغمہ نکل رہا ہے۔ اگرچہ قطرہ بہت چھوٹا ہے لیکن جب دریا میں ملتا ہے تو وہ دریا بن جاتا ہے اس لئے ہر ایک قطرہ دریا ہونے کا دعویدار ہے۔ بالکل اسی طرح ہم بھی اگرچہ جزو ضعیف ہیں لیکن پھر بھی ہم انا الحق (میں خدا ہوں) کے مدعی ہیں۔ ہماری شان ملاحظہ ہو کہ ہم کو بھی قطرہ کی طرح اپنے مبداء کے ساتھ عینیت کا دعوےٰ ہے۔ کیونکہ ہم بھی اسی بحر بیکراں (ہستی خدا) کے جز ہیں۔

۱۰۔ محابا۔۔۔ خوف ضامن۔۔۔۔ ذمہ دار۔ خون بہا۔۔۔ فدیہ۔۔۔۔ قیمت خون ــــــ تو بے خوف و خطر میری طرف دیکھ، میں ذمہ دار ہوں۔ اگر شہید نگاہ ہو گیا تو تجھ سے میرا خون بہا کوئی طلب نہ کرے گا۔ کیونکہ شہیدان نگاہ کا کوئی خون بہا نہیں ہوا کرتا۔ "ادھر دیکھ" نے شعر کو بلند کر دیا ہے یعنی قتل بھی کر اور سن بھی۔

۱۱۔ غارت گر جنس وفا۔۔۔ باوفا عاشقوں کو برباد کرنے والا یعنی معشوق شکست قیمت دل۔۔۔۔ دل کی قیمت گھٹانا۔ دل کو توڑنے کی آواز ہو سکتی

ہے لیکن قیمت دل کو توڑنے میں کوئی صدا نہیں ہوتی ۔۔۔ اے غارت گر جنسِ وفا ذرا سن اور غور سے سن کہ قیمت دل توڑنے میں کوئی آواز نہیں ہوتی۔ اس لئے تو دل کو نہ توڑ یعنی میرے دل کی بے قدری نہ کر۔ کیونکہ اس کو توڑنے سے کوئی آواز پیدا نہ ہوگی جو تیری سامعہ نوازی کا باعث بنے (حسرت، ہم خیال) طبا طبائی۔ (۱) تو جو یہ کہتا ہے کہ ہمیں شکست دل کی خبر نہیں۔ تو کہیں شکست دل میں آواز ہوتی ہے جو تجھے سنائی دیتی، شکست کو شکست قیمت دل سے تعبیر کرکے جنس وغارت اس کے مناسبات ذکر کئے ہیں (۲) شکست دل کی صدا تجھے اچھی معلوم ہوتی ہے تو دل شکنی تو کئے جا اور سنے جا بھلا دل کی صدا، اور صدائے شکستِ دل کی کیا حقیقت ہے، جو تامل کیے (سعید) ۔ بیخود: جنسِ وفا جو میرے دل میں تھی وہ گویا قیمت دل تھی یعنی میرا دل اسی وجہ سے قیمتی تھا کہ اس میں جنسِ وفا تھی۔ تو نے دل توڑ کر سکون غارت کر دیا۔ تو اب میری سن اور مکرر کہتا ہوں کہ میری بات سن شکست دل کی صدا نالہ ہوا کرتا ہے جس سے تو ڈرتا ہے اور سننا نہیں چاہتا۔ تو خود شکر کر تو نے دل نہیں توڑا بلکہ قیمت دل توڑی قیمت دل کی شکستگی میں کوئی صدا پیدا نہیں ہوتی۔ اس صورت میں تجھے ڈرنا نہیں چاہیئے۔

آسی (۱) اے صدائے شکست قیمت دل کے شائق سن مگر شکست قیمت دل میں صدا کہاں ہوتی ہے سن سے دو معنی پیدا ہوتے ہیں کہ تو میری بات سن یا شکست قیمت دل کی صدا سن، جسے تو سن نہیں سکتا۔ آسی کہتے ہیں بعض نسخوں میں انہوں نے بجائے قیمت کے شیشہ دیکھا ہے اور وہ زیادہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں سن بطور طنز ہوگا (۲) ہم خیال طبا طبائی!

۱۱۔ جگرداری ... استقلال۔ صبر۔ شکیب ... صبر۔ خاطر ...... دل سے میں نے کب دعویٰ کیا ہے کہ تمہارے بغیر مجھے چین آجائے گا بھلا عاشق کا یہ دعوے کرنا حقیقت ہی کیا رکھتا ہے۔ تم میرے صبر و استقلال کو ایک اشارے سے غارت کر سکتے ہو۔ جگرداری کا دعویٰ کرنے سے جو تمہیں غلط فہمی ہو گئی ہے اس کی بناء پر تم مجھے زیادہ بے چین نہ کرو۔

۱۲۔ بر قاتل ..... اے قاتل۔ فتنۂ طاقت ربا ..... طاقت کو زائل کرنے والا فتنہ ۔۔۔ اے قاتل معشوق تو یہ صبر آزما وعدہ کیوں کرتا ہے۔ تیرے نزدیک تو یہ معمولی سی بات ہے لیکن میرے لئے یہ صبر آزما وعدہ فتنۂ طاقت ربا ہے۔

الفاظ کی نشست سے شعر میں یہ خوبی پیدا ہو گئی ہے کہ قاتل کو صبر آزما کی صفت بھی قرار دے سکتے ہیں۔ بیخود نے یہی معنی لئے ہیں اور کافر کو بھی فتنۂ طاقت ربا کی صفت قرار دیا ہے۔

۱۳۔ کیا عبارت والفاظ، کیا اشارہ، کیا کنایہ کیا ناز و انداز غرض محبوب کی ہر بات میرے لئے بلائے جان آفت مصیبت ہے جب جذبۂ شوق تیز ہوتا ہے تو محبوب کی ہر بات دل میں ہیجان و بے قراری پیدا کر دیتی ہے۔

۲۲۔ درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا ۱ پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا
بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم ۲ الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا
سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا ۳ روبرو کوئی بتِ آئینہ سیما نہ ہوا
کم نہیں نازشِ ہمنامیِ چشمِ خوباں ۴ تیرا بیمار برا کیا ہے، گر اچھا نہ ہوا
سینہ کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک گیا ۵ خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا

نام کا میرے ہے وہ دکھ کہ کسی کو نہ ملا ۷ کام میں میرے ہے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا

ہر بن مو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خوں ناب ۸ حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جز میں کل ۸ کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے

۹ دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

۱۔ درخور.... قابل قہر و غضب... عتاب اٹھانے کے لائق.... ہم جیسا۔
— جب محبوب صرف ہمیں کو قابل قہر و غضب سمجھتا ہے تو پھر اگر ہم کہیں کہ ہم جیسا کوئی اور پیدا نہیں ہوا تو اس میں کونسی غلط بیانی ہے مطلب یہ ہے کہ ہمارا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ آفت زدگی میں ہم لاثانی ہیں۔

۲۔ بندگی.... عبادت۔ آزادہ ..... مرد آزاد منش۔ خود بیں..... وہ شخص جو اپنی بات کا بڑا ہو اور دوسروں کی بات کو اپنی بات سے کم سمجھے۔ وا ...... کھلا —— باوجود بندگی بیچارگی کے میرے آزادہ روی اور خودبینی کا یہ عالم ہے۔ کہ اگر خانہ کعبہ کے دروازہ کو بند پاتا ہوں تو واپس چلا آتا ہوں یعنی میں کنڈی کھٹکھٹا کر دروازہ کھلوانا اپنی شانِ آزادی اور خودبینی کے خلاف سمجھتا ہوں جب ہماری حالت یہ ہے۔ تو بھلا پھر ہم کسی اور کے سامنے کیوں جھکنے لگے تھے۔ ندرتِ بیان اس کو کہتے ہیں کہ اپنی خودبینی اور آزادگی کے پردے میں کعبہ کی عظمت کا پہلو بھی نکل آیا۔ کہ وہ ایسی بارگاہ ہے جس کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا۔

۳۔ بُتِ آئینہ سیما..... وہ محبوب جس کی پیشانی آئینہ کی طرح روشن ہو۔ روبرو..... بدِ مقابل —— تیری یکتائی اور عدیم المثالی کا دعویٰ تمام محبوبانِ جہان تسلیم کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کوئی تمام تجھ سا آئینہ سیما محبوب

تیرے سامنے نہیں آتا۔ اور تیرا مقابلہ نہیں کرتا۔ چونکہ آئینہ میں آئینہ دیکھنے
والے کا عکس نظر آتا ہے۔ اس لئے آئینہ سیما کی صفت بت کے ساتھ
نہایت خوب ہے۔

سہما۔ دنیا کا کوئی حسین تیرا مد مقابل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ سب کے حسن میں
تیرا ہی جمال پرتو فگن ہے اور یہی انعکاس تیرے دعوئے یکتائی کی مقبولیت
عام ہے۔ آسی۔ تو وہ منتظر کہ تیری یکتائی کوئی نہ مٹا سکا اور کوئی آئینہ سیما معشوق تیرا مد
مقابل پیدا نہ کر سکا جب آئینہ مقابل ہوتا ہے تو مقابل پیدا ہو جاتا ہے لیکن یہ پیالہ
ٹوٹ گیا آئینہ سیما جس میں عکس آئینی مد مقابل پیدا ہو جانے کا پورا احتمال تھا۔ وہ بھی کوئی مقابل
پیدا نہ کر سکا۔ وحدت وجود کی طرف اشارہ ہے۔

۴۔ نارسی۔۔۔ فخر چشم خوباں کو شعرا چشم بیمار کہتے ہیں اور عاشق بھی
بیمار کہلاتا ہے یہی ہمنامی ہے ـــ عاشق بھی بیمار ہے اور تیری آنکھیں
بھی بیمار ہیں۔ جب دونوں بیمار کہلائے تو ہم نام ہوئے۔ بس اگر تیرا بیمار اچھا
نہ ہوا۔ تو کچھ مضائقہ نہیں۔ کیونکہ اس کے لئے یہی فخر کافی ہے۔ کہ وہ تیری چشم
کا ہمنام ہے۔ بقول آسی۔ اس شعر میں انتہائی حسرت ہے۔ عاشق اپنی بدترین
حالت کو معشوق کی ایک چیز سے ہمنام پاکر اسی پر صبر بلکہ ناز کرتا ہے۔

۵۔ سینہ کا داغ ہے۔۔۔ دھبہ ہے، ننگ ہے۔ خاک کا رزق ہے
۔۔۔۔ رائیگاں جاتا ہے ـــ جو قطرہ دریا میں مل کر دریا نہیں بن جاتا وہ
رائیگاں جاتا ہے۔ اور جو قطرہ زمین پر گرتا ہے۔ وہ زمین میں جذب ہو کر فنا ہو جاتا
ہے۔ اسی طرح وہ نالہ جو دل ہی میں رہ جاتا ہے۔ اور لب تک نہیں آتا۔ وہ سینے
میں داغ بن کر پوشیدہ ہو جاتا ہے۔ (۲) اگر داغ کے معنی ننگ و عار کے
لئے جائیں تو پھر مطلب یہ ہوگا۔ کہ جو نالہ لب تک نہیں آتا اور ضبط کیا

جاتا ہے وہ جوشش عشق پر بدنامی کا دھبہ لگاتا ہے۔ اور وہ قطرہ جو زمین پر گرتا ہے، زمین جذب ہو کر فنا ہو جاتا ہے۔ گویا اسے دریا بننے کا موقع نہیں ملتا۔

طباطبائی اور آسی پہلے معنی لکھتے ہیں۔ اور نظم و حسرت۔ سعید دوسرے معنی۔

۶۔ میرے نام کا..... میرے حصے کا۔ کام..... کاروبار ــــ میرے حصے میں وہ دکھ اور مصیبتیں آئی ہیں۔ جو دنیا میں کسی پر نازل نہیں ہوئیں اور میرے کاروبار میں اس قسم کے فتنے پیدا ہوئے ہیں جو دنیا میں کبھی اٹھے ہی نہیں۔ جو مصیبتیں اور فتنے عام طور پر پیش آتے ہوں، ان کا تدارک تو ہو سکتا ہے لیکن نئی نئی تکلیفوں اور فتنوں کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے جب روز ایک نئی مصیبت نازل ہوگی۔ تو اس کی روک تھام کیسے ہو سکتی ہے۔ روک تھام کے لئے سوچنے اور تدبیر نکالنے کی ضرورت ہے۔ لیکن یہاں حالت یہ ہے کہ ایک آفت سے سانس لینے کی نوبت نہیں آتی۔ کہ دوسری آ دھمکتی ہے۔ اور وہ بھی ایسی کہ جو کبھی دیکھی نہ سُنی۔

۷۔ تنِ مُو..... بال کی جڑ۔ دمِ ذکر..... بیان کرتے وقت۔ حمزہ کا قصہ ..... حضرت حمزہ کی کہانیاں خلاف واقعہ ہیں۔ دل پر کوئی اثر نہیں کرتیں۔ لوگ دلچسپی کے لئے سنتے ہیں ــــ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ قصۂ عشق لوگ باگ داستان امیر حمزہ کی طرح دلچسپی سے سنیں۔ اس کو سنکر تو روئیں روئیں سے خوناب ٹپکنا چاہیئے۔ اگر ایسا نہ ہو۔ تو پھر یہ سمجھ لو۔ کہ وہ داستانِ امیر حمزہ ہے عشق کا رونا نہیں۔

۹۔ دیدۂ بینا..... نگاہِ عارف۔ دجلہ..... مراد دریا ــــ نگاہِ عارف کو

قطرہ میں دریا اور جزو میں کل کا تماشہ نظر آتا ہے۔ دیدۂ بینا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ کہ اسے قطرے میں دریا اور جزو میں کل نہ دکھائی دے۔ مطلب یہ ہے کہ دیدۂ بینا کو لازمی طور پر جزو میں کل کا تماشہ نظر آتا ہے۔

۱۰۔ تھی خبر گرم..... زبان زدِ خاص و عام تھا۔ اڑیں گے پرزے... سخت سزا دی جائے گی۔ تماشہ نہ ہوا... یعنی سزا نہ دی گئی — یہ بات عام طور پر مشہور تھی۔ کہ آج غالب کو اتنی سزا دی جائے گی کہ اس کے پرزے اڑ جائیں گے چنانچہ ہم بھی یہ تماشہ دیکھنے کے لئے گئے لیکن یہ تماشہ نہ ہوا، یعنی غالب کو مار مار کر اُس کے پرزے نہ اُڑائے گئے۔ اس بیان سے مقصود یہ ہے۔ کہ ہماری رسوائی اور مصیبت کو لوگ تماشہ سمجھتے ہیں معشوق کا استغنا بھی دکھایا ہے۔ کہ پرزے اڑانے اور قتل کر دینے کا وعدہ کر کے بھول گیا بیخود لکھتے ہیں۔ کہ اس سزا سے امتحان عشق لینا منظور تھا۔ اور ایسا کرنے سے عاشق امتحانِ عشق میں بغیر امتحان دیئے کامیاب ہو گیا۔

اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں ۔ کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

۱۔ جنونِ جولاں..... وحشی آوارہ۔ پشت خار... وہ آلہ خارِ واز جس سے فقرا پشت کھجایا کرتے ہیں اور ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے ہیں — اسدؔ ہم ایسے وحشی اور بے سر و سامان فقیر ہیں۔ کہ ہمارے پاس پشت خار بھی نہیں ہے جو فقیروں کے پاس عام طور پر ہوا کرتا ہے۔ اس لئے ہم پشت خار کا کام سر پنجۂ مژگان آہو سے لیتے ہیں (۲) عالم وحشت میں ہم آہو سے بھی آگے نکل جاتے ہیں۔ چونکہ آہو ہمارے پیچھے ہوتا ہے اس لئے پنجۂ مژگان آہو ہمیں پشت خار کا کام دیتا ہے۔

حسرت پنجۂ مژگان کو پشتِ خار قرار دے کر اپنی نسبت وحشت کا اظہار کیا ہے اور بس۔

طباطبائی۔ اس راہ اور آہو کا تقابل تو ظاہر ہے۔ جنونِ جولاں ہونے سے یہ اشارہ کیا ہے۔ کہ آہو بھی میرے پیچھے رہ جاتا ہے۔ اور پشتِ خار سے پیچھے کھجانے ہیں مگر الفاظ پشتِ خار کی مناسبت کے لئے ہے بے سروپا کہنے سے یہ مقصود ہے۔ کہ پشتِ خار تک میرے پاس نہیں۔ اگر ہے تو مژگانِ آہو ہے پنجہ ہیں اور مژگان ہیں اور پشتِ خار ہیں وجہ تشبیہ ظاہر ہے۔ یعنی تینوں کی شکل ایک سی ہے۔ مژگان کو پہلے پنجے سے تشبیہ دی۔ پھر پنجہ کو پشتِ خار سے۔

۲۳۔ پئے نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا ۱ بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعوی پارسائی کا
نہ ہو حسنِ تماشا دوست رسوا بیوفائی کا ۲ بہ مہرِ صد نظر ثابت ہے دعوی پارسائی کا
زکوٰۃِ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا ۳ چراغِ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا
نہ مارا جان کر بیجرم قاتل تیری گردن پر ۴ رہا مانندِ خونِ بے گنہ حق آشنائی کا
تمنائے زباں محوِ سپاسِ بیزبانی ہے ۵ مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بیدست و پائی کا
وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے ۶ چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا
دہانِ ہر بتِ پیغارہ جو زنجیرِ رسوائی ۷ عدم تک بیوفا چرچا ہے تیری بیوفائی کا
نہ دے نامے کو اتنا طول غالبؔ مختصر لکھ دے
۸ کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستمہائے جدائی کا

۱۔ پئے نذرِ کرم ...... بخشش الٰہی کو نذر کر دینے کے لئے۔ شرمِ نارسائی ...... بارگاہِ خدا سے دور رہنے کی شرم۔ خوں غلطیدہ ...... خون شدہ۔ صد رنگ ...... سو طرح سے بخشش الٰہی کو نذر کرنے کے واسطے ہمارے پاس صرف

شرمِ نارسائی کا تحفہ ہے یعنی یہ تحفہ وہ دعویٰ پارسائی ہے جس کا سینکڑوں قسم کے گناہوں کے ہاتھوں خون ہو چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میری سو بار کی ٹوٹی ہوئی توبہ گو میری شرم نارسائی درگاہِ الٰہی میں عفو و معذرت کے لئے پیش کرتی ہے۔

سہا۔ رنگ کے معنی شوق کے بھی آتے ہیں۔ اس سے رندی و سیہ کاری بھی مراد ہو سکتی ہے۔

۲۔ حُسن تماشا دوست... نمائش پسند حُسن۔ رسوا بیوفائی کا.... بیوفائی کی وجہ سے بدنام۔ بہر صد نظر.... سو نظروں کی بہر سے محبوب کے نمائش پسند ہونے کی وجہ سے اس پر آوارگی اور بے وفائی کا الزام لگا کر اس کو بدنام نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اس کی تماشا دوستی سے اس کی پارسائی ثابت ہوتی ہے کیونکہ وہ سو نظریں جو اس پر پڑتی ہیں۔ وہ حقیقتاً سو مہریں ہیں جو اس کے دعویٰ پارسائی کی تصدیق کرتی ہیں۔ طباطبائی نے دوسرا پہلو طعن کا نکالا ہے لیکن اچھا معلوم نہیں ہوتا کہتے ہیں۔ تماشہ دوست ہو کر اور اغیار سے تاک جھانک کر کے پارسائی کی اور خیانت و بے وفائی کی بدنامی سے کہاں بچ سکتے ہو۔

بیخود۔ ہر جگہ اور ہر چیز میں دوست کے حُسن کا جلوہ ہے مگر پھر بھی وہ کہیں موجود نہیں کسی جگہ قیام نہیں کرتا۔ با ایں ہمہ اس پر بے وفائی کا الزام بھی عاید نہیں ہو سکتا۔ دیکھنے والوں کی سینکڑوں نگاہیں اس مضمون پر مہر ثبت کرتی ہیں کہ ہم اس کے چہرے سے کم بھی رسائی نہیں کر سکے اور یہ پارسائی کی جان ہے۔ پھر دعوے پارسائی میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔

۳۔ زکوٰۃ.... مال کا چالیسواں حصہ جو ہر سال خیرات کیا جاتا ہے۔ جلوہٗ بینش۔ محبوب، انہر آسا.... مانند آفتاب ـــــ اے محبوب تو اپنے حسن کی زکوٰۃ دے۔ تاکہ اس کی تابش سے فقیر (عاشق) کا کاسۂ گدائی ایسا چراغ بن جائے جو سورج کی طرح اس کے گھر کو روشن کر دے۔

بیخود اور طباطبائی۔ کاسۂ گدائی دل سے استعارہ ہے۔ یعنی اے جلوہ گاہِ بینش میرے کشکولِ دل کو زکوٰۃِ عرفان دے کر روشن کر دے۔ کہ اس فقیر کے لئے وہ چراغ ہو جائے۔ اور آفتاب کی طرح شبِ تارہ کی جہالت کو دن کر دے (سہا)

آسی۔ (۱) ہم خیال (۲) جلوہٗ بینش سے خیال ہوتا ہے۔ کاسۂ گدائی کا استعارہ آنکھوں سے ہے یعنی اے جلوہٗ بینش تو اپنا جلوہ دکھا کر میری آنکھوں کو روشن کر دے۔ خانہ استعارہ ہے دل سے یعنی تو، اگر تیرا جلوہ آنکھوں میں سما جائے۔ تو میرا دل اس نور سے منور ہو جائے۔ حسرت بھی جلوہٗ دیدار سے چشمِ مشتاق کو روشن کرنا مراد لیتے ہیں۔

۴۔ حالی ــ "تو نے ایک مشتاق قتل کو بے جرم سمجھ کر اس لئے قتل نہیں کیا کہ خونِ بے گناہ اپنی گردن پر نہ لے۔ مگر اس صورت میں تیری گردن پر یہ جائے خونِ بے گناہ کے حق آشنائی رہ گیا۔ گویا حقِ آشنائی یہ تھا کہ تو مجھ کو قتل کر ڈالتا۔"

۵۔ بیاں.... تشکر بے دست و پائی.... مجبوری یعنی بے زبانی ـــ زبان، ہے زبانی کے شکریہ میں محو ہے۔ کہ اس کی بدولت بے دست و پائی کے شکوہ کا تقاضا مٹ گیا۔ مطلب یہ ہے زبان کی تمنا تھی کہ بیدستِ پائی کی شکایت کی جائے لیکن بے زبانی کی وجہ سے یہ شکایت نہ کر سکی۔

اس لئے زبان بے زبانی کا شکریہ ادا کر رہی ہے۔ کہ شکوۂ بے دست و پائی سے اس کی جان بچ گئی۔

حسرتؔ۔ زبان کی تمنا متقاضی تھی کہ بے دست و پائی کی شکایت کی جائے۔ لیکن چونکہ مجھ کو بے زبان دیکھ کر ان کو خود بخود رحم آگیا۔ اس لئے تمنائے زبان بے زبانی کا شکریہ ادا کر رہی ہے کیونکہ بے زبانی ہی کے سبب سے شکوۂ بیدست و پائی کی ضرورت باقی نہ رہی۔ اور ان کو عرض حال و شکایت کے بغیر ہی رحم آگیا (سعیؔ نے دوسرا مفہوم یہی لکھا ہے)

بیخودؔ۔ میری تمنا یہ تھی کہ میں تجھ سے ایسی زبان مانگوں جس کی مدد سے تیری درگاہ میں عرض حال کرسکوں۔ مگر اس درخواست سے پہلے میری زبانِ محو سپاس بے زبانی ہو گئی یعنی مجھ کو وہ خاص زبان نہ ملنے کا یہ فائدہ پہنچا کہ میں تیری بارگاہ میں شکوۂ بے دست و پائی (بے سرو سامانی) پیش نہ کرسکا۔ اور اس سے یہ فائدہ ہوا۔ کہ مجھ کو بجائے زبان شکایت کے درجۂ تسلیم عطا ہو گیا۔

۶۔ نفس ..... سانس۔ نگہت گل .... خوشبو سے معطر ہوا۔ چمن کا جلوہ ...... فصلِ بہاری۔ رنگین نوائی .... خوش الحانی .... میرے نفس اور نگہت گل میں کوئی خاص فرق نہیں۔ کیونکہ ان دونوں کی علت جلوۂ گل۔ (فصل بہاری) ہے یعنی ادھر بہار آئی اور نگہت گل اڑنی شروع ہوئی اور ادھر میری رنگین نوائی شروع ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ نفس نگہت گل سے کم نہیں ہے۔

۷۔ بیغارِ نا جو .... طعنہ زن۔ زنجیر رسوائی .... بہت زیادہ بدنامی، بہت زیادہ بدنامی۔ دہن کی شکل حلقۂ زنجیر کی سی ہوتی ہے اس لئے بہت سے دہن مل کر ایک

زنجیر بن گئی۔ معشوق کے دہن کو شعرا عدم کہتے ہیں۔ لہٰذا دہنِ معشوق پر بیوفائی کا ذکر آنے سے بیوفائی کا چرچا عدم تک پہنچا ـــــ اے بیوفا تیری بیوفائی کا ذکر ہر طعنہ زن معشوق کے منہ پر ہے۔ اور اس طرح سے طعنہ زن معشوقوں کے دہنوں کے حلقوں سے ایک رسوائی کی زنجیر بن گئی ہے۔ اور چونکہ دہنِ معشوق عدم ہے۔ اس لئے یہ سلسلۂ رسوائی عدم تک جا پہنچا ہے۔ یعنی تو اس بیوفائی کی وجہ سے نہ صرف معشوقوں میں بدنام ہے بلکہ تیری رسوائی بہت دور تک پہنچی ہے۔

۸۔ اے غالبؔ تو اپنے خط کو زیادہ طول نہ دے۔ فقط اتنا مختصر کر کے لکھ دے کہ میں تیرے سامنے ستم ہائے جدائی بیان کرنے کی حسرت اپنے دل میں رکھتا ہوں مختصر لکھنے سے خود بخود ظاہر ہو جائے گا۔ کہ ستم ہائے جدائی اتنے زیادہ ہیں کہ میں ان کو ضبطِ تحریر میں نہیں لا سکتا

۴۴۔ گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائیگا ۱ بے تکلف داغِ مہ مہرِ دہاں ہو جائے گا
زہرہ گر ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہے آب ۲ پرتوِ مہتاب سیلِ خانماں ہو جائے گا
لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر ۳ ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا
دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا ۴ یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائے گا
سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا ۵ مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا
گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط ۶ شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائیگا
باغ میں مجھ کو نہ لیجا ورنہ میرے حال پر ۷ ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائیگا
وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو ۸ اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا

فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسدؔ

دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائے گا

۱۔ اندوہ...... رنج و غم۔ داغِ ماہ...... چاند کا داغ۔ مہرِ دہاں...... مہرِ خاموشی۔

داغ کی مشابہت مہر سے ظاہر ہے ——— اگر شب ہجر کا غم جدائی میں بیان نہ کروں
تو سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ چاند کا داغ میرے دہن کے لئے مہر خموشی بن گیا تھا۔

بیخود۔ مہر، ہاں ہو جائے گا یعنی جس طرح چاند کے داغ کو سارا زمانہ دیکھتا
ہے۔ اسی طرح تمہاری جدائی کی تکلیفوں کا حال لوگوں پر کھل جائے گا گویا میری خموشی
زبان بن کر افشائے راز محبت کرے گی۔ اور پھر تم بدنام ہو جاؤ گے۔ اس سے بہتر یہ ہے
کہ تم میری مصیبت کا حال سن لو۔ تاکہ غم دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ اور راز چھپا رہے

۲۔ زہرہ آب ہونا۔۔۔ پتہ پانی ہونا، بہت زیادہ دہشت و غم۔ پر تو مہتاب
۔۔۔۔ چاندنی سیل۔۔۔۔ طوفانِ آب۔ خانماں۔۔۔ گھر ——— اگر شبِ جدائی کی
دہشت سے پتہ پانی ہوتا ہے۔ تو کیا تعجب ہے۔ کہ چاندنی کا پتہ بھی پانی ہو جائے
اور وہ میرے گھر کے لئے سیلاب بن جائے۔ مطلب یہ ہے کہ چاندنی جس کا منظر
لطف پیدا کرتا ہے۔ شب ہجر میں میری بربادی کا موجب بن جائے گی۔

۳۔ محبوب بے خبر پڑا سو رہا ہے۔ اس وقت میں اس کے پاؤں کا بوسہ
بہت آسانی سے لے سکتا ہوں۔ لیکن یہ خیال مانع ہے کہ کہیں جاگ اٹھا
تو وہ کافر مجھ سے بدگمان ہو جائے گا۔ اور یہ سمجھنے لگے گا کہ میری محبت بے لوث
نہیں ہے۔ حسرت نے "سوتے میں" سے یہ مفہوم پیدا کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔ اگر
میرے خواب میں آئے۔ اور میں اس کے پاؤں کا بوسہ لے لوں تو وہ بدگمان
ہو کر خواب میں بھی آنا چھوڑ دے گا۔

۴۔ صرف وفا۔۔۔۔ جو وفاداری کی تمام مہمات کے لئے کافی ہو۔ نذرِ امتحان
ہو جائے گا۔ یعنی امتحان ہی میں ختم ہو جائے گا ——— ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ ہمارا
دل تمام عمر کی عشق بازی اور وفاداری کے لئے کافی ہوگا لیکن یہ معلوم نہ تھا
کہ صرف پہلے امتحان کے دوران ہی میں اس کا خاتمہ ہو جائیگا۔

۵ - دل میں جگہ ہونا۔۔۔۔ محبت کرنا ـــــ چونکہ تجھ کو سبھی پیار کرتے ہیں اور ہر شخص کے دل میں تیری قدر ہے - اس لئے اگر تو مجھ سے خوش ہو جائے گا تو تیری محبت کی بدولت کل زمانہ مجھ پر مہربان ہو جائے گا۔ شاید معشوق کو خدا مان کر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ خدا مہربان تو سب مہربان۔

۶ - نگاہِ گرم۔۔۔۔ نظرِ عتاب - خس۔۔۔۔ تنکا ـــــ اگر تیری نظرِ عتاب اسی طرح مجھ کو ضبطِ محبت کی تعلیم دیتی رہی تو تیری نظرِ عتاب کے خوف سے خون رگوں کے اندر اس طرح پوشیدہ ہو جائیگا جس طرح شعلہ خس میں نہاں ہو جاتا ہے یعنی مطلب یہ ہے - کہ جب ضبط کی وجہ سے خوں فشانی نہ ہو سکے گی۔ تو آخر کار آتشِ عتاب کی گرمی سے رگوں میں خون خشک ہو جائے گا۔ یا جل جائے گا۔

۷ - حال۔۔۔۔ حال زار - گلِ تر اور چشمِ خوں فشاں میں بوجہ رنگ تری حسین مشابہت ہے ـــــ میرا حال ایسا خراب ہے - کہ ہر ایک کو میرے حالِ زار پر رونا آتا ہے - اس لئے تو مجھ کو باغ میں نہ لے جا۔ اگر تو مجھ کو چمن میں لے جائے گا۔ تو میری حالت زار کو دیکھ کر گلوں کی آنکھوں سے خون کے آنسو ٹپکنے لگیں گے - اور اس طرح سے سیرِ باغ سے تجھ کو بجائے فرحت کے حزن و ملال ہو گا۔

۸ - میں امید پر جی رہا ہوں۔ اور تیرے ظلم برداشت کر رہا ہوں کہ قیامت کے دن میرا اور تیرا انصاف ہو جائے گا۔ اور مجھے میری مظلومی کی داد مل جائیگی اگر روزِ حشر بھی میرے ساتھ انصاف نہ ہو۔ تو بہت افسوس ہے۔

۹ - اے اسد تو عقلمند ہے - ذرا سوچ تو سہی تجھے نادان کی دوستی سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے مثل مشہور ہے "نادان کی دوستی اور جی کا زیاں" یہ خود لکھتے ہیں

کہ اس طریقے سے دل کو فریب دے کر عشق سے باز رکھنا چاہتے ہیں اور یہ بات اختیار سے باہر ہے کہ عاشق جان کے خوف سے عشق کو ترک کر دے۔

۲۵- درد منت کش دوا نہ ہوا ۱ میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو ۲ اک تماشہ ہوا گلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں ۳ تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب ۴ گالیاں کھا کے بدمزا نہ ہوا
ہے خبر گرم ان کے آنے کی ۵ آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی ۶ بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی ۷ حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
زخم گر دب گیا۔ لہو نہ تھما ۸ کام گر رک گیا روا نہ ہوا
رہزنی ہے کہ دلستانی ہے ۹ لے کے دل دلستاں روانہ ہوا
کچھ تو پڑھیئے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالب غزل سرا نہ ہوا

۱- منت کش.... احسان مند- ممنون- اچھا نہ ہوا.... صحت یاب ہوا
برا نہ ہوا.... اچھا ہوا — اگر میں دوا سے صحت یاب نہ ہوا- تو کوئی حرج کی بات نہیں- بلکہ یہ اچھا ہی ہوا- کیونکہ میرا درد دوا کے احسان سے بچ گیا۔ مطلب یہ ہے کہ میرے غیور درد کو دوا کا احسان لینا منظور نہیں۔

۲- قاعدہ ہے کہ چار آدمیوں کو جمع کر کے جھگڑا چکایا کرتے ہیں تاکہ وہ انصاف کریں۔ لیکن شاعر کو رشک اجازت نہیں دیتا- کہ اور لوگ عاشق و معشوق کی گارینہ باں سنیں- اس لئے معشوق سے کہتا ہے- تم گلہ کرنے کے لئے رقیبوں کو کیوں جمع کرتے ہو- یہ گلہ ہے یا تماشہ- آگے- گلہ مند عاشق کو

قرار دے کر کہتے ہیں۔ کہ گلہ کرتا ہوں۔ الخ

۳۔ جب تم ہی نے ہم کو قتل کر کے ہماری آرزوئے قتل پوری نہ کی۔ تو پھر ہم اپنے مقدر کو آزمانے کے لئے اور کہاں جائیں۔ یعنی یہ آرزو کہیں اور پوری نہیں ہو سکتی۔

۴۔ تمہارے لبوں میں کتنی شیرینی ہے۔ کہ رقیب کو تم نے گالیاں دیں۔ گالیاں تلخ ہوتی ہیں۔ لیکن چونکہ وہ تمہارے لبوں سے نکلیں۔ اس لئے وہ بھی شیریں ہو گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ رقیب باوجود اس کے کہ لذتِ عشق سے محروم تھا۔ لیکن پھر بھی وہ تمہاری گالیاں سن کر ناراض (بے مزہ) نہ ہوا۔ کھانا۔ مزہ۔ شیریں مناسب الفاظ ہیں۔

۵۔ آج ان کے تشریف لانے کی خبر مشہور ہے۔ لیکن ہماری بے سروسامانی کی یہ حالت ہے۔ کہ آج ہمارے گھر میں بوریا بھی نہیں جو اس پر ان کو بٹھا سکتے۔ ایک طرف ان کے آنے کی خوشی ہے اور دوسری طرف بے سروسامانی کا یہ عالم ہے۔ طبا طبائی مضمون کو سست کہتے ہیں آسی رکیک کہہ کر حسنِ بیان کی تعریف کرتے ہیں۔

۶۔ حالی۔ میری بندگی کیا نمرود کی خدائی تھی۔ کہ اس سے مجھ کو سوائے نقصان کے کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ یہاں بندگی سے مراد عبادت نہیں بلکہ عبودیت ہے بندگی پر نمرود کی خدائی کا اطلاق کرنا بالکل نئی بات ہے۔ طبا طبائی کہتے ہیں کہ غرورِ حسن کی طرف اشارہ ہے۔

بیہاؤ آسی۔ خدا جس کی میں نے عبادت کی۔ کیا وہ نمرود تھا اور کیا اس کی خدائی نمرود کی خدائی تھی کہ میرا بھلا نہ ہوا۔

۷۔ حق۔۔۔۔۔ (۱) سچ (۲) فرض ـــــ اگر ہم نے راہِ حق میں جان دی تو کون سا

کمال کیا۔ کیونکہ جان اسی کی دی ہوئی تھی۔ ہمارے پاس تو فقط ایک امانت تھی ہم نے واپس کر دی۔ امانت کے واپس کرنے میں کون سا احسان یا ایثار ہے۔ اس لئے سچ بات تو یہ ہے۔ کہ ہم فرض حق ادا نہیں کر سکے۔ یعنی جان دینا کوئی بڑی بات نہیں بلکہ انسان پر اور بہت سے فرض ہیں جن کو ادا کرنا واجب ہے۔

۸۔ ہمارا زخم جب باندھ دیا گیا تو پھر بھی لہو جاری رہا۔ حالانکہ زخم کو دبا دینے سے لہو تھم جانا چاہیئے تھا۔ اور اس کے برخلاف اگر ہمارا کام رک گیا تو پھر چل نہ سکا۔ حالانکہ اس قاعدے کے مطابق ہونا یہ چاہیئے تھا کہ جس طرح کام رک جانے پر روا نہیں ہوتا۔ اسی طرح زخم کے دب جانے سے لہو بھی رواں نہ ہوتا۔ ظاہر یہ کرنا چاہتے ہیں کہ جو بات میرے حق میں مفید ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ الٹی پیش آتی ہے۔ اپنی بدنصیبی اور تقدیر کی دگرگونی کا اظہار کیا ہے۔

۹۔ رہزنی.... راستے میں لوٹنا۔ دلستانی.... دل لینا۔ انہوں نے راہ چلتے میرا دل چھین لیا۔ بتلایئے کہ یہ طرز رہزنی ہے یا انداز دلستانی یعنی قاعدہ یہ چاہتا تھا کہ دل لینے کے لئے وہ انداز و ناز دکھاتے لیکن وہ تو رہزنوں کی طرح لوٹ کر چلتے ہوئے اب ڈھونڈتے پھریئے کہ کون تھا اور کہاں گیا۔؟

آسی و طبا طبائی: قافیہ معمولہ کے عیب نے شعر کو بھدا کر دیا ہے بیخود کہتے ہیں۔ قافیہ نئے اور لطف پیدا کر دیا ہے۔

۱۰۔ بیخود کا بیان ہے۔ کہ قلعہ میں کسی شہزادہ کے مکان پر مشاعرہ ہوا تھا غالب نے طرح میں غزل نہ لکھی تھی جب اصرار و مبالغہ کی حد تک پہنچ گیا۔ تو یہ غیر طرح غزل پڑھ دی مقطع پہلے سے اس مضمون کا کہہ لیا تھا۔ جیسا کہ مقطع کے مضمون سے ظاہر ہے۔ واللہ اعلم۔

۲۶ گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا ۱ گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا
یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب ۲ مگر ستم زدہ ہوں، ذوقِ خامہ فرسا کا
حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی ۳ دوام کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا
غمِ فراق میں تکلیف سیرِ باغ نہ دو ۴ مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا
ہنوز محرمیٔ حسن کو ترستا ہوں ۵ کرے ہے ہر بنِ مو کام چشمِ بینا کا
دل اس کو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے ۶ ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا
نہ کہہ کہ گریہ بمقدارِ حسرتِ دل ہے ۷ مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اس کو یاد اسدؔ
۹
جفا میں اس کی ہے انداز کارفرما کا

۱۔ اضطراب شوق اسقدر زیادہ ہے کہ وہ دل میں بھی نہیں سما سکتا۔ حالانکہ دل میں اسقدر وسعت ہے کہ اس میں دونوں جہاں بہت آسانی سے سما سکتے ہیں کہتے ہیں کہ اسقدر فراخی اور وسعت کے باوجود شوق کو تنگدلی کی شکایت ہے اور یہ شکایت بجا معلوم ہوتی ہے کیونکہ اضطراب شوق کو ضرورت کے مطابق جگہ نہ ملنے سے اس کا جوش اضطراب ٹھنڈا پڑ گیا۔ گویا دریا کا اضطراب موتی میں سما گیا۔ اصل میں موتی کی آب کو دیکھ کر شاعر کا دماغ اس باریک خیال کی طرف متوجہ ہوا۔ اور اس نے گوہر کو دل اور اضطراب شوق کو اضطراب دریا سے تشبیہہ دیکر یہ لطیف معنی پیدا کئے۔

۲۔ پاسخ مکتوب ... خط کا جواب۔ ستم زدہ ... مجبور۔ ذوق خامہ فرسا ... لکھنے کا شوق ــــ یہ بات تو میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تو میرے خط کا جواب ہرگز نہ دے گا۔ لیکن میں کیا کروں کہ خامہ فرسائی کا شوق مجھے مجبور کرتا ہے اس لئے میں تجھے برابر خط لکھے جاتا ہوں۔ گویا ذوق خامہ فرسا کا ستم زدہ ہوں۔ و ستم زدہ قابل رحم ہوتا ہے اس لئے تو

نا راض نہ ہو

۳۔ حنائے پائے خزاں ..... خزاں کے پاؤں کی مہندی۔ بہار کو بوجہ رنگینی کہا ہے۔ دوام .... ہمیشہ۔ کلفتِ خاطر .... ملالِ دل ـــ اگر بہار کچھ چیز ہے۔ تو سمجھ لیجئے۔ کہ وہ خزاں کے پاؤں کی حنا ہے۔ ہمارا روزانہ کا مشاہدہ ہے۔ کہ حنا کی رنگینی اور دلفریبی چند روز میں زائل ہو جاتی ہے اور پھر خزاں ہی کا دور دورہ رہتا ہے۔ اس طرح سے دنیا کا عیش بھی عارضی اور ناپائیدار ہے اور ہمیشہ اس کا انجام کلفتِ خاطر اور رنجِ دل کا باعث ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں عیش و نشاط کا زمانہ قلیل اور مصیبت کا عرصہ طویل ہوتا ہے۔

۴۔ دماغ نہیں .... پسند نہیں۔ خندہ ہائے بیجا .... خندۂ گل کو خندہ بیجا کہنے کی یہ وجہ ہے۔ کہ کچھ سمجھ کر یا ازراہِ تعجب نہیں ہنستا۔ اس لئے اس کا خندہ بے محل اور بے جا ہے ـــ میں غمِ فراق میں مبتلا ہوں۔ اس لئے مجھ کو سیرِ باغ کے لئے مجبور نہ کرو۔ حالتِ رنج و غم میں مجھے پھولوں کی بیجا ہنسی پسند نہیں گویا میں گلوں کے خندہ ہائے بیجا کی تاب نہیں لا سکتا۔

۵ محرومی .... رازداری۔ بنِ مو .... بال کی جڑ ـــ اگرچہ میرے ہر ایک رونگٹے کی جڑ چشمِ بینا کا کام کر رہی ہے۔ لیکن پھر بھی میں حسنِ ازلی کے دیدار سے محروم ہوں۔ مطلب یہ ہے۔ کہ باوجود ہمہ تن چشمِ شوق اور چشمِ بینا بن جانے کے میں حقیقت کے راز سے واقف نہیں ہو سکا۔

طباطبائی لکھتے ہیں۔ ہر بنِ مو کو چشمِ بینا کہنے کی وجہ یہ ہے جب ہر شے آئینۂ ظہورِ قدرت وصنعت ہے تو اس میں بنِ مو بھی داخل ہے یعنی ہر بنِ مو اس طرح حکمت و صنعت کو دکھا رہی ہے جس طرح کوئی آنکھ سے دیکھ لیتا ہے۔

۶۔ دماغ کہاں .... برداشت یا تاب نہیں۔ قافیہ کی مجبوری سے "تقاضا کا" باندھ

دیا ہے ورنہ تقاضے کا فصیح اور درست ہے ـــــ پیشتر اس کے کہ وہ ناز و انداز دکھاتے۔ اور اس طریقے سے دل مانگنے کا تقاضا کرتے۔ ہم نے اپنا دل پہلے ہی انکو دے دیا۔ اور تقاضے کی نوبت نہ آنے دی۔ کیونکہ ہمیں حُسن کے تقاضے کی تاب نہیں (بیخود، طباطبائی)

آسی: مصنف کا مطلب یہ ہے کہ اداو ناز حُسن کو ہم دل نہ دیتے تو حسن ہم سے دل لینے کا تقاضا کرتا۔ مگر ہم نے اُسے گوارہ نہ کیا۔ اور تقاضے کی نوبت نہ آنے دی (سعید)

۷. یہ نہ سمجھو کہ میرا رونا میری حسرتِ دل کے برابر ہے۔ بلکہ میری حسرتِ دل میرے گریہ سے بہت زیادہ ہے۔ اس لئے کثرتِ اشک۔ فشانی سے اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ میری آنکھوں سے دریائے اشک جاری ہے لیکن وہ بھی میری حسرتِ دل کے برابر نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حسرتِ دل زیادہ ہے۔ اور مقدار گریہ سے اس کا اندازہ ممکن نہیں۔ بیخود نے معشوق کو اور آسی نے ہمدم کو منادی قرار دیا ہے۔

آسی (۱) ہم خیال (۲) میں اس قدر رو چکا ہوں کہ اتنی مجھے حسرت بھی نہ تھی (۳) میری حسرت اتنی گراں پایہ نہ تھی۔ جتنا مجھے رونا پڑا۔

۸۔ اس کو۔۔۔ معشوق کو۔ اس کی۔۔۔۔ فلک کی۔ کارفرما۔۔۔ معشوق ستم شعار جب میں مظلومی کی حالت میں آسمان کو دیکھتا ہوں۔ تو مجھ کو اپنا معشوق یاد آجاتا ہے۔ کیونکہ فلک کی جفا کاری میں مجھے اپنے معشوق کی کارفرمائی کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ معشوق ہی بانی جور و جفا ہے اور آسی نے فلک کو جفاکاری کا حکم دیا ہے۔ (آسی)

بیخود۔ فلک کو دیکھ کر خدا یاد آجاتا ہے۔ اس لئے آسمان جس قدر ظلم و ستم

مجھ پر کرتا ہے۔ وہ سب اسی کے حکم سے ہیں۔ بغیر حکم الٰہی کے آسمان کچھ نہیں کر سکتا
سعید ــــ ظلم فلک کو دیکھ کر مجھ کو اپنا معشوق یاد آتا ہے۔ کیونکہ وہ بھی ایسا ہی ظالم ہے۔

۲۷۔ قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا ۱ خطِ جام مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا
اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا ۲ غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

۱۔ غالب۔ خیال تو دقیق نظم کیا گیا ہے لیکن لطف بادہ نہیں قطرہ جو ٹپکنے میں بے اختیار ہے از فرطِ حیرت سے ٹپکنا بھول گیا۔ برابر بوندیں تھم کر رہ گئیں۔ تو پیالے کا خط اس تاگے کی صورت بن گیا جس میں موتی پرو دئے گئے ہوں۔ سعید دہیخود۔ طباطبائی لکھتے ہیں۔ حیرت کی شگرف کاری کا اظہار مقصود ہے لیکن یہ حیرت حسن ساقی کو دیکھ کر پیدا ہوتی ہے۔ مضمون مصنف کے ذہن میں رہ گیا۔

حسرت۔ جب ساغر نے لب یار سے ملا تو قطرہ ہائے مے بفرط حیرت منجمد ہو کر گویا گوہر بن گئے۔ اور خطِ جام رشتۂ گوہر کے مانند ہو گیا۔

آسی۔ قطرۂ مے کا کام حیران کرنا ہے۔ اور وہ حیرت نفس پرور اور روح پرور ہے۔ خطِ جام نے گویا اس کی روح پروری نے گوشتہ گوہر بنا دیا ہے۔ اس سے فقط مدح شراب مقصود ہے۔

۲۔ ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ سوائے میرے کوئی اور آہ و نالہ نہیں کرتا۔ گویا ان کو میرے عشق کا اعتبار ہو گیا ہے لیکن یہی اعتبار میری تباہی کا باعث ہے۔ وہ اس طرح سے کہ اگر کبھی رقیب آہ و فریاد کرتا ہے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ میرا ہی کام ہے۔ اس لئے وہ مجھ پر خفا ہوتا ہے۔ طباطبائی بیخود۔ سعید میرے ہم خیال ہیں۔ مگر خانہ خرابی کی مزید تشریح یہ لکھتے ہیں خانہ خرابی

یا تو اس لئے کہ کوئی کرے اور کوئی بھرے۔ یا اس لئے کہ رقیب سمجھا۔ کہ معشوق مجھ سے ناراض ہے۔ اور اس سے خوش۔ آسی (۱) ہم خیال (۲) چونکہ اسے میرے عشق کا اعتبار ہو گیا ہے۔ اس وجہ سے وہ غیر کی ہر تکلیف کو میرے عشق کا نتیجہ سمجھتا ہے۔ اور مجھ پر خفا ہوتا ہے۔ میرے اعتبارِ عشق سے غیر کو تکلیف پہنچنے کی متعدد وجوہ ہو سکتی ہیں۔ مثلاً غیر مجھ کو اپنا حریف سمجھ کر تکلیف اٹھاتا ہے۔ یا میرا عشق صادق اپنا حریف دیکھنا نہیں چاہتا۔ اس لئے غیر کو تکلیف پہنچاتا ہے۔ اور ماسوائے معشوق سب کو فنا کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے یہ مفہوم تاویلی ہے اور اصل مقصد سے بہت دور پہنچ گیا ہے۔

۲۸ جب بتقریبِ سفر یار نے محمل باندھا ۱ تپشِ شوق نے ہر ذرہ پہ اک دل باندھا

اہلِ بینش نے بحیرت کدہ شوخیٔ ناز ۲ جوہرِ آئینہ کو طوطیِ بسمل باندھا

یاس و امید نے یک عربدہ میداں مانگا ۳ عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا

نہ بندھے تشنگیٔ ذوق کے مضموں غالبؔ

۴ گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

۱۔ محمل .... اونٹ کا کجاوہ ــــ جب میری محبوبہ نے سفر کرنے کے لئے محمل تیار کی تو میری تپشِ شوق نے ریت کے ہر ذرے پر ایک دل باندھ دیا۔ تاکہ محمل یار میرے دل پر قدم رکھتی ہوئی جائے۔ ذرہ کی تابش سے فائدہ اٹھا کر اس کو دلِ مضطرب قرار دیا ہے اور یار کے وقتِ سفر اپنے دل کی بے چینی دکھائی ہے۔ بیخود میرے ہم خیال ہیں۔ فرید نشتر نخ غور طلب ہے لکھتے ہیں ہمارا شوق ہمیں اس کے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ اس بیقراری کی حالت میں سواری کے چلنے میں جو ذرات گرد و غبار کی صورت میں بلند ہوتے

تھے۔ ہم سمجھتے تھے۔ کہ ہر ذرہ پر ایک دل باندھا ہوا ہے۔ ورنہ ذرہ میں یہ تڑپ کہاں؟

آ سی۔ جب یار نے سفر کے لئے محمل باندھا تو میرا دل نہایت بیقرار ہوا۔ اور محمل کے ہر ذرہ یا عام ذرہ ذرہ پر شوق نے ایک دل باندھ دیا اور محمل کے ساتھ بھیج دیا یعنی ذرات محمل میرے دل تپاں تھے۔ ذرہ کی چمک اور دل کی تپش کا عالم یکساں ہے مطلب یہ ہے۔ کہ اس کے محمل کے ساتھ دل تپاں بھی رخصت ہوا۔

۲۔ اہل بینش۔۔۔۔ اہل نظر، دیکھنے والے حیرت کدہ۔۔۔ مراد آئینہ عکس یار کی وجہ سے آئینہ کو حیرت کدہ کہا ہے۔ جوہر آئینہ۔۔۔ فولادی آئینہ کے جوہر سبز ہوتے ہیں۔ اور پہلو کی طرف سے دیکھنے میں جوہر سبز متحرک معلوم ہوتے ہیں۔ شوخی ناز کی وجہ سے اسے طوطی بسمل سے مشابہ کیا ہے ۔۔ اہل نظر نے فولادی آئینہ کے سبز متحرک جوہر کو طوطی بسمل قرار دیا ہے جو کہ معشوق کی شوخی ناز کو دیکھ کر تڑپ رہی ہے گویا فولادی آئینہ ایک حیرت کدہ ہے جہاں یار کی شوخی ناز سے اس کے سبز جوہر طوطی بسمل کی مانند تڑپ رہے ہیں۔ بقول حسرت اس میں نازک اشارہ یہ ہے کہ ناز یار کی شوخی ارباب شوق کی حیرت کو اضطراب سے بدل دیا کرتی ہے۔

۳۔ عربدہ میدان۔۔۔۔ میدان جنگ۔ میدان مانگنا۔۔۔ جنگ کرنا۔ عجز ہمت۔ پست ہمتی۔ دل سائل کو ایک طلسم اور میدان عربدہ کو یاس و امید قرار دیا ہے۔ اور اس طلسم کو پست ہمتی کا بانی ۔۔۔ میری پست ہمتی نے میرے دل کو ایک میدان طلسم بنا رکھا ہے جس میں یاس و امید میں جنگ ہو رہی ہے۔ اور یہ دونوں ایک دوسرے پر غالب آنا چاہتی ہیں۔ مطلب یہ

ہے کہ پست ہمتی امید و بیم کی جنگ میں مبتلا کر دیتی ہے۔ آسی یہی معنی لکھ کر کہتے ہیں سوال کرنا بہت بُرا ہے اور یہ پست ہمتوں کا کام ہے جس سے دل طلسم امید و بیم بن جاتا ہے۔ باقی شارحین متفق ہیں۔

۴۔ ذوق سے مراد ذوقِ سخن۔ ساحل...... ساحل کی تشنگی مشہور ہے وہ دریا سے ہم آغوشی کے باوجود پیاسا اور خشک رہتا ہے۔ دل کھول کر...... مبالغہ سے۔ اچھی طرح ـــــ اے غالب ہم نے اتنا مبالغہ کیا۔ کہ دریا کو بھی ساحل بنا دیا لیکن میرے ذوقِ سخن کی تشنگی ملاحظہ ہو کہ پھر بھی ذوقِ سخن کی تشنگی کا مضمون ادا نہ ہو سکا۔

۲۶۔ میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں ؛ گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا
ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں ۲ وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا
درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں
۳ جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا۔

۱۔ تشنہ کام...... پیاسا۔ محروم ـــ بڑے تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ مجھ جیسا میخوار بزمِ مے نوشی سے بغیر پیئے چلا آئے۔ فرض کیا کہ میں نے مے نوشی سے توبہ کر لی تھی۔ اس لئے میں نے شراب نہ مانگی لیکن سوال یہ ہے۔ کہ ساقی کو کیا ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے زبردستی نہ پلائی۔ شراب خوروں کا قاعدہ ہے کہ وہ زبردستی دوسروں کو پلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن وہاں ایسا نہ ہوا۔ اس لئے اس واقعہ کو یا تو بدقسمتی سمجھئے یا ساقی کی ناراضگی اور بے توجہی کا نتیجہ۔

۲۔ تیر...... تیرِ نظر ـــــ وہ زمانہ گیا۔ جب دل اپنی جگہ پر آرام سے تھا۔ اور جگر اپنے مقام پر۔ اب تو ان کے ایک تیرِ نظر نے دونوں کو چھید کر زخمی کر دیا ہے

۳- درماندگی ..... مصیبت۔ رشتہ۔ تاگہ۔ درماندگی کو گرہ اور تدبیر کو ناخن گرہ کشا سے استعارہ کیا ہے .... جب ہم مشکلات اور مصائب کے پھندوں میں پھنسے ہوئے نہ تھے۔ تو اس وقت ہم میں ان پھندوں کو کھولنے اور مصائب کو دور کرنے کی ہمت اور تدبیر سوچنے کی قوت موجود تھی لیکن اب وہ بات نہیں رہی۔ اب ہم مصائب میں مبتلا ہیں۔ ایسی حالت میں کچھ بن پڑے۔ اور مشکلات کا دفیعہ ہو سکے تو بات ہے قاعدہ ہے۔ جب انسان مصیبتوں میں پھنس جاتا ہے۔ تو اس کی عقل کچھ کام نہیں کرتی۔

۴- گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا ۱ بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا
تنگیٔ دل کا گلہ کیا، یہ وہ کافر دل ہے ۲ کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

بعد یک عمر ورع بار تو دیتا بارے
کاش رضواں ہی در یار کا درباں ہوتا

۱- ہمارا گھر کثرت گریہ سے دریا برد ہو گیا ہے۔ خیال یہ ہے کہ اگر ہم نہ روتے تو ہمارا گھر برباد نہ ہوتا۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے اگر دریا نہ ہوتا تو اس کی جگہ بیابان ہوتا۔ گویا ہمارا گھر رونے سے ویران نہ ہوتا۔ تو پھر کوئی اور آفت آتی۔ غرض ویرانی کسی صورت نہ جاتی اور بدنصیبی کسی طرح ضرور ظاہر ہوتی۔ (جملہ شارحین متفق)

آسی۔ لوگ کہتے ہیں۔ ہمارا گھر رونے سے ویران ہو گیا۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ یہ گھر جہاں اب دریا ہے۔ اگر یہاں دریا نہ ہوتا تو بیابان ہوتا۔ غرض ویران ضرور رہتا (معنی وہی ہیں۔ جو میں نے لکھے ہیں۔

۲- میں اپنی تنگیٔ دل کی کیا شکایت کروں۔ یہ کم بخت دل ایسا برا واقع ہوا

ہے کہ ہر صورت میں اس کا مصیبتوں میں مبتلا رہنا لازمی ہے اگر یہ تنگ (مبتلائے مصائب) نہ ہوتا۔ تو پھر پریشان ہوتا یعنی اس کی داشتگی پریشانی کے درجہ کو پہنچ جاتی۔ اس لئے اس کی تنگی اور پریشانی ہمارے لئے برابر ہے۔

۴۔ ورع... پرہیزگاری۔ بار... جگہ، اجازت داخلہ۔ رضوان... بہشت کا دربان — ہم نے تمام عمر محبوب کی پرستش میں بسر کردی لیکن اس کا دربان اس قدر سخت گیر ہے کہ وہ پھر بھی ہم کو یار کے مکان میں جانے کی اجازت نہیں دیتا کاش کہ اس کا دربان رضوان ہوتا۔ جو ایک عمر عبادت میں گزارنے کے بعد بہشت میں تو داخل ہونے دیتا۔ مطلب یہ ہے کہ رضوان حسب عادت ہماری پرستش کا خیال کر کے ہم کو ضرور اندر آنے دیتا۔ اور اس طرح سختی سے ہم کو رد نہ کرتا۔

۳۱۔ نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ۱ ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
ہوا جب غم سے یوں بےحس تو غم کیا سر کے کٹنے کا ۲ نہ ہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا
ہوئی مدت کہ غالب مر گیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

۱۔ حالی۔ بالکل نئی طرح سے نیستی کو ہستی پر ترجیح دی ہے اور ایک عجیب توقع پر معدوم محض ہونے کی تمنا کی ہے پہلے مصرعہ کے معنی تو ظاہر ہیں۔ دوسرے مصرعہ سے بظاہر یہ مفہوم ہوتا ہے۔ اگر میں نہ ہوتا تو دیکھنا چاہیئے۔ کہ میں کیا چیز ہوتا۔ مطلب یہ ہے۔ کہ خدا ہوتا کیونکہ پہلے مصرعہ میں بیان ہو چکا ہے کہ اگر کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا۔ (سعید)

طباطبائی۔ صوفیہ کے مذاق میں کہا ہے یعنی کچھ نہ تھا۔ تو خدا تھا اور کچھ ہو گیا یعنی اپنے مبدا سے مغائر ہو گیا۔ اور اس مبداء فیض سے علیحدہ ہو جانا میرے حق میں برا ہوا (سب متفق)

۲- زانو پر دھرا ہونا ...... جب انسان غمگین ہوتا ہے تو سر زانو پر رکھ کر خاموش بیٹھ جاتا ہے ——— میں کثرتِ آلام سے بالکل بےحس ہوگیا ہوں۔ اور مجھے اپنے سر تک کا ہوش نہیں رہا۔ مرا سر کٹ گیا ہے لیکن مجھے بیخودی کی وجہ سے اس کا احساس تک نہیں ۔۔ اگر میرا سر تن سے جُدا نہ ہوتا۔ تو پھر بھی کثرتِ غم سے بےحس و حرکت زانو پر دھرا ہوتا۔ اس لئے سر کے کٹ جانے سے کوئی فرق نہیں پڑا پھر مجھے سر کے کٹ جانے کا غم کیوں ہو۔

۳- اگرچہ غالبؔ کو مرے ہوئے ایک مدت ہوگئی ہے مگر اب تک یاد آتا ہے کہ وہ ہر بات پر کمال بےپروائی سے تحقیراً کہا کرتا تھا۔ کہ یوں ہو جاتا تو کیا ہوتا یعنی کچھ نہ ہوتا۔ (آسی۔ طباطبائی۔ بیخود) سعید۔ اس کی بحث و تمحیص کی عادت بار بار یاد آتی ہے۔ سہا۔ وہ ہر بات پر ارمان و تمنا کا اظہار کرتا تھا یعنی یوں ہوتا۔ تو کیا لطف ہوتا۔

۳۲- یک ذرّہ زمیں نہیں بیکار باغ کا ۔۔۔ ۱ ۔۔۔ یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالے کے داغ کا

بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی ۔۔۔ ۲ ۔۔۔ کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خطِ ایاغ کا

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل ۔۔۔ ۳ ۔۔۔ کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

تازہ نہیں ہے نشۂ فکرِ سخن مجھے ۔۔۔ ۴ ۔۔۔ تریاکیٔ قدیم ہوں دودِ چراغ کا

سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے ۔۔۔ ۵ ۔۔۔ پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار ۔۔۔ ۶ ۔۔۔ یہ میکدہ خراب ہے مے کے سراغ کا

باغِ شگفتہ تیرا بساطِ نشاطِ دل
ابرِ بہار خمکدہ کس کے دماغ کا

۱- جادہ .... راستہ، بتیا، فتیلہ .... بتی داغ .... چراغ سے استعارہ ہے

بہار سے باغ میں سبزۂ و گل کی اتنی فراوانی ہے۔ کہ زمین کا ایک ذرہ بھی بیکار نہیں رہا یعنی ہر جگہ گل و سبزہ نمودار ہے یہاں تک کہ باغ کی روشیں جن پر بہار کا کوئی اثر نہیں ہوا کرتا وہ بھی اثر بہار سے چراغ لالہ کی بتیاں معلوم ہوتی ہیں۔ لطیفہ یہ ہے۔ کہ روشِ باغ بھی باعثِ فروغ باغ ہے۔ اور اس کو لالہ کے ساتھ وہی مناسبت ہے۔ جو فتیلہ و چراغ میں ہوتی ہے۔ (حسرت سہا۔ سعید)

آسی و طباطبائی (۱) ہم خیال (۲)، داغ سے اگر زخم مراد لیں تو فتیلہ وہ بتی ہے۔ جو زخم میں رکھتے ہیں۔ اس صورت میں کثرتِ نشو و نما کا اظہار ہے کہ جادہ ایسا باریک پڑ گیا ہے جیسے رگ لالہ ہوتی ہے اور داغ لالہ کی تخصیص اس لئے ہے۔ کہ کثرت گل ہائے رنگین سبزی پر دلالت کرے۔ بیخود نے یہی لکھا ہے۔

۲۔ آشوب ... مصیبت۔ آگہی ... ہوشیاری، افکار دنیاوی۔ عجز حوصلہ ... پست ہمتی۔ ایاغ ... جامِ شراب جس پر شراب ناپنے کے لئے خطوط کھنچے ہوئے ہوں۔ کہتے ہیں۔ جامِ جمشید پر بھی ایسے ہی خطوط تھے چونکہ مصائب و شدائد دنیاوی کو برداشت کرنے سے حوصلہ عاجز ہے اس لئے اس نے آگہی و ہوشیاری پر خطِ ایاغ کھینچ دیا ہے یعنی شراب پی کر آگاہی کو صفحۂ دل پر سے کاٹ دیا ہے۔ تاکہ مستی اور غفلت سے احساس ہوشیاری و آگہی جاتا رہے۔ (آسی۔ طباطبائی۔ سعید۔ شراب نوشی کے بغیر افکار دنیوی سے نجات نہیں مل سکتی۔ لیکن یہاں ساقی نے ایسی پست ہمتی سے کام لیا۔ کہ جام میں بھی خط کھینچ دیا۔ یعنی پورا ایک پیالہ بھی شراب دی بلکہ خط نفرہ تک بھردی۔ اگرچہ ضرورت زیادہ تھی۔ حسرت۔ آگاہی کو آشوب

قرار دیا جس کی برداشت کے لئے میگساری لازم ہے۔ اور ظاہر ہے اس غرض کے لئے ایک ساغر سے کیا کام چلتا ہے خصوصاً ایسی حالت میں کہ ساغر بھی لبریز نہ ہو۔ بلکہ صرف خطِ ساغر تک ہو۔

بیخود۔ عجزِ حوصلہ کی وجہ سے ہم نے ساغر پر نشان بنا دیئے ہیں۔ اب ناپ کر پیتے ہیں اور مقدار دن بدن بڑھاتے جاتے ہیں۔ اور آشوب آگہی کی طاقت برداشت بقدرِ افزائش مقدارِ شراب رفتہ رفتہ پیدا ہوتی جاتی ہے یعنی ذکرِ واشغالِ کی مشق و ممارست دن بدن زیادہ کرتے جاتے ہیں۔

۳۔ بعض گملوں کے عشق میں دیوانی ہو رہی ہے اور پھول اس پر ہنس رہے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے جس چیز کو عشق کہتے ہیں۔ وہ اصل میں خللِ دماغ ہے کیونکہ دیوانوں پر ہی لوگوں کو ہنسی آیا کرتی ہے۔ طباطبائی کہتے ہیں کہ حالِ زار کی جگہ کاروبار اس لئے استعمال کیا ہے۔ کہ کار بمعنی زراعت اور بار بمعنی ثمر ہے یہ گل سے مناسبت رکھتا ہے۔

۴۔ ثریا کی اندیم ...... پرانا افیونی۔ دودِ چراغ ...... چراغ کا دھواں چند دبار چراغ کی لو کے ذریعہ سے افیون کا دھواں نال سے پیتے ہیں ـــ اور شعراء اکثر رات کو چراغ کے سامنے بیٹھ کر مشقِ سخن کرتے ہیں نشہ فکرِ سخن کی لت مجھے کچھ نئی نہیں پڑی۔ بلکہ مدتوں سے دودِ چراغ کو پیتا ہوں۔ یعنی چراغ کے سامنے بیٹھ کر فکرِ سخن کرتا ہوں۔ ظاہر ہے۔ دود بمعنی فکرِ سخن اور چراغ سے کلام روشن کا استعارہ کیا ہے۔

۵۔ بند ...... قید۔ عدو ...... دشمن۔ فراغ ...... آزادی ـــ ہم بہت مرتبہ عشق کی مصیبتوں سے آزاد ہوئے مگر ہم کیا کریں۔ ہمارا دل ہی فارغ البال رہنا نہیں چاہتا۔ گویا وہ ہماری آزادی کا دشمن ہے

جب ہم آزاد ہوتے ہیں وہ پھر بندِ عشق میں گرفتار کروا دیتا ہے۔ بیخود لکھتے ہیں عشق سے دنیا کی محبت اور بندِ عشق سے اس میں پھنسا ہوا ہونا مراد ہے یعنی دنیا میں بغیر شغل و فکر آدمی رہ ہی نہیں سکتا۔

۶۔ میکدہ۔۔۔۔ مراد آنکھ سے۔۔۔۔ یعنی خونِ دل۔ خراب۔۔۔۔ ویران۔ سراغ۔ تلاش۔ موجِ نگاہ۔۔۔۔ تارِ نظر۔۔۔۔ بینائی ـــــ اگر میری آنکھوں سے خونِ دل آنسو بن کر نہیں بہتا تو موجِ نگاہ (بینائی) کے۔۔۔ میری آنکھوں میں غبار اڑنے لگتا ہے یعنی مجھے کم نظر آتا ہے۔ اور یہ کیفیت میرے لئے سخت تکلیف کا باعث ہے۔ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ یہ میکدہ (چشم) شراب (خونِ دل) کی جستجو میں (خاک لب) غبار آلود ہے۔ ظاہر ہے۔ بغیر شراب کے میکدہ میں خاک ہی اڑتی ہے یعنی ویران ہوتا ہے۔ میکدے کیلئے خراب کا لفظ پُرلطف ہے۔

۷۔ باغِ شگفتہ۔۔۔۔ سرسبز و شاداب۔ بساط۔۔۔ فرش۔ نشاط۔۔۔ سرور۔ خمکدہ۔ میخانہ ـــــ ابرِ بہار میری مستی و نشاط کا باعث نہیں ہو سکتا۔ وہ کسی اور کے دماغ کا خمکدہ ہوگا یعنی وہ کوئی اور لوگ ہوں گے جو ابرِ بہار سے مسرور و سرخوش ہوتے ہوں گے۔ میرے سرورِ دل کا باعث تو تیرے حسن کا شگفتہ و شاداب باغ ہے۔ اور اس کے علاوہ کوئی چیز میرے دل و دماغ کے لئے مستی کا باعث نہیں ہو سکتی (حسرت۔ سعید۔ بیخود)

طباطبائی۔ جب شگفتگی باغ سے تجھے نشاط پیدا ہوتا ہے۔ تو خیال کرتا ہے کہ ابرِ بہار جس نے ساغر کو شرابِ رنگ و بو سے لبریز کر دیا کس کے دماغ کا میکدہ ہوا۔ ابرِ بہار بھی تیرے ہی دماغ میں نشہ پیدا کرنے کے لئے ایک خمکدہ ہے۔ بساط و نشاط میں تجنیس خطی ہے۔ آسی دونوں مفہوم لکھنے

ہیں ـــ

۲۳ وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا ۱ رازِ مکتوب بہ بے ربطیٔ عنوان سمجھا
یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز ۲ چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا
شرحِ اسبابِ گرفتاریٔ خاطر مت پوچھ ۳ اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا
بدگمانی نے نہ چاہا اُسے سرگرمِ خرام ۴ رخ پہ ہر قطرہ عرق دیدۂ حیراں سمجھا
عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا ۵ نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا
سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی ۶ ہر قدم سایہ کو میں اپنے شبستاں سمجھا
تھا گریزاں مژۂ یار سے دل تا دمِ مرگ ۷ دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا

دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار، اسد
۸ غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

۱۔ چینِ جبیں۔ تیوری۔ غمِ پنہاں ۔۔۔۔ رنجشِ دل۔ عنوان۔ سرخی، پتہ
رازِ مکتوب ۔۔۔۔ خط کا مضمون۔ چینِ جبیں کی تشبیہ بے ربطیٔ عنوان سے
ہے اور غمِ پنہاں کا استعارہ رازِ مکتوب سے ـــ میری تیوریوں سے
اُس نے میرے غمِ پنہاں کو بھانپ لیا۔ گویا عنوان کی بے ربطگی سے وہ خط
کے مضمون کو سمجھ گیا یا اُس نے میری چینِ جبیں سے میرے غمِ پنہاں کا اس طرح
پتہ لگا لیا جس طرح پتہ کی بے ربطگی سے خط کا مضمون معلوم ہو جاتا ہے۔

۲۔ غالب پہلے یہ سمجھنا چاہیئے کہ آئینہ فولاد کے آئینہ سے ہے ورنہ حلبی آئینوں
میں جوہر کہاں۔ اور ان کو صیقل کون کرتا ہے۔ فولاد کی جس چیز کو صیقل کروگے
بے شبہ پہلے ایک لکیر پڑے گی۔ اس کو الف صیقل کہتے ہیں۔ جب یہ مقدمہ معلوم
ہوا تو اب اُس کے مفہوم کو سمجھیئے۔ ع

چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

یعنی ابتدائے سنِ تمیز سے مشقِ جنوں ہے۔ اب تک کمالِ فن حاصل نہیں ہوا۔ آئینہ تمام صاف نہیں ہو گیا۔ بس وہی ایک لکیر صیقل کی موجود ہے چاک کی صورت بھی الف کی سی ہوتی ہے۔ اور چاک آثارِ جنون میں سے ہیں (اُردوئے معلیٰ) آسی اور طباطبائی "بیش نہیں" پر اعتراض کرتے ہیں۔ کہ یہ فارسی کا ترجمہ ہے۔

۳۔ شرح ..... کھولنا لفظ تنگ کی مناسبت سے لائے ہیں۔ گرفتاریٔ خاطر۔ گرفتگیٔ دل۔ گرفتاریٔ زنداں کی رعایت ملحوظ رہے ۔۔۔ میری گرفتگیٔ دل کی تفصیل مجھ سے دریافت نہ کرو۔ یوں سمجھ لو کہ میرا دل مصائب و آلام سے اس قدر تنگ ہوا۔ کہ میں اس کو زنداں سمجھنے لگا ہوں۔ لطف یہ ہے کہ زنداں تنگ ہوتا ہے۔

۴۔ نہ چاہا ..... گوارا نہ کیا۔ قطرہ عرق زدک (اضافت) پسینہ کی بوند؛ دیدۂ حیران یعنی چشمِ رقیب ۔۔۔ میری بدگمانی نے یہ بھی گوارہ نہ کیا کہ وہ محوِ خرام رہے۔ کیونکہ چلنے سے اس کے ماتھے پر جو پسینہ آجاتا ہے وہ مجھے دیدۂ حیران (چشمِ رقیب) معلوم ہوتا ہے۔ اور میرا رشک یہ گوارا نہیں کرتا۔ کہ رقیب کی چشمِ حیران اس کے ماتھے پر جم جائے (طباطبائی۔ بیخود۔ حسرت، مہا۔ آسی اور سعید) میرا معشوق مجھ سے اتنا بدگمان ہے کہ گرمِ خرام ہونا بھی گوارا نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ اپنے ہر قطرۂ عرق کو میرا دیدہ حیران سمجھتا ہے۔

۵۔ اپنے عجز کو حسن۔ خس کو رگِ نبض اور یار کی بدخوئی کو شعلہ سوزاں سے تشبیہہ دی ہے کہتے ہیں ۔۔۔ میں نے اپنے عجز کو دیکھ کر یہ اندازہ کر لیا۔ کہ معشوق یقیناً بدخو اور تندمزاج ہوگا۔ گویا میں نے تنکے کی نبض کو دیکھ کر تپشِ شعلہ

معلوم کر لی ہے۔ اور اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ اس کی بدخوئی کے مقابلہ میں میرا عجز میری ہلاکت اور تباہی کا باعث ہوگا۔ جب اپنے آپ کو تنکا سمجھے اور معشوق کو شعلہ سوزاں تو نتیجہ یقیناً یہی نکلا کہ معشوق کی آتش غضب اس کو اسی طرح جلا کر خاک کر دے گی جس طرح شعلہ گھانس پھونس کو جلا دیتا ہے

۶۔ شبستان.... رات بسر کرنے کی جگہ، منزل ـــ سفر عشق میں جب تھکان بڑھ گئی تو ضعف و کمزوری نے آرام کرنے پر مجبور کیا۔ چونکہ اس سفر عشق میں آرام کرنے کے لئے کوئی منزل ہوتی نہیں۔ اس لئے میں ہر قدم پر اپنے سایہ کو دیکھ کر یہی سمجھا کہ رات ہو گئی ہے۔ اور منزل آگئی ہے مطلب یہ ہے کہ انتہائی ناکامی اور مایوسی کے عالم میں انسان یاس اور نا امیدی ہی کو اپنا غمگسار اور مددگار سمجھتا ہے۔

۷۔ مژگان یار کو پیکان قضا قرار دیا ہے جس سے بچنا ناممکن ہے میرا دل مرتے دم تک مژگانِ یار سے بچنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن آخر نہ بچ سکا۔ مژگانِ یار سے گریز کرنا میری نادانی تھی۔ کیونکہ وہ تیر قضا تھا۔ اور اس سے بچنا ناممکن تھا۔ تعجب کی بات ہے کہ دل نے اس ناممکن کام کو اس قدر آسان سمجھ رکھا تھا۔ اور مژگانِ یار کی زد سے بچنے کے لئے متواتر کوششیں کرتا تھا۔

۸۔ کافر میں ایہام ہے۔ کہتے ہیں۔ اے اسد تم نے اس بیوفا کو وفادار سمجھ کر کیوں اپنا دل دے دیا۔ یہ تمہاری غلطی تھی۔ کہ تم نے ایک کافر کو مسلمان سمجھ لیا۔ اور یہ سمجھتے ہوئے کہ وفاداری شرط اسلام ہے۔ تم نے اپنا دل اس کے حوالے کر دیا۔ یا یہ کہ اس کو وفادار سمجھنا ایسی ہی غلطی ہے جیسے کسی کافر کو مسلمان سمجھ لینا۔

۳۴ پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا ۱ دل جگر تشنۂ فریاد آیا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز ۲ پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا
سادگی ہائے تمنّا یعنی ۳ پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا
عذرِ واماندگی اے حسرتِ دل ۴ نالہ کرتا تھا جگر یاد آیا
زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی ۵ کیوں ترا راہ گذر یاد آیا
کیا ہی رضوان سے لڑائی ہوگی ۶ گھر ترا خلد میں گر یاد آیا
آہ وہ جرأتِ فریاد کہاں ۷ دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا
پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال ۸ دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے ۹ دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
۱۰ سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

۱- دیدۂ تر... چشم اشک آلود- تشنۂ فریاد آیا- آرزومند فریاد ہوا
آیا فارسی محاورے کا ترجمہ ہے- اُردو میں مروّج نہیں- آج مجھے پھر
اپنی چشم اشک آلود یاد آگئی اور نتیجہ کے طور پر میرا دل و جگر فریاد کا آرزو
ہوگیا- کہ پھر وہی گریہ و زاری کی لذت حاصل کرے (سعید- حسرت-
بیخود) بعض لوگ دیدۂ تر سے معشوق کی چشم تر مراد لیتے ہیں- یعنی مجھے معشوق
کی چشم تر یاد آئی اور اس کی وجہ سے میرا دل و جگر آرزومند
فریاد ہوا-

طباطبائی- آسی- دل- جگر تشنۂ فریاد ہوا- تو مجھے دیدۂ تر یاد آگیا
کہ یہ تشنگی رونے ہی سے بجھے گی-

۲- دم لینا... ٹھہرنا- سکون ہونا- قیامت... اضطراب بے چینی
— بقول حالی "دوست کو رخصت کرنے وقت جو دردناک کیفیت گذری

تھی۔ اور جو اس کے چلے جانے کے بعد رہ کر یاد آتی ہے۔ اس میں جو کبھی کبھی وقفہ ہو جاتا ہے۔ اس کو قیامت کے دم لینے سے تعبیر کیا ہے" مطلب یہ ہے۔ کہ تیرے چلے جانے کے بعد ابھی میرا دل سکون پذیر نہ ہوا تھا۔ کہ تیرا وقت سفر یاد آگیا اور پھر دل میں وہی تلاطم پیدا ہو گیا۔

۳۔ سادگی...... نادانی۔ تمنا...... آرزوئے وصل۔ نیرنگ نظر... محبوب پرفن۔ پہلے مصرعہ میں دیکھو محذوف ہے۔ ذرا میری تمنا کی سادگی اور نادانی ملاحظہ ہو کہ مجھے پھر وہی محبوب پرفن یاد آرہا ہے جس کی نیرنگ نظری نے میری زندگی تباہ کردی ہے۔ سادگی یہی ہے۔ کہ معلوم ہے اس سے تمنا پوری نہیں ہو سکتی لیکن پھر بھی اس کی طرف ڈھلے جاتے ہیں۔

۴۔ واماندگی... بے بسی، مجبوری۔ "واماندگی" کے بعد "قبول کر" محذوف ہے۔ دل کو حسرت تھی کہ نالہ کیا جائے۔ اس لئے کہتے ہیں۔ کہ اے حسرت دل میری بے بسی اور مجبوری کا عذر قبول کر میں آہ و نالہ کرنے کیلئے آمادہ تھا۔ مگر مجھے اپنا جگر خستہ یاد آگیا۔ کیونکہ اگر میں نالہ کرتا تو میرا جگر شق ہو جاتا۔ اس لئے میں نے نالہ نہ کیا۔

۵۔ ہماری زندگی کسی نہ کسی طرح گذر ہی جاتی۔ ہم کو تیری رہ گذر بیکار یاد آئی۔ کیونکہ تیری رہگذر میں بھی کامگاری اور مرادمندی ممکن نہیں۔ اس لئے اس کا یاد آنا فضول ہے۔ (حسرت)

آسی وسعید۔ تیرا رہگذر کیوں یاد آیا کہ اس کو یاد کرکے ہم مر گئے (طباطبائی نے اس قدر اور لکھا ہے) اور یہ بات اچھی ہوئی۔ کہ میں زندگی سے بیزار تھا۔ لیکن اس کے یاد آنے سے ایسا اندوہ و قلق ہوا۔ کاشکے نہ یاد آیا

ہوتا تو زندگی کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جاتی

۷۔ رضوان ..... داروغہ بہشت ۔کیا ہی لڑائی ہوگی ..... خوب لڑائی ہوگی جب جنت میں مجھے تیرا گھر یاد آئیگا ۔ اور میں اس کی تعریف کروں گا ۔ تو رضوان کہے گا بہشت اچھی ہے ۔ میں کہوں گا ۔ تیرا گھر بہتر ہے ۔ اس ردوکد میں رضوان سے خوب لڑائی ہوگی ۔

طباطبائی نے دوسرے معنی یہ لکھے ہیں ۔ کہ میں خلد سے نکل کر یار کے گھر کی طرف جانا چاہوں گا ۔ اور رضوان مجھے روکے گا ۔ اس طرح خوب لڑائی ہوگی (بیخود)

۷ ۔ پہلے جس قدر فریاد کی جرأت میرے دل میں تھی وہ اب نہیں رہی ۔ دل کی بے جرأتی اور کم طاقتی سے تنگ آکر میں اپنے جگر کو یاد کرتا ہوں جس میں کبھی فریاد کرنے کی طاقت دل سے بہت زیادہ تھی لیکن افسوس کہ اب جگر میں بھی وہ طاقت فریاد نہیں رہی مطلب یہ ہے کہ اگر جگر سلامت ہوتا ۔ تو میں خوب نالے کرتا

۸ ۔ دل گم گشتہ ..... کھویا ہوا دل ۔ مگر شاید میرا خیال پھر تیری گلی کی طرف جا رہا ہے ۔ شاید وہ کھوئے ہوئے دل کو ادھر ادھر ڈھونڈھنے چلا ہے کیونکہ تیرے کوچے ہی میں دل کے کھوئے جانے کا احتمال ہے ۔

۹ ۔ حالی ۔ اس شعر سے جو معنی فوراً متبادر ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ جس دشت میں ہم ہیں وہ اس قدر ویران ہے ۔ کہ اس کو دیکھ کر گھر یاد آتا ہے یعنی خوف معلوم ہوتا ہے ۔ مگر ذرا غور کرنے کے بعد اس سے یہ معنی نکلتے ہیں ۔ کہ ہم تو اپنے گھر ہی کو سمجھے تھے ۔ کہ ایسی ویرانی کہیں نہ ہوگی ۔ مگر دشت بھی اس قدر ویران ہے کہ اس کو دیکھ کر گھر کی ویرانی یاد آتی ہے ۔

۱۰ ۔ عام طور پر دیوانوں کو بچے پتھر مارا کرتے ہیں ۔ بچپن میں میں نے

مجنوں کو مارنے کے لیے پتھر اٹھایا تھا۔ کہ دفعتہً مجھے اپنا سر یاد آگیا۔ یعنی یہ خیال آیا۔ کہ ممکن ہے کبھی میں بھی اس طرح دیوانہ ہو جاؤں اور لڑکے مجھ کو پتھر ماریں۔ اس لیے میں نے پتھر نہ مارا۔ طباطبائی اور آسی لکھتے ہیں۔ یہ سوچکر پتھر اپنے ہی سر مار لیا۔ ظاہر ہے۔ اس مفہوم میں لطف نہیں۔

۲۵ ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا ۱ آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

تم سے بیجا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ ۲ اس میں کچھ شائبۂ خوبیٔ تقدیر بھی تھا

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں ۳ کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد ۴ ہاں کچھ اک رنجِ گرانباریٔ زنجیر بھی تھا

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا ۵ بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

یوسف اسکو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی ۶ گر بگڑ بیٹھے تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا

دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا ۷ نالہ کرتا تھا ولے طالبِ تاثیر بھی تھا

پیشہ میں عیب نہیں رکھیے نہ فرہاد کو نام ۸ ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا نہ سہی ۹ آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق ۱۰ آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

۱۔ عناں گیر۔۔۔ روکنے والا۔ یار کو آنے میں دیر ہو گئی ہے تو کہتے ہیں کہ شاید آپ کو کسی رقیب نے روک لیا تھا۔ ورنہ دیر سے آنے کا کیا سبب ہے؟

۲۔ خوبی تقدیر۔۔۔ مراد تقدیر کی برائی بطور طنز کہا ہے۔ میری تباہی اور بربادی کے باعث تم نہیں ہو۔ میں تم سے یونہی اپنی تباہی کی شکایت کیا کرتا ہوں اصل میں یہ خرابیاں کچھ میری ہی تقدیر میں لکھی تھیں۔

۳۔ فتراک ۔۔۔ شکاربند۔ نخچیر ۔۔۔ شکار ۔ اگر تم مجھے بھول گئے ہو۔ تو آؤ میں تمہیں اتنا پتا بتلا دوں۔ بھلا یاد کرو۔ کبھی تم نے شکار کر کے اپنے شکاربند میں کچھ باندھا تھا۔ بس وہی ہوں میں۔

۴۔ وحشی ۔۔۔ دیوانۂ محبت۔ تیرے دیوانۂ الفت کو قید کی حالت میں بھی تیری زلف کی یاد ہر دم رہتی ہے! اور اس کے ساتھ یہ بھی یاد آیا کرتا ہے کہ کچھ تھوڑی سی تکلیف زنجیر کی گرانباری کی بھی تھی۔ یاد زلف کے مقابلے میں قید زنجیر کو حقیر ظاہر کیا ہے۔ تاکہ زلف کی گرانباری ظاہر ہو۔

۵۔ لب تشنہ ۔۔۔ آرزومند۔ تم بجلی کی طرح میری آنکھوں کے سامنے آئے اور ایک دم چھپ گئے۔ گویا میں اچھی طرح دیکھ بھی نہ سکا۔ بھلا اس طرح سے میری کیا تسلی ہو سکتی ہے۔ تم کو چاہیے تھا کہ اطمینان سے آتے جی بھر کر درشن دیتے اور بات چیت کرتے۔

۶۔ یوسف ۔۔۔ یوسف اگرچہ حسن میں بےمثال تھے۔ لیکن بازار میں غلام ہو کر بکے تھے۔ لائق تعزیر ۔۔۔ قابل سزا۔ میں نے اس کو یوسف کہہ دیا یعنی غلام سے تشبیہہ دے دی لیکن خیریت یہ ہوئی۔ کہ انہوں نے کچھ نہ کہا۔ اگر وہ اس بات پر ناراض ہو جاتے۔ تو بجا تھا۔ اور حقیقتاً میں اسی غلطی پر سزا پانے کے قابل تھا دوسرے معنی یہ ہیں۔ کہ اس کا حسن یوسف سے زیادہ ہے۔ یعنی میں نے اس کو اس سے کمتر سے تشبیہہ دی۔ اس لیے میں قابل سزا تھا۔

۷۔ غیر کو دیکھ کر بھلا میرا کلیجہ کیوں نہ ٹھنڈا ہو۔ کیونکہ ایک تو وہ نالہ و زاری کرتا تھا اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنے نالوں میں اثر کا بھی طالب تھا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ بھی میری طرح نامراد تھا۔ اگر وہ طالب تاثیر نہ ہوتا۔ تو اس کی مرادمندی ثابت تھی جس سے مجھے تکلیف ہوتی۔

بیخود۔ غیر کو دیکھ کر میرا کلیجہ ٹھنڈا کیوں نہ ہو جائے۔ اس لئے کہ میں نالے کرتا تھا اور اپنے نالوں سے تاثیر کا طالب تھا۔ یعنی مجھ پر میرے نالوں کا کچھ اثر ظاہر نہ ہوا تھا۔ اب غیر کو تپ ہی حالت میں دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ یہ میری ہی فریاد کا اثر ہے۔

۸۔ جواں میر۔ جواں مرگ۔ آشفتہ سر۔۔۔ عاشق، پریشان حال۔ نام رکھنا۔۔۔ عیب نکالنا پیشہ میں کوئی عیب نہیں ہے الکاسب حبیب اللہ۔ اس لئے یہ کہہ کر غالب برنام نہ رکھیے۔ کہ کوہ کنی اس کا پیشہ تھا۔ اس کے علاوہ یہ کام تو اس نے اپنے محبوب کی تمنا پوری کرنے کے لئے اختیار کیا تھا۔ حقیقتاً وہ جوانمرگ بھی ہم جیسا عاشق پیشہ تھا۔ اس لئے اس کو ہم اپنی جماعت سے خارج نہیں کر سکتے (تمام متفق) بیخود لکھتے ہیں۔ ہم بھی عاشق پیشہ ہیں اور میر بھی عشق پیشہ تھا۔

۹۔ ہم مرنے کے لئے تیار کھڑے تھے۔ اگر یار نے ہم کو پاس آ کر قتل کرنا گوارا نہ کیا۔ تو بجا ندارد ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس کے ترکش میں کوئی تیر بھی نہ تھا۔ کہ ہمیں دور ہی سے مار دیا ہوتا۔ مطلب یہ ہے۔ کہ اگر پاس آنے میں کسر شان تھی۔ تو دور سے تیر چلا کر قتل کرنے میں کیوں پس و پیش کی۔

۱۰۔ فرشتوں۔۔۔ کراماً کاتبین جو انسان کے اعمال قلم بند کرتے ہیں۔ قاعدہ ہے جب تک فریقین حاضر نہ ہوں۔ اس وقت تک کسی مقدمہ کا فیصلہ نہیں کیا جاتا۔ لیکن غالب کہتے ہیں۔ خدا کی عدالت کا قانون بھی عجیب ہے جو کچھ کراماً کاتبین لکھ دیتے ہیں۔ وہی کافی سمجھا جاتا ہے اور فریق ثانی کی طرف سے صفائی کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ مطلب یہ ہے کہ ہم کو سزا دینے کے لئے محض فرشتوں کی تحریر کافی نہیں ہے۔ بلکہ ہمارا بھی کوئی وکیل یا گواہ وغیرہ ہونا چاہیئے۔

۱۱۔ ریختہ.... اُردو کی شاعری۔ میر.... میر تقی میر۔ اُردو شاعری کے
مسلم الثبوت استاد ہیں۔ غالب اُردو شاعری کے تم ہی اُستاد نہیں ہو۔
کہتے ہیں۔ اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھے جو اردو شاعری کے استاد کہلاتے
تھے۔ اپنے آپ کو میر کا ہم پلہ بتانا چاہتے ہیں طرزِ ادا خوب ہے۔

۱، ۲۔ لبِ خشک در تشنگی مردگاں کا | ۱ | زیارت کدہ ہوں دلِ آزردگاں کا
ہمہ ناامیدی ہمہ بدگمانی | ۲ | میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

۱۔ تشنگی.... شدتِ آرزو و شوق سے استعارہ ہے۔ در تشنگی مردگاں....
.... وہ لوگ جو آرزو و شوق میں مر گئے۔ مصرعہ اولیٰ میں "میں ہوں" محذوف ہے
لبِ خشک.... تشنۂ آرزو مند۔ دل آزردگان.... محروم القسمت عشاق
ہیں ان لوگوں کا لبِ خشک ہوں۔ جو لوگ آرزوئے شوق کی تشنگی میں
مر گئے۔ اور میں ان لوگوں کی زیارت گاہ ہوں جو دل آزردہ اور محروم القسمت
ہیں۔ مطلب یہ ہے میرا رتبہ ان سے بلند ہے۔ اس لئے ان لوگوں کی زیارت
گاہ اور مقامِ آرزو ہوں۔

۲۔ ہمہ ناامیدی، ہمہ بدگمانی.... سر تا سر ناامیدی اور بدگمانی کی تصویر۔
فریبِ وفا خوردگان.... وفا کا فریب کھائے ہوئے لوگ۔ میں دل ہوں....
سراپا بدگمانی و یاس بنا ہوں۔ جو لوگ وفا کے فریب خوردہ ہوتے ہیں ان کا دل سراپا ناامیدی
اور بدگمانی بن جاتا ہے۔ اسی طرح وفا کا فریب کھا کر میں بھی سراپا یاس و بدگمانی بن گیا ہوں۔

۳، ۴۔ تو دوست کسی کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا | ۱ | اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا
چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے | ۲ | خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا
توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے | ۳ | آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا
جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم | ۴ | میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

میں سادہ دل آزردگیِ یار سے خوش ہوں ۵ یعنی سبقِ شوق مکرر نہ ہوا تھا

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک ۶ میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

جاری تھی اسدؔ داغِ جگر سے مری تحصیل
۷
آتشکدہ جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا

۱۔ اے ستمگر تو آج تک کسی کا دوست نہیں بنا۔ تیرا ظلم صرف مجھ تک محدود نہیں بلکہ تو نے اوروں پر اتنے زیادہ ظلم کیے ہیں جو مجھ پر نہیں کیے دوسرے لطیف معنی یہ ہیں۔ کہ میں سمجھتا تھا۔ تو ظلم صرف مجھ پر ہی کرتا ہے اور رقیب اِن سے محروم ہیں۔ لیکن معلوم ہوا۔ کہ تو نے رقیبوں پر کئی قسم کے بہت زیادہ ظلم کیے اور مجھے اِن سے محروم رکھا۔ رشک کا بالکل نیا ڈھنگ ہے۔ شرکتِ غیر ظلم میں بھی گوارا نہیں۔ نیز یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ مجھ پر ظلم نہ کرنا بربنائے دوستی نہیں ہے۔ بلکہ غیریت کا سبب ہے۔

۲۔ مہِ نخشب ... مصنوعی چاند جس کو حکیم ابن عطا (مقنع) نے چند دواؤں سے تیار کیا تھا۔ وہ چاند چاہِ نخشب سے نکلتا تھا۔ اس کی روشنی چار فرسنگ سے زیادہ دُور نہ جاتی تھی۔ نیز اصلی چاند کے مقابلے میں ماند تھا۔ آخر کار یہ دو مہینے بعد شق ہو گیا۔ برابر نہ ہوا ..... ناقص رہا۔ اس کے ... معشوق کے ـــ ہنوز خورشید میرے محبوب کے حسن و جمال کے برابر نہ ہوا تھا۔ یعنی ماہِ نخشب کی طرح ادھورا اور ناقص تھا۔ کہ دستِ قدرت نے اس کو اسی طرح چھوڑ دیا جس طرح حکیم ابن عطا نے ماہِ نخشب ناقص دیکھ کر ترک کر دیا تھا مطلب یہ ہے۔ کہ سورج حسنِ معشوق کے مقابلے میں ناقص ہے۔

۳۔ حالی ... دعوے یہ ہے کہ جس قدر ہمت عالی ہوتی ہے اسی کے موافق اسکی تائید غیب سے ہوتی ہے۔ اور ثبوت یہ ہے کہ قطرہ اشک جس کو آنکھوں میں

جگہ ملی ہے۔ اگر اس کی ہمت جبکہ وہ دریا میں تھا۔ موتی بننے پر قانع ہو جاتی۔ تو اس کو جیسا کہ ظاہر ہے۔ یہ درجہ یعنی آنکھوں میں جگہ ملنے کا حاصل نہ ہوتا (یادگار غالب) بلکہ وہ کانوں یا گلے ہی تک پہنچکر رہ جاتا۔

۴۔ قامت کو قیامت سے تشبیہہ دی ہے جب تک میں نے قدِ یار کو نہ دیکھا تھا۔ اس وقت تک میں قیامت کا معتقد نہ ہوا تھا۔ لیکن جب سے میں نے قدِ یار کو دیکھا ہے۔ مجھے قیامت پر یقین ہو گیا ہے۔ گویا یار کی محشر خرامی سے مجھے فتنۂ قیامت کا اندازہ ہو گیا ہے۔

۵۔ میری سادہ دلی ملاحظہ فرمایئے۔ کہ میں یار کے رنجیدہ ہو جانے سے خوش ہوں۔ کیونکہ اس حالت میں مجھ کو سبقِ شوق دہرانے کا مزید موقع ملتا ہے مطلب یہ ہے۔ اگر یار رنجیدہ نہ ہوتا۔ تو مجھے اظہارِ شوق کا مزید موقع نہ ملتا۔ محبت وعشق کے گلے شکووں میں جو لطف ہے۔ اہل دل اس سے اچھی طرح واقف ہیں بس اسی لئے شاعر اس موقع پر بھی خوش ہے۔

۶۔ دریائے معاصی۔۔۔ گناہوں کا دریا۔ تنک آبی۔۔۔ پانی کم ہونا۔ تر دامن۔۔۔ گناہگار ــــ حالیؔ: گناہ کرنے میں ہمارا حوصلہ اتنا فراخ ہے کہ باوجودیکہ دریائے معاصی خشک ہو گیا۔ مگر ابھی ہمارے دامن کا پلہ تک نہیں بھیگا۔ مطلب یہ ہے۔ کہ میں نے اتنے زیادہ گناہ کئے۔ کہ گناہ ختم ہو گئے مگر پھر بھی میرا دل سیر نہیں ہوا۔

۷۔ سمندر۔۔۔ ایک کیڑا ہے جو اگر آگ بہت مدت تک روشن رہے تو اس میں پیدا ہو جاتا ہے اور آگ سے باہر نکلتے ہی مر جاتا ہے اپنا سمندر سے اور داغ کا آتشکدہ سے مقابلہ کر کے داغ کو ترجیح دی ہے۔ اے اسد میں داغِ جگر سے اس وقت سے تحصیل آتش مزاجی کر رہا ہوں جبکہ آتشکدہ میں جہاں ہر

وقت آگ روشن رہتی ہے سمت رہ پیدا نہ ہوا تھا۔

۲۸۔ شب کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا | رشتۂ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا ۱
مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا | کس قدر یا رب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا ۲
حاصلِ الفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو | دل بدل پیوستہ گویا یک لبِ افسوس تھا ۳
کیا کہوں بیماریٔ غم کی فراغت کا بیان | جو کہ کھایا خونِ دل بے منتِ کیموس تھا ۴

۱۔ مجلس فروز۔۔۔ رونقِ محفل۔ ناموس۔۔۔ شرم وحیا عصمت۔ رشتۂ شمع وہ تاگا جو شمع میں ہوتا ہے بتی۔ کسوت۔۔۔ لباس۔ فانوس۔۔۔ فانوس کے ڈھانچہ پر کپڑا چڑھا دیتے ہیں۔ خار در پیرہن۔۔۔ فارسی محاورہ ہے مراد بےچینی رات کو جس وقت کہ محبوب محفلِ راز میں بزم افروز تھا۔ تو اس کے سامنے شمعیں اس قدر بےچین تھیں۔ کہ معلوم ہوتا تھا۔ ان کے تاگے رتبیاں کسوتِ فانوس میں خارِ پیراہن کی طرح چبھ رہے ہیں مطلب یہ ہے۔ کہ محفلِ ناموس میں شمع کی موجودگی بھی ناموس کے منافی تھی۔ اس لئے وہ خود بخود بےچین ہوئی جاتی تھی۔

۲۔ مشہد۔۔۔ شہادت گاہ۔ ہلاکِ حسرتِ پابوس۔۔۔ پابوسی کی حالت میں مر گیا۔ کوسوں تک۔۔۔ دُور دُور تک جس جگہ عاشق شہید ہوا ہے وہاں دُور دُور تک مہندی اُگ آئی ہے۔ مہندی کے اُگنے سے ظاہر ہے۔ کہ اس کو پابوسی کی کس قدر حسرت تھی۔ اس میں رمز یہ ہے کہ اگر جیتے جی پابوسی کی آرزو پوری نہ ہوئی تو اب شاید اس طرح ہو جائے۔ کہ حنا محبوب اپنے پاؤں میں لگا لے اور حسرت پابوسی پوری ہو جائے۔

۳۔ حاصلِ الفت۔۔۔ نتیجہ محبت شکستِ آرزو۔۔۔ آرزو کا خون ہونا دل بدل پیوستہ۔۔۔ دل سے دل ملنا۔ محبت ہونا ہم نے محبت کا نتیجہ سوائے آرزوؤں کے خون ہونے کے کچھ اور نہ دیکھا۔ عاشق ومعشوق دونوں کے

نازل کرکے لبِ افسوس کی صورت پیدا کر دیتے ہیں جن سے ہمیشہ افسوس ہی کا اظہار ہوتا ہے۔

۴۔ بے منت ۔۔۔ بغیر احسان کیموس ۔۔۔ غذا ہضم ہونے اور خون بننے سے پہلے طبخ اول میں کیلوس کی شکل اختیار کرتی ہے اور آش بن جاتی ہے۔ اس کے بعد طبخ دوم میں کیموس کی صورت پاکر پانی کی مانند بن جاتی ہے اور خون کی شکل اختیار کرتی ہے۔ میں اپنی بیمارئ غم کی فارغ البالی کا حال کیا بیان کروں میں جو کچھ کھاتا ہوں وہ بجائے اس کے کہ پہلے کیلوس بنے اور پھر کیموس بن کر خون بنے فوراً خون بن جاتی ہے۔ گویا میں غذا نہیں کھاتا۔ بلکہ خونِ دل پیتا ہوں۔

۳۹۔ آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لیکے رہ گئے ۱ صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا
قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریئے ۲ اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

۱۔ اپنا سا منہ لے کے رہ جانا ۔۔۔ شرمندہ ہونا۔ دل نہ دینا۔ عاشق نہ ہونا معشوق کو کہتے ہیں آپ بہت غرور سے کہا کرتے تھے۔ کہ ہم کسی پر عاشق نہیں ہو سکتے۔ لیکن اب وہ غرور کہاں گیا آئینہ میں اپنی شکل دیکھ کر اپنے ہی آپ پر عاشق ہو گئے۔ گویا وہ غرور کس آسانی سے ٹوٹ گیا۔

۲۔ گردن مارنا ۔ قتل کرنا۔ رشک کی یہ انتہا ہے۔ کہ عاشق معشوق کے ہاتھوں کسی کو قتل ہوتے بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اس لئے کہتا ہے۔ کہ آپ قاصد کو اپنے ہاتھ سے قتل نہ کریں۔ یہ میرا قصور تھا۔ کہ میں نے اس کے ہاتھ نہیں خط بھیجا۔ اس لئے مجھے قتل کیجیے۔

۴۰۔ عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا ۱ جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا
جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لئے ہوئے ۲ ہوں شمع کشتہ درخورِ محفل نہیں رہا
مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں ۳ شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

بروئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے ۴ یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن ۵ غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار ۶ لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں ۷ حاصل سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا مگر اسدؔ
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا ۸

۱۔ عرضِ نیازِ عشق ... عشق کی نیازمندی (احتیاج و عاجزی) کا اظہار۔ ناز تھا ... میرا دعویٰ نیازمندی و نازبرداری۔ ہجر و بے وفائی کے صدموں سے میرا دل اس قابل نہیں رہا کہ وہ عشق سے نیازمندی کا دعویٰ کر سکے۔ حق یہ ہے کہ جس دل پر مجھ کو عاجزی اور نیازمندی کی وجہ سے فخر حاصل تھا وہ دل نہیں رہا۔ مطلب یہ ہے کہ عشق کے قابل نہیں ہے کیونکہ اب ہم سے ناز برداریاں نہیں ہو سکتیں۔

۲۔ داغ ... افسوس، آرزو و حسرت ... آرزو۔ شمع کشتہ ... بجھی ہوئی شمع۔ درخورِ محفل ... محفل کے لائق۔ محفل کا ہستی سے استعارہ ہے۔ میں دنیا سے جاتا ہوں اور حسرتِ ہستی کا داغ میرے دل پر ہے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ میں ایک ایسی بجھی ہوئی شمع ہوں جو بجھنے کے بعد محفل میں رکھنے کے قابل نہیں رہی اور داغِ محفل اپنے ساتھ ہی لے گئی۔ لطف یہ ہے کہ شمع جب بجھ جاتی ہے تو اس کی بتی دیر تک چمکتی رہتی ہے اس کیفیت کو داغِ حسرت سے تمثیل دی ہے نیز یہ خوبی بھی ہے کہ شمع کشتہ کو محفل سے اور مرنے کو بزمِ ہستی سے اٹھا دیتے ہیں۔ اور دونوں داغِ حسرت و ہستی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔

۳۔ اور ہی ... کوئی دوسری۔ شایاں ... قابل۔ قاتل ... وہ محبوب۔ میری حالت اب ایسی خراب ہو گئی ہے کہ وہ مجھے صیدِ زبوں خیال کرے گا اور کسی صورت سے

قتل کرنا پسند نہ کرے گا۔ اس لئے اے دل اب مرنے کی کوئی دوسری تدبیر کرنی چاہیے
آسی لکھتے ہیں کہ شاعر نے گرانجانی کا اظہار کیا ہے اور اس خیال کی تائید "شایانِ دستِ
دبازوے قاتل" سے ہوتی ہے۔ نظیری سے۔

آں شکارم من کہ ہم لائق بہ کشتن نیستم شرم می آید مرا زانکس کہ صیادِ من است

۴۔ بر روئے شش جہت.... سارے زمانے کے لئے شش جہت
.... یعنی زمین آسمان اور شمال وجنوب و مشرق ومغرب یہاں.... مراد آئینہ
خانہ۔ ناقص وکامل.... عارف وعامی۔ دنیا ایک آئینہ خانہ ہے اور عارف وعامی
دونوں اس آئینہ خانہ میں حیران ہیں یعنی اسرارِ قدرت کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ (آسی) طباطبائی
ا جس طرح آئینہ قبول عکس میں ناقص وکامل کا کچھ امتیاز نہیں کرتا۔ بلکہ ہر چیز
کا عکس قبول کر لیتا ہے اسی طرح زمانہ بھی جو مثال آئینہ خانہ ہے ناقص وکامل کا
عکس دکھانے میں کوئی امتیاز نہیں کرتا۔ گویا سب کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرتا
ہے (سعید) طباطبائی اور بیخود آئینہ شش جہت سے عارف کا دل روشن مراد
لے کر کہتے ہیں۔ کہ دلِ عارف پر اچھی بری دونوں کیفیتیں پرتو فگن ہوتی ہیں۔

۵۔ وا کر دیئے.... کھول دیئے۔ میرے جذبِ شوق نے حسن کو بالکل بے نقاب
کر دیا ہے۔ سب پردے اٹھ گئے ہیں۔ صرف ایک نگاہ کا پردہ رہ گیا ہے۔ یعنی
حسن تو بے پردہ ہے لیکن اب ہماری نگاہ ہی نہیں دیکھ سکتی۔ گویا اس کے
حسن کا جلوہ ظاہری آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ ہاں چشمِ دل اگر وا ہو جائے۔ تو
اس کا نظارہ ممکن ہے۔

۶۔ رہین ستم.... مبتلائے مصائب۔ اگرچہ میں ہمیشہ مصائب دنیا میں
مبتلا رہا لیکن پھر بھی میں تجھے کبھی نہیں بھولا۔ مطلب یہ ہے کہ دنیاوی تفکرات
سے ہمارے جذبۂ عشق میں کمی نہیں ہوئی۔

۷۔ ہوائے کشتِ وفا۔۔۔ وفا کی آرزو۔ واں۔۔۔ کشتِ وفا ہیں۔ حاصل ۔۔۔ پہلے کے معنی نتیجہ اور دوسرے کے معنی باقی ہوئی چیز۔ میرے دل میں سے آرزوئے وفا ہی مٹ گئی۔ کیونکہ وفا کا نتیجہ سوائے حسرت کے کچھ اور حاصل نہ ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ حسرت ہی حاصلِ وفا ہے۔ اس لئے وفا کی آرزو بھی جاتی رہی۔

۸۔ میں ان تکلیفوں سے نہیں ڈرتا جو عشق میں اٹھانی پڑتی ہیں بلکہ بات یہ ہے کہ دل جو مظالمِ عشق کو برداشت کیا کرتا تھا نہیں رہا۔ لہٰذا جب مصائبِ عشق کو برداشت کرنے والا دل نہیں رہا۔ تو اب عشق کے ظلم و ستم کون اٹھائے۔

۴۱۔ رشک کہتا ہے کہ اسکا غیر سے اخلاص حیف ۱ عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

ذرہ ذرہ ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے ۲ گردشِ مجنوں بچشمکہائے لیلیٰ آشنا

شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز ۳ ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا

شکوہ سنجِ رشکِ ہمدیگر نہ رہنا چاہیئے ۴ میرا زانو مونس اور آئینہ تیرا آشنا

میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے ۵ عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا

کوہکن نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسدؔ
۶ سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

۱۔ جب میں اس کو غیر سے محبت کرتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ تو رشک کی وجہ سے مجھے افسوس ہوتا ہے لیکن عقل کہتی ہے۔ کہ یہ رشک و افسوس فضول ہے بھلا وہ بے مہر کسی کا دوست بھی ہو سکتا ہے جس طرح تیرے ساتھ اس نے بیوفائی کی ہے اسی طرح غیر کے ساتھ کرے گا۔ اس کی یہ محبت و اخلاص محض ظاہری ہے کیونکہ قدرت نے محبت کا مادہ اس کی طبیعت میں ودیعت نہیں رکھا۔

۲۔ میخانۂ نیرنگ۔۔۔ میخانہ طلسم مراد انقلابِ گردشِ ایام۔ گردش۔۔۔۔۔ آوارگی۔ چشمک۔۔۔۔ اشارہ چشم جس طرح گردش و آوارگی مجنوں چشمِ لیلیٰ کے

اشاروں کی پابند تھی۔ بالکل اسی طرح دنیا کا ہر ذرہ ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے۔ اور نیرنگیٔ عالم کا پابند محض اسی کو اس سے اختلاف ہے لکھتے ہیں: دُنیا کا ذرہ ذرہ بوقلمونی اور دگرگونی کے میخانے کا ایک ساغر ہے جو انسان کو بے خود و حیران بنا دیتا ہے جو گردشِ مجنوں کے لئے گردش (تکلیف دہ) ہے وہی گردش لیلےٰ کی آنکھوں میں بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اور مجنوں کو پیاری ہے۔

۳۔ شوق... عشق۔ سامان طراز.... سامان مہیا کرنے والا۔ نازش... فخر و ناز۔ اربابِ عجز.... عشاق۔ دستگاہ.... قابلیت، وسعت۔ عشاق جن کا پیشہ عجز و انکساری ہے۔ اور جو اپنی خصوصیات کی وجہ سے ذرہ اور قطرہ سے مشابہ ہیں۔ عشق ہی ان کے لئے سرمایۂ نازش و فخر ہے۔ یا ان کے لئے نازش کا سامان عشق ہی مہیا کرتا ہے۔ کیونکہ عشق ہی کی بدولت ذرہ میں صحرا کی وسعت اور قطرہ میں دریا کی قابلیت پیدا ہو جاتی ہے۔

۴۔ شکوہ سنج.... شاکی۔ ہمدیگر.... ایک دوسرے کا۔ بدگمانی کی وجہ سے ہم دونوں کو ایک دوسرے کی شکایت نہیں کرنی چاہئے۔ اس میں بات ہی کون سی ہے۔ زانو میرا ہمدم و مونس ہے یعنی میں تیرے خیال میں ہر وقت سر بزانو رہتا ہوں۔ اور تیرا رفیق تو آشنا آئینہ ہے یعنی تو ہمیشہ زانو پر آئینہ رکھ کر اس کو دیکھنے میں مصروف رہتا ہے۔ لہٰذا دونوں کی حالت ایک جیسی ہے۔ پھر شکایت.. چہ معنی؟ شعرا آئینہ کو زانو سے تشبیہ دیا کرتے ہیں۔

۵۔ میں ہوں اور میرے پہلو میں ایک وحشی دل ہے جو آفت کا پرکالہ ہے بسلامتی (عافیت) کا دشمن اور آوارگی کا دوست ہے اس لئے مجھ پر جو بھی آفت آئے وہ کم ہے۔ آفت کا ٹکڑا۔ محاورہ ہے۔

۶۔ کوہکن.... فرہاد.... تمثالِ شیریں.... شیریں کی تصویر۔ اے اسد فرہاد تو

محض شیریں کی تصویر بنانے والا سنگتراش تھا گویا عاشق صادق نہ تھا اگر وہ عاشق صادق ہوتا تو یہ ناممکن تھا۔ کہ پتھر سے سر مارتا اور محبوب پیدا نہ ہو جاتا۔ بجنوری و سعید کا خیال ہے۔ کہ بھلا کہیں پتھروں سے سر پھوڑنے سے معشوق پیدا ہوتے ہیں۔

۲۴۔ ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا ۱ بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا
مے وہ کیوں بہت پیتے بزم غیر میں یا رب ۲ آج ہی ہوا منظور ان کو امتحاں اپنا
منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے ۳ عرش سے ادھر ہوتا کاش کے مکاں اپنا
دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے ۴ بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا
درد دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلادوں ۵ انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا
گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا ۶ ننگ سجدہ سے میرے سنگ آستاں اپنا
تا کرے نہ غمازی کر لیا ہے دشمن کو ۷ دوست کی شکایت میں ہم نے ہمزباں اپنا

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے
۸
بے سبب ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

۱۔ ایک تو حسن مجسم کا ذکر اور اس پر میری رنگین بیانی، اس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ہمارا رازداں ہی ہمارا رقیب بن گیا۔ سب شارحین متفق ہیں۔ آسی لکھتے ہیں۔ کہ ہمارا رازدان ہمارا رقیب ہو گیا کہ ہمارے معشوق کا ذکر اپنی زبان سے کرتا ہے۔ یعنی ہم کو اتنا رشک ہے۔ کہ اس کا ذکر اور اس کا نام کسی اور کی زبان سے سننا نہیں چاہتے۔

۲۔ اس شعر میں افسوس اور شکایت کا اظہار ہے کہتے ہیں کہ محبوب نے بزم غیر میں حد سے زیادہ شراب اس لئے پی ہے کہ اس کو یہ اندازہ لگانا مقصود تھا کہ وہ کتنی شراب پی سکتا ہے۔ پھر بطرز افسوس کہتے ہیں کہ یہ ہماری بدقسمتی ہے

کہ اس کو بزمِ غیر میں آج اپنی عالی ظرفی کا امتحان لینے کی سوجھی۔ مطلب یہ ہے کہ یہ امتحانِ مے نوشی بجائے بزمِ غیر کے میری مجلس میں ہوتا۔ تو کیا لطف ہوتا طبا طبائی لکھتے ہیں۔ پی گئے کے مقام پر مصنف نے پیتے باندھا ہے جس سے معنی نکلتے ہیں۔ کہ بھلا بزمِ غیر میں وہ کیوں بہت سی شراب پیتے۔ یہ میری بدقسمتی ہے۔ کہ آج مجھے گھر میں آئے۔ تو بہت سی شراب پی گئے۔

۳۔ اس وقت ہمارا امکان عرش پر واقع ہے اور عرش سے زیادہ بلند کوئی اور مقام نہیں۔ اے کاش کہ ہمارا امکان عرش سے پرے ہوتا۔ پھر ہم عرش کو اپنا منظر بنا لیتے۔ اور اس کی اچھی طرح سیر کرتے مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی حقیقت و ماہیت سے بے خبر ہیں۔ یا یوں سمجھئے کہ ہم اور آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ لیکن عرش پر مکان ہونے سے یہ آرزو پوری نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ عرش عالمِ بالا کی آخری حد ہے۔

۴۔ حالی۔ یعنی خوب ہی ہوا۔ کہ معشوق کے در کا پاسبان ہمارا جان پہچان نکلا۔ اب ہمارے لئے اس بات کا موقع حاصل ہے۔ کہ وہ جس قدر چاہے ہم کو ذلت دے۔ ہم اس کو ہنسی میں ٹالتے رہیں گے اور یہ ظاہر کرتے رہیں گے۔ کہ یہ ہمارا قدیم آشنا ہے اور ہمارا اس کا قدیم سے یہی برتاؤ ہے۔

۵۔ میں اپنے دردِ دل کا حال کب تک لکھے جاؤں، داستانِ دردِ دل لکھتے لکھتے میری انگلیاں زخمی ہو گئی ہیں اور قلم سے خون ٹپکنے لگا ہے۔ اس لئے اب لکھا نہیں جاتا۔ لہٰذا اب مناسب ہے کہ میں خود ان کے پاس جاؤں اور ان کو اپنی حالت دکھاؤں۔ اس طرح وہ میری حالت کو سمجھ جائینگے یاد رہے۔ خامہ کی خونچکانی اور مضمون خونچکاں ـــــ انگلیوں کے فگار ہونے کے سبب سے ہے۔

۶۔ عبث .... فضول، ننگ۔ شرم —— اس شرم کی وجہ سے کہ مجھ جیسے ننگِ خلق نے آپ کے سنگِ آستاں پر سجدے کیئے ہیں۔ آپ نے سنگِ آستان کو فضول تبدیل کیا۔ کیونکہ وہ پتھر تو میرے ننگِ سجدہ سے گھستے گھستے خود بخود مٹ جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ میں اس قدر سجدے کرتا کہ وہ پتھر گھس جاتا۔ اس لئے اُسے تبدیل کرنے کی تکلیف آپ نے بیکار برداشت کی۔

۷۔ غمازی... چغلی۔ سخن چینی۔ میں نے اس خیال کے ماتحت کہ رقیب یار کے سامنے جاکر میری چغلی نہ کھائے۔ کہ جیسے وہ بھی آپ کی شکایت کر رہا تھا میں نے یار کی شکایت میں اس کو اپنا ہمزبان کر لیا ہے۔ اس طریق کار سے حاصل یہ ہے کہ اب وہ یار کے سامنے میری غمازی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ ایسی صورت میں اس پر بھی برابر کا الزام عائد ہوتا ہے۔

۸۔ حالی، آسمان کی دشمنی کے کیا خوب اسباب بتائے ہیں۔ اور اپنی دانائی اور ہنرمندی کس خوبصورتی سے ثابت کی ہے لوگ کہتے ہیں۔ کہ آسمان اس شخص کا دشمن ہوتا ہے۔ جو کہ دانا اور ہنرمند ہو پس چونکہ غالب نے آسمان کو اپنا دشمن بتلایا ہے۔ اس لئے ایک طریقے سے اپنے آپ کو دانا اور ہنرمند جتلایا ہے۔

۳۴۔ سرمۂ مفتِ نظر ہوں مری قیمت یہ ہے ۱ کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا

رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم ۲ تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا

۱۔ میں وہ سرمہ ہوں جس کی کوئی قیمت نہیں۔ اور اگر اس کی کچھ قیمت ہے۔ تو محض یہ ہے۔ کہ چشمِ خریدار پر میرا احسان رہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے کلام کی کوئی قیمت نہیں اور باوجود اس بے قیمتی کے اس کا فیض عام ہے یعنی ہر شخص اس سے بصیرت حاصل کر سکتا ہے۔

۲۔ اے دوست مجھے عشق میں رونے کی اجازت دیدے۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو۔ کہ میرے غمِ نہاں کا اثر تیرے چہرے پر نمایاں ہو جائے یعنی تیری پریشانی تیری پشیمانی کا موجب ہو۔ مطلب یہ ہے کہ رونے سے میرے دل کی بھڑاس نکل جائے گی۔ پھر میری بے چینی کا اثر تجھ پر پڑے گا

۴ ۴۔ غافل بوہمِ نازِ خود آرا ہے ورنہ یاں ۱ بے شانۂ صبا نہیں طرّہ گیاہ کا

بزمِ قدح سے عیشِ تمنا نہ رکھ کہ رنگ ۲ صیدِ زدامِ جستہ ہے اس دامگاہ کا

رحمت اگر قبول کرے کیا بعید ہے ۳ شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے ۴ پُرگل خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا

جاں درہوائے یک نگہ گرم ہے اسدؔ

۵
پروانہ ہے وکیل ترے دادخواہ کا

۱۔ غافل۔۔۔ انسان غافل۔ خود آرا۔۔۔۔۔ نازاں۔ شانہ۔۔۔۔ کنگھی۔ طرۂ گیاہ۔ گھاس۔ غافل انسان اپنی کاروائی پر نازاں ہے اور یہ سمجھتا ہے۔ کہ اس کا ہر اچھا فعل اس کی عقل و تدبیر کا نتیجہ ہے لیکن امر واقعہ یہ ہے۔ کہ دنیا میں ایک طرۂ گیاہ (گھاس کا پتہ) بھی ایسا نہیں ہے جس کو صبا بناتی سنوارتی نہ ہو۔ مطلب یہ ہے۔ بغیر حکم الٰہی کے پتہ بھی نہیں ہلتا۔ اور جو کچھ ہوتا ہے۔ وہ اسی کے حکم سے ہوتا ہے لیکن انسان غفلت کی بدولت اس کو اپنی حسنِ تدبیر کا نتیجہ خیال کرتا ہے۔ لطف الٰہی کو بادِ صبا سے تشبیہہ دی ہے۔

۲۔ بزمِ قدح۔۔۔ بزمِ شراب۔ رنگ۔۔۔ عیش و عشرت۔ صیدِ زدام جستہ وہ شکار جو جال میں سے نکل بھاگا ہو۔ دام گاہ۔۔۔ شکار گاہ۔ بزمِ مے نوشی سے عیش و عشرت کی تمنا نہ رکھنی چاہیئے کیونکہ عیش ایک ایسا شکار ہے جو اس

دام گاہ محفل عیش سے نکل کر بھاگا ہوا ہے۔ اور بھاگنے کا سبب یہ ہے۔ کہ اس نے محفل شراب میں رہنا باعث تکلیف خیال کیا۔ مطلب یہ ہے کہ عیش و عشرت کو ثبات نہیں۔ اس لئے اس کی تمنا نہیں رکھنی چاہیئے۔

۳۔ کیا بعید ہے...... کیا تعجب ہے۔ میں اپنے گناہوں کی وجہ سے اس قدر شرمندہ ہوں۔ کہ عذر گناہ کی بھی جسارت نہیں کر سکتا۔ کیا عجب ہے کہ رحمت کریم اس شرمندگی کو عذر گناہ کے عیوض قبول کرے اور میرے گناہ معاف کر دے۔ یعنی اس کی رحمت سے شرمندگی ہی عذر گناہ ہو جائے۔

۴۔ زخم کو گل سے تشبیہہ دی ہے۔ کہتے ہیں۔ میں شوق شہادت میں مقتل کو کس طرح خوش چلا ہوں۔ میری نگاہ کا دامن گل ہائے زخم سے بھرا ہوا ہے یعنی شوق شہادت میں میری نگاہوں کو زخم بھی پھول دکھائی دیتے ہیں۔

۵۔ ہوا...... خواہش۔ نگہ گرم...... محبت آمیز نظر۔ پروانہ...... پتنگا۔ داد خواہ ــــ فریادی یعنی اسد۔ اے محبوب۔ اسد کی جان تیری ایک نگاہ گرم کی آرزومند ہے۔ اور تیرے اس فریادی (اسد) کا وکیل پروانہ بنا ہے۔ یعنی جس طرح پروانہ شمع کی ایک نگاہ گرم سے جل کر خاکستر ہو جاتا ہے اسی طرح اسد بھی تیری نگاہ گرم سے جل جانے کا آرزومند ہے۔ پروانے کو وکیل اس لئے بنایا ہے۔ کہ وہ شمع کا عاشق ہے۔ اور جل کر اپنی جان دے دیتا ہے۔

۵۴۔ جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا ۱ کہتے ہیں ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا
رات دن گردش میں ہیں سات آسماں ۲ ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا
لاگ ہو تو اس کو ہم سمجھیں لگاؤ ۳ جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا
ہو لئے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ ۴ یا رب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا

موجِ خوں سر سے گذر ہی کیوں نہ جائے ۵ آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا
عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ ۶ مر گئے پر دیکھئے دکھلائیں کیا
پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

۱۔ خیال یہ ہے کہ اگر معشوق چاہے کہ ظلم سے باز آجائے تو وہ باز نہیں آ سکتا۔ معشوق کہتا ہے کہ میں نے ظلم کرنا ترک کر دیا۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ وہ ظلم سے ہرگز باز نہیں آیا۔ پہلے اور ظلم تھے۔ اب یہ ظلم ہے کہ وہ مجھے اس شرم سے منہ ہی نہیں دکھاتا۔ کہ میں نے تجھ پر بہت ظلم کئے ہیں۔ ظاہر ہے عاشق کے لئے یہ بہت بڑا ظلم ہے۔ کہ معشوق اسے اپنی شکل نہ دکھلائے۔ اس سلوک سے ثابت ہے۔ کہ ظلم سے باوجود توبہ کے باز نہیں آیا۔

۲۔ رات دن ساتوں آسمان گردش میں ہیں۔ اور اِن کی گردش کی وجہ سے ہمیشہ انقلاب ہوتا رہتا ہے۔ جب خود بخود حالات بدلتے جاتے ہیں تو ہمیں گھبرانے کی کیا ضرورت ہے۔ اسی گردشِ آسمانی میں ہمارے حالات بھی تبدیل ہو جائیں گے۔ ہمیں فکر و تردد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مرضی مولے از ہمہ اولے۔ مطلب یہ ہے کہ شاکر رہو جو بہتر ہوگا ہو جائے گا۔

۳۔ حالی۔ لاگ، دشمنی اور لگاؤ محبت، یہ مضمون عجب نہیں کہ کسی اور نے بھی باندھا ہو مگر ہم نے آج تک نہیں دیکھا، اگر باندھا بھی ہوگا تو اس خوبی اور لطافت سے ہرگز نہ باندھا ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کو نہ ہمارے ساتھ دشمنی ہے اور نہ دوستی۔ اگر دشمنی بھی ہوتی تو اس لئے کہ اس میں بھی ایک نوع کا تعلق ہوتا ہے۔ ہم اس کو دوستی سمجھتے۔ لیکن جب دوستی نہ ہو اور نہ دشمنی تو پھر کس بات پر دھوکہ کھائیں۔ قطع نظر خیال کی عمدگی اور ندرت کے لاگ اور لگاؤ ایسے دو لفظ بہم پہنچائے ہیں جن کا

ماخذ متحد اور معنی متضاد ہیں۔ اور یہ ایک عجیب اتفاق ہے جس نے خیال کی خوبی کو دوچند کر دیا ہے۔

۴۔ ہم نے نامہ بر کو خط دیا۔ کہ یار کو پہنچا دے لیکن پتہ نہیں ہمیں کیا ہو گیا کہ ہم بھی اس کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ اپنی اس محویت پر دل میں یہ خیال پیدا ہوا۔ کہ اپنا ہی تو خط ہے۔ کیا ہم اسے خود ہی پہنچائیں گے۔ یہ تو معیوب سی بات ہے لطف بیان تعریف سے بالا ہے۔ رشک جنوں محویت کا اظہار کیا ہے۔

۵۔ جا ہے ہمارے سر سے خون کا دریا کیوں نہ بہائے یعنی ہم کو قتل ہی کیوں نہ کر دیا جائے لیکن ہم آستانِ یار سے کبھی نہ اٹھیں گے۔ دوسرے مصرعہ میں کیا تحقیر کے لئے لائے ہیں۔ یعنی کیا ہم مرنے سے ڈر کر آستانِ یار سے اٹھ جائیں۔

۶۔ حالی۔ دکھلائیں کیا کا مرجع خدا کو ٹھہرایا ہے۔ کہتا ہے عمر بھر تو موت کا انتظار کرتا رہا۔ کہ مرجانے پر راحت مل جائے گی۔ اب تو مر گئے ہیں۔ دیکھئے خدا کیا دکھاتے ہیں۔ خوشی ملے گی یا وہی رنج کا رنج۔ آسی لکھتے ہیں۔ تمام عمر ہم نے مرنے کی راہ دیکھی۔ اب دیکھئے مرنے کے بعد ہم کیا رنگ دکھلاتے ہیں۔

۷۔ ہم نے اپنی تمام عمر ان کے عشق میں گنوا دی۔ تعجب ہے کہ ان کو ابھی تک یہ بھی معلوم نہ ہوا۔ کہ غالب کون ہے۔ اب کوئی ہمیں یہ بتلا دے۔ کہ ان کے اس سوال کا کیا جواب دیں۔ نعمت خان عالی سے

زمرد م یارمی پرسد کہ عالی کیست طالع بین
کہ عمرم در محبت رفت و کارم آخر رسید اینجا

۲۶ہم۔ لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی ۱ چمن زنگار ہے آئینہ باد بہاری کا
حریف جوشش دریا نہیں خود داری ساحل ۲ جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا

۱۔ لطافت۔ نزہت۔ مجردات۔ کثافت... مادیت۔ قاعدہ ہے۔ کہ لطافت بغیر کثافت کے جلوہ گر نہیں ہوتی یعنی مجردات بغیر مادہ کی آمیزش کے ظاہر نہیں ہوتے۔ مثلاً بادِ بہاری لطافت ہے۔ اس لئے اس کا جلوہ بھی چمن ہی کے ذریعہ نمودار ہُوا کرتا ہے۔ چمن اپنی سبزی کی وجہ سے آئینہ بادِ بہاری کا زنگار ہے یہی وجہ ہے۔ کہ چمن کی کثافت از زنگار چمن کے بغیر بادِ بہاری جلوہ گر نہیں ہو سکی مطلب یہ ہے۔ لطافت و کثافت لازم و ملزوم ہیں۔

۲۔ حریف... مدِ مقابل۔ جوشش دریا... طغیانی یعنی ساحل لاکھ اپنے تئیں بچائے۔ مگر جب دریا طغیانی پر آتا ہے۔ تو ساحل محفوظ نہیں رہ سکتا اسی طرح جہاں تو ساقی ہو وہاں ہوشیاری کا دعویٰ نہیں چل سکتا۔ یہ شعر حقیقت اور مجاز دونوں پر محمول ہو سکتا ہے۔ اپنے آپ کو ساحل اور ساقی کو جوشش دریا سے تشبیہہ دی ہے

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا	۱	درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا
تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد	۲	تھا لکھا بات کے بنتے ہی جدا ہو جانا
دل ہُوا کشمکشِ چارۂ زحمت میں تمام	۳	مٹ گیا گھسنے میں اس عقدہ کا وا ہو جانا
اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ	۴	اسقدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا
ضعف سے گریہ مبدل بدم سرد ہوا	۵	باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا
دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال	۶	ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا
ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا	۷	روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا
گر نہیں نکہتِ گل کو ترے کوچے کی ہوس	۸	کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا
تاکہ تجھ پر کھلے اعجازِ ہوائے صیقل	۹	دیکھ برسات میں سبز آئینہ کا ہو جانا
بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالب	۱۰	چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

۱۔ قطرہ دریا میں مل کر بظاہر فنا ہو جاتا ہے لیکن حقیقتاً اس کی موت واقع نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ اپنے مبداء سے جا ملتا ہے۔ اور یہی قطرہ کے لئے باعث مسرت ہے۔ اسی طرح جب درد حد سے گزر جاتا ہے۔ تو مریض کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ فنا ہو کر مریض کے سب دکھ دور ہو جاتے ہیں اور وہ بھی اپنے مبدءِ حقیقی سے جا ملتا ہے۔ گویا درد کا حد سے گذر نا ہی اس کے لئے دوا ہو جاتا ہے مطلب یہ ہے کہ فنا ہستی کا عین مقصود ہے۔

۲۔ قفلِ ابجد...... ایک قسم کا قفل جس پر بہت سے حروف کندہ ہوتے ہیں قفل بنانے والا ایک لفظ مقرر کر دیتا ہے جب ان حروف کی ترتیب سے وہ لفظ بنتا ہے۔ تو قفل فوراً کھل جاتا ہے۔ غالبؔ نے اپنی قسمت کو اس قسم کے قفل سے تشبیہہ دی ہے کہتا ہے کہ میری قسمت میں یہ لکھا تھا۔ کہ جب قفلِ ابجد کی طرح بات بن جائے یعنی تجھ سے ملاقات کی تدبیریں بن پڑیں تو تو مجھ سے فوراً جدا ہو جائے

۳۔ چارۂ زحمت...... تکلیف کو دور کرنے کی تدبیر۔ تمام ہوا...... فنا ہوا عقدہ...... گرہ۔ دِل کو عقدہ سے تشبیہہ دی ہے۔ میرا دل عالجہ کی کشمکش اور کوششوں ہی میں تمام ہو گیا۔ گویا میرا دل ایک عقدہ (گرہ) تھا جو کھولنے کی کوشش میں گھِس گھِس کر رہ گیا۔ اور اس کا کھولنا ناممکن ہو گیا۔ جب گرہ کو کھولنے کی زیادہ کوشش کی جائے۔ تو اور بھی سخت ہو جاتی ہے اور اکثر اوقات گرہ نہ گرہ باقی رہتی ہے۔ نہ ڈورا بس یہی کیفیت عاشق کے عقدۂ دل کی کشائش کی کشمکش میں ہوتی ہے۔

۴۔ اربابِ وفا...... عشاق۔ اللہ اللہ...... کلمۂ تعجب۔ اللہ اللہ آپ کو اپنے عاشقوں سے کس قدر نفرت ہوئی ہے۔ کہ اب آپ ان پر جفا کرنی بھی گوارا نہیں

کرنے پہلے مصرعہ سے دو مفہوم پیدا ہوتے ہیں (۱) پہلے جفا کرتا تھا لیکن اب جب یہ دیکھا کہ اس کی جفائیں بھی ہمیں عزیز ہیں۔ تو اس نے جفا بھی ترک کر دی (۲) ایک وہ زمانہ تھا۔ کہ ہم پر عنایات صرف کی جاتی تھیں۔ اور اب یہ حال ہے کہ ہم جفا سے بھی محروم ہیں۔

۵۔ باور آیا.... یقین آیا۔ پانی کا ہوا ہو جانا.... اس عمل کو مسئلہ استحالہ عناصر کہتے ہیں۔ اب تک ہم مسئلہ استحالۂ عناصر کے قائل نہ تھے۔ گویا یہ نہ مانتے تھے کہ پانی بھی ہوا ہو جاتا ہے یعنی ایک عنصر دوسرے عنصر میں تبدیل ہو جاتا ہے مگر اب یہ مسئلہ ہماری سمجھ میں آگیا کیونکہ ہم نے اس کو عملی طور پر دیکھ لیا۔ وہ اس طرح سے کہ جب ہمیں طاقت تھی۔ تو ہم گریہ کیا کرتے تھے لیکن اب ضعف اس قدر بڑھ گیا ہے۔ کہ گریہ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کے بدلے اب ہم سرد آہیں بھرتے ہیں یعنی پانی (گریہ) نے ہوا (آہ) کی صورت اختیار کر لی ہے۔

۶۔ میرے دل میں سے تیری انگشت حنائی کا خیال مٹنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا دشوار ہے۔ مثل مشہور ہے گوشت سے ناخن کبھی جدا نہیں ہوتا۔

۷۔ آہ یعنی غم فرقت میں روتے روتے تمام ہو جانا میرے نزدیک ایک ایسی معمولی بات ہے جیسے ابر بہاری کا برس کر کھلنا۔ یہ بالکل نرالی تشبیہ ہے۔ حسرت، آسی اور طباطبائی رونے روتے فنا ہو جانے کو باعث انبساط کہتے ہیں۔ اور سعید دونوں مطالب۔

۸۔ نکہت گل.... پھولوں کی خوشبو۔ گرد رہ جولان صبا.... صبا کے راستے کی گرد۔ اگر نکہت گل کو تیرے کوچے میں جانے کی آرزو نہیں۔ تو پھر وہ کیوں صبا کے راستے کی گرد بننا پسند کرتی ہے۔ یعنی پھر کیا سبب ہے کہ وہ (صبا میں شامل

ہو جاتی ہے نکہت گل کے صبا میں بس جانے سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اس کے ساتھ ساتھ تیرے کوچہ میں جانے کی آرزو رکھتی ہے۔

۹۔ اعجاز..... کرشمہ..... ہوا..... آرزو صیقل..... جلا، چمک آئینہ ..... مراد فولادی آئینہ جو برسات میں زنگ آلود یعنی سبز ہو جاتا ہے یعنی بعد۔ آئینہ فولادی کا سبز زنگ آلودہ ہو جانا ایک کرشمہ ہے جس کی تاویل شاعر یوں کرتا ہے۔ کہ یہ اس لئے ہے۔ کہ آئینہ کو صیقل پذیر ہونے کی آرزو ہوتی ہے شاعر کہتا ہے۔ کہ اس کرشمۂ آرزو کو دیکھنا کہ آئینۂ فولاد کی ہیئت بدل جاتی ہے۔

طباطبائی۔ برسات میں آئینہ فولادی پر زنگ آجاتا ہے۔ وہ گویا سبزہ ہے جسے ہوائے صیقل نے پیدا کیا ہے۔ ہوا یعنی خواہش و شوق ہے حاصل یہ ہے کہ شوق وہ چیز ہے۔ کہ فولاد پر بھی اثر کرتا ہے۔

آسی۔ اگر تو چاہے کہ ہوا یعنی خواہش اور عشق کے اعجاز کو دیکھے تو برسات میں آئینہ فولادی کو دیکھ اس پر زنگ لگ جاتا ہے۔ یہ زنگ محض جذبِ عشقِ صیقل کی وجہ سے ہے۔ کہ زنگ لگے گا۔ تو صیقل ضرور کی جائے گی۔ اس میں آئینہ کو معشوق و عاشق دونوں کہہ سکتے ہیں۔

حسرت۔ آج کل اعجاز ہوا یہاں تک بڑھا ہوا ہے کہ ہوا یعنی خواہش میں بھی وہی تاثیر اور اعجاز پیدا ہو گیا ہے۔ جو اصلی ہوا میں ہوتا ہے میرے نزدیک یہ مفہوم سب سے بہتر ہے۔

بیخود۔ آئینہ فولادی پر برسات کی ہوا سے زنگ آجاتا ہے مثال کے طور پر فرماتے ہیں۔ کہ صرف باغ اور صحرا ہی میں ہوا کا اثر ظاہر نہیں ہوتا۔ بلکہ آئینۂ فولاد تک اس سے متاثر ہوتا ہے۔

۱۰۔ جلوۂ گل..... سیر گل۔ ذوقِ تماشا۔ اشتیاق دید۔ وا ہو جانا..... کھل جانا

—— سیرِ گل (مطالعہ قدرت) سے مذاقِ دید پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے انسان کی آنکھ کو ہر کیفیت سے لطف اندوز ہونا چاہیئے۔ تاکہ شوقِ مطالعہ کی تربیت ہو سکے مطلب یہ ہے۔ انسان کو باغِ جہاں میں ہر رنگ کو دیکھنا چاہیئے تاکہ صانعِ حقیقی کو پہچان سکے۔

ردیف ب

۸۴ - پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب — دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب

پوچھ مت وجہ سیہ مستیٔ اربابِ چمن — ۲ — سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

جو ہوا غرقۂ مے بختِ سیاہ رکھتا ہے — ۳ — سر سے گذرے پہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب

ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر — ۴ — موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب

چار موج اٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سو — ۵ — موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب

جسقدر روحِ نباتی ہے جگر تشنۂ ناز — ۶ — دے ہے تسکیں بدمِ آبِ بقا موجِ شراب

بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر — ۷ — شہپرِ رنگ سے ہے بال کشا موجِ شراب

موجۂ گل سے چراغاں ہے گذرگاہِ خیال — ۸ — ہے تصور میں ز بس جلوہ نما موجِ شراب

نشہ کے پردے میں ہے محوِ تماشائے دماغ — ۹ — بسکہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما موجِ شراب

ایک عالم پہ ہیں طوفانیٔ کیفیتِ فصل — ۱۰ — موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب

شرحِ ہنگامۂ مستی ہے زہے موسمِ گل — ۱۱ — رہبرِ قطرہ بدریا ہے خوشا موجِ شراب

ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسدؔ

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

۱۔ بال کشا ہو۔۔۔ پر کھولے، پرواز کرے، اذفت۔۔۔ موسم بہار بطرب۔۔۔

شراب کی صراحی ...... بطخ کی شکل کا۔ دل ودست تنا ..... تیرنے کی قوت اور حوصلہ

پھر وہ وقت یعنی موسم بہار آگیا۔ کہ امواج شراب میں طلاطم پیدا ہو۔ اور موج شراب بطے (صراحی مے) کو شناوری کی قوت اور حوصلہ دے یعنی شراب کی صراحی گردش میں آئے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ برسات کا موسم آگیا ہے۔ اب ساغرو مینا گردش میں آنا اور شراب نوشی کا دور شروع ہونا چاہیئے۔ (سعید حسرت۔ طباطبائی)

آسی۔ پھر وقت آیا۔ کہ بط مے یعنی صراحی مے جو بشکل بط ہوتی ہے پرواز کرے۔ اور بط مے جو شناوری مے کو دوست رکھتا ہے تیرنے کے لئے شراب کا دریائے مواج عنایت کرے بیخود لکھتے ہیں "ایران میں قاعدہ ہے کہ انگور سنگ مرمر کے حوضوں میں بھر دیتے ہیں۔ جب آفتاب کی گرمی سے ان کا عرق نکلنا شروع ہوتا ہے۔ تو اس وقت انہیں پاؤں سے روندتے ہیں۔ اس کے بعد مٹی کی سبز صراحیاں ان حوضوں میں ڈال دیتے ہیں۔ بط اسی صراحی کو کہتے ہیں۔ مسامات کے ذریعہ عرق چھن چھن کر صراحیوں میں بھر جاتا ہے۔

۲۔ سیہ مستی ...... بدمستی۔ ارباب چمن ...... درخت پودے وغیرہ۔ تاک ...... انگور۔ چمن کے درختوں اور پودوں کی بدمستی کی وجہ نہ پوچھو جب ہوا انگور کی بیلوں کے سایہ میں سے گذرتی ہے۔ تو اس میں موج شراب کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر اس کے اثر سے ارباب چمن سیہ مست ہو کر جھومنے لگتے ہیں۔

۳۔ غرقہ مے ...... شراب میں ڈوبا۔ مدہوش ہوا بخت رسا .. خوش قسمت بال ہما ...... ہما کا پر مشہور ہے جس کے سر پر سے گذر جائے بادشاہ ہو جاتا ہے

کہتے ہیں جو شخص شراب کے دریا میں ڈوب گیا۔ سمجھ لو کہ بہت ہی خوش نصیب ہے۔ کیونکہ اگر موجِ شراب سر پر سے بھی گذر جائے۔ اگر شراب بالکل ہی مدہوش کر دے، تو پھر بھی وہ ہما کے سایہ کا اثر رکھتی ہے۔ (آسی۔ طبا طبائی)

حسرت لکھتے ہیں "بھی" سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر شراب کا استعمال باعتدال ہو تو اس کا کیا کہنا۔ لیکن اگر اس کا نشہ حد سے گذر جائے۔ تب بھی وہ بال ہما سے مشابہ ہے۔ سعید دبیخود ہم خیال ہیں۔ طبا طبائی نے دوسرے معنی یہ لکھے ہیں۔ کہ اگر ہم مے کشی کے پیچھے تباہ ہو جائیں۔ جب بھی موجِ شراب بال ہما سے کم نہیں ہے۔

۴۔ موجِ ہستی..... ہستیٔ گذران فیض ہوا..... تاثیر آب و ہوا برسات کا موسم وہ موسم ہے کہ اس کی تاثیر سے ہر طرف زندگی کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ کہ فیض ہوا سے موجِ ہستی موجِ شراب بن جائے۔ حقیقتاً موسم بہار میں قوتِ نمو میں ایک قسم کا جوش پیدا ہو جاتا ہے پس اس کی تاثیر سے ہر شے کا متکیف ہونا بالکل ممکن ہے شاعر اسی تاثیر سے موجِ ہستی کو موجِ شراب میں تبدیل کرنے کا آرزو مند ہے۔

۵۔ چار موج..... چار قسم کی موجیں جن کا ذکر مصرعہ ثانی میں ہے طوفانِ طرب..... جوشِ مسرت۔ موجِ گل..... یعنی بکثرت پھول۔ موجِ شفق..... یعنی آسمان پر شفق کی سرخیاں اڑنا۔ موجِ صبا..... ہوا کے جھونکے موجِ شراب..... شراب کا دور۔ یا شراب کی مہک اور لپٹیں۔ جوشِ انبساط سے ہر طرف چار موجیں اٹھتی ہیں یعنی موجِ گل، موجِ شفق، موجِ دریا اور موجِ شراب مطلب یہ ہے جوشِ مسرت ہر طرف پھوٹا پڑتا ہے۔ تختۂ زمین پر رنگ برنگ کے پھول کھلے ہیں آسمان پر شفق کی سرخیاں اڑ رہی ہیں فضا میں صبا اٹھکیلیاں کرتی پھرتی

ہے۔ اور یاروں میں شراب کا دَور چل رہا ہے جس کی مہک موجوں کی طرح اُٹھ رہی ہے

چار موج۔ بمعنی گرداب ...... دوسرے مصرعہ میں پانی کی موجوں کا ذکر بھی موجود ہے جو مفہوم ادا کیا گیا ہے۔ اس پر تمام شارحین متفق۔

۶۔روح نباتی .... قوت نامیہ۔ جگر تشنہ۔ تشنہ جگر، شائق۔ ناز .... اٹھکیلیاں کرنا۔ دم .... گھونٹ۔ آب بقا .... آبحیات جس قدر قوت نامیہ ناز و انداز کی شائق ہے یعنی جس قدر سبزہ لہلہانا اور اٹھکیلیاں کرنا پسند کرتا ہے۔ اسی قدر موجِ شراب آبحیات کے گھونٹ دے دے کر اس کو تسکیں اور قوت بخشتی ہے (آسی، سعید، حسرت)

طباطبائی۔ بیخود۔ ہم میں شراب سے جو امنگ اور جوش پیدا ہوتا ہے وہ قوتِ نامیہ کی حرکت ہے یعنی شراب قوتِ نامیہ کے حق میں وہ کام کرتی ہے جو کام کہ بارش نباتات کے حق میں کرتی ہے۔ اور ناز سے یہاں اینڈنا مقصود ہے۔ جو کہ لوازم فخر و ناز سے اور نشو و نما کے خواص سے ہے۔

۷۔رگِ تاک .... انگور کی بیل کی رگیں۔ شہپر .... وہ پر جس کی مدد سے پرندے اُڑتے ہیں۔ رنگ .... پتوں کی رنگینی۔ بال کشا .... پر کھولتا موجِ شراب انگور کی بیل میں خون بن کر دوڑ رہی ہے۔ اور پتوں وغیرہ میں رنگ بن کر ظاہر ہوتی ہے۔ گویا اس کا دوڑنا پرواز ہے۔ اور اس کی رنگینی پر پرواز کی رنگینی۔ مطلب یہ ہے۔ کہ یہ موجِ شراب ہی ہے۔ ادھر ان صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔

۸۔موجۂ گل .... موجِ گل، کثرتِ گل۔ زبس ... بہت زیادہ موجِ شراب کو موجِ گل اور ہجومِ گل کو چراغاں سے مشابہ کیا ہے چونکہ میرے

تصورات میں موجِ شراب بہت ہی زیادہ جلوہ نما ہے اور شراب اپنی رنگینی کے لحاظ سے موجِ گُل سے مشابہت رکھتی ہے۔ اور موجِ گُل چراغاں سے مشابہ ہے۔ اس لئے موجِ شراب کی بدولت میرے گذرگاہِ خیال میں چراغاں کی سی بہار پیدا ہو گئی ہے۔

۹۔ نشو و نما.... یعنی نشو و نمائے دماغ۔ سر... خیال۔ خواہش بر دماغ کی رعایت سے لائے ہیں۔ موجِ شراب کو دماغ کی نشو و نما کا بہت ہی زیادہ خیال ہے۔ اس لئے وہ نشہ کے پردے (صورت) میں دماغ کی نشو و نما کا معائنہ کر رہی ہے۔ اسعید حسرت۔ طبا طبائی، بیخود جس طرح خیال ترقی کرتے کرتے بہت بڑھ جاتا ہے۔ اسی طرح شراب کا نشہ دماغ میں پہنچکر بڑھتا رہتا ہے۔

۱۰۔ طوفانی.... جوش و خروش کا اظہار کرنے والے۔ یعنی موجۂ سبزہ نوخیز سے لے کر موجِ شراب تک۔ فصل.... موسمِ بہار۔ موجِ سبزۂ نوخیز سے لے کر موجِ شراب تک سب نے تمام عالم میں ایک طوفان اٹھا رکھا ہے۔ یعنی فصلِ بہار نے بیحد سبزہ و گل پیدا کئے ہیں اور شراب کے دور چل رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ سب مستی کے عالم میں ہیں۔

۱۱۔ شرح.... مفصل بیان۔ موسمِ گل بھی کیا عجیب چیز ہے۔ لطف یہ ہے موسمِ گل ہنگامۂ ہستی کی شرح ہے۔ یعنی بہار کے لطف بھی چند روزہ ہیں ہستی بھی ناپائدار ہے۔ پھر کہتے ہیں۔ موجِ شراب بھی کیا چیز ہے کہ قطرہ کو دریا سے ملا دیتی ہے۔ یعنی انسان کو بیہوش کر کے اس کی روح کو مبدءِ حقیقی سے ملحق کر دیتی ہے۔ صرف بیخود کو اختلاف ہے۔

موسمِ گل کا جوش بتا رہا ہے۔ کہ ہنگامۂ ہستی کی گرم بازاری خاص میرے

ہی دم سے دنیا میں قائم ہے۔ گویا میں ہنگامۂ ہستی کی شرح ہوں اور اسی طرح موجِ شراب دعوے کر رہی ہے۔ کہ میں قطرہ کو دریا تک پہنچانے میں خضرِ راہ کا حکم رکھتی ہوں یعنی جس طرح قطرہ فنا ہو کر دریا میں جا ملتا ہے۔ اسی طرح نشۂ شراب روح کو بے خودی کے عالم میں اس کے مرجع تک پہنچا دیتا ہے۔

۱۲-۱- اے اسد جلوۂ گل کو دیکھ کر میرے ہوش اڑے جاتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ پھر وہ وقت آگیا کہ موجِ شراب حرکت میں آئے یعنی شراب نوشی کا دور چلے۔ (ممکن ہے "دیکھ" امر کا صیغہ ہو، بال اور اڑنے میں مناسبت لفظی ہے۔

ردیف ت

۹۴- افسوس کہ دیداں کا کیا رزق فلک نے | ۱ | جن لوگوں کی تھی درخورِ عقدِ گہر انگشت
کافی ہے نشانی ترے چھلے کا نہ دینا | ۲ | خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت
لکھتا ہوں اسد سوزشِ دل سے سخنِ گرم | ۳ | تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت

۱- دیداں.... جمع الجمع دود کی یعنی کیڑے۔ عقدِ گہر... موتیوں کی لڑی درخور.... قابل، لائق۔ افسوس کا مقام ہے جن لوگوں کی انگلیاں سلکِ گوہر کے قابل تھیں۔ آسمان نے آج ان کو کیڑوں کا رزق بنا دیا۔ یعنی آج مرنے کے بعد ان کو کیڑے کھا رہے ہیں (طبا طبائی، آسی، حسرت، سعید، دیداں کی جگہ "دنداں" متن قرار دیتے ہیں جن لوگوں کی انگلیاں سلکِ گوہر کے قابل تھیں افسوس کہ فلک نے انہیں دنداں کا

رزق بنا دیا۔ وہ لوگ حسرت سے انگلیاں کاٹ رہے ہیں مطلب یہ ہے کہ صاحبِ کمال مفلسی اور حسرت کی زندگی بسر کرتے ہیں اور نااہل چین اور آرام کی۔

۴۔ نشانی کا چھلہ دینا مشہور بات ہے، کہتے ہیں تو جب مجھ سے جدا ہو کر سفر میں جا رہا تھا تو تو نے مجھے نشانی کا چھلا نہ دیا۔ بلکہ بوقتِ سفر خالی انگلی دکھا دی۔ کہ دیکھ لو میرے پاس چھلا نہیں ہے۔ ورنہ میں تمہیں چھلا ضرور دیتا۔ اے میرے دوست میرے لئے تیری یہی نشانی کافی ہے کہ تو نے مجھے خالی انگلی دکھا دی۔ خالی انگلی دکھانے سے دو باتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ اس نے مجھے شوخی سے انگوٹھا دکھا دیا جس کا مطلب یہ ہے کہ چھلا کوئی نہیں ملتا مزے کرو۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ میں یہی یاد رکھوں گا کہ تو نے مجھے نشانی نہ دی۔

۴۔ سخن گرم..... کلام پُر تاثیر، عمدہ کلام۔ انگشت رکھنا..... حرف رکھنا عیب نکالنا۔ مطلب یہ ہے میں ایسے عمدہ اشعار لکھتا ہوں کہ کوئی شخص میرے کلام میں عیب نہیں نکال سکتا۔ رعایت لفظی سے شعر بلند ہو گیا ہے۔ لفظی مفہوم یہ ہے کہ میرا کلام سوزشِ دل کی وجہ سے اس قدر گرم ہوتا ہے کہ کوئی اس پر انگلی نہیں رکھ سکتا۔

۵۰۔ رہا گر کوئی تا قیامت سلامت ۱ پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت
جگر کو مرے عشقِ خونابہ مشرب ۲ لکھے ہے خداوندِ نعمت سلامت
علی الرغم دشمن شہیدِ وفا ہوں ۳ مبارک مبارک سلامت سلامت
نہیں گر سر و برگِ ادراکِ معنے
تماشائے نیرنگِ صورت سلامت

۱۔ اگر کوئی روزِ قیامت تک بھی زندہ رہے تو پھر کیا آخر ایک دن تو مرنا

ہی ہے مطلب یہ ہے۔ کہ موت سے بچنا ناممکن ہے۔ اگر کوئی قیامت تک بھی جیئے تو پھر بھی اُسے مرنا پڑے گا۔ مشہور ہے۔ قیامت کے دن پہلے سب مرجائیں گے اور پھر زندہ ہوں گے۔ بنجود کہتے ہیں۔ کہ قیامت کے دن مرنے میں یہ لطف پیدا ہو گیا ہے۔ کہ روزِ قیامت ـــــ زندہ ہونے کا دن ہے اس دن کسی شخص کا مرنا لطف سے خالی نہیں۔

۲۔ خونابہ مشرب ..... خالص خون پینے کا عادی۔ عشق کا مشرب خون پینا ہے۔ اُس نے میرے خونِ جگر سے پرورش پائی ہے۔ اس احسان کی وجہ سے عشق میرے جگر کو "خداوندِ نعمت سلامت" لکھتا ہے۔ ظاہر ہے یہ القاب ولیٔ نعمت کو ہی لکھا جاتا ہے۔

۳۔ علی الرغم ..... برخلاف۔ مقابلے میں۔ مبارک سلامت ..... کلمات مبارک باد۔ رقیب (دشمن) شہیدِ وفا نہیں۔ بلکہ اس کے مقابلے میں ہیں شہیدِ وفا ہوں اور محبت میں شہیدِ وفا ہونا بہت بڑا امتیاز ہے۔ اس امتیاز پر خود کو مبارک مبارک سلامت سلامت کہہ کر مبارک باد دیتے ہیں۔ اس تبریک اور امتیاز کی وجہ یہ ہے۔ کہ شہید ہونا باعثِ زندگیٔ جاوید ہے۔

۴۔ سروبرگ ..... سامان، قوت ..... ادراکِ معنی ..... دریافتِ معنی معنی سمجھنا۔ معنی ..... حقیقت، صورت ..... معنی کی ضد، اجسام ظاہری۔ اگر ہم میں رازِ حقیقت کو دریافت کرنے کی قوت نہیں تو نہ سہی، اجسام ظاہری کا مطالعہ ہی ہمارے لئے کافی ہے۔ کیونکہ مجاز حقیقت کا راز ہے۔

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ
یار لائے مرے بالیں پہ اُسے پر کس وقت[۱]

۱۔ مند گئیں ..... بند ہو گئیں، موت آگئی۔ پر ..... مگر۔ بالیں .....

سرہانے۔ میرے دوست یار کو میری بالیں پر کس وقت لائے ہیں کہ میں اُسے
پوری طرح دیکھ بھی نہ سکا۔ یعنی میں نے اُن کو دیکھنے کے لئے آنکھیں کھولنے
کی کوشش کی لیکن اسی کوشش میں میری آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہوگئیں
مطلب یہ ہے۔ کہ یاروں نے احسان کیا۔ لیکن بے وقت۔

۵۱۔ آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست ۱ دودِ شمعِ کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست

اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر ۲ کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست

خانہ ویراں سازیِ حیرت تماشا کیجئے ۳ صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتۂ رفتارِ دوست

عشق میں بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے ۴ کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمارِ دوست

چشمِ مارو شن کہ اُس بیدرد کا دل شاد ہے ۵ دیدۂ پرخوں ہمارا ساغرِ سرشارِ دوست

غیر یوں کرتا ہے میری پرسش اُسکے ہجر میں ۶ بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوارِ دوست

تاکہ میں جانوں کہ ہے اسکی رسائی واں تلک ۷ مجھ کو دیتا ہے پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست

جبکہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعفِ دماغ ۸ سر کرے ہے وہ حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست

چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر ۹ ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیِ گفتارِ دوست

مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجئے ۱۰ یا بیاں کیجے سپاسِ لذتِ آزارِ دوست

یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آئی ہے آپ
ہے ردیف شعر میں غالبؔ زبس تکرارِ دوست

۱۔ آمدِ خط۔۔۔ سبزہ آغاز۔ بازار سرد ہوا۔۔۔ خریدار کم ہو گئے۔ دودِ شمع
کشتہ۔۔۔ بجھی ہوئی شمع کا دھواں۔ علامتِ تاریکی۔ خطِ یار کی برائی
ہے۔ خط کے آنے سے محبوب کے حسن کا بازار سرد ہو گیا۔ گویا خطِ
رخسارِ دوست بجھی ہوئی شمع کا دھواں تھا جس کے اٹھنے ہی اجتماعِ
عشاق منتشر ہو گیا۔

۲-۱ اے دلِ ناعاقبت اندیش تو اپنے شوقِ دیدار کو ضبط کر، بھلا جلوۂ دیدارِ دوست کی کوئی تاب لا سکتا ہے۔ ممکن ہے مصرعہ ثانی میں واقعہ طور کی طرف اشارہ ہو کہ موسیٰ بھی دیدارِ یار کی تاب نہ لا سکے تھے۔

۳- خانہ ویراں سازی ... گھر کا ویران کرنا اور اُجاڑنا۔ تماشا کیجئے ... دیکھئے۔ رفتہ ... وارفتہ، والہ و شیدا۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے کہ حیرت نے میرے گھر کو کس طرح اُجاڑا ہے۔ کہ میں نقشِ قدم کی طرح رفتارِ دوست پر مٹا۔ نقشِ قدم کی خصوصیت یہ ہے کہ قدم کا نشان زمین پر پڑ جاتا ہے۔ اور وہ چشمِ حیرت کی طرح کھلا رہتا ہے۔ یہ نشان بہت قلیل مدت میں مٹ جاتا ہے۔ غالبؔ نے انہیں خصوصیات سے استفادہ کیا ہے۔ اور اپنے تئیں بہ اعتبار حیرانی، پامالی، خانہ بربادی اور ناپائیداری نقشِ قدم سے تشبیہہ دی ہے۔

۴- میں اگرچہ دوست کا بیمار (عاشق) تھا اور اسی کے عشق کی بیماری میں مجھ کو مرنا چاہیئے تھا۔ لیکن افسوس کہ میری موت اس طرح سے واقع نہیں ہوئی بلکہ میں رشکِ دشمن کی بیداد سے مرا۔ افسوس بھی اسی بات کا ہے کہ میں کشتۂ بیدادِ دوست نہ ہو سکا۔ کشتۂ بیدادِ رشکِ دشمن ہوا۔ سعیدؔ نے بیدادِ رشک کی مزید تشریح یہ کی ہے کہ مجھ کو از راہِ رشک یہ گوارا نہ ہو سکا۔ کہ تو دشمن پر ظلم کرے اور مجھ کو اس لطف سے محروم رکھے۔ اس لئے اس رشک سے میں مر گیا۔

۵- مصرعہ ثانی میں "ہے" "محذوف" ہے۔ اور یہ اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ دیدہ پُرخون کی رعایت سے "چشمِ ما روشن" اور "چشمِ ما روشن" کے لحاظ سے "دلشاد" لائے ہیں۔ "چشمِ ما روشن دل ما شاد" خوشی کے موقعہ پر بولتے ہیں۔ ساغر سرشار ... ساغر لبریز۔ اگر اس بے درد کا دل ہماری خونفشانی سے خوش ہے تو ہم بھی خوش ہیں۔ یہ کیا کم ہے۔ کہ ہمارا دیدہ پُرخوں دوست کے لئے ساغر

لبریز ہے

۶- یہ قطعہ ہے۔ اس میں دشمن کے برتاؤ کی تصویر کھینچی ہے۔ پرسش بیمار پرسی۔ عیادت۔ اس کے ہجر میں رقیب میری اس طرح عیادت کرتا ہے جیسے کوئی بہت بے تکلف دوست کسی دلی دوست کی۔

۷- اور اس پرسش کا اصل مطلب یہ ہے۔ کہ وہ مجھ پر ظاہر کرے۔ کہ اس کی رسائی یار تک ہے۔ اس لئے مجھ کو دوست کے وعدۂ دیدار کا پیغام دیتا ہے۔ گویا وہ دوست بن کر میرے دل کو جلاتا اور آتشِ رشک کو بھڑکاتا ہے۔

۸- سر کرے ہے ....شروع کرتا ہے۔ حدیث .... بات۔ اس کی اس قسم کی گفتگو سن کر میں کہتا ہوں۔ ضعف دماغ سے مجھ کو باتیں سننے کا یارا نہیں۔ لب۔ اپنا سلسلۂ کلام مختصر کر۔ یہ سن کر وہ دوست کی زلفِ عنبریں کی گفتگو شروع کر دیتا ہے۔ اگرچہ ضعف دماغ میں خوشبو بھی معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن زلفِ یار کی خوشبو بھلا کیسے بری معلوم ہو سکتی ہے اس لئے میں اس کو روک نہیں سکتا۔ اور اس کی گفتگو جاری رہتی ہے گویا رقیب کے سامنے ضعف دماغ کا عذر بھی نہیں چلتا۔ اور وہ کسی طرح میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔

جب رقیب مجھ کو چپکے چپکے روتا ہوا دیکھتا ہے تو وہ مجھ کو خوش کرنے کے لئے یار کی شوخیٔ گفتار کا ذکر ہنس ہنس کر شروع کر دیتا ہے لیکن میرا حال یہ ہے۔ کہ میں رشک سے مرا جاتا ہوں۔ اور دل ہی دل میں کڑھتا ہوں

۱۰- ایسی حالت میں میں رقیب کی ان مہربانیوں کی شکایت کروں۔ جو وہ

میرا دل جلانے کی غرض سے میرے حال پر صرف کرتا ہے یا آزارِ دوست کی لذت کا شکریہ ادا کروں کہ وہ اِن کا اس قدر محرم راز ہو گیا ہے۔ مہربانی طنزاً استعمال کیا ہے اور شکریہ اس لئے کہ عاشقوں کو معشوق کی آزار رسانی ہی مرغوب ہوتی ہے۔

۱۱۔ مجھے اپنی یہ غزل جی سے پسند ہے۔ کیونکہ اس کے ہر شعر کی ردیف میں بار بار "دوست" کا لفظ آیا ہے۔ اور دوست بہت مجھے بہت ہی مرغوب ہے۔

ردیف ج

۵۲۔ گلشن میں بندوبست برنگِ دگر ہے آج | ۱ | قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج
آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ | ۲ | تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج
اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل | ۳ | سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہے آج

۱۔ برنگِ دگر۔۔۔ بطریق دیگر۔ حلقہ بیرون در۔۔۔ یعنی بیرونِ در کی زنجیر کا حلقہ مراد وہ شخص جس کو اندر آنے کی اجازت نہ ہو۔ آج باغ میں نئی طرز کا انتظام ہے قمری باغ کا پرندہ ہے لیکن آج اس کو بھی باغ کے اندر آنے کی اجازت نہیں گویا نئے انتظام کے ماتحت قمری کے گلے کا طوق حلقۂ بیرونِ در بن گیا ہے (آسی بعید۔ طباطبائی)

بیخود۔ حلقہ بیرون در سے دروازہ کی محراب مراد ہے گلشن میں بہار آگئی ہے۔ اس لئے دوسرا انتظام کیا گیا ہے حلقہ بیرونِ در یعنی محراب در قمری کا طوق لگ گئی ہے۔ آج جو شخص چمن کی سیر کو آئے گا۔ وہ قمری کی طرح گرفتار

جمع ہو جائے گا

حسرت. ہمارا محبوب سیرِ چمن کو آنے والا ہے۔ اس لئے کسی کو باغ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں اور گلوئے قمری کا طوق حلقہ بیرونِ در بنا ہوا ہے

۵۔ آج میری آہ کے ساتھ ایک دل کا ٹکڑا باہر آجاتا ہے۔ شاید آج ہمارے تارِ نفس (آہ) نے اثر کو شکار کر لیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آج ہماری آہ میں تاثیر پیدا ہوئی ہے (سوائے حسرت تمام متفق)

حسرت۔ تارِ نفس کی کمند نے اثر کو شکار کر لیا ہے۔ یعنی آج ہماری آہ میں اثر پیدا ہوا ہے لیکن اس اثر کا نتیجہ اُلٹا ہے کہ ہر فغاں کے ساتھ ایک پارۂ دل باہر آتا ہے یعنی اثرِ آہ سے دل ٹکڑے ہوا جاتا ہے۔ اثرِ آہ کے اس اُلٹے نتیجے کے ذکر سے اپنی بدبختی کا اظہار منظور ہے۔

۶۔ کنارہ کر... علیحدہ ہو جا، چل... رخصت ہو۔ عافیت... آرام و راحت۔ سیلاب گریہ... طوفانِ اشک۔ اے آرام و راحت اور اے انتظام اب میرے مکان سے رخصت ہو جا۔ کیونکہ آج میرے رونے کا طوفان در و دیوار گرانے کے درپے ہے۔ مبادا تمہیں بھی نقصان پہنچے۔

۷۔ ہم مریضِ عشق کے تیماردار ہیں ۔ اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

مسیحا... معشوق۔ علاج... محاورہ ہے بمعنی سزا۔ دعویٰ یہ ہے کہ مرضِ عشق کسی طرح اچھا نہ ہوگا۔ کہتے ہیں۔ چلو ہم مریضِ عشق کی تیمارداری کرتے ہیں لیکن پہلے یہ بتلا دو کہ اگر ہماری اس تیمارداری اور دیکھ بھال کے باوجود مریضِ عشق اچھا نہ ہوا۔ تو پھر مسیحا کی کیا سزا ہے۔ الفاظ سے ظاہر ہے کہ مسیحا کو یہ شکایت ہے کہ بیمار کی تیمارداری صحیح طریقے سے نہیں ہوتی۔ اس لئے علاج کامیاب نہیں ہوتا۔ اور تیماردار ادھر یہ سمجھے ہوئے ہے کہ مریضِ عشق کبھی اچھا

نہیں ہو سکتا۔ اس لئے وہ تیمارداری کا ذمہ لیتا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ شرط بھی لگاتا ہے کہ اگر باوجود تیمارداری کے مریض اچھا نہ ہوا۔ تو مسیحا کا کیا علاج۔

ردیف چ

۵۲۔ نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ ۱ اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

کمالِ گرمیِ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ ۲ برنگِ خار مرے آئینہ سے جوہر کھینچ

تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار اے دل ۳ کیا ہے کس نے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ

تری طرف ہے بہ حسرت نظارۂ نرگس ۴ بکوریِ دل و چشمِ رقیب ساغر کھینچ

بہ نیم غمزہ ادا کر حقِ ودیعتِ ناز ۵ نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ

مرے قدح میں ہے صہبائے آتشِ پنہاں

بروئے سفرہ کبابِ دلِ سمندر کھینچ

۱- مصرعہ اول... ترکِ آرزو نہ کر۔ انتظار کھینچنا... انتظار کرنا۔ اگر شراب نہیں ہے۔ تو ساغر ہی کا انتظار کر۔ کیونکہ بزمِ آرزو سے کسی حالت میں بھی سانس باہر نہ لینا چاہئیے۔ مطلب یہ ہے کہ ترکِ آرزو کسی حالت میں بھی درست نہیں۔ دُنیا یہ امید قائم۔

۲- گرمیِ سعیِ تلاشِ دید... دیدارِ یار کی جستجو میں دوڑ دھوپ۔ برنگ... مانندِ آئینہ... حسرتِ دیدار۔ دیدارِ یار کی جستجو میں میں نے بہت زیادہ دوڑ دھوپ کی اور دوڑ دھوپ میں میں نے حد سے زیادہ کوششیں صرف کیں۔ اور تکلیفیں اٹھائیں۔ کہتا ہے ان سرگرمیوں کی کیفیت مجھ سے نہ پوچھو۔ میرے

آئینہ حسرت دیدار میں سے جوہر آئینہ کو خار کی طرح نکال کر دیکھ لو۔ تم کو خود ہی معلوم ہو جائے گا۔ کہ یہ گرمی سعیٔ تلاش دید میں لگے ہیں۔ مطلب یہ ہے حسرت دیدار نے حیران بنایا۔ آئینہ حیران ہوتا ہے۔ اور اس میں جوہر ہوتے ہیں چنانچہ اس آئینہ میں بجائے جوہر کے کانٹے لگے ہیں۔

بیخود۔ میرے آئینہ کمال کی گرمی وسعی کا حال مجھ سے نہ پوچھو۔ اہل نظر کی تلاش وجستجو میں اتنی تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ کہ اب میرے آئینہ کمال کا جوہر میری آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے۔ قدردان کمال کے نہ ملنے سے مایوس ہو کر یہ چاہتا ہوں کہ کوئی شخص ایسا ہی مجھ کو مل جائے جو جوہر کمال کو میرے آئینہ کمال سے کانٹے کی طرح کھینچ لے۔ (سعید)

۳۔ اے دل بستر پر پڑے پڑے انتظار یار کرنا۔ آرام کرنے کا بہانہ ہے۔ یہ انتظار نہیں ہے۔ ذرا یہ تو بتایئے کس نے اشارتاً کہا ہے کہ تو بستر کے ناز اٹھا۔ بستر کے ناز اٹھانا تو راحت طلبی کی علامت ہے۔ اس لئے اٹھ راحت کو ترک کر۔ ناز بستر سے مختلف مفہوم پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً صحرا نوردی کر۔ جستجوئے معشوق کر۔ یا اس انتظار کی ایذا اٹھانے سے مرجانا بہتر ہے (طباطبائی۔ آسی۔ سعید)

حسرت۔ اے دل تیری راحت کے لئے میل خواب اور ناز کشی کی بجائے انتظار یار کافی ہے۔

۴۔ اے محبوب تیری طرف نرگس بڑی حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔ کہ تو کیوں شراب نہیں پیتا۔ تو اس شرم سے شراب نہیں پیتا۔ کہ وہ تجھے دیکھ رہی ہے۔ لے میں تجھے بتاتا ہوں کہ چشم رقیب اور دل رقیب یعنی چشم و دل نرگس اندھے ہیں۔ اس لئے تو بے تکلف شراب پی اور اس سے نہ شرما نرگس کو رقیب

اس لئے کہا ہے۔ کہ وہ یار کی طرف بحسرت دیکھ رہی ہے۔ اور چونکہ چشم نرگس دیکھ نہیں سکتی۔ اس لئے اس کو کور چشم اور کوردل لکھا ہے۔ نیز نرگس کو ساغر سے بھی مشابہت ہے (آسی۔ طبا طبائی۔ بیخود)

حسرت۔ اگر نرگس تیری طرف بڑی حسرت سے دیکھ رہی ہے تو تجھ کو چاہیئے کہ باغ میں اس طرح بے تکلف شراب نوشی میں مشغول نہ ہو سعید۔ نرگس جو تیری طرف بڑی حسرت سے دیکھ رہی ہے اس لئے تو میرے اس رقیب کی کوری دل و چشم کی خواہش میں جام شراب پی۔ تاکہ وہ اندھی ہو جائے۔ اور تجھے نظر نہ لگے۔

۵۔ ودیعت۔۔۔۔ امانت۔ نیام۔۔۔۔ میان۔ لفظی صنعت یہ ہے۔ کہ اگر "نیام" کا الف نکال دیا جائے۔ تو "نیم" باقی رہ جاتا ہے۔ میں نے تیرے ناز کے خنجر کو پردۂ زخم جگر کی نیام میں امانت رکھا۔ اب تو میری اس امانت داری کا حق نیم غمزہ سے ادا کر۔ مطلب یہ ہے۔ کہ میں نے مدتوں تیرے خنجر ناز کو اپنے جگر میں بطور امانت رکھا۔ تو اس خنجر کو میرے جگر سے نکال لے اور مجھے حق امانتداری ادا کرنے۔ حق امانت میں نیم نگاہ طلب کرتے ہیں۔ (حسرت۔ آسی)

طبا طبائی۔ ناز وادا۔ تجھ میں خدا کی ودیعت ہے۔ اس کا حق ادا کرنے کے لئے ادا کر۔ اور اس طرح خنجر ادا کو کھینچ کہ معلوم ہو۔ پردۂ جگر عاشق سے کھینچ کر رہا ہے۔ یعنی ادا تیغ بے نیام ہے۔ اگر اس کے لئے کوئی نیام ہے۔ تو زخم جگر عاشق ہے۔ طبا طبائی کا خیال ہے۔ کہ معنی کا خون ہو گیا ہے۔

سعید۔ شرح ہاشمی اندر رسالہ اردو۔ تو نے جو خنجر جگر میں بھونک دیا ہے اب ناز کا حق ادا کر اور اُسے باہر اس طرح کھینچ لے کہ زخم زیادہ کشادہ اور زخم کا منہ آسانی سے ہو جائے۔ خنجر بھونکنا غمزہ کامل کی نتیجہ تھی اور اب اس طرح کھینچنا یا پردۂ زخم سے نکال لینا نیم غمزہ ہے۔ کہ ناز کا حق ادا کرنے میں جو کسر تھی وہ پوری ہو جائے

بیخود۔ ادا و ناز جو تجھ کو اللہ تعالےٰ نے بخشے ہیں۔ وہ گویا اس کی امانت ہے اس امانت کا حق نیم غمزہ سے ادا کر۔ اگر غمزہ پورا ہو جائے گا۔ تو فوراً عاشق کی جان نکل جائیگی۔ اس لئے تجھ کو لازم ہے کہ نیم غمزہ سے کام لے۔ اور اس کی مثال ایسی ہے کہ اگر زخم جگر میں وار کرنے کے بعد خنجر چھوڑ دیا جائے گا۔ تو بسمل فوراً جان بحق ہو جائے گا۔ اور اگر وار کرنے کے بعد خنجر زخم میں سے کھینچ لیا جائے گا تو مجروح کے مرنے میں ضرور دیر لگے گی۔ اور شاید جانبر بھی ہو جائے اس لئے نیم غمزے سے کام لینا بہتر ہے۔

۶۔ قدح.... پیالہ مراد دل صہبا.... شراب آتش پنہاں.... آتش عشق سفرہ.... دسترخوان سمندر.... ایک جانور جو آگ میں پیدا ہوتا ہے کھینچ .... یعنی چن دے میرے پیالے میں آتش پنہاں ہے اس لئے میرے دسترخوان پر سمندر کے دل کے کباب ہونے چاہئیں مطلب یہ ہے جب شراب آتش پنہاں کی ہے تو اس کے ساتھ کباب بھی سمندر کے دل کے چاہئیں جو آتشی کیڑا ہے نیز دل بھی باطنی شئے ہے اور آتش پنہاں بھی۔

ردیف د

۵۴۔ حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد ۱ بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد

منصب شیفتگی کے کوئی بھی قابل نہ رہا ۲ ہوئی معزولیٔ انداز و ادا میرے بعد

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے ۳ شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

خوں ہے دل خاک میں احوال بتاں پر یعنی ۴ ان کے ناخن ہوئے محتاج حنا میرے بعد

درخور عرض نہیں جوہر بیداد کو جا ۵ نگہ ناز ہے سرمے سے خفا میرے بعد

بے جنونِ اہلِ جنوں کیلئے آغوشِ وداع ۶ چاک ہوتا ہے گریباں سے جدا میرے بعد

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگنِ عشق ۷ ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی ۸ کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

آئے ہے بیکسیٔ عشق پہ رونا غالبؔ

۹ کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

۱ غمزہ... چشم و ابرو سے اشارہ کرنا۔ اہلِ جفا... معشوق۔ جب تک میں زندہ رہا حُسن غمزے کی کشمکش میں مبتلا رہا۔ کیونکہ غمزہ ہر وقت حُسن کو اکساتا تھا کہ عاشق پر وار کرے۔ میرے مرنے کے بعد یہ کشمکش ختم ہو گئی۔ اور معشوق آرام سے ہو گئے مطلب یہ ہے۔ کہ حسن و غمزہ کی جفا کاریاں میری زندگی تک تھیں۔ کیونکہ میں ہی اُن کے ناز و انداز اُٹھانے والا تھا۔ اب نہ کوئی مجھ جیسا عاشق صادق ہوگا نہ اُن کے ظلم و ستم اُٹھائے گا۔

۲ منصب شیفتگی... عہدہ عاشقی۔ معزولی... تعطل۔ میرے مرنے کے بعد اب کوئی شخص موجود نہیں جو عہدہ عاشقی کے قابل ہو۔ اس لئے معشوق کے انداز و ناز بھی معطل ہو گئے منصب اور معزولی مناسب الفاظ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب منصب عاشق نہیں رہا۔ تو انداز و ادا جو اس کے لوازمات میں سے ہیں۔ خود بخود معزول ہو گئے۔ آتش مرحوم کا شعر اس سے بہت بلند ہے ؎

ہو گیا سلسلہ مہر و محبت برہم ناز نین بھول گئے غمزہ و ادا میرے بعد

۳ قاعدہ ہے جب شمع کو بجھایا جاتا ہے تو اس سے دھواں اُٹھتا ہے حقیقتاً وہ دھواں نہیں ہوتا بلکہ وہ شمع کے سوگ میں شعلہ شمع سیہ پوش ہو جاتا ہے اسی طرح جب میرے مرنے سے شعلہ عشق بجھا۔ تو وہ بھی میرے سوگ میں سیہ پوش ہو گیا۔ خلاصہ شعر یہ ہے کہ میرے مرنے سے عشق کا خاتمہ ہو گیا اور یہی وجہ اس کے سیہ پوش ہونے کی ہوئی۔ سیاہ

لباس سے سوگ کا اظہار ہوتا ہے۔

ہم۔خاک ... قبر۔خوں ہے دل ... دل غمگین ہے۔میرا دل قبر میں بھی معشوقوں کے حال پر غمگین ہے۔اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میرے مرنے سے ان کے ناخن مہندی کے محتاج ہو گئے ہیں۔کیونکہ جب تک میں زندہ تھا تو وہ میرے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کر لیا کرتے تھے۔لیکن اب ان کو آرائش کے لئے مہندی لگانی پڑتی ہے۔(آسی۔بیخود۔سعید)

حسرت، طباطبائی۔مجھ کو احوالِ بتاں پر افسوس آتا ہے۔کہ میرے بعد میرے سوگ میں انہوں نے مہندی لگانا چھوڑ دی۔

۵۔درخورعرض ... اظہار کے قابل۔جوہر ... عرض کی رعایت سے لائے ہیں۔جا ... جگہ۔میرے مرنے کے بعد جوہر بیداد کو اب کوئی مناسب جگہ اپنے آپ کو ظاہر کرنے کے لئے نہیں ملتی یعنی کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جس پر بیداد کی جا سکے۔اس لئے انہوں نے آنکھوں میں سرمہ لگانا چھوڑ دیا ہے مطلب یہ ہے کہ میں ہی ان کی سرگیں آنکھوں کے ظلم اٹھانے والا تھا۔ممکن ہے میرے سوگ میں سرمہ لگانا چھوڑ دیا ہو۔

۶۔آغوشِ وداع ... رخصت ہوتے وقت بغلگیر ہونا۔چاک ہونا ہے۔گریبان ... گریبان پھٹتا ہے۔میرے مرنے کے بعد جنون اہل جنون سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہونے کو آخری مرتبہ ہم آغوش ہو رہا ہے۔گویا چاک گریبان سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہا ہے۔مطلب یہ ہے کہ دنیا میں رسم جنوں میرے بعد باقی نہ رہے گی۔اور اب کوئی شخص اپنا گریبان چاک نہ کرے گا۔چاک کا گریبان سے جدا ہونا خوب ہے۔

حالی۔اس شعر کے ظاہری معنی یہ ہیں۔کہ جب سے میں مر گیا ہوں۔ مٹے

مردِ افگن عشق کا ساقی یعنی معشوق بار بار صلا دیتا ہے۔ یعنی لوگوں کو شراب عشق کی طرف بلاتا ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ میرے بعد شراب عشق کا کوئی خریدار نہیں رہا۔ اس لئے اس کو بار بار صلا دینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر زیادہ غور کرنے کے بعد جیسا کہ مرزا خود بیان کرتے تھے۔ اس میں ایک نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں۔ اور وہ یہ ہیں۔ کہ پہلا مصرعہ بھی ساقی کی صلا کے الفاظ ہیں اور اس مصرعہ کو وہ مکرر پڑھ رہا ہے۔ ایک دفعہ بلانے کے لہجے میں پڑھتا ہے۔ کون ہوتا ہے۔ حریف مئے مرد افگن عشق؟ یعنی کوئی ہے جو مئے مرد افگن عشق کا حریف ہو۔ پھر جب اس آواز پر کوئی نہیں آتا۔ تو اس مصرعہ کو مایوسی کے لہجہ میں مکرر پڑھتا ہے۔ کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق! یعنی کوئی نہیں ہوتا۔ اس میں لہجہ اور طرزِ آواز کو بہت دخل ہے۔ کسی کو بلانے کا لہجہ اور ہے اور مایوسی سے چپکے چپکے کہنے کا اور انداز ہے۔ جب اس طرح مصرعہ مذکور کی تکرار کرو گے۔ تو فوراً یہی معنی ذہن نشین ہو جائیں گے۔

۸۔ تعزیت ... ماتم پرسی۔ میں اس غم سے مرا جاتا ہوں کہ میرے مرنے کے بعد دنیا میں کوئی ایسا شخص بھی نظر نہیں آتا۔ جو مہر و وفا کی تعزیت کرنے کا اہل ہو۔ مطلب یہ ہے۔ کہ مہر و وفا کا خاتمہ بھی میرے ساتھ ہو جائیگا۔ اور کوئی ان کا رونے والا نہ ہوگا۔ قاعدہ ہے مُردے پر رونے کے لئے بہت لوگ جمع ہو جاتے ہیں لیکن یہاں حالت یہ ہے۔ کہ کوئی تعزیت کا بھی اہل نظر نہیں آتا۔ اس لئے مہر و وفا کا مجسمہ اسی غم میں مرا جاتا ہے (بیخود سعید۔ طبا طبائی)۔

طبا طبائی۔ آسی۔ میں اس غم سے مرا جاتا ہوں کہ میرے بعد مہر وفا کو پرسا بھی دینے والا کوئی نہیں ہے۔

۹۔ سیلاب بلا..... یعنی عشق۔ غالب مجھ کو عشق کی بےکسی اور تنہائی پر رونا آتا ہے۔ جب میں مر جاؤں گا۔ تو یہ عشق کس کے گھر جائے گا یعنی کوئی ایسا عاشق نہیں۔ جو میرے بعد عشق کی میزبانی کرے۔ اور اس کی مصیبتیں برداشت کرے۔

ردیف ر

بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر درو دیوار ۱ نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر درو دیوار
وفورِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ ۲ کہ ہو گئے مرے دیوار و در، درو دیوار
نہیں ہے سایہ کہ سن کر نوید مقدمِ یار ۳ گئے ہیں چند قدم پیشتر، درو دیوار
ہوئی ہے اس قدر ارزانی مے جلوہ ۴ کہ مست ہے ترے کوچہ میں ہر درو دیوار
جو ہے تجھے سرِ سودائے انتظار تو آ ۵ کہ ہیں دکانِ متاعِ نظر، درو دیوار
ہجوم گریہ کا سامان کب کیا میں نے ۶ کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پر درو دیوار
وہ آ رہا مرے ہمسایہ میں تو سایہ سے ۷ ہوئے فدا درو دیوار پر، درو دیوار
نظر میں کھٹکے ہے بن تیرے گھر کی آبادی ۸ ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر درو دیوار
نہ پوچھ بیخودیٔ عیشِ مقدمِ سیلاب ۹ کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر درو دیوار

نہ کہہ کسی سے کہ غالبؔ نہیں زمانہ میں
۱۰
حریفِ رازِ محبت مگر درو دیوار

۱۔ یہ درو دیوار جو ہماری نگاہِ شوق کو تجھ تک پہنچنے سے روکتے ہیں ان کی کوئی پروا نہیں۔ کیونکہ روکنا تو درکنار یہ تو اُلٹے ہماری نگاہِ شوق کو بال و پر کا کام دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے۔ کہ رکاوٹ اور روک تھام سے جذبۂ عشق میں

اور بھی زیادہ ترقی ہوتی ہے۔ اور اس لئے در و دیوار نگاہِ شوق کے لئے بال و پر ہیں۔

۲۔ وفور ..... کثرت۔ کاشانہ ..... جھونپڑی۔ رنگ ... حالت۔ کثرتِ گریہ نے میرے مکان کا یہ حال کر دیا ہے کہ دیوار کو توڑ کر اس میں در بنا دیا اور دروازہ کے آگے دیوار گر کر ملبہ کا ڈھیر لگ گیا۔ گویا وہ دیوار بن گیا۔ مطلب یہ ہے کہ سیلاب گریہ سے مکان تہ و بالا ہو گیا ہے جہاں دیوار تھی۔ وہاں دروازہ بن گیا جہاں دروازہ تھا۔ وہاں دیوار بن گئی۔

۳۔ نوید مقدم ..... تشریف آوری کی خوشخبری۔ فرماتے ہیں۔ یہ در و دیوار کا سایہ نہیں ہے۔ بلکہ یار کے آنے کی خوشخبری سن کر در و دیوار مہمان کے استقبال کے لئے چند قدم آگے بڑھ گئے ہیں۔

۴۔ ارزانی ..... سستا پن۔ مے جلوہ ... شراب دیدار۔ تو نے شراب دیدار کو کس قدر ارزاں کر دیا ہے۔ کہ تیرے کوچے کے در و دیوار تک اس شراب سے مست ہو رہے ہیں۔ شاید یار کی بے حجابی کا ماتم کیا ہے۔

۵۔ سر ... خیال۔ سودائے انتظار ... متاع و جنس انتظار کی خریداری اگر تجھے جنسِ انتظار کی خریداری منظور ہے۔ تو آ کر دیکھ کہ عشاق نے اپنی نگاہیں در و دیوار پر اس طرح جمائی ہیں کہ در و دیوار متاعِ نظر کی دکان بن گئی ہے۔

۶۔ جب کبھی میں نے ہجوم گریہ کا سامان کیا یعنی دل کھول کر رونے کا بندوبست کیا تو فوراً در و دیوار میرے قدموں پر گر پڑے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے رونے کے ارادے میں اس قدر اثر ہے کہ رونے سے پہلے در و دیوار گر پڑتے ہیں۔ ظاہری مفہوم یہ ہے کہ در و دیوار نے میری منت سماجت کی اور قدموں پر سر رکھ دیا کہ رونا نہیں ورنہ ہم تباہ ہو جائیں گے۔ بہر کیف نتیجہ دونوں کا ایک ہے۔

۷۔ جب وہ میرے ہمسائے میں آ کر رہا۔ تو میرے در و دیوار کا سایہ اس کے در و دیوار کے سایہ پر فدا ہو گیا۔ چونکہ ایک دیوار کا سایہ دوسری دیوار کے سایہ سے اکثر مل جاتا ہے۔ اس لئے یہ لطیف خیال پیدا ہو گیا۔

۸۔ جب کوئی چیز نظر میں کھٹکتی ہے۔ تو آنکھوں سے پانی بہنے لگتا ہے کہتے ہیں۔ تیرے بغیر میرے گھر کی آبادی میری آنکھوں میں کھٹکتی ہے (بُری معلوم ہوتی ہے) اس لئے ہم ہمیشہ اپنے گھر کے در و دیوار کو دیکھ کر روتے ہیں۔

۹۔ سیلاب کے آنے کی خوشی میں میرے در و دیوار جس قدر بے خود و دارفتہ ہیں۔ وہ مجھ سے نہ پوچھ۔ بلکہ یوں سمجھ لے۔ کہ در و دیوار کو حال آ جاتا ہے اور وہ سر بسر ناچتے پھرتے ہیں۔ (آسی)

بیخود۔ سعید۔ طبا طبائی۔ سیلاب آنے کی خوشی میں میں ایسا بیخود ہو جاتا ہوں۔ کہ در و دیوار کے گرنے کو رقص سمجھتا ہوں۔

۱۰۔ غالب تو اپنا رازِ محبت کسی سے نہ کہہ۔ کیونکہ دنیا میں رازِ محبت کوئی نہیں چھپا سکتا۔ اور اگر تو رازِ محبت اپنے تک محدود نہیں رکھ سکتا۔ تو صرف در و دیوار سے کہہ۔ کیونکہ وہ سُن سکتے ہیں لیکن کسی سے کہہ نہیں سکتے ظاہر ہے۔ در و دیوار سے باتیں کرنا پاگل پن کی علامت ہے۔ اس لئے حاصل یہ نکلا کہ رازِ محبت منہ سے نہ نکالا جائے۔

۵۶۔ گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر ۱ جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کہے بغیر
کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن ۲ جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر
کام اس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں ۳ لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم ۴ سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر

چھوڑوں گا میں نہ اس بُت کافر کا پوجنا ۵ چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام ۶ چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو ۷ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بہرا ہوں میں تو چاہیئے دونا ہو التفات ۸ سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

غالب نہ کر حضور میں تو بار بار عرض

ظاہر ہے تیرا حال سب ان پر کہے بغیر

۱- جب کبھی میں آپ سے اپنے گھر آنے کے لئے کہا کرتا تھا تو آپ کہہ دیتے تھے۔ ہم تیرا گھر ہی نہیں جانتے۔ کیونکہ آئیں لیجیئے میں نے آپ سے بغیر اجازت حاصل کیئے۔ آپ کے دروازہ پر ہی اپنا گھر بنا لیا ہے۔ فرمایئے اب بھی آپ میرے گھر کو بغیر بتائے نہ جائیں گے۔

۲- جب تک مجھ میں حالِ دل بیان کرنے کی قوت تھی۔ اُس وقت تو کبھی میرا حال پوچھا نہیں۔ لیکن اب جبکہ مجھ میں بات کرنے کی بھی طاقت نہیں رہی۔ تو کہتے ہیں کہ میں کسی کے دل کی بات بغیر کہے کیسے جان سکتا ہوں۔ تم بات کہو۔ تو تمہارے دل کی بات کروں۔ تم نے خرابی دکھائی ہے۔

۳- تقدیر کی بات ہے۔ میرا معاملہ اس شخص سے پڑا ہے جس کا نام کوئی شخص بغیر ستمگر کہے نہیں لے سکتا یعنی تمام دنیا اُسے ستمگر کہتی ہے۔ ظاہر ہے۔ ایسے ظالم سے کیسے اُمیدیں پوری ہوں گی۔

۴- ہم جو خاموش ہیں۔ اس کا سبب یہ نہیں ہے۔ کہ ہم کسی سے ڈرتے ہیں بلکہ اصل حقیقت یہ ہے۔ کہ ہمارے دل ہی میں کوئی بات نہیں۔ ورنہ اگر ہمارے دل میں کوئی بات ہوتی تو ہم کبھی خاموش نہ رہتے۔ سر جاتا یا رہتا ہم ایسے صاف باطن ہیں

کہ اپنے دل کی بات کہے بغیر کبھی باز نہ آتے۔

ممکن ہے۔ یہ کہنا چاہتے ہوں کہ ہمیں تو صرف معشوق سے محبت ہے۔ اور کوئی آرزو نہیں۔ ورنہ ہم اپنا مدعا کہتے اور ضرور کہتے۔

۵۔ میں اُس بُت کافر کی پرستش اور عشق ہرگز ترک نہ کروں گا چاہے خلقِ خدا مجھ کو کافر ہی کیوں نہ کہے جو شخص خدا کے سوا کسی اور کو پوجتا ہے۔ اُسی کو کافر کہا جاتا ہے۔ الفاظ نہایت مناسب ہیں۔

۶۔ ہمارا مقصد اصلی غمزہ و ناز ہے۔ مگر کیا کیا جائے۔ گفتگوئے شاعرانہ میں غمزہ و ناز کو دشنہ و خنجر کہے بغیر کام نہیں چلتا مطلب یہ ہے۔ کہ شاعری میں تشبیہہ اور استعارہ سے کام لیئے بغیر لطفِ سخن پیدا نہیں ہوتا۔ گویا ہم ضرورتِ شعری سے مجبور ہیں۔

۷۔ ہر چند مشاہدہ حق کی گفتگو ہو۔ مگر شاعری میں بادہ و ساغر کے الفاظ ضرور لانے پڑتے ہیں۔

۸۔ دونا.... دُگنا۔ التفات.... توجہ۔ نظرِ عنایت۔ میں بہرا ہوں اس لئے آپ کو مجھ پر دوگنی مہربانی اور توجہ کرنی چاہیئے۔ کیونکہ جب تک کوئی بات آواز بلند اور مکرر کہی نہ جائے اُس وقت تک میں سُن ہی نہیں سکتا۔ آپ ناراض کیوں ہوتے ہیں۔ یہ بات تو ایسی ہے۔ کہ اس کی وجہ سے مجھ پر دوگنی مہربانی ہونی چاہیئے۔

۹۔ غالبؔ تو اپنا حال بار بار عرض نہ کر۔ تیرے کہے بغیر ہی اُن کو تیری پوری کیفیت معلوم ہے اپنے حال کو کس خوبی اور صفائی سے بیان کرتے ہیں۔ مگر سب کچھ عرض کرنے کے بعد بھی یہی ظاہر کرتے ہیں۔ کہ کچھ نہیں کہا یہ معنوی خوبی ہے۔

۵۷- کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر ۱ جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے ۲ سرگرمِ نالہ ہائے شرربار دیکھ کر

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا ۳ رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

آتا ہے میرے قتل کو پر جوشِ رشک سے ۴ مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق ۵ لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر

وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ ۶ ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ ۷ لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال ۸ رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں ۹ جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر

کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینہ میں مرے ۱۰ طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر ۱۱ دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آ گیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

۱ جلتا ہوں.... رشک سے۔ تابِ رخ.... جمالِ عالم سوز۔ میں رخِ یار کا جلوہ دیکھ کر کیوں نہ جل گیا۔ مجھے ضرور جل جانا چاہیئے تھا۔ یہ نہ جلنے کا ہی نتیجہ ہے۔ کہ میں اپنی طاقتِ دیدار کے رشک سے جلا جاتا ہوں، غالب نے

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے   میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

۲- آتش پرست.... نالہ ہائے شرربار کی وجہ سے اپنے آپ کو آتش پرست سے مشابہ کیا ہے چونکہ میں شب و روز آتش بار نالے کیا کرتا ہوں۔ اس لئے عوام مجھے آتش پرست کہنے لگے ہیں۔ آتش پرست دن رات اپنی آگ ہی کے خیال میں رہتے ہیں اور میری بھی یہی کیفیت ہے۔

۳۔ بے سبب آزار۔۔۔ بے وجہ ستانے والا۔ جفا عاشق صادق کا حق ہے۔ لیکن تم ہوس پرستوں پر بھی جفا کرتے ہو۔ اور یہ خیال نہیں کرتے جفا عاشق صادق ہی کے لئے مخصوص ہونی چاہیئے۔ اس لئے میں تم سے محبت کرتے ہوئے رکتا ہوں۔ کیونکہ اس طرح سے میرے عشق کی آبرو کو بٹہ لگتا ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ عشق کا لطف اس وقت ہے جب تم اس کی قدر بھی کرو۔ اور قدر یہی ہے کہ جفا کرو۔

۴۔ وہ مجھے قتل کرنے کو آتا ہے۔ اس لئے مجھے بہت خوش ہونا چاہیئے تھا لیکن نہیں ہیں۔ اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر جوشِ رشک سے مرا جاتا ہوں۔ کہ تلوار اتنی خوش قسمت کہاں سے آئی تھی۔ کہ اس کے ہاتھ میں پہنچ گئی اس طرح سے وہ خوشی بھی خاک میں گئی جو اس کے ہاتھ سے قتل ہو کر حاصل ہوتی۔ کیونکہ قتل کرنے سے پہلے ہی میں جوشِ رشک سے مر گیا۔ بیخود اور آسی نے "پُر جوش" متن قرار دیا ہے۔

۵۔ خوف کے مارے موجِ مے تیری رفتار کو دیکھ کر کانپ رہی ہے موجِ مے کے لرزنے کانپنے کی وجہ یہ ہے۔ کہ خونِ خلق تیری مستانہ رفتار سے ہوا۔ اور تیری مستی کا باعث تیری مے نوشی ہوئی جس کا مطلب یہ ہے کہ خونِ خلق گردنِ مینا پر ثابت ہوا۔ کیونکہ اسی میں وہ شراب تھی جو خونِ خلق کا باعث ہوئی۔ پس اسی بناء پر اب شراب صراحی میں لرز رہی ہے۔

۶۔ واحسرتا۔۔۔ افسوس۔ ہاتھ کھینچنا۔۔۔ دست بردار ہونا۔ حریص۔۔۔ بیحد خواہشمند۔ جب یار نے مجھ کو لذتِ آزار کا بے حد خواہش مند پایا تو افسوس صد افسوس کہ اس نے جفا کاری بھی ترک کر دی یعنی اب ہم جفا سے بھی محروم رہ گئے۔ ؎

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ ۔۔۔ اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

عیار۔۔۔کسوٹی۔ متاع۔۔۔۔ جنس۔ بک جاتے ہیں۔۔۔۔ غلام یا قدردان ہو جاتے ہیں۔ ہم اپنے متاع سخن کے خریدار کے ہاتھوں بک جاتے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ خریدار شعر کو پرکھنے والا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص میرے کلام کی صحیح قدر جانتا ہے۔ میں بھی اس کی قدر کرتا ہوں۔

۸۔ سبحۂ صد دانہ۔۔۔۔ سو دانوں کی تسبیح۔ دانوں کی وجہ سے تسبیح میں نشیب و فراز پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن زنار ہموار ہوتا ہے۔ کیونکہ اس میں دانے نہیں ہوتے۔ تسبیح و زنار دونوں ایک منزل پر پہنچنے کے دو راستے ہیں۔ لیکن فرق یہ ہے۔ کہ زنار کا راستہ ہموار ہے۔ اور تسبیح کی راہ میں سو نشیب و فراز ہیں۔ اس لئے ہر مقام پر ٹھوکر لگتی ہے کہتے ہیں۔ زنار باندھ لے اور سو دانوں والی تسبیح کو توڑ ڈال۔ کیونکہ مسافر ہمیشہ سیدھے اور صاف راستے ہی پر چلا کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کفر کا راستہ آسان اور صاف ہے۔

۹۔ آبلوں کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں کہ میں ان پاؤں کے آبلوں سے گھبرا گیا تھا۔ لیکن راستے کو پرخار دیکھ کر جی خوش ہو گیا ہے کہ کانٹے لگ کر یہ آبلے پھوٹیں گے۔ اور زیادہ تکلیف ہوگی۔ عشق میں انسان اذیت کو پسند کرنے لگتا ہے۔

۱۰۔ میرا دوست مجھ سے کس قدر بدگمان ہو گیا ہے۔ کہ میرے آئینۂ دل میں جو زنگ لگا ہے۔ اور جو نتیجہ ہے افسردگی کا وہ اس کو زنگ افسردگی خیال نہیں کرتا۔ بلکہ ازراہِ بدگمانی یہ خیال کرتا ہے۔ کہ یہ کسی طوطی کا عکس ہے جس سے مجھ کو اس کی بجائے محبت ہو گئی ہے۔ زنگار اور طوطی میں سبزہ کی وجہ سے مشابہت ہے۔ نیز طوطی و آئینہ میں وہی نسبت ہے۔ جو گل و بلبل میں ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ اس کو اب یہ بدگمانی ہو گئی ہے۔ کہ میرا عاشق طوطی سے اپنا

دل بہلانے لگا ہے۔ آہستہ آہستہ اس کے دل سے میرا عشق جاتا رہے گا اس لئے وہ زنگار آئینہ پر رشک کھاتا ہے۔

۱۱۔ حالی۔ اس شعر میں اس آیت کے مضمون کی طرف اشارہ ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ ہم نے امانت کو زمین و آسمان اور پہاڑوں کے سامنے پیش کیا مگر وہ اس کے متحمل نہ ہوئے اور ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔ میرزا فرماتے ہیں۔ برق تجلی کے گرنے کے ہم مستحق تھے۔ نہ کہ کوہ طور، اس لئے شراب خور کا ظرف دیکھ کر اس کے موافق اس کو شراب دی جاتی ہے پس کوہ طور جو منجملہ جمادات کے ہے۔ وہ کیونکر تجلی الٰہی کا متحمل ہو سکتا ہے۔ یہ خیال مع اس تمثیل کے جو بیان ہوئی ہے۔ بالکل اچھوتا خیال ہے۔

۱۲۔ تیری دیوار دیکھ کر مجھے غالبؔ شوریدہ حال کا سر پھوڑنا یاد آگیا۔ شوریدہ حال" سے سر پھوڑنے کا سبب ظاہر ہے۔ اور لفظ "وہ" سے تمام سابقہ واقعات کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھچ جاتی ہے۔

۵۸۔ لرزتا ہے مرا دل زحمت مہر درخشاں پر ۱ میں ہوں وہ قطرۂ شبنم جو ہو خار بیاباں پر
نہ چھوڑی حضرت یوسف یاں بھی خانہ آرائی ۲ سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر
فنا تعلیم درس بیخودی ہوں اس زمانے سے ۳ کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوار دبستاں پر
فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویش مرہم سے ۴ بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر
نہیں اقلیم الفت میں کوئی طومار ناز ایسا ۵ کہ پشت چشم سے جس کے نہ ہووے مہر عنواں پر
مجھے اب دیکھ کر ابر شفق آلودہ یاد آیا ۶ کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر
بجز پرواز شوق ناز کیا باقی رہا ہوگا ۷ قیامت اک ہوائے تند ہے خاک شہیداں پر

نہ لڑ ناصح سے غالبؔ کیا ہوا گر اس نے شدت کی
۸
ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

۱۔ مہرِ درخشاں.... چمکتا ہوا سورج ۔ زحمت.... تکلیف شبنم کے چمکنے کو لرزنے سے تعبیر کیا ہے میں ایک ایسا قطرۂ شبنم ہوں ۔ جو خارِ بیاباں کی نوک پر آویزاں ہے آفتاب مجھے جذب کر لینے کے لئے کیسی کیسی سرگرمیاں دکھا رہا ہے ۔ کہاں میں اور کہاں آفتاب، نوکِ خار پر ہونے کی وجہ سے میری فنا تو ویسے ہی بہت قریب ہے ۔ اس لئے آفتاب کی تکلیف فرمائی پر میرا دل لرزتا ہے کہ وہ اتنی سی بات کے لئے کس قدر کوشش کر رہا ہے ۔

۲۔ سفیدی میں ایہام ہے ۔ ایک تو آنکھ کی سفیدی یعنی نور ۔ دوسرے قلعی جو دیواروں پر آرائش کے لئے پھیرتے ہیں ۔

قید میں تو حضرت یوسف کو خانہ آرائی چھوڑ دینی چاہیئے تھی ۔ لیکن انہوں نے آرائش کو وہاں بھی ترک نہ کیا ۔ یہ حسن کسی حال میں بھی آرائش ترک نہیں کرتا ۔ دیکھ لو چشم یعقوب کی سفیدی (آنکھوں کا نور) قید خانے کی دیواروں پر آرائش کے لئے پھرتی تھی ۔ دوسرا مفہوم یہ ہے ۔ کہ حضرت یعقوب کی آنکھوں کا نور قید خانے میں حضرت یوسف کو تلاش کرتا تھا ۔ کیونکہ وہ حضرت یوسف کے فراق میں روتے روتے اندھے ہو گئے تھے ۔ گویا ان کی آنکھوں کا نور آنکھوں سے نکل کر دیوار زنداں پر آ گیا تھا ۔

۳۔ لام الف یعنی لا بمعنی فنا، شاعر نے الف بے کے بدلے یہ حروف اختیار کئے ہیں جن سے شعر کا مرتبہ بلند ہو گیا ہے ۔ میں اس زمانہ سے سبق بیخودی میں فنا ہوں جبکہ مجنوں عام بچوں کی طرح مدرسے کی دیواروں پر لام الف لکھتا پھرتا تھا ۔ گویا اس کو ان حروف کے معنی بھی معلوم نہ تھے ۔ لیکن میں اس وقت درسِ بے خودی میں فنا ہو چکا تھا ۔ مطلب یہ ہے ۔ کہ مجنوں میرے آگے کا بچہ ہے ۔

۴۔ اگر میرے پارہ ہائے دل نمک لگانے پر راضی ہو جاتے تو مجھے مرہم کے تلاش کرنے میں مطلق تشویش نہ ہوتی۔ مطلب یہ ہے۔ نمک سے زخموں کو تکلیف ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ عشاق کو وہ مرغوب ہے۔ اس کے علاوہ عاشق صادق کے لئے مرہم تلاش کرنا باعثِ عار ہے۔ (بیخود۔ سعید۔ آسی)

طباطبائی (۱) پارہ ہائے دل کو نمک چھڑکنے سے وہ لذت حاصل ہوتی ہے کہ باہم نزاع کرتے ہیں۔ اس سبب سے میں چاہتا ہوں کہ بلا سے میں مرہم لگا لوں۔ اور ان سب کو اس لذت سے محروم کر دوں (۲) ہم خیال۔

۵۔ طومار.... دفترِ پشتِ چشم.... کنایہ از غمزہ و اغماض چشم پوشی۔ اقلیم دیار۔ دیار الفت میں کوئی دفتر ناز ایسا نہیں ملے گا جس کے عنوان پر معشوقوں کے غمزہ و اغماض کی مہریں ثبت نہ ہوں۔ مطلب یہ ہے۔ کہ یہ لوگ ادھر دل لیتے ہیں ادھر آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ لفظ عنوان سے ظاہر ہے۔ کہ ابتدا ہی میں ایسی فریب کاری روا رکھی جاتی ہے۔

۶۔ مجھے آسمان پر ابرِ شفق آلودہ دیکھ کر ایک بات یاد آتی ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ جب میں محبوب سے جدا تھا۔ تو یہی ابرِ شفق آلودہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے تیری فرقت میں آسمان سے گلستان پر آگ برستی تھی۔

۷۔ خیال یہ ہے۔ کہ قیامت کے دن مردے اُٹھیں گے۔ فرماتے ہیں۔ روزِ قیامت تیرے شہیدوں میں سوائے پروازِ شوقِ ناز کے اور باقی ہی کیا رہا ہوگا۔ جو قیامت انہیں دوبارہ زندہ کر دے گی۔ اُن کے لئے تو قیامت ایک تیز وتند ہوا ہے جو خاکِ شہیداں کو اور زیادہ پریشان کر دے گی۔ خاکِ شہیداں کو پریشاں کرنے کا مفہوم صاف ہے کیونکہ ان کی خاک پہلے ہی شوقِ ناز میں اڑتی پھرتی ہے۔

۱۰۸۔ اپنے دل سے کہتے ہیں اگر ناصح نے زیادتی کی ہے۔ تو اس سے نہ لڑ۔ ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریبان پر۔ اس کو پھاڑ ڈالیں گے۔ کیا گریبان پھاڑنے سے تسکین نہ ہوگی۔ ناصح کی شدت کا بدلہ کس طور پر اور کس انداز سے لینا چاہتے ہیں۔ اور اس میں مجبوری اور بے کسی کا کیا عمدہ پہلو نکالا ہے۔ خوب شعر ہے۔

۵۹۔ ہے بسکہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور ۱ کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور
یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات ۲ دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور
ابرو سے ہے کیا اس نگہ ناز کو پیوند ۳ ہے تیر مقرر مگر اس کی ہے کماں اور
تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھیں گے ۴ لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور
ہرچند سبک دست ہوئے بت شکنی میں ۵ ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور
ہے خونِ جگر جوش میں دل کھول کے روتا ۶ ہوتے جو کئی دیدۂ خوننابہ فشاں اور
مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے ۷ جلاد سے لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور
لوگوں کو ہے خورشید جہاں تاب کا دھوکا ۸ ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور
لیتا نہ اگر دل تمہیں دیتا کوئی دم چین ۹ کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور
پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے ۱۰ رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

۱۔ چونکہ ہر اشارے میں ایک نئی بات پائی جاتی ہے۔ اس لئے اگر وہ حقیقتاً محبت بھی کرتے ہیں۔ تو ہم کو یقین نہیں آتا۔ ہم یہی سمجھتے ہیں۔ کہ یہ سب کچھ فریب ہے۔ حسرت۔ یہ گمان ہوتا ہے۔ کہ اظہارِ محبت اس لئے کرتے ہیں۔ کہ ہماری فریفتگی اور عشق کا حال دریافت کر لیں۔ جب ان کو ہمارے عشق کا یقین ہو جائیگا تو محبت کی بجائے نازِ معشوقانہ شروع کر دیں گے۔

۲۔ وہ میری بات کو نہ اب تک سمجھے ہیں اور نہ آئندہ سمجھنے کی امید ہے۔ اے خدا اگر تو میری زبان کو ایسی قوت بیان نہیں دیتا جو میں ان کو اپنا مدعا سمجھا سکوں۔ تو اُنہی کا ایسا دل عنایت کر دے۔ کہ وہ میرے مطلب کو سمجھ جائیں (سعید۔ آسی)

طباطبائی۔ بیخود۔ سوال وصل میں کھل کر نہیں کر سکتا اور وہ سادہ دلی سے بغیر صاف صاف کہے ہوئے سمجھ نہیں سکتے (اس لئے دعا مانگتے ہیں) حالی لکھتے ہیں کہ مرزا صاحب نے در پردہ اُن لوگوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو ان کے کلام کو بے معنی یا بعید الفہم کہا کرتے تھے۔

۳۔ پیوند.... علاقہ۔ تعلق۔ جوڑ۔ مفر.... یقیناً۔ ضرور قرار دیا گیا۔ نگہ ناز کو تیر قرار دیا ہے کمانِ ابرو کو نگاہ ناز سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ نگاہِ ناز تیر تو ضرور ہے۔ مگر اس کی کمان ابرو نہیں ہے۔ بلکہ اسکی کمان کچھ اور ہی ہے۔ طباطبائی سعید اور آسی کہتے ہیں۔ کہ یہ حسن کی کمان ہے۔ بیخود لکھتے ہیں یہ نگاہِ ناز کا تیر دلی ارادہ کی کمان سے نشانے پر لگا کرتا ہے۔ اسی لئے اس کے زخم مختلف صورتوں کے ہوا کرتے ہیں۔ کہیں وہ خوشی کا پہلو اختیار کر کے عاشق کو تڑپاتا ہے۔ کہیں غصہ کے پیکان سے قتل کرتا ہے۔ حسرت کا خیال ہے۔ کہ یہ کمال دلربائی ہے۔ کہ مثل کمانِ قضا اس کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا۔

۴۔ جب تک تم شہر میں موجود ہو۔ ہمیں دل وجان کا کچھ غم نہیں۔ اگر تم ہمارا دل چھین لوگے اور جان لے لوگے۔ تو ہم بازار سے دل وجان اور خرید لیں گے تمہارے عہد میں دلفروشی اور جان فروشی کا بازار گرم ہے۔ کیونکہ ہر شخص دل وجان سے تنگ ہے۔ اس لئے وہ بہت سستے داموں ہمارے ہاتھ دل وجان بیچ ڈالے گا۔

۵ - شکستِ .... مشتاق - ہم .... ہماری ذات یا ہستی - حالی - اس شعر میں سارا زور "ہم" کے لفظ پر ہے - یعنی جب تک کہ ہماری ہستی باقی ہے - اس وقت تک راہِ معرفتِ الٰہی میں ایک اور سنگِ گراں سدِ راہ ہے پس اگر ہم نے بت توڑنے میں شکستی حاصل کی ہے - تو کیا فائدہ - یہ بڑا پجاری یا بت یعنی ہماری ہستی تو ابھی موجود ہے۔

۶ - اس وقت میرا خونِ جگر جوش میں ہے - اے کاش میری بہت سی آنکھیں ہوتیں تو میں خوب دل کھول کر رو لیتا - اور حسبِ حسرت خونابہ فشانی کرتا - مطلب یہ ہے خونابہ فشانی اور خونِ جگر کا جوش ٹھنڈا کرنے کے لئے دو آنکھیں کافی نہیں سہ۔

نہ کہہ کہ گریہ بہ اندازِ حسرتِ دل ہے　　مری نظر میں ہے سب جمع و خرچ دریا کا

۷ - ہر چند کہ میرا سر ہی کیوں نہ اُڑ جائے - لیکن مجھے مطلق پروا نہیں میں تو اس ادا پر مرتا ہوں - کہ وہ جلاد جب بار بار کہتا ہے - ہاں اور وار کر، ہاں ہاں ایک اور ہاتھ مار۔"

۸ - میرے سینے میں بہت سے داغ ہیں - میں ان داغوں میں سے ایک داغِ نہاں کو ہر روز لوگوں کو دکھا دیتا ہوں - اور وہ دھوکے سے یہ سمجھتے ہیں یہ آفتابِ عالمتاب ہے جو ہر روز افقِ مشرق سے طلوع ہوتا ہے سہ

مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا　　طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا

۹ - غالب یہ بہت لطیف تقریر ہے - لینا کو ربط ہے چین سے، کرتا مربوط ہے - آہ و فغاں سے عربی میں تعقید لفظی اور معنوی معیوب ہیں - فارسی میں تعقید معنوی عیب اور تعقید لفظی جائز ہے - بلکہ فصیح و بلیغ ہے - ریختہ تقلید ہے فارسی کی - حاصل معنی مصرعِ عین یہ ہے - کہ اگر دل نہیں نہ دیتا تو کوئی دم چین لیتا - اور اگر نہ

مرنا۔ تو کوئی دن اور آہ و فغاں کرنا۔"

۱۰۔حالی ۔ نالے یعنی ندی نالے، نہ آہ و نالہ، مثال کس قدر مثل لا کے مطابق ہے اور مضمون کتنا سچا فی الحقیقت مصیبت اور رنج و تکلیف کے سبب جوں جوں شاعر کی طبیعت رکتی ہے۔ اسی قدر رلا دیتی ہے۔ خصوصاً جو مضمون اس وقت وہ اپنے حسب حال لکھتا ہے وہ نہایت مؤثر اور درد انگیز ہوتا ہے۔

۱۱۔ ویسے تو دنیا میں اور بھی شاعر بہت اچھے اچھے ہیں۔ لیکن یہ بات عام طور پر مشہور ہے۔ کہ غالب کا انداز بیان سب سے الگ ہے۔

صفائے حیرت آئینہ ہے سامان زنگ آخر ۱ تغیر آب بر جا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر
نہ کی سامان عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی ۲ ہوا جام زمرد بھی مجھے داغ پلنگ آخر

۱۔ آب برجا ماندہ ۔۔۔ پانی جو ایک جگہ پر ٹھہر جاتا ہے۔ آئینہ کو پانی سے اور پانی کی کائی کو زنگ آئینہ سے تشبیہہ دی ہے۔ جیسے پانی جو ایک جگہ پر ٹھہرا رہے اس کا رنگ تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور اس پر کائی جم جاتی ہے اسی طرح آئینے کی صفائے حیرت ہی سے آئینے میں زنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح آئینہ بیکار رہنے سے خراب ہو جاتا ہے۔ اور پانی ایک جگہ ٹھہر کر بدرنگ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح وہ لوگ بھی تباہ حال ہوتے ہیں جن کا آئینہ دل صاف ہوتا ہے اور ان کی طبیعت کی روانی رک جاتی ہے۔

۲۔ سامان عیش و جاہ سے میری وحشت مزاج کا علاج نہ ہو سکا۔ بلکہ جام زمرد بھی میرے لئے داغ پشت پلنگ بن گیا۔ جس سے میری وحشت میں مزید اضافہ ہوا۔ جام زمرد بن سامان عیش ہے۔ اور داغ پشت پلنگ سبب وحشت و پریشانی۔

۶۱- جنوں کی دستگیری کس سے ہو گر ہو نہ عریانی ۔ ۱ گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر
برنگِ کاغذِ آتش زدہ نیرنگِ بیتابی ۔ ۲ ہزار آئینہ دل باندھے ہے بالِ یک تپیدن پر
فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے ۔ ۳ متاعِ بُردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر
ہم اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن کہ رکھتا ہے ۔ ۴ شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر
فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا ۔ ۵ فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر

اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

۱- گریباں چاک ... اضافت مقلوب۔ یعنی چاک گریبان، پھٹا ہوا گریبان حق ... احسان۔ عریانی جنوں کی علامت اور اس کی مددگار ہے۔ اس لئے پھٹے ہوئے گریبان کا میری گردن پر احسان ہو گیا ہے۔ کیونکہ اسی نے مجھ کو عریاں کیا ہے اور عریاں کر کے میرے جنون کی دستگیری کی ہے۔ ورنہ جنون کیسے ظاہر ہوتا۔ (آسی۔ سعید۔ بیخودؔ)

حسرتؔ، طباطبائی۔ گریباں کو منادیٰ سمجھے ہیں یعنی اے گریبان چونکہ تو نے عریاں کر کے میرے جنون کی دستگیری کی ہے۔ اس لئے چاک کا میری گردن پر حق ہو گیا ہے۔

۲- برنگ ... بشکل۔ نیرنگ ... شعبدہ۔ بال ... بازو۔ تپیدن ... تڑپنا۔ میرا شعبدۂ بیتابی کاغذ آتش زدہ کی طرح یک بال تپیدن پر ہزار آئینہ باندھتا ہے۔ یعنی جس طرح جلتے ہوئے کاغذ میں سینکڑوں نقاط روشن نمودار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح شعبدہ بیتابی نے ہزاروں آئینے میرے دل پر باندھ دیئے ہیں۔ جو ایک چمک کے ساتھ چمکنے لگتے ہیں۔ گویا بال یک تپیدن کو کاغذ آتش زدہ سے اور اس کے روشن نقاط کو ہزار دلوں سے تعبیر کیا گیا ہے (حسرتؔ بیخودؔ آسی)

طباطبائی بنیرنگِ بیتابی شلِ کاغذ آتش زدہ ہے کہ دل نے ایک بال تپیدن پر ہزار ہزار آئینے باندھے ہیں۔ اس شعر میں آئینہ متحرک کی تڑپ کو اس شعلہ سے تشبیہہ دی ہے جو کاغذ آتش زدہ سے بلند ہو۔

سعید نے سید ہاشمی کی یہ شرح رسالہ اردو سے نقل کی ہے "یہاں باندھنے سے مراد ڈھانا، باندھنا یا اسیر بنانا ہے۔ کاغذ آتش زدہ میں سکڑنے اور مٹنے کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اس سے بیتابی کو تشبیہہ دی ہے۔ اور ایسے کاغذ میں جو روشن نقطے نمودار ہو جاتے ہیں۔ ان کی مناسبت سے ہزار آئینہ کا لفظ کہا ہے۔ مگر ان تکلفات کے پردوں میں مطلب یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ تکلیف و بے قراری میں اگر کوئی شے موجبِ تسکین ہو سکتی ہے۔ تو وہ تڑپنا اور لوٹنا ہے۔

۳۔ عیش رفتہ ۔۔۔۔ زمانۂ ماضی کا عیش۔ متاع بردہ ۔۔۔ لوٹا ہوا مال۔
حالی: یہ مضمون بالکل وقوعیات میں سے ہے۔ جو لوگ آسودگی کے بعد مفلس ہو جاتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنے تئیں مظلوم و ستم رسیدہ و فلک زدہ سمجھا کرتے ہیں۔ اور آخر دم تک اس بات کے متوقع رہتے ہیں۔ کہ ضرور کبھی نہ کبھی ہمارا انصاف ہوگا۔ اور ہمارا اقبال پھر عود کر آئے گا۔ (یادگارِ غالب) حاصل یہ ہے۔ کہ انقلاب آسمانی سے جو زمانہ عیش جاتا رہا ہے۔ پھر اس کے واپس آنے کی امید فضول ہے اس لئے آسمان سے اس کی بار بار درخواست کرنا ایسا ہی ہے جیسے لٹے ہوئے مال و متاع کو رہزن پر قرض خیال کر لینا اور اس کی واپسی کی امید رکھنا۔ بھلا رہزن کہیں مال واپس بھی کیا کرتا ہے۔

۴۔ بے سبب رنج ۔۔۔۔ بلا وجہ رنجیدہ ہونے والا۔ آشنا دشمن ۔۔۔۔ دوستوں کا دشمن۔ ہمارا ایسے محبوب سے پالا پڑا ہے۔ جو بلا وجہ رنجیدہ ہونے والا ہے۔ اور

اُنہی کا دشمن ہے۔ جو اس کی دوستی کا دم بھرتے ہیں نیز وہ ایسا بدگمان ہے کہ سورج کی کرن جو روزنِ دیوار میں سے آتی ہے۔ اسے تارِ نظر سمجھ کر چشمِ روزن پر جھانکنے کی تہمت لگاتا ہے (حسرت، سعید)

طباطبائی۔ آسی۔ بیخود۔ روزن میں جو شعاع آتی ہے۔ اُسے دیکھ کر مجھ سے لڑتا ہے کہ یہ تیری نگاہ تھی۔ تو جھانکا ہوگا۔

۵۔ فروغِ طالع... خوش قسمتی۔ خاشاک... گھاس پھونس۔ گلخن .... بھاڑ بھٹی۔ اگر تو اپنی حقیقت کو دیکھنے کا مشتاق ہے۔ تو فنا ہو جا کیونکہ گھاس، پھونس کا نصیبہ اسی وقت چمکتا ہے جب اس کو بھاڑ میں ڈالا جاتا ہے (جب گھانس پھونس جلتی ہے۔ تو شعلہ اٹھتا ہے اور وہی اس کا فروغ طالع ہے) مطلب یہ ہے کہ فنافی اللہ ہو کر انوارِ معرفت حاصل کر۔ بغیر فنا ہوئے یہ مرتبہ نہیں مل سکتا۔

۶۔ اسد بھی عجیب قسم کا بسمل ہے وہ قاتل سے کہتا ہے کہ تو مشقِ ناز کو جاری رکھ اور خونِ ناحق کے خوف سے مشقِ ناز سے دست کش نہ ہو۔ اگر تجھے یہ خوف ہے۔ تو لے خونِ دو عالم ہم اپنی گردن پر لیتے ہیں۔ اب تو کوئی خوف کی بات نہیں رہی۔ نہ روزِ قیامت تجھ سے باز پرس ہوگی۔ اور نہ یہاں کوئی تیرے خلاف خون کا دعوی کرے گا۔ کیونکہ دونوں جہان کی ذمہ داری ہم نے اپنے سر لے لی ہے

ستمکش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں   تکلف برطرف مل جائیگا تجھ سا رقیب آخر

خوباں... حسین۔ تجھ سا رقیب... وہ حسین جو تجھ پر عاشق ہو میں جو تیرے ظلم اٹھاتا ہوں۔ تو اس میں بھی ایک مصلحت ہے اور وہ یہ ہے کہ تجھ پر بہت سے حسین عاشق ہیں۔ ممکن ہے۔ کہ ان میں سے مجھے کوئی تجھ جیسا خوبصورت رقیب مل جائے۔ اور میں اس سے دل لگا لوں۔

۶۲ لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور ۱ تنہا گئے کیوں؟ اب رہو تنہا کوئی دن اور

مٹ جائیگا سر گر ترا پتھر نہ گھسے گا ۲ ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور

آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں ۳ مانا کہ ہمیشہ نہیں، اچھا کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے ۴ کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف ۵ کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے ۶ پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور

تم کون سے ایسے تھے کھرے داد و ستد کے ۷ کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیّر سے لڑائی ۸ بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گذری نہ بہر حال یہ مدت خوش و ناخوش ۹ کرنا تھا جواں مرگ گذارا کوئی دن اور

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب
۱۰ قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

۱۔ یہ غزل بطور مرثیہ لکھی گئی ہے۔ زین العابدین خاں عارف مرزا صاحب کے سالے تھے اور ان کو بہت عزیز تھے۔ جب انہوں نے عین شباب میں انتقال کیا تو مرزا صاحب کو سخت صدمہ ہوا۔ اسی غم کا ان اشعار درد خیز میں اظہار کیا ہے۔ عارف! تم کو چاہیئے تھا کہ تم میرے ساتھ جاتے اور میری روانگی (موت) کا انتظار کرتے۔ تم نے جانے میں اس قدر جلدی کی۔ لہذا اب تم دوسری دنیا میں تنہا رہو۔ نہ تم تنہا جاتے نہ وہاں تمہیں تنہا رہنا پڑتا۔ اپنے سے پہلے مر جانے پر ملامت اور تاسف کا ایک نیا ڈھنگ نکالا ہے۔

۲۔ ناصیہ فرسا... ماتھا رگڑنے والا۔ سر ٹکرانا پتھر اور در سے مراد سنگِ مزار اور قبر ہے میری ناصیہ فرسائی اور سر ٹکرانا تیرے مزار پر چند دن اور ہے۔ گویا تھوڑے دنوں میں یا تو تیرا سنگِ مزار گھس جائیگا یا ناصیہ فرسائی سے میرا سر ہی باقی نہ رہے گا

۳۔ ابھی کل کی بات ہے کہ تم اس دنیا میں آئے ہو اور آج کہتے ہو کہ میں جاتا ہوں۔ یہ بات ہم مانتے ہیں۔ کہ جانا ضرور ہے۔ اور تم یہاں ہمیشہ نہیں رہ سکتے لیکن کچھ دن تو اور ٹھہرو۔ حاصل یہ ہے کہ مرنے کی ایسی بھی کیا جلدی ہے۔

۴۔ تم (دنیا سے) رخصت ہوتے ہوئے کہتے ہو۔ کہ اب ہم قیامت کے دن ملیں گے۔ بہت خوب، کیا قیامت کا کوئی اور دن ہوگا یعنی ہمارے لئے تو تمہاری دوامی جدائی کی وجہ سے آج ہی قیامت کا دن ہے۔

۵۔ آسمان سے شکائت کرتے ہیں۔ اے فلکِ پیر عارف تو ابھی جوان تھا اور اس نے باغِ جہاں میں آکر کچھ بھی نہ دیکھا۔ اگر وہ کوئی دن اور نہ مرتا تو تیرا کیا بگڑ جاتا۔ الفاظ بہت مناسب ہیں۔

۶۔ ماہِ شب چہاردہم ... چودھویں رات کا چاند، ماہ کامل۔ اے عارف تم میرے گھر کے چودھویں کے چاند تھے۔ اور چودھویں کے چاند کا قاعدہ ہے کہ وہ تھوڑا تھوڑا گھٹ گھٹ کر غائب ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں پھر کیا وجہ کہ تم ماہِ چہاردہم ہوتے ہوئے ایک دم چھپ گئے۔ اور میرے گھر کا وہ نقشہ (یعنی رونق کوئی دن اور کیوں نہ قائم رہا۔

۷۔ داد و ستد ... لین دین۔ لین دین کے ایسے کہاں کے کھرے تھے کہ تم نے ملک الموت کے ایک ہی تقاضے میں جان دے دی۔ کچھ دن اسے اور تقاضا کرنے دیتے ۔۔ یعنی کچھ دن اور جیتے۔

۸۔ نیّر ... نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر غالبؔ کے عزیز شاگرد تھے۔ کہتے ہیں۔ میں مانتا ہوں۔ کہ مجھ سے تمہیں نفرت تھی۔ اور نیّر سے تمہاری لڑائی تھی بھلا بچوں نے کیا قصور کیا تھا۔ ان کی بہاریں تو کچھ دنوں اور دیکھی ہوتیں۔
آسی اور سعید لکھتے ہیں۔ کہ مرزا کو نیّر سے بہت محبت تھی اور وہ عارف کو گوارا

نہیں تھی۔ ممکن ہے اس معاملہ پر نیّر و عارف میں کچھ باہم چشمک ہو۔ اور یہاں اس کی طرف اشارہ ہو۔

۹۔ اتنی عمر آخر تم نے رنج و راحت سے گزار ہی دی۔ اے جوانمرگ۔ اسی صورت سے کچھ دنوں اور گذارا کر رہا تھا۔

۱۰۔ تم لوگ نادان ہو۔ جو یہ کہتے ہو۔ کہ عارف کی جوان موت کے بعد اے غالبؔ تم کیوں زندہ ہو یعنی مر کیوں نہ گئے۔ میرا جواب یہ ہے میں اس لئے نہیں مرتا۔ کہ میری قسمت میں ابھی چند دن مرنے کی تمنا کرنی اور لکھی ہے پھر مروں کیونکر

"ردیف ز"

۱۶۳۔ فارغ مجھے نہ جان کہ مانند صبح مہر ۱ ہے داغ عشق زینت جیب کفن ہنوز

ہے نازِ مفلساں زر از دست رفتہ پر ۲ ہوں گلفروش شوخی داغِ کہن ہنوز

میخانۂ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں ۳ خمیازہ کھینچے ہے بت بیداد فن ہنوز

۱۔ جیب کفن کو صبح اور داغِ عشق کو آفتاب سے تشبیہ دی ہے۔ یہ نہ سمجھ کہ مرنے کے بعد میں غمِ عشق سے فارغ ہوگیا ہوں۔ مجھے مرنے کے بعد بھی غمِ عشق سے فراغت نہیں۔ بلکہ صبح مہر کے مانند داغِ عشق میری جیب کفن کی زینت کا باعث ہے مطلب یہ ہے۔ کہ داغِ عشق میری جیب کفن پر اسی صورت سے چمکتا ہے جیسے چاک گریبان صبح میں آفتاب روشن ہوتا ہے۔

طباطبائی کی تشریح قابلِ غور ہے: ۔ صبح استعارہ ہے۔ شب کے گذر جانے سے اور جیب کفن کو بھی گریبان صبح سے تشبیہ دی جاتی ہے مطلب وہی ہے کہ مرنے پر بھی میں عشق سے خالی نہیں ہوں (باقی مجھ سے متفق)

۲۔ زر از دست رفتہ ۔۔۔۔ گذشتہ امارت، کھویا ہوا مال و زر۔ جیسے ایک مفلس اپنی کھوئی دولت پر ناز کیا کرتا ہے ۔ کہ کبھی میں اس قدر فارغ البال اور امیر تھا۔ اسی طرح میں بھی اپنے داغہائے کہن کو یاد کر کے ناز کیا کرتا ہوں۔
(حسرت۔ بیخود سعید)

سعید۔ جس طریقہ سے ایک مفلس اپنی گئی ہوئی دولت پر اور گلفروش اپنے بکے ہوئے پھولوں پر ناز کرتا ہے اسی طرح میں اپنے داغِ کہن پر ناز کرتا ہوں۔

طباطبائی۔ داغِ عشق اب نہیں ہے۔ تو میں اس کا تذکرہ ہی کیا کرتا ہوں۔ داغ کو اشرفی سے تشبیہہ دی ہے۔ اور زوالِ عشق کو دولت از دستِ رفتہ سے۔

۳۔ خاک بھی نہیں ۔۔۔ خون کا ایک قطرہ بھی نہیں۔ خمیازہ کھینچے ہے ۔۔۔ انگڑائیاں لیتا ہے یعنی اور شراب طلب کرتا ہے۔ میرے مے خانہ جگر میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی نہیں رہا۔ خاک اڑ رہی ہے۔ لیکن وہ بُتِ بیداد گر اب تک انگڑائیاں لے رہا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی اسے اور خون پینے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اس کا نشہ پورا نہیں ہوا۔ بتِ بیداد فن اس لئے کہا ہے۔ کہ بجائے شراب کے خون پیتا ہے۔

۴۔ حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز ۔ ۱ دعا قبول ہو یارب کہ عمرِ خضر دراز
نہ ہو بہرزہ بیاباں نوردِ وہمِ وجود ۲ ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز
وصالِ جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں ۳ کہ دیجیے آئینہ انتظار کو پرداز
ہر ایک ذرۂ عاشق ہے آفتاب پرست ۴ گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوۂ ناز

نہ پوچھ وسعتِ میخانۂ جنوں غالبؔ
جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز

۱- حریف ... دوست - فسونِ نیاز ... عجز و نیاز کا جادو، منتر حالی ایک نئی شوخی ہے - جو شاید کسی کو نہ سوجھی ہوگی - کہتا ہے کہ کسی مشکل مقصد کے حل ہونے میں تو عجز و نیاز کا منتر کچھ کام نہیں دیتا - لاچار اب یہی دعا مانگیں گے کہ الٰہی خضر کی عمر دراز ہو یعنی ایسی چیز طلب کریں گے - جو پہلے ہی دی جا چکی ہے -

۲- ہرزہ ... بیہودگی - وجود ... مسئلہ وحدت الوجود - وہم ... خیال نشیب و فراز ... بلند و پست، مراد ناقص - وہم وجود کے بیابان میں تو بیکار ٹھوکریں نہ کھاتا پھر، ابھی تیرے تصوّر میں نشیب و فراز ہیں یعنی ہنوز تیرا تصوّر ناقص ہے اس لیئے وہ تیرے خیال میں نہیں آسکتا (سعید)

حسرت بہرزہ یعنی بیکار - تیرے تصوّر میں نشیب و فراز ہیں - یعنی تیرا تصوّر ناتمام اور قاصر ہے مطلب یہ ہے - کہ وحدت الوجود کا عقیدہ ختیار کرنا چاہیئے - تاکہ وجود اشیائے عالم کے متعلق تمام اوہام سے نجات حاصل ہو -

طبا طبائی - وجود سے وجود ماسوی اللہ مراد ہے - اور نشیب فراز کا یہی سبب ہے - کہ تو وجود کے لئے مراتب سمجھے ہوئے ہے جس کا مرتبہ اعلیٰ وجوب ہے - اور مرتبہ ادنے امکان اور امکان میں بھی قیام بذات و قیام بغیرہ جوہر عرض واحد کے لئے وجود میں پستی و بلندی رکھتا ہے - یعنی جادہ مستقیم یہ ہے کہ ہر شے کو موجود بوجود سمجھ اور وجود کے لئے اقسام نہ نکال - کہ یہ راستہ بھٹکا ہے -

بیخود - وجود ماسوی اللہ میں تو بیکار ٹھوکریں کیوں کھاتا پھرتا ہے معلوم ہوا - ابھی تیرے تصور میں نشیب فراز ہیں - اگر ایسا ہے - تو ابھی تک تیرا

تصور ناتمام اور ناقص ہے۔

آتش ۔(۱) صوفیہ وغیرہ پر طنز ہے ۔مطلب یہ ہے ۔کہ تو اپنے وہم میں صفت وجود یعنی توحید وعرفان کا راستہ طے کرنا چاہتا ہے ۔ اور اس میں تو نے مراتب مقرر کیے ہیں ۔کہ پہلے فنا فی الشیخ ہو پھر فنا فی الرسول پھر فنا فی اللہ و دیگر مقامات جبروت ، ملکوت ۔ ناسوت وغیرہ وغیرہ کو طے کرے تو ان نشیب فراز اور مقامات کا خیال تیرے دل میں ہے ۔ اور تو ان خیالات میں محو ہے ۔ تو اس راستے کا طے کرنا ایک فضول اور بیہودہ کام ہے ۔اس صورت سے تو ہرگز منزل مقصود پر نہیں پہنچ سکتا۔

۲۔ تو نے ماسوی اللہ کا کچھ وجود سمجھ رکھا ہے ۔ اسی وہم کے جنگل کو تیرا خیال طے کر رہا ہے اور با وجود اس کے سینکڑوں انقلاب تو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہے ۔ مگر پھر بھی تیری نظر میں نشیب و فراز کی وقعت ہے ۔حالانکہ وجود ماسوی اللہ ۔اور نشیب و فراز کچھ چیز نہیں ہیں اور یہ محض تیرا وہم ہی وہم ہے۔

مولوی مہدی صاحب از رسالہ اردو ۔ تو وجود ماسوائے اللہ کے وہم میں مست ہے جب تک ۔ تو یہ سمجھتا رہے گا ۔کہ وجود کی قسمیں اور مراتب ہیں مثلاً وجود اور امکان وغیرہ تو اس وقت تک تیرا خیال ناقص اور نا مکمل رہے گا۔ حاصل یہ ہے ۔کہ ایک ہستی واجب کے سوا دوسری ہستی نہ سمجھ (سعید)

۳۔ جلوہ تماشا ۔۔۔ جلوہ حسن کی تماشا دکھانے والا ہے ۔ دماغ ۔۔۔ طاقت ۔ برداشت ۔ پرواز ۔۔۔ آئینہ ۔ جلا ۔صیقل ۔ یہ بات ہم مانتے ہیں کہ وصالِ یار جلوہ حسن کو تماشا دکھا دیتا ہے یعنی انتظار کے بعد جلوہ وصال ممکن ہے لیکن یہ طاقت کس میں ہے ۔کہ بیٹھ آئینہ انتظار کو صیقل کیا

کرے۔ بالفاظِ دیگر انتظار بیکار کیا کرے۔

۴۔ خاک ہونے پر ... یعنی مر کر۔ ہوائے جلوہ ... آرزوئے جلوہ — مرنے کے بعد بھی عاشق کی آرزوئے جلوۂ ناز فنا نہیں ہوئی۔ دیکھ لو۔ اس کی خاک کا ہر ذرہ آفتاب پرست ہے۔ ذراتِ آفتاب کی روشنی میں چمکتے ہیں۔ ان کی چمک ہی سے یہ لطیف مضمون سوجھا ہے۔

۵۔ خاک انداز ... وہ برتن جس میں کوڑا کرکٹ ڈالتے ہیں بیخانۂ جنون یعنی صحرائے جنوں۔ صحرائے جنون کی وسعت دریافت نہ کرو۔ یہ سمجھ لو کہ یہاں کاسۂ گردوں ایک کوڑا کرکٹ پھینکنے کا برتن ہے مطلب یہ ہے کہ صحرائے جنون آسمان سے بے اندازہ بڑا ہے۔ گویا آسمان اس کے مقابلہ میں ایک خاک انداز ہے۔

۶۵۔ وسعتِ سعیِ کرم دیکھ کہ سر تا سرِ خاک ۱ — گذرے ہے آبلہ پا ابرِ گہربار ہنوز
یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت ۲ — نقشِ پا میں ہے تپِ گرمیٔ رفتار ہنوز

۱۔ کرم ... سخاوت۔ سر تا سرِ خاک ... تمام روئے زمین پر۔ ذرا ابرِ کرم کی کوشش کرم کی وسعت کو دیکھو کہ وہ باوجود آبلہ پائی کے تمام روئے زمین پر گہرباری کرتا ہوا گزرتا ہے۔ قطراتِ باراں کی وجہ سے ابر کو آبلہ پا کہا ہے بتلانا یہ چاہتے ہیں کہ سعیٔ کرم میں اس کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ سخاوت میں کمی نہیں کرتا۔ حاصلِ شعر یہ ہے۔ کہ کریم سخاوت کرنے میں تکلیف کا احساس نہیں کرتا۔

۲۔ یک قلم ... یکسر۔ سر بسر۔ قلم۔ کاغذ۔ صفحہ الفاظ وغیرہ متناسب الفاظ ہیں۔

۳۔ گرمیٔ رفتار کی تپش میرے نقشِ پا میں ابھی تک اتنی زیادہ باقی ہے۔

کہ اس کے اثر سے تمام صفحۂ دشت کا غذ آتش زدہ کی طرح جل رہا ہے۔ اور
پیچ و تاب کھا رہا ہے۔

۶۶۔ کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز ۱ کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز
دل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے ۲ ہے ترے تیر کا پیکان عزیز
تاب لائے ہی بنے گی غالبؔ ۳ واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

۱۔ حالی۔ اس کے ظاہری معنی تو یہ ہیں۔ اگر اس سے جان عزیز رکھوں۔ تو وہ ایمان لے لیگا۔ اس لئے جان کو عزیز نہیں رکھتا۔ ایمان کو عزیز رکھتا ہوں اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں۔ کہ اس بت پر جان قربان کرنا عین ایمان ہے تو پھر اس سے جان کیونکر عزیز رکھی جا سکتی ہے۔

۲۔ اگرچہ واقعہ یہ ہے۔ کہ تیرے تیر کا پیکان میرے دل سے نکل گیا لیکن درحقیقت وہ میرے دل سے نہیں نکلا یعنی اس کی محبت ابھی تک دل میں باقی ہے چنانچہ یہی وجہ ہے۔ کہ تیرے تیر کا پیکان مجھے بہت ہی عزیز ہے

۳۔ تاب لائے ہی بنے گی . . . . . صبر کرنا ہی پڑے گا۔ غالبؔ اب تو صبر کرنا ہی پڑے گا۔ کیونکہ واقعہ بہت سخت ہے اور اس کی سختی کا یہ تقاضا ہے۔ کہ جان دے دی جائے۔ گر کیا کیا جائے مگر جان بھی پیاری ہے اس لئے اس حادثہ کو برداشت ہی کرنا پڑے گا۔

۶۷ نہ گل نغمہ ہوں نہ پردہ ساز ۱ میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تو اور آرائش خم کاکل ۲ میں اور اندیشہ ہائے دور دراز
لاف تمکیں، فریب سادہ دلی ۳ ہم ہیں اور راز ہائے سینہ گداز
ہوں گرفتار الفت صیاد ۴ ورنہ باقی ہے طاقت پرواز
وہ بھی دن ہو کہ اس ستمگر سے ۵ ناز کھینچوں بجائے حسرت ناز

نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خون ۶ جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز
اے ترا غمزہ یک قلم انگیز ۷ اے ترا ظلم سر بسر انداز
تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو ۸ ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز
مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا ۹ میں غریب اور تو غریب نواز
اسداللہ خاں تمام ہوا ۱۰
اے دریغا وہ رندِ شاہد باز

۱۔ گل نغمہ ...... گلبانگ ۔ نہ تو میں گلبانگ ہوں اور نہ پردہ ساز ہوں ۔ بلکہ میں اپنی شکست کی آواز ہوں جو سراپا درد ہے ۔ گویا خوشی کے نغموں سے مجھے کوئی واسطہ نہیں ۔ میری آواز میرے دل ٹوٹنے کی آواز ہے ۔

۲۔ خم کاکل ...... زلف کا پیچ ۔ آرائش ..... سنگار ۔ اندیشہ .. خیال تو تو اپنی زلفوں کو بنانے سنوارنے میں مصروف ہے ۔ اور ادھر میں دُور دراز کے وہموں میں محو ہوں ۔ سوال یہ ہے ۔ کہ یہ اندیشہ ہائے دور دراز کیا ہیں ۔ حسرت لکھتے ہیں ۔ مثلاً یہ اندیشہ ہے ۔ کہ تیری آرائش میرے کمالِ محبت سے بدگمانی کا باعث ہے ۔ یعنی تو یہ سمجھتا ہے ۔ کہ مجھے گرفتارِ وفا رکھنے کے لئے ہنوز آرائشِ ظاہری کی ضرورت باقی ہے ۔ حالانکہ میری محبت اس سے مستغنی ہے ، طباطبائی ۔ دیکھئے اب کون کون عاشق ہوتا ہے یا کس کس عاشق کو یہ بناؤ دکھایا جاتا ہے ۔ بیخود ۔ دیکھئے کتنے نئے عاشق پیدا ہوتے ہیں ۔ اور کس قدر رقیبوں کا ہجوم مجھ پر ہوتا ہے ۔ آسی ۔ یہ آرائش مجھ پر کیا کیا ستم کرے گی ۔ یہ آرائش کر کے تو کہاں جائے گا وغیرہ وغیرہ ۔

۳۔ لاف ... شیخی ۔ تمکین ..... وقار ، ضبط ۔ سادہ دلی ..... سادہ لوحی

عشق میں تمکین و وقار کی شیخیاں سبحان اللہ۔ یقیناً یہ ہماری سادہ لوحی کے فریب ہیں۔ ورنہ عشق میں کب ممکن ہے۔ کہ کوئی صبر و تمکین کے وعدے کو نبھا سکے۔ کیونکہ ہمارے سینے میں ایسے سینہ گداز راز بھرے ہوئے ہیں۔ جن کو چھپانا ناممکن ہے۔ جب یہ راز ظاہر ہو جائیں گے۔ تو لاف تمکین کہاں باقی رہے گی۔ (حسرت، بیخود، سعید)

طباطبائی۔ اے لاف سادہ دلی تیرا وصف تو یہ مشہور ہے کہ تو تمکین فریب ہے۔ تو کچھ خبر لے۔ کہ میرے دل میں ایسے راز ہیں۔ جو سینہ گداز ہیں یعنی انہیں فاش کر دے۔ کہ ان کا بوجھ میرے دل پر سے ہٹ جائے۔ حاصل یہ ہے کہ سادہ لوحی سے اپنے ضبط و تمکین کی شکایت ہے اور یہ ظاہر ہے کہ سادہ لوحی کا مقتضی افشائے راز اور تمکین و وقار کی شان اخفائے راز ہے۔

آسی (۱) میرے ہم خیال (۲) ہم خیال طباطبائی (۳) اے لاف تمکین تو نے میری سادہ دلی کا فریب کھایا ہے۔ اور اس پر مطمئن ہے کہ ہمارا حال کسی پر کھل نہیں سکتا حالانکہ ہمارے سینے کے اندر جو راز ہیں وہ ہرگز چھپ نہیں سکتے اور وہ سینہ گداز ہیں۔ (۴) ہم کبھی تمکین کی شیخیاں مارتے ہیں اور کبھی اپنی سادہ لوحی کا لوگوں کو فریب دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ سب ان رازہائے سینہ گداز کا اثر ہے جو ہمارے سینے میں مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ یعنی لوگ ہمارے تمکین کی لاف اور ہماری سادہ دلی کے فریب کے وجوہات سے خوب واقف ہو گئے ہیں۔ (۵) ہماری تمکین کا دعوے لاف اور ہماری سادہ لوحی کا ادعا فریب سمجھا گیا ہے۔ اور اس کا سبب رازہائے سینہ گداز ہیں۔

حکیم امتیاز الدین (رسالہ اردو) کسی جگہ اضافت نہیں۔ سادہ دل سے یہاں مراد ہے۔ دل کا اثر سے خالی ہونا اور شاعر کہتا ہے کہ ایسے رازہائے سینہ گداز

کے ہوتے تمکین کا دعوے کیا جائے۔ تو وہ بیہودہ ادعا ہے اور اگر دل کو غیر متاثر سمجھا جائے تو یہ بھی غلطی یا دھوکا ہے (سعید)

۴۔ ہم میں صیاد کی محبت نہیں گرفتار ہوں۔ اس لئے نہیں اڑتا۔ ورنہ مجھ میں ابھی طاقت پرواز موجود ہے۔ طباطبائی و بیخود۔ اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں۔ کہ تعلقات دنیا نے اپنا اسیر کر لیا ہے۔ ورنہ چاہیں تو آزاد ہو سکتے ہیں۔

۵۔ اب تک میں اس کے ناز اٹھانے کی حسرت اپنے دل میں رکھتا ہوں خدا وہ دن بھی کرے کہ میں بجائے حسرت ناز کے حقیقتاً اس کے ناز اٹھاؤں یعنی خدا کرے میری حسرت پوری ہو جائے۔

۶۔ گلبازی۔۔۔ پھولوں سے کھیلنا۔ گلباز سے مراد مسرور۔ میرے دل میں کوئی خون کا قطرہ باقی نہیں رہا۔ جس سے میری پلکوں نے گلبازی نہ کی ہو گویا میرے دل کے تمام قطرات خون سے پلکوں نے گلبازی کی ہے یعنی خوشی خوشی ان کو بہایا ہے۔

۷۔ انگیز۔۔۔ انگیختن سے امر۔ انداز۔۔۔ انداختن سے امر۔ لے کا مناوی نازنین ہے۔ یک قلم۔۔۔ سراسر۔ اے نازنین تیرا غمزہ سراسر انگیز ہے یعنی ایک دم زندہ کر دیتا ہے۔ اور تیرا ظلم سرلبسر انداز ہے (یعنی دفعتہً مار ڈالتا ہے) گویا تجھ میں زندہ کر دینے اور مار ڈالنے کی متضاد صفتیں موجود ہیں۔

۸۔ ریزش سجدہ۔۔۔ سجدہ کرنا۔ تو جلوہ افروز ہوا۔ میری جبیں نیاز کے پے در پے سجدے مبارک ہوں۔ طباطبائی۔ سعید۔ بیخود) آسی نے یہ بھی معنے نکالے ہیں۔ کہ تو آگیا۔ اب مجھے تیرے لئے بہت سے سجدے کرنا مبارک ہو۔

۹- کچھ غضب نہ ہؤا۔ کچھ اعتنا تی ہے۔ مشتاق تو ٹی بے جا بات نہیں ہوئی۔ شکایت کا اظہار ہے یا طنز ہے۔ بطور رشک یہ نہیں کہا۔ اگر تو نے مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہؤا۔ کیونکہ میں تیری اس مہربانی کا مستحق تھا۔ دنیا کا قاعدہ یہی ہے کہ غریب نواز غریبوں کی خبر گیری کیا کرتے ہیں۔ پس میں غریب ہوں۔ اور تو غریب نواز ہے۔ اس لئے اگر تو نے غریب نوازی کی۔ تو اس میں کون سا کمال ہوگیا۔

۱۰- تمام ہؤا..... مر گیا۔ دریغا.... ہائے افسوس۔ شاہد باز..... معشوق پرست۔ اسد اللہ خاں مر گیا۔ ہائے افسوس وہ رند حسن پرست کیا خوب آدمی تھا۔

ردیف س

۶۸- مژدہ اے ذوق اسیری کہ نظر آتا ہے ۱ دامِ خالی قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس
جگرِ تشنۂ آزار تسلّی نہ ہؤا ۲ جُوئے خوں ہم نے بہائی بُنِ ہر خار کے پاس
مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے ۳ خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس
میں بھی رُک رُک کے نہ مرتا جو زباں کے بدلے ۴ دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس
دہنِ شیر میں جا بیٹھئے لیکن اے دل ۵ نہ کھڑے ہو جیئے خوبانِ دل آزار کے پاس
دیکھ کر تجھ کو چمن بسکہ نمو کرتا ہے ۶ خود بخود پہنچے ہے گل گوشۂ دستار کے پاس

مر گیا پھوڑ کے سر غالب وحشی ہے ہے
بیٹھنا اس کا وہ آ کر تری دیوار کے پاس

۱- پرندے پکڑنے کے لئے جال لگا کر اس کے قریب اس جانور کو پنجرے میں بند کر کے رکھ دیتے ہیں جس کے ہم جنس پرندوں کو جال میں پھنسانا مقصود ہوتا ہے۔ جب پنجرے والا پرندہ بولتا ہے۔ تو جنگل میں سے اس کے ہم جنس پرندے اس کے قریب آجاتے ہیں۔ اور آتے ہی جال میں گرفتار ہو جاتے ہیں کہتے ہیں اے ذوقِ اسیری تجھ کو مژدہ ہو کہ تیری آرزو پوری ہو گئی۔ کیونکہ مرغِ گرفتار کے پاس جو قفس میں بند ہے۔ ایک خالی جال بھی نظر آرہا ہے۔ اب چلو اور اس میں گرفتار ہو جاؤ۔

۲- تشنۂ آزار... آزار کا خواہشمند تسلی نہ ہوا... اس کی تسلی نہ ہوئی

سے نہ تسلی ہوا دلِ بےتاب — نہ تھما چشمِ تر سے خونِ ناب

بُن... جڑ۔ باوجود اس کے کہ ہم نے ہر کانٹے کی جڑ کے پاس ایک خون کی نہر بہا دی۔ لیکن پھر بھی میرے ایذا دوست جگر کی تسلی نہ ہوئی۔ سبب متفق ہیں۔ کہ یہ خون کی ندیاں صحرا نوردی میں تلوؤں میں کانٹے چبھنے سے رواں ہوئیں مگر آسی نکلتے ہیں۔ کہ تلوؤں میں کانٹے چبھنے کی وجہ سے تلوؤں سے اور اس کی تکلیف محسوس ہونے سے جوئے خوں بہائی۔

۳- تم اچھے وقت میرے آئے۔ کہ حسرتِ دیدار بھی پوری نہ ہو سکی میں نے تمھیں دیکھنے کے لئے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن آنکھیں کھولتے ہی کھولتے ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔ اسی مفہوم کو اس طرح بھی ادا کیا ہے سے

یار لائے مری بالیں پہ اسے پر کس وقت — مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ

۴- دشنہ... خنجر۔ غمخوار مجھے ہر وقت ملامت کرتا ہے طعنے دیتا ہے اس لئے ہر وقت میری جان پر بنی رہتی ہے۔ اگر اس کے پاس زبانِ طعن کے بدلے ایک تیز خنجر ہوتا۔ تو میں اس طرح سسک سسک کر نہ مرتا۔ بلکہ وہ مجھے ایکدم

ہی ہلاک کر دیتا ہے۔

آسی۔ غمخوار کو بوجہ غمخوار ہونے کے جان دینا پسند کیا ہے۔ مگر نصیحت اور ملامت سننا پسند نہیں اور یہ شانِ کمالِ عشق ہے۔

۵۔ دل کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔ کہ دہن شیر میں جا بیٹھئے یعنی اپنی جان کو سخت ترین خطرے میں ڈال دیجئے اور لقمۂ اجل بن جایئے لیکن معشوق دل آزار کے پاس جا کر بھی نہ کھڑے ہو جیئے یعنی دل لگانے سے مرنا بہتر ہے بیٹھنے اور کھڑے ہونے کا مقابلہ لطف خیز ہے۔

۶۔ نمو کرنا۔۔۔۔ بڑھنا۔ بالیدگی۔ تجھ کو دیکھ کر چمن میں اس قدر بالیدگی ہوتی ہے کہ گل تیرے گوشہ دستار کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ معشوق کے دیدار سے ہر شے میں ولولہ شوق پیدا ہوتا ہے۔

۷۔ ہائے افسوس کہ غالبؔ وحشی سر پھوڑ کر مر گیا۔ اب ہمیں اس کا تیری دیوار کے پاس شوق دیدار میں یا سر پھوڑنے کے لئے آکر بیٹھنا یاد آتا ہے۔ ایک اور جگہ کہا ہے۔ ؎

یاد آگیا مجھے تری دیوار دیکھ کر سر پھوڑنا وہ غالبؔ شوریدہ حال کا

ردیف ش

۶۹۔ نہ لیوے گر خسِ جوہر طراوت سبزۂ خط سے ۱ لگا دے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش

فروغ حسن سے ہوتی ہے حلّ مشکلِ عاشق ۲ نہ نکلے شمع کے پا سے نکالے گر نہ خار آتش

۱۔ خس جوہر۔۔۔ خس جوہر آئینہ۔ یعنی جوہر آئینہ طراوت۔۔۔۔ نمی۔ نگار۔۔۔

محبوب اگر خس جوہر آئینہ سبزۂ خط سے طراوت حاصل نہ کرے۔ تو یقیناً خانۂ آئینہ میں یار کے آتشین رُخ کے عکس سے آگ لگ جائے۔ مطلب یہ ہے شعلۂ حسن کا اثر سبزۂ خط کی نمی کی وجہ سے آئینہ کے خس یا جوہر کو نہیں جلاتا۔ ورنہ اگر سبزۂ خط کی نمی نہ ہو تو خس جوہر جل کر خاک ہو جائے۔

۲۔ فروغ حُسن ... جلوۂ حُسن۔ خار ... شمع کی بتی کو خار کہا ہے۔ آتش کر فروغِ حسن، شمع کو عاشق۔ اور رشتۂ شمع کو خارِ شمع سے تشبیہ دی ہے۔ اور اس خار کو نکالنے والا شعلۂ شمع قرار دیا ہے۔ جب شمع روشن ہوتی ہے۔ تو رشتۂ شمع جل جاتا ہے۔ رشتۂ شمع پائے شمع میں خار ہے۔ اس کے جلنے سے گویا شمع کے پاؤں میں سے خار نکل جاتا ہے۔ ظاہر ہے۔ خار پا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اس کے نکل جانے سے شمع (عاشق) کی مشکل حل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح معشوق کے فروغِ حسن سے عاشق کی مشکل حل ہوتی ہے جو شمع کی طرح جلتا ہے۔

ردیفِ ع

جادۂ رہ خور کو وقتِ شام ہے تارِ شعاع
چرخ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع

جادۂ رہ ... پگڈنڈیا جس سرزمین پر سے لوگ بار بار گزرتے ہیں۔ وہاں قدموں کے اثر سے ایک لکیر سی پڑ جاتی ہے۔ اسے لیک بھی کہتے ہیں۔ خور ... خورشید۔ تارِ شعاع ... وہ سفید خط جو غروبِ آفتاب کے بعد اور طلوعِ آفتاب سے پہلے آسمان پر چمکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس کو قرنی الشمس کہا جاتا ہے

شام کے وقت جب آفتاب رخصت ہوتا ہے۔ تو تارِ شعاع اس کے لئے جادۂ راہ (یعنی جانے کا راستہ) بن جاتا ہے۔ اور آسمان ماہِ نو کے ذریعہ اپنی آغوشِ وداع کو اسے رخصت کرنے کے لئے وا کر دیتا ہے۔ ماہِ نو کی صورت بجنسہٖ ایسی ہوتی ہے جیسے کوئی بغلگیر ہونے کو اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے مطلب یہ ہے کہ وقتِ شام آفتاب آمادۂ سفر ہے۔ اور آسمان اسے رخصت کرنے کو تیار۔

آسی۔ وقتِ شام آفتاب جو آسمان سے رخصت ہوتا ہے اور اس پر ہلال نمودار ہوتا ہے۔ تو وہی شعاعِ شمس اس کے واسطے جادہ راہ ہے۔ اور ماہِ نو وہ آغوش کشادہ ہے۔ جو آسمان نے سورج کو رخصت کرنے کے لئے کھولی ہے۔ حاصل یہ ہے۔ کہ شام کے وقت آسمان آفتاب کو رخصت کر دیتا ہے۔ آسی۔ شعاع کے معنی وہ نہیں لیتے۔ جو باقی شارحین نے لئے ہیں وہ لکھتے ہیں۔ شعاع کے یہ معنی خلافِ قیاس ہیں۔

۰۰. رخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیِ شمع ۱ ہوئی ہے آتشِ گل آبِ زندگانیِ شمع
زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگ خاموشی ۲ یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیِ شمع
کرے ہے صرف بایمائے شعلہ قصہ تمام ۳ بطرزِ اہلِ فنا ہے فسانہ خوانیِ شمع
غم اس کو حسرتِ پروانہ کا ہے اے شعلہ ۴ ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیِ شمع
ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے ۵ بجلوہ ریزیِ باد و بہ پرفشانیِ شمع
نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار نہ پوچھ ۶ شگفتگی ہے شہیدِ گلِ خزانیِ شمع
جلے ہے دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو ۷ نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانیِ شمع

۱. سوزِ جاودانی ... سوزِ دائمی۔ آتشِ گل ... رشکِ آتشِ گل۔ آبِ زندگانی ...... آبِ حیات۔ آتشِ گل ... سرخیِ گل یعنی سرخیِ رخسارِ معشوق

کے رُخِ انور کو دیکھ کر شمع رشک کی وجہ سے سوزِ دائمی میں مبتلا ہو گئی جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ محبوب کے رخساروں کی سُرخی جو آتشِ گل سے مشابہ ہے شمع کے لئے آبِ حیات بن گئی ہے۔ گویا وہ رشکِ رخسار سے ہمیشہ جلتی ہے اور جلتی رہے گی۔ شعراء بجھی ہوئی شمع کو شمع کشتہ کہتے ہیں شاعر نے اسی خیال کے ماتحت روشن شمع کو زندہ فرض کر لیا۔ اور یہ مضمون پیدا کیا۔

۲۔ یہ بات ۔۔۔۔ یعنی اہل زبان مرگ کو خاموشی کہتے ہیں۔ روشن ہوئی ۔۔ ظاہر ہوئی۔ اہل زبان کے محاورے میں خاموشی مرگ کے مترادف ہے اور یہی بات شمع کی زبانی بزم میں بھی ظاہر ہو گئی۔ مطلب یہ ہے کہ جب شمع بُجھ جاتی ہے تو اس کو شمع کشتہ یا مردہ کہتے ہیں۔ یا شمع کی لو کو زبانِ شمع کہا جاتا ہے شمع کا خاموش ہو جانا اس کا فنا ہو جانا ہے۔ اس لئے وہ زبانِ حال سے اس نکتہ کو ظاہر کرتی ہے۔ کہ اہلِ زبان کا خاموش رہنا ان کی موت ہے۔

۳۔ ایما ۔۔۔۔ اشارہ۔ قصہ تمام کرنا ۔۔۔۔ زندگی ختم کرنا یعنی جل بجھنا شمع صرف شعلہ کے اشارے سے اپنی زندگی کا قصہ تمام کرلیتی ہے یعنی شعلہ کی محبت میں جل بجھتی ہے۔ گویا شمع کی فسانہ خوانی اہلِ فنا کی طرح ہے۔ جو شعلۂ عشقِ الٰہی سے لو لگا کر فنا ہو جاتے ہیں۔ (طباطبائی۔ سعید۔ بیخود)

آسی۔ شمع کی فسانہ خوانی اور اپنا قصہ سُنانا اس طرح ہے جیسے کہ عارف اپنا حال اشاروں میں ظاہر کرتے ہیں۔ شمع کے شعلہ کی جنبش کو اشارہ اور جل بجھنے کو قصہ کا تمام کرنا فرض کیا ہے۔ اہلِ فنا کے جل بجھنے کو فسانہ خوانی نہیں کہہ سکتے۔ اگرچہ جل بجھنے سے قصہ تمام ضرور ہو جاتا گویا دوسرے معنوں میں

فسانہ خوانی بیکار ہو جاتا ہے۔

مولوی محمد مہدی از رسالہ اردو۔ شمع کی فسانہ خوانی اِن لوگوں کی طرح ہے جو اپنی ذات میں فنا ہو کر خودی کو ترک کر دیتے ہیں۔ فسانہ خوانی سے فنا ہو نا مراد ہے۔ اور جس کے ایسا سے شمع اپنا قصہ تمام کرتی ہے۔ یعنی فنا ہوتی ہے۔ وہ شعلہ ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ اس سے لو لگا کر اپنی ہستی کو مٹا دیتی ہے۔

۴۔ اے شعلے تیرے لرزنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ شمع حسرتِ پروانہ کے غم میں ناتواں ہو گئی ہے۔ گویا شمع کی لو کا لرزنا شمع کی ناتوانی کی نشانی ہے۔ اور یہ لرزنا اس وجہ سے ہے۔ کہ وہ حسرت و ناکامیٔ پروانہ کے غم میں گھلے جاتی ہے۔

۵۔ اہتزاز۔۔۔ خوش ہو کر جھومنا۔ بجلوہ میں بائے قسمیہ ہے۔ جلوہ ریزیٔ باد۔۔۔ ہوا کا چلنا۔ پر فشانیٔ شمع۔۔۔ شمع کا جھلملانا۔ قسم ہے مجھ کو شمع کے جھلملانے اور ہوا کی جلوہ ریزی کی۔ کہ تیرے خیال سے میری روح کو فرطِ انبساط سے جنبش ہوتی ہے۔ (آسی۔ سعید۔ طباطبائی)

حسرت، بیخود۔ تیرے خیال سے روحِ عاشق کو ایک جنبش سرور حاصل ہوتی ہے جس طرح ہوا چلنے سے شعلہ شمع کو حرکت پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح تیرے خیال سے مستیٔ سرور پیدا ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے۔ "ب" کو بائے قسمیہ قرار دینے میں جس قدر لطف ہے وہ بائے تشبیہ مقرر کرنے میں نہیں۔

۶۔ شہید۔۔۔ کشتہ۔ خزانی۔۔۔ خزاں زدہ۔ شہید۔۔۔ عاشق بھی۔ ہوئی گل میں ایہام ہے۔ غمِ عشق کے داغ کی خوشی کی بہار کا حال مجھ سے نہ پوچھ

بلکہ یوں سمجھ لے۔ کہ شگفتگی اور بہار۔ شمع کے گل خزاں زدہ پر نثار جان سے ہٹی پڑی ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ غم عشق کے کملائے ہوئے داغ میں وہ بہار ہے جس پر شگفتگی نثار ہے۔

۲۔ شمع بالین یار پر مجھ کو بیٹھے ہوئے دیکھ کر جلتی ہے۔ اس جلنے سے ظاہر ہے کہ وہ میری رقیب ہے۔ جب وہ رقیب ٹھہری تو پھر اس کی بدگمانی کا داغ میرے دل پر کیوں نہ ہو۔ یعنی پھر میں کیوں نہ اس سے بدگمان ہو جاؤں رقیب سے بدگمان ہو جانا عاشق کا عمومی دستور ہے۔

ردیف ف

۱۔ ہم رقیب سے نہیں کرتے وداع ہوش ۱	مجبور یاں تلک ہوئے اے اختیار حیف
جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے ۲	اے ناتمامیٔ نفس شعلہ بار حیف

۱۔ وداع ہوش کرنا۔۔۔۔ بیخود ہونا۔ بیم۔۔۔۔ خوف۔ رقیب کے خوف کے مارے ہم بیخود ہونا پسند نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ ہماری بیخودی سے فائدہ اُٹھائے گا۔ یا ہمارے رازِ عشق سے واقف ہو جائے گا۔ اے اختیار تجھ پر افسوس ہے۔ اب ہم اس حد تک مجبور ہو گئے ہیں اور بے اختیار ہو گئے ہیں کہ وداع ہوش بھی نہیں کر سکتے۔

۲۔ اے آہ شعلہ بار تیری ناتمامی پر افسوس ہے۔ کہ کیوں تو نے ہمیں ایک دم جلا کر خاک نہ کر دیا۔ تو ہمیں آہستہ آہستہ جلا رہی ہے۔ اور اس بات سے میرا دل کڑھتا ہے۔ اس شعر میں ایک طب کا مسئلہ ہے۔ جو میرزا صاحب نے پہلے بھی بیان کیا ہے۔ یعنی ہر سانس کے ساتھ جو ہم

میں داخل ہوتی ہے۔ وہ تفریح قلب بھی کرتی ہے اور حرارت غریزی کو برانگیختہ بھی۔ اور یہی حرارت فنا و بقا کا باعث ہے۔

ردیف ک

۷۲- زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک ۱ کیا مزہ ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

گردِ راہِ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل ۲ ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک

مجھ کو ارزانی رہے تجھ کو مبارک ہو جیو ۳ نالۂ بلبل کا درد اور خندۂ گل کا نمک

شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج ۴ گردِ ساحل ہے بزخمِ موجۂ دریا نمک

داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی واہ وا ۵ یاد کرتا ہے مجھے دیکھے ہے وہ جس جا نمک

چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہے ۶ دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگیں ہیں اعضا نمک

غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توفیرِ درد ۷ زخم مثلِ خندۂ قاتل ہے سر تا پا نمک

یاد ہیں غالب تجھے وہ دن کہ وجدِ ذوق میں
زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

۱- دیوانے کو بچے پتھر مار کر ستایا کرتے ہیں۔ غالب اپنے آپ کو دیوانہ تصور کرتے ہیں۔ اور ان بچوں کی شکایت کرتے ہیں۔ کہ یہ بے پروا بچے میرے زخموں پر نمک کہاں چھڑکتے ہیں۔ یعنی نہیں چھڑکتے اگر انہیں پتھروں میں جو وہ مارتے ہیں۔ نمک ہوتا۔ تو کیا لطف آتا۔ مطلب یہ ہے۔ کہ مجھے دوگنی لذت حاصل ہوتی۔ یعنی پتھر بھی لگتے اور زخموں پر نمک بھی۔

۲- یوں تو دنیا میں بہت نمک پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ جس قدر ہم چاہیں اپنے

زخموں پر چھڑکنے کے لئے بہم پہنچا سکتے ہیں. لیکن میرے زخمِ دل کے لئے تو
راہ یار کی گرد سامانِ فخر و ناز ہے۔ اس خیال میں نزاکت یہ ہے کہ نمک ابتدا
میں واقعی بہت تکلیف دیتا ہے۔ مگر آخر کار زخم کو بھر دیتا ہے۔ برخلاف
اس کے گرد سے زخم اور زیادہ خراب ہوتا ہے۔ اسی لئے گرد کو نمک پر ترجیح دی
ہے۔ طبا طبائی نے ایک یہ معنی بھی پیدا کئے ہیں. کہ دنیا میں نمک اتنا کہاں ممکن
ہے جس پر میرا زخم جگر ناز کرے۔

۳۔ ارزانی رہے۔ . . مبارک ہو۔ اس شعر میں لف ونشر مرتب ہے۔ مجھ کو
نالۂ بلبل کا درد ارزانی رہے۔ اور تجھ کو خندۂ گل کا نمک مبارک ہو۔

آسی۔ تجھے حسن نے گل کی طرح خندۂ نمکین عطا کیا ہے اور اس خندۂ
نمکین نے مجھے نالۂ پُر درد بلبل دیا ہے۔ اس لئے دونوں قابلِ مبارک باد ہیں۔
وہ نمک تیرے لئے باعثِ فخر اور یہ درد میرے لئے مایہ ناز ہے۔ طبا طبائی
ہو جیو کو مکروہ قرار دیتے ہیں۔ اور آسی لکھتے ہیں۔ کہ اس عہد میں یہ
متروک نہ تھا۔

۴۔ جولاں. . . . گھوڑے کو دوڑانا۔ شور. . . غوغا۔ دریا کی صفت ہے لیے
شور کے معنی نمک کے بھی ہیں۔ آج دریا کے کنارے کس نے اپنے توسنِ ناز
کو جولانی دی ہے۔ اس کے شورِ جولاں سے گرد ساحل نمک بن کر موجِ دریا
کے زخموں پر نمک چھڑکتی ہے۔ گویا گرد ساحل رشک سے نمک بن گئی ہے
وجہ رشک یہ ہے کہ اس کے مقابلے میں دریا کے زور شور کی کچھ حقیقت نہ رہی
اصلی خیال یہ ہے۔ کہ میرے محبوب کا توسن موجِ دریا سے بھی زیادہ تیز خرام تھا
یہی وجہ تھی کہ اس کی اُڑائی ہوئی گرد نے موجِ دریا کے زخموں پر نمک چھڑکا
یعنی اس کو رشک پیدا ہوگیا۔ کیونکہ دریا کی رفتار میں یہ زور شور اور روانی نہیں

۵۔ داد دینا...... تعریف کرنا۔ میرا محبوب میرے زخموں کا کیسا زبردست قدردان ہے۔ کہ وہ جہاں کہیں نمک دیکھتا ہے۔ مجھ کو یاد کرتا ہے — یعنی بے اختیار اس کو میرے زخم یاد آجاتے ہیں۔ طباطبائی یاد کرنے کے معنی بلانے کے لیتے ہیں۔ یعنی پھر وہ مجھے بلا کر میرے زخموں پر نمک چھڑکتا ہے،

۶۔ اے محبوب عاشق کو زخمی چھوڑ کر چلے جانا افسوس کی بات ہے ایسے وقت میں تیرا ٹھہرنا ضروری ہے۔ کیونکہ اس کا دل اس بات کا آرزومند ہے کہ تو اس کے زخموں پر نمک چھڑک کر لذت درد میں اضافہ کرے۔

۷۔ منت کھینچنا...... احسان اٹھانا۔ توفیر درد...... درد زیادہ کرنا۔
خندۂ قاتل کو بوجہ حسن ملیح نمکین کہا ہے۔ خندۂ زخم ایک عام استعارہ ہے درد کو زیادہ کرنے کے لئے میں معشوق کے سوا کسی غیر کا احسان ہرگز نہ اٹھاؤں گا۔ یعنی میں کسی اور سے درخواست نہ کروں گا۔ کہ وہ میرے زخموں پر نمک چھڑکے اگر معشوق نہیں چھڑکتا تو کچھ مضائقہ نہیں۔ میرے لئے یہی کافی ہے۔ کہ جس طرح خندۂ معشوق نمکین ہے۔ اسی طرح میرا زخم بھی خندہ ہے اور اس کے خندۂ نمکین کے اثر سے میرا زخم۔ سراپا سر نمک بنا ہوا ہے مطلب یہ ہے۔ مجھے نمک کے لئے منت غیر اٹھانے کی کیا ضرورت، میرا زخم اس کے خندۂ نمکین سے نمک کی کان بنا ہوا ہے۔

۸۔ یہ عورتوں کا عقیدہ ہے۔ کہ اگر نمک زمین پر گر جائے تو اسے پلکوں سے اٹھانا چاہیئے۔ مطلب یہ ہے کہ نمک کا گرانا گناہ ہے۔ اور یہ بھی زبان زد خاص و عام ہے۔ کہ اگر کسی سے نمک گر جائے تو قیامت کے دن وہ نمک اسے پلکوں سے چننا پڑتا ہے۔ اس لئے عموماً نمک کی بہت احتیاط کی جاتی ہے کہ گرنے نہ پائے۔ کہتے ہیں۔ غالب انہیں، وہ دن یاد نہیں ہے۔ جب زخم سے

جس قدر نمک گر جاتا تھا۔ تم فرطِ شوق سے اسے اپنی پلکوں سے چنتے
یعنی تم وہ اپنی ایذا دوستی کا زمانہ بھول گئے؟ بالکل ناممکن ہے۔ کہ محض مذکورہ
بالا قدیم الاعتقاد بات کی طرف اشارہ کیا ہو۔ اور درد کا پہلو خود بخود
نمایاں ہو گیا ہو۔

۷۳۔ آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک ۱ کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ ۲ دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک
عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب ۳ دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن ۴ خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک
پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم ۵ میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک
یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل ۶ گرمیٔ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

۱۔ ایک عمر۔۔۔۔ مدت دراز۔ سر ہونا۔۔۔۔ (۱) سمجھنا۔ باخبر ہونا (۲) ہم سر ہونا
آہ کو اثر پیدا کرنے کے لئے ایک مدت دراز درکار ہے۔ جب تک آہ میں
اثر پیدا ہو گا۔ اور تیری زلف ہمارے حالِ زار سے باخبر ہو گی۔ اس وقت
تک ہمارا خاتمہ ہو چکے گا۔ (بیخود۔ طباطبائی)

آسی۔ (۱) ہم خیال مؤلف (۲) جب تک ہماری آہ میں اثر پیدا ہو گا۔ اور
ہم تیری زلف کی مہم کو سر کریں گے۔ اس وقت تک ہمارا خاتمہ ہو
جائے گا۔ (سعید)

۲۔ کام۔۔۔۔۔ دہن۔ نہنگ۔۔۔ مگرمچھ۔ ہر موج ایک جال ہے اور
اس جال کا ایک ایک حلقہ "صد کام نہنگ" کا بنا ہوا ہے مطلب یہ ہے

کہ ایک ایک موج میں سینکڑوں مگرمچھ منہ پھاڑے ہوئے ہیں۔ ایسی خطرناک حالت میں دیکھئے۔ قطرہ کے موتی بننے تک کی مدت میں اس پر کیا کیا آفتیں آتی ہیں۔ بقولِ حالی۔ مطلب صرف اس قدر ہے۔ کہ انسان کو درجہ کمال تک پہنچنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

۳۔ رنگ۔۔۔۔ حال۔ علاج۔ تدبیر۔ عاشقی صبرطلب۔۔۔ عشق میں صبر سے کام چلتا ہے بے صبری معاملات کو بگاڑ دیتی ہے کہتے ہیں۔ عاشقی میں صبر کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ بغیر صبر کے معاملات بگڑ جاتے ہیں لیکن تمنا مجھے بیتاب کر رہی ہے۔ کہ حصولِ مطلب میں جلدی کرو۔ اس طرح سے میں عجیب کشمکش میں پھنس گیا ہوں۔ ایسی حالت میں جب تک جگر خون ہو کر عشق میں پختگی اور اثر پیدا ہو۔ اس وقت تک میں دل کی کیا تدبیر کروں۔ گویا میں اسے کیونکر سنبھالوں۔

۴۔ ہام ... یہم رہے ہیں کہ تم ہماری طرف سے تغافل نہ کروگے اور ہماری جلدی ہی خبر لوگے لیکن مصیبت یہ ہے۔ کہ جتنی دیر میں تمہیں ہماری خبر پہنچے گی۔ اتنی دیر میں ہمارا کام تمام ہو جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ ہم میں اتنی طاقت نہیں۔ کہ سوزِ دل کو برداشت کر سکیں۔

۵۔ پرتو خور۔۔۔۔ تمازت آفتاب، دھوپ۔ حکماء کا قول ہے کہ شبنم تمازت آفتاب ہی سے پیدا ہوتی ہے اور تمازتِ آفتاب ہی اسے جذب کر لیتی ہے۔ کہتے ہیں جس طرح دھوپ شبنم کو فنا کی تعلیم دیتی اور اسے فنا کر دیتی ہے بجنسہٖ یہی میری حالت ہے گویا آپ آفتاب ہیں اور میں شبنم کا قطرہ ہوں۔ اس لئے میری زندگی محض اتنی، ایک محبت بھری نظر تک ہے۔ جب آپ آفتاب کی طرح مجھ پر اپنا پرتو ڈالیں گے۔ تو میں قطرۂ شبنم کی طرح فنا ہو جاؤں گا اور اس طرح

سے تعلیم فنا حاصل کروں گا۔

۶۔ اے غافل انسان زندگی کی فرصت اتنی قلیل ہے۔ کہ تو بمشکل دنیا کو ایک نظر دیکھ سکتا ہے۔ یوں سمجھ لے کہ بزمِ دنیا کی رونق اتنی دیر تک قائم رہتی ہے جتنی دیر میں ایک چنگاری رقص کر کے بجھ جاتی ہے۔ ذوق لکھتے ہیں:۔

کیا اعتبار ہستیِ ناپائیدار کا　　　چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

۷۔ اے اسد غمِ زندگی کا علاج موت کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا دیکھ لو چاہے محفلِ غم ہو یا بزمِ نشاط ہو شمع کو ہر صورت میں صبح تک جلنا ہی پڑتا ہے۔ قاعدہ ہے جب تک صبح نہیں ہوتی یا شمع ختم نہیں ہو جاتی اسے جلایا جاتا ہے۔ اور اس کو جلنا پڑتا ہے بعینہٖ یہی حالت انسان کی ہے جب تک اسے موت نہیں آتی۔ اس کی مشکلات کا خاتمہ نہیں ہوتا۔ اور اسے خوش و ناخوش زندگی کے اوقات پورے کرنے پڑتے ہیں۔

ردیف گ

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ　۱　یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد　۲　مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

۱۔ اجابت ۔۔ قبول ۔ بغیر ۔۔۔ سوائے ۔ اگر تجھ کو اپنی دعا کے قبول ہونے کا یقین ہے ۔ تو کوئی اور دعا نہ مانگ ۔ یعنی صرف یہی مانگ کہ تجھ کو دلِ بے مدعا مل

جائے جب تجھے دل بے مدعا مل جائے گا تو کسی اور چیز کے لئے دعا مانگنے کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔

آسی۔ اگر تجھ کو اپنی دعا کے قبول ہو جانے کی بھی امید ہے تب بھی دعا نہ کر۔ اپنے دل کو بے مدعا رکھ اور ہمیشہ اسی خواہش میں رہ کہ دل میں کوئی مدعا پیدا نہ ہو۔ نہ دل میں کوئی خواہش پیدا ہوگی۔ نہ دعا مانگنے کی ضرورت پڑے گی۔

۲۔ حالی۔ اس شعر میں ایک نئی طرح کی شوخی ہے جو بالکل اچھوتی ہے بظاہر شاعر درخواست کرتا ہے۔ کہ اے خدا مجھ سے میرے گناہوں کا حساب نہ مانگ۔ اور در پردہ الزام دیتا ہے گویا یہ کہتا ہے کہ گناہوں کا حساب کیونکر دوں۔ وہ شمار میں اس قدر ہیں۔ کہ جب ان کو شمار کرتا ہوں تو وہ داغ جو تو نے دنیا میں دیئے ہیں اور وہ شمار میں اس کثرت سے ہیں جس کثرت سے میرے گناہ ہیں۔ ان کی گنتی یاد نہیں آتی۔ گناہ اور داغوں کے شمار میں برابر ہونے سے یہ مراد رکھی ہے۔ کہ جب کسی گناہ کا مرتکب ہؤا تو بسبب عدم استطاعت کے اس کو خاطر خواہ نہ کر سکا۔ کوئی نہ کوئی حسرت ضرور باقی رہ گئی۔ مثلاً شراب پی تو وصل نصیب نہ ہؤا۔ اور وصل میسر آیا۔ تو شراب نہ ملی۔ پس جتنے گناہ کئے ہیں اتنے ہی داغ دل پر کھائے ہیں۔

ردیف ل

۷۵۔ ہے کس قدر ہلاک فریب وفائے گل ؛ بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

آزادیٔ نسیم مبارک کہ ہر طرف ۲ ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گل

جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا ۳ اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گل

خوش حال اس حریفِ سیہ مست کا کہ جو ۴ رکھتا ہو مثلِ سایۂ گل سر بپائے گل

ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لئے بہار ۵ میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گل

شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے ۶ مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گل

سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی ۷ خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل

تیرے ہی جلوہ کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک ۸ بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل

غالب مجھے ہے اس سے ہم آغوشی آرزو
۹ جس کا خیال ہے گلِ جیبِ قبائے گل

۱۔ بلبل فریبِ وفائے گل پر کس قدر مٹی ہوئی ہے۔ کہ گل بھی اس کی حماقت پر ہنستے ہیں۔ یعنی بلبل اس دھوکے میں مری جاتی ہے۔ کہ رنگِ گل میں وفا و ثبات ہے۔ اور پھول اس بناء پر ہنستے ہیں۔ کہ اس نے خوب دھوکا کھایا۔

بلبل کے کاروبار پہ ہے خندہ ہائے گل   کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔

۲۔ ہوائے گل .... مراد بوئے گل۔ گلِ شگفتہ کو ٹوٹا ہوا حلقۂ دام کہا ہے اور وہ اس لئے کہ اس میں بوئے گل بند رہتی۔ غنچوں کے کھل جانے سے بوئے گل کے دام کے حلقے ٹوٹ گئے ہیں اور حلقہ ہائے دام ٹوٹ جانے سے بوئے گل آزاد ہو گئی ہے۔ لہذا بوئے گل (نسیم) کو آزادی مبارک ہو۔

۳۔ تمام لوگ موجِ رنگ کے دھوکے میں آ گئے۔ اور اس پر مفتون ہو گئے درحقیقت وہ موجِ رنگ نہ تھی۔ بلکہ وہ گل کی نوائے خونیں اور نالۂ خونچکاں تھا۔ کسی نے اس سے یہ مفہوم نکالا ہے۔ کہ پھول کا گریۂ خونیں کس قدر بے اثر تھا۔

سبب۔ چمن میں جو کوئی پھول تھا۔ وہ موجِ رنگ کے دھوکے میں مرگیا۔ یعنی اس دھوکے میں کہ اس نے اس رنگ کو مستقل اور پائیدار سمجھا۔ اگرچہ وہ بالکل بے ثبات تھا۔ افسوس ہے کہ اب وہ پھول دھوکے میں آنے پر بڑی غمناک اور دل سوز آواز میں نالہ کر رہے ہیں۔ اور ان کی حالت قابل افسوس ہے۔

۴۔ حریف ..... مراد عاشق۔ گل ..... مراد معشوق۔ وہ بدمست عاشق کس قدر خوش نصیب ہے۔ جس کا سر سایہ گل کی طرح محبوب کے پاؤں پر رکھا ہو۔ بدمست عاشق کو سایۂ گل سے اور معشوق کو گل سے تشبیہ دی ہے اور ہماری شاعری میں یہ تشبیہ نادرات سے ہے۔

۵۔ ایجاد کرنا ... وجود میں لانا۔ پیدا کرنا۔ نفس عطر سائے گل، نگہت معطر، بہار۔ پھولوں کو تیرے لئے پیدا کرتی ہے۔ تاکہ تو ان کو کام میں لائے یعنی تو ان کو ہار بنا کر گلے میں ڈالے۔ اپنے بستر کو ان سے زینت دے۔ ان کے ساتھ تو گلبازی کرے وغیرہ وغیرہ۔ یہ باتیں ایسی ہیں۔ جو موجب رشک ہیں۔ اس لئے نفس عطر سائے گل (نگہت معطر) میری رقیب ٹھہری۔

۶۔ بینا ..... شیشۂ شراب۔ ہوائے گل ..... آرزوئے گل۔ موسم بہار میں شیشے میں شراب اور دل میں آرزوئے سیر گل ضرور ہونی چاہیئے۔ چونکہ میرا شیشہ شراب سے اور دل ہوائے سیر گل سے خالی ہے۔ اس لئے میں ہمیشہ موسم بہار سے شرمندہ ہوں۔ (آسی، بیخود)

طباطبائی، سعید، یہ شعر ایک سوال مقدر کا جواب ہے۔ میرا شراب پینا اور باغوں کی سیر کرنا لوگ برا سمجھتے ہیں۔ مگر میں ایسا نہ کروں تو مجھے باد بہاری سے شرمندگی ہوتی ہے۔

۷۔ سطوت ...... رعب دبدبہ۔ شوخی ہے ..... نا پسند ہے۔ تیرا حسن غیرت والا ہے۔ اور اس کو اس بات کی تاب نہیں۔ کہ اس کا عاشق اس کے سوا کسی اور چیز کو محبت کی نظر سے دیکھے۔ چنانچہ تیرے رعب حسن کی وجہ سے میری نظروں میں رنگ ادائے گل خون بن گیا ہے یعنی میں گل کی دلفریب اداؤں کو پسند نہیں کرتا۔

۸۔ قفا .... پیچھے گل در قفائے گل .... پھول کے بعد پھول ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک اس دھوکے میں کہ تو جلوہ گر ہے۔ پھول ایک دوسرے کے پیچھے بے اختیار دوڑے چلے آتے ہیں کہ تیرا جلوہ دیکھیں مطلب یہ ہے۔ کہ پھول اس دھوکے میں کہ صحن چمن میں تو جلوہ گر ہوا ہے ایک دوسرے کے بعد کھلتے چلے جاتے ہیں۔

یعنی جب کوئی پھول کھلتا ہے۔ تو اور کلیاں یہ سمجھ کر کہ تو پھول کے پردے میں جلوہ گر ہوا ہے پھول بن کر سلسلہ وار کھلنی شروع ہو جاتی اور اس سلسلہ کو دیکھ کر یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ ایک پھول کے پیچھے دوسرا پھول بھاگتا آ رہا ہے۔

۹۔ ہم آغوشی آرزو ... یعنی آرزوئے ہم آغوشی۔ وصل جیب قبا ..... گریبان۔ غالب مجھے اس شاہد حقیقی سے ہم آغوشی کی آرزو ہے۔ کہ جس کے خیال سے گل نے اپنے گریبان کو زینت دی ہے۔

ردیف م

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس ۱ برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم

محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال ۲ ہیں ورق گردانیٔ نیرنگِ یک بت خانہ ہم

باوجودیکہ جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں ۳ ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم

ضعف سے ہے نے قناعت سے یہ ترکِ جستجو ۴ ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم

دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسدؔ

۵ جانتے ہیں سینۂ پرخوں کو زنداں خانہ ہم

۱۔ بیش از یک نفس۔۔۔ دم بھر سے زیادہ۔ ہم آزاد ہیں اور قاعدہ ہے کہ آزادوں کو دنیا میں ایک دم بھر سے زیادہ غم نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگ اپنے غمکدہ کی شمع کو برق سے روشن کرتے ہیں۔ جیسے برق کی چمک دم بھر سے زیادہ نہیں رہتی۔ اسی طرح ہم آزاد لوگوں کے غم و الم بھی بیش از یک نفس نہیں رہتے۔ مطلب یہ ہے کہ جب ہمارے ماتم خانہ میں غم دم بھر سے زیادہ نہیں رہتا۔ تو روشنی بھی دم بھر سے زیادہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم چشمک برق کو کام میں لاتے ہیں۔

۲۔ گنجفہ کھیلنے والے پتوں کو بار بار انگلیوں میں پھیلا پھیلا کر دیکھا کرتے ہیں اور تمام بازیوں کے ورق شمار کرتے ہیں۔ ورق گردانی۔۔۔ گردانی میں یٔ زائد ہے۔ ورق گرداں یعنی ورق گردانندہ۔ گنجفہ اور ورق میں رعایت لفظی ہے ہمارا خیال ہر وقت ان محفلوں کی یاد کو تازہ کرتا ہے۔ جو برہم ہو چکی ہیں۔ گویا ہم ان گذری ہوئی صحبتوں کے ورق گرداں ہیں جنکو ہم نیرنگ بت خانہ سمجھتے ہیں گنجفہ کی

ورق گردانی سے محفلِ نشاط کی برہمی کو تشبیہہ دی ہے۔

۳۔ یک جہاں ہنگامہ ..... بہت زیادہ ہنگامہ اور جوش و خروش۔ پیدائی ... ظہور۔ باوجود اس کے کہ ہماری ہستی بہت ہی ہنگامہ خیز ہے لیکن بایں ہمہ شورا شوری ہم اس چراغاں سے مشابہ ہیں۔ جو پروانے کے دل میں ہوتا ہے مطلب یہ ہے۔ کہ ہنگامہ ہستی بہت ہے لیکن حقیقت میں اسکا وجود نہیں

۴۔ ہمتِ مردانہ قناعت پر تکیہ کرتی ہے لیکن ہم نے جو ترکِ جستجو یعنی قناعت کی ہے۔ وہ قناعت کی وجہ سے نہیں بلکہ ضعف و کمزوری کی بناء پر ہے۔ اس لئے ہم ہمتِ مردانہ کی تکیہ گاہ کے لئے وبالِ جان ہیں مطلب یہ ہے کہ مرد ہمت کو اپنا تکیہ گاہ بناتے ہیں لیکن ہمارا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اس لئے تکیہ گاہ ہمت مردانہ ہم کو وبال خیال کرتی ہیں۔

۵۔ دائم الحبس ..... ہمیشہ کے لئے قید۔ میرے دل میں لاکھوں آرزوئیں ہمیشہ کے لئے قید ہیں۔ اس لئے میں اپنے دل پُر خون کو زندان خانہ خیال کرتا ہوں مطلب یہ ہے کہ ہماری آرزوئیں لاکھوں ایسی ہیں۔ جو کبھی پوری نہ ہوں گی۔

ـــ ۵

بنالہ حاصلِ دلبستگی فراہم کر ۔ ۱ ۔ متاعِ خانۂ زنجیر جز صدا معلوم

دل بستگی .... تعلق خاطر۔ اس کو زنجیر سے تشبیہہ دی ہے متاع ... دولت۔ سرمایہ۔ صدا ..... آواز زنجیر یعنی نالۂ زنجیر جس طرح خانۂ زنجیر کا اثاث البیت سوائے صدائے زنجیر کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ اسی طرح دل بستگی کا مال و منال بھی نالہ کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس لئے اگر تجھے دلبستگی درکار ہے تو حاصل دلبستگی یعنی نالہ و بکا کو فراہم کر۔ مطلب یہ ہے۔ دل بستگی کے لئے نالہ کشی اختیار کرنی چاہیئے کیونکہ حاصلِ دلبستگی نالہ ہے طباطبائی لکھتے ہیں۔ کہ اس بیان سے تعلقات

دنیا کی مذمت مقصود ہے۔

۷۷۔ مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور ۱ رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم
وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا ۲ رکھ لیجو میرے دعویٰ وارستگی کی شرم

۱۔ پردیس میں مرنا جو ہر شخص کو ناگوار ہوتا ہے۔ اس پر خدا کا شکر اس لئے کرتا ہے کہ اگر وہاں بے گور و کفن پڑے رہے تو کچھ مضائقہ نہیں۔ اس واسطے کہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ یہ کون ہے اور کس رتبے کا آدمی تھا لیکن وطن میں جہاں ایک زمانہ واقفِ حال ہو۔ مگر خریدار و غمخوار ایک بھی نہ ہو۔ وہاں مُردے کی اس طرح مٹی خراب ہونی سخت رسوائی اور ذلت کی بات تھی پس خدا کا شکر ہے کہ اس نے پردیس میں مار کر میری بیکسی کی شرم رکھ لی۔ اس میں گو بظاہر خدا کا شکر ہے لیکن فی الحقیقت سراسر اہلِ وطن کی شکایت ہے جس کو ایک عجیب پیرایہ میں ظاہر کیا۔

۲۔ کمین ۔۔۔۔ گھات ۔ وارستگی ۔۔۔ آزادی ۔ اے خدا دامِ زلف کے حلقے بُری طرح ۔ گھات میں ہیں۔ اور ادھر میں آزادی کا دعویدار ہوں اگر میں اس دام کے حلقوں میں گرفتار ہو گیا۔ تو میرا آزادی کا دعویٰ باطل ہو جائے گا۔ اس لئے میرے دعوئے آزادی کی شرم رکھ لینا۔

ردیف ن

لوں وام بختِ خفتہ سے یک خوابِ خوش ولے
غالبؔ یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

وام ۔۔۔۔۔ اُدھار ۔ قرض ۔ خوابِ خوش ۔۔۔۔ خوابِ شیریں

میں اپنے بختِ خفتہ سے ایک خوابِ شیریں قرض تو لے لوں۔ لیکن مجھے خوف یہ ہے کہ میں اس قرض کو ادا کیسے کروں گا۔ اس کی ادائیگی تو اس صورت میں ممکن تھی۔ کہ مجھے نیند آتی۔ جب نیند نہیں آتی تو پھر خوابِ شیریں کہاں سے آئے گا۔ کہ میں اس کو ادا کر سکوں گا۔ مطلب یہ ہے۔ کہ تقدیر سو رہی ہے اور میں بے خواب ہوں۔ خوب ہے۔

۸۷۔ وہ فراق اور وہ وصال کہاں ۱ وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
فرصتِ کاروبارِ شوق کسے ۲ ذوقِ نظارۂ جمال کہاں
دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا ۳ شورِ سودائے خط و خال کہاں
تھی وہ اک شخص کے تصور سے ۴ اب وہ رعنائی خیال کہاں
ایسا آسان نہیں لہو رونا ۵ دل میں طاقت جگر میں حال کہاں
ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق ۶ واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں
فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں ۷ میں کہاں اور یہ وبال کہاں
مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

۱۔ یہ ساری غزل زمانۂ ماضی کی یاد میں ہے۔ کہتے ہیں۔ وہ فراق و وصال کے لطف خواب و خیال ہو گئے۔ نہ وہ راتیں رہیں نہ دن رہے۔ غرض وہ دن راتیں۔ مہینے اور سال سب رخصت ہو گئے۔ زمانہ ماضی کی باتیں خواب اور خیال معلوم ہوتی ہیں۔

۲۔ شوق بمعنی عشق۔ اب عشق و عاشقی کے کاروبار کی کسے فرصت ہے۔ وہ زمانہ ہی گذر گیا۔ یہاں تک کہ نظارۂ جمال کا ذوق بھی دل میں باقی نہیں رہا۔

۳۔ دل کا تو ذکر ہی کیا۔ اب وہ پہلے جیسا دماغ بھی نہیں رہا جب یہ صورت ہے۔ تو پھر جنونِ عشق کیونکر باقی رہ سکتا ہے۔

۴۔ شخص سے مراد معشوق ہے۔ معشوق کا لفظ اس لئے استعمال نہیں کیا کہ عشق و عاشقی کے خیالات محو ہو چکے ہیں۔ رعنائی خیال ۔۔۔۔ شوخی و رنگینیٔ خیال ہمارے خیال میں جس قدر رعنائیاں اور رنگینیاں تھیں، وہ سب ایک شخص کے تصور اور محبت کی وجہ سے تھیں چونکہ اب وہ تصور دل سے مٹ گیا اس لئے وہ شوخیاں بھی جاتی رہیں۔ تصور کا لفظ عشق کی جگہ لائے ہیں۔ اور یہ بھی شخص کی طرح مقتضائے مقام ہے۔

۵۔ لہو رونا ۔۔۔۔ اشک خونی بہانا۔ حال ۔۔۔ قوت۔ لہو کے آنسو بہانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لئے دل وجگر میں بڑی طاقت چاہیئے۔ چونکہ ہماری تمام طاقت سلب ہو چکی ہے یعنی ہم بہت زیادہ خون کے آنسو بہا چکے ہیں اس لئے اب ہمارے دل وجگر میں خون کے آنسو رونے کی طاقت باقی نہیں رہی۔

۶۔ قمار خانہ ۔۔۔۔ جوئے خانہ۔ ہم سے قمار خانۂ عشق ہمیشہ کے لئے چھوٹ گیا۔ اب ہم وہاں کس برتے پر جائیں۔ کیونکہ گرہ میں مال نہیں رہا۔ مطلب یہ ہے۔ کہ ہم نقدِ دل تو پہلے ہی ہار چکے ہیں۔ اب وہاں جا کر کس چیز پر داؤ لگائیں گے۔ طباطبائی اور آسی۔ مال سے نقدِ دل اور اشرفی داغ مراد لیتے میں۔ اور سعید اور بیخود نقد دل اور دولت صبر وغیرہ۔

۷۔ وبال ۔۔۔۔ مصیبت یعنی فکر دنیا۔ میں تو ایک آزاد اور بےفکر انسان تھا لیکن اب ہر وقت تفکرات دنیا سے پریشان رہتا ہوں۔ ظاہر ہے میرا اس وبال سے کوئی تعلق نہ تھا۔

۸- غالب میں اعضاء و قوےٰ کمزور ہو گئے اور وہ اعتدالِ عناصر جو زمانۂ شباب میں تھا اب باقی نہیں رہا۔ حکماء کا خیال ہے۔ جب تک عناصر زندگی میں اعتدال رہے۔ تندرستی قائم رہتی ہے۔ جب ان میں سے کوئی ایک عنصر کم یا زیادہ ہو جائے تو انسان مضمحل ہوتے ہوتے لقمۂ اجل ہو جاتا ہے طباطبائی لکھتے ہیں۔ کہ اعتدالِ عناصر سے شباب مراد ہے مطلب وہی ہے۔ کیونکہ زمانۂ شباب میں اعتدالِ عناصر کی وجہ سے اعضا و قویٰ تندرست و توانا رہتے ہیں۔

۵۷- کی وفا ہم سے تو غیر اُس کو جفا کہتے ہیں	۱	ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں
آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر ان سے	۲	کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھیے کیا کہتے ہیں
اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو	۳	جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں
دل میں آ جائے ہے ہوتی ہے جو فرصت غش سے	۴	اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں
ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود	۵	قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں
پائے افگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے	۶	خارِ رہ کو ترے ہم مہرِ گیا کہتے ہیں
اک شرر دل میں ہے اُس سے کوئی گھبرائے گا کیا	۷	آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں
دیکھیے لاتی ہے اُس شوخ کی نخوت کیا رنگ	۸	اُس کی ہر بات پہ ہم نامِ خدا کہتے ہیں

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
مر گیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں

۱- اگر محبوب ہم سے وفا کرتا ہے۔ تو اغیار کہتے ہیں کہ یہ وفا نہیں جفا ہے اس نکتہ چینی پر عاشق کے دل میں خوف پیدا ہوتا ہے۔ کہ کہیں سچ مچ محبوب جفا پیشہ نہ بن جائے۔ اس لیے اس سے کہتا ہے کہ کچھ مضائقہ نہیں۔ دنیا کا دستور یہی ہے۔ اہلِ دنیا اچھوں کو بھی بُرا ہی کہا کرتے ہیں۔ اس لئے تم انکی باتوں کی پروا نہ کرو اور ہمارے

ساتھ یہی سلوک جاری رکھو۔

۲۔ آج ہم نے ارادہ کیا ہے کہ ان کے پاس جا کر اپنی پریشانیٔ دل کا اظہار کریں گے ہمارے یہ ارادہ کیسا ہے لیکن اس پر عمل پیرا ہونا بہت مشکل ہے کیونکہ ان کو دیکھ کر ہم سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ اور ایسی محویت کا عالم طاری ہو جاتا ہے کہ ہم کہنا کچھ چاہتے ہیں اور منہ سے کچھ نکلتا ہے۔ اس لئے دیکھنا چاہیئے کہ ہمارا یہ ارادہ پورا بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ "پر دیکھئے کیا کہتے ہیں" سے ایک پہلو یہ بھی نکلتا ہے۔ کہ دیکھئے وہ ہماری پریشانیٔ دل کا حال سُن کر کیا فرماتے ہیں۔

طباطبائی لکھتے ہیں ... المعنی ہے اور ... ہے

۳۔ اندوہ رُبا ... غم کو دُور کرنے والا۔ اگلے زمانے کے سیدھے سادے اور بھولے بھالے بزرگوں کا خیال ہے۔ کہ شراب و نغمہ سے غم غلط ہو جاتا ہے۔ حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ شراب و نغمہ سے گذشتہ زمانے کے عیش و نشاط کے مناظر سامنے آ جاتے ہیں۔ اور ان کے یاد آنے سے دل کو اذیت ہوتی ہے اس لئے حقیقتاً شراب و نغمہ اندوہ ربا نہیں۔ بلکہ اندوہ فزا ہیں گویا ہے۔ جو لوگ اگلے زمانے کے سادہ دل بزرگوں کی طرح اب تک شراب و نغمہ کی حقیقت سے واقف نہیں۔ ان پر حرف گیری نہ کرو۔ بہتر ہے۔ کہ شراب و نغمہ کے متعلق ان کا یہی حُسنِ ظن قایم رہے (سعید۔ بیخود)

طباطبائی۔ اندوہ رُبا ہونے کے انکار سے یا تو اندوہ فزا ہونا مقصود ہے یا مراد ہے کہ اندوہ ایسی چیز ہے کہ ... کی طرح بھلائے نہیں بھولتا۔

آسی ... نغمہ ... کو پرانے آدمی کہتے ہیں۔ کہ اندوہ رُبا اور غم غلط ہے اور آج کل کے زمانے میں اس میں یہ صفت باقی نہیں رہی ہے۔ کہ اندوہ و غم اس سے کم ہو جائے ... لوگوں سے اس بنا پر جھگڑا کرنے کی ضرورت نہیں۔ شراب و نغمہ میں پہلے

یہ خاصیت ہوگی۔ جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں۔ اگرچہ ایسا نہیں ہے۔

۴۔ عاشق فراقِ یار میں لگاتار نالے کر رہا ہے۔ گویا اس کوشش میں ہے کہ کسی نہ کسی طرح نالہ یار تک جا پہنچے۔ چنانچہ جب نالہ یار تک جا پہنچتا ہے تو وہ خاموش ہو جاتا ہے۔ یہ خاموشی بے ہوشی ہے۔ جو لگاتار کوشش اور محنت کا نتیجہ ہے۔ اور اس کامیابی کی علامت ہے۔ کہ نالہ رسا ہو گیا۔ چنانچہ جب ہوش ٹھکانے آتے ہیں۔ تو دل میں خیال آتا ہے۔ کہ اگر نالہ کی رسائی اس کو نہیں کہتے۔ تو پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں۔

بیخود۔ جب مجھے غش سے افاقت حاصل ہوتی ہے۔ تو میرا معشوق میرے دل میں آ جاتا ہے۔ اور یہ میرے نالے کے اثر سے ہوتا ہے۔ مجھے معلوم نہیں اور کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں۔ اس سے زیادہ رسائی نالہ کو کیا ہوگی۔ کہ فوراً ہی معشوق کو کھینچکر دل میں لے آتا ہے (سعید)

طباطبائی۔ نالہ رسا وہ ہے۔ کہ اثر تک جس کی رسائی ہو۔ لیکن شاعر نے یہاں استفہام کر کے یہ بات ظاہر کی ہے۔ کہ اس کے نالے کو کبھی اثر تک رسائی نہیں ہوئی۔ یہ جانتا ہی نہیں کہ نالۂ رسا اسے کہتے ہیں جس کی پہنچ اثر تک ہو۔ کیونکہ یہ رسائی نالہ اس کو سمجھتا ہے کہ غش سے چونکا اور نالہ دل میں آ موجود ہوا۔ (سعید۔ آسی)

۵۔ ادراک ۔۔۔ عقل مسجود ۔۔۔ جس کو سجدہ کیا جائے معبود۔ اہل نظر ۔۔۔ حقیقت بین۔ قبلہ ۔۔۔ وہ سمت جس طرف منہ کر کے عبادت کی جاتی ہے جو لوگ ہم پر اعتراض کرتے ہیں۔ کہ تم قبلہ کو پوجتے ہو یعنی خانہ کعبہ کی اینٹ پتھر تمہارے مسجود ہیں۔ ان کو معلوم ہو کہ ہمارا مسجود خانہ کعبہ نہیں ہے بلکہ ہمارا مسجود وہ ہے جو جہات سے منزہ اور مبرّا ہے۔ اور اس کا دریافت کرنا عقل

کے بس کی بات نہیں۔ کیونکہ وہ سرحدِ ادراک سے بہت بالا ہے۔ ہم نے اپنے مسجود کو سجدہ کرنے کے لئے ایک سمت مقرر کر لی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ نظر جہت قبلہ کو خدا نہیں کہتے۔ بلکہ خدا نما کہتے ہیں۔ اور جو جاہل لوگ ہیں وہ خانہ کعبہ ہی کو مسجود کہتے ہیں۔

۶۔ مہر گیا ... ایک بوٹی ہے۔ کہتے ہیں، جو شخص اس کو اپنے پاس رکھے اُس پر سب مہربان ہو جاتے ہیں۔ ہمارے زخمی پاؤں پر جب سے تجھے رحم آیا ہے ہم خارِ راہ کو جن سے ہمارے پاؤں زخمی ہوئے ہیں۔ کانٹا نہیں سمجھتے۔ بلکہ ہم ان کو مہر گیاہ کہتے ہیں۔ کیونکہ ان کی وجہ سے تو ہم پر مہربان ہوا ہے۔

۷۔ شرر سے روح حیوانی اور ہوا سے مراد سانس۔ ہمارے دل میں روح حیوانی کا ایک شرر ہے۔ اس سے ہم کیا گھبرائیں۔ کیونکہ یہ تو اصول فطرت ہے کہ سانس لینے سے حرارت غریزی میں اشتعال پیدا ہوتا ہے۔ اور اسی اشتعال کی بدولت ہماری زندگی قائم رہتی ہے۔ گویا ہمارا سانس لینا محض حرارت غریزی کو اشتعال دینے کی غرض سے ہے۔

ہمارے دل میں آتشِ عشق کا ایک شرارہ ہے۔ بھلا ہم اس شرارہ سے کیا گھبرائیں گے حقیقتاً ہمیں شرارہ کی ضرورت نہیں۔ بلکہ ہمیں آگ مطلوب ہے اور اسی لیئے ہم بے چین ہیں۔ لیکن عوام کا یہ خیال ہے۔ کہ ہم اس شرارہ سے گھبرا کر ہوا طلب کرتے ہیں یعنی آہیں بھرتے ہیں۔

سعید۔ ہمارے دل میں آتشِ عشق کا ایک شرارہ ہے جس سے ہم کو کوئی گھبراہٹ اور پریشانی نہیں۔ اس لئے ہم اس کو ہوا یعنی ہیچ کہتے ہیں کیونکہ ہمارے حوصلے کے مطابق نہیں۔ ہم کو تو آگ مطلوب ہے۔ شرر ہمارے

لئے کم ہے۔

آتی ۔ لوگ ہم کو طعنہ دیتے ہیں۔ کہ دل کی آتش غم سے گھبرا کر ہم کو ہوا کھانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے۔ کہ ہم گھبرا کر گرمی کے مٹانے کے لئے ہوا نہیں کھاتے۔ بلکہ آگ کے بھڑکانے کے لئے ہوا کھاتے ہیں یعنی سانس لیتے ہیں۔

حسرت۔ ہم لوگ کہ ہوا سے آگ مراد لیتے ہیں۔ بھلا ہم دل کے ایک شرر سے کیا گھبرائیں گے۔

۸ نامِ خدا کہنا... ماشاء اللہ۔ تعریف کرنا۔ نخوت... غرور و تکبر۔ محبوب کی ہر بات پر ہم ماشاء اللہ بہت خوب، چشم بد دور وغیرہ کہتے ہیں۔ ہماری اس تعریف سے اس کا غرور اور تکبر بہت بڑھ گیا ہے۔ دیکھئے آخر کار اِن کا غرور کیا رنگ لاتا ہے۔

۹ ۔ وحشت غلام علی خاں۔ شیفتہ۔ نواب مصطفٰے خاں۔ لوگ کہتے ہیں۔ غالب آشفتہ نوا مر گیا ہے۔ اب شائد اس کے مرنے پر وحشت اور شیفتہ مرثیہ لکھیں۔ یہ دونوں حضرات غالب کے عزیز دوست تھے۔ اس لئے اِن سے توقع ظاہر کی ہے۔ کہ وہ اپنے رنج دلی کا اظہار مرثیہ لکھ کر کریں۔

۸۰ ۱ ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں | آہ بر وِ کیا خاک اس گل کی کہ گلشن میں نہیں

۲ رنگ ہو کر اڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں | ضعف سے اے گریہ کچھ باقی مرے تن میں نہیں

۳ ذرے اُس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں | ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب

۴ پنبۂ نورِ صبح سے کم جسکے روزن میں نہیں | کیا کہوں تاریکیٔ زندانِ غم اندھیر ہے

۵ انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں | رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے

۶ غیر سمجھا ہے کہ لذت زخمِ سوزن میں نہیں | زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن

بسکہ ہم ہیں اک بہار ناز کے مارے ہوئے ۷ جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

قطرہ قطرہ اک ہیولیٰ ہے نئے ناسور کا ۸ خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں

لیکنِ ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری ۹ موجِ مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود ۱۰ قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر

۱۱ بے تکلف ہوں وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

ا۔ کہتے ہیں۔ جس طرح اس پھول کی کچھ بھی آبرو نہیں ہوتی۔ جو گلشن میں نہ ہو اسی طرح وہ گریبان بھی پیراہن کے لئے باعثِ ننگ و عار ہے۔ جو دامن میں نہیں ہوتا۔ اور گریبان اس وقت دامن میں پہنچتا ہے۔ جب وہ چاک ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اہلِ عشق کے نزدیک چاک دامانی باعثِ تعز ہے۔

بیخود اور طبا طبائی لکھتے ہیں کہ گریبان چاک ہو کر گل سے مشابہت پیدا کرتا ہے اور دامن کو صحنِ گلشن بنا دیتا ہے۔

۲۔ گریہ ضعف و نقاہت سے اب میرے جسم میں کچھ باقی نہیں رہا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اس قدر خون کے آنسو بہا چکا ہوں کہ سارا خون دامن پر آچکا ہے۔ وہ قطراتِ خون جو سوءِ اتفاق سے میرے جسم میں رہ گئے تھے۔ اور قطراتِ اشک بن کر نکل نہ سکے تھے۔ وہ میرا رنگ بن کر اڑ گئے ہیں۔ ظاہر ہے۔ کہ ضعف میں رنگ اڑ جاتا ہے گویا خون کی کمی سے رنگ پیلا پڑ جاتا ہے۔

۳۔ اگر کسی روزن میں سے دھوپ آئے تو دھوپ کے ساتھ لاتعداد ذرات آتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس واقعہ کو سامنے رکھ کر کہتے ہیں۔ کہ اس کے گھر کی دیواروں کے روزنوں میں سے جو ذرات اس کے مکان کے اندر آ رہے ہیں

یہ ذرات نہیں ہیں۔ بلکہ گویا آفتاب کے اجزاء ہیں۔ جو محبوب کے دیکھنے کے لئے ہجوم کرکے آرہے ہیں۔ مطلب یہ ہے۔ کہ آفتاب تک کو تجھے دیکھنے کا شوق ہے اسی لئے وہ روزنِ دیوار میں سے جھانکتا ہے۔

۴۔ پنبہ۔۔۔ روئی۔ اس زندانِ غم کی تاریکی کا حال کیا بیان کروں۔ اس میں اس قدر تاریکی ہے۔ کہ اگر اس کے روزن میں روئی کا پنبہ رکھ دیا جائے تو بجائے اس کے کہ روزن بند ہو کر وہاں تاریکی میں اضافہ ہو۔ وہ سفیدۂ سحر کی کی طرح چمکتا ہے۔ فائدہ یہ ہے۔ جہاں بہت زیادہ اندھیرا ہو۔ وہاں ذرا سی روشنی بھی بہت پھیل جاتی ہے۔ یہی ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ کہ زندانِ غم اس قدر زیادہ تاریک ہے۔ کہ اس میں روئی کی سفیدی سے روشنی ہو جاتی ہے۔

۵۔ حالی۔ یعنی تمام دنیا میں جو رونق اور چہل پہل ہے۔ وہ عشق و محبت کی بدولت ہے۔ خواہ زن و فرزند کی محبت ہو۔ خواہ مال و دولت کی۔ خواہ ملک و ملت کی خواہ کسی اور چیز کی۔ پس اگر خرمن میں یہ برق نہیں یعنی دلوں میں محبت نہیں تو اس کی مثال اس انجمن کی ہے۔ جس میں شمع کی روشنی نہیں۔

مولینا سعید۔ ہاشمی (رسالہ اُردو حقیقت میں مرزا نے اس میں فلسفۂ روافیہ کا یہ عقیدہ بیان کیا ہے۔ کہ خودہستی کا مقتضیٰ اور لازمہ فنا یا نیستی ہے (سعید۔)

۶۔ زخم سلوانا۔۔۔ زخموں میں ٹانکے لگوانا چارہ جوئی۔۔۔ علاج معالجہ سوزن۔۔۔ سوئی میں نے زخموں میں ٹانکے لگوائے ہیں۔ اس پر غیر مجھے یہ طعنہ دیتا ہے کہ میں عاشق صادق نہیں کیونکہ میں نے اپنے زخموں کو مندمل کرنے کی کوشش کی ہے اور واقعی یہ بات طریقِ عشق کے خلاف ہے لیکن اس کم بخت کو یہ خبر نہیں کہ میں نے زخموں میں ٹانکے ان کو درست کرنے کے لئے نہیں لگوائے بلکہ میرا مقصد اس معالجہ سے یہ تھا۔ کہ میں زخمِ سوزن کی لذت حاصل کروں۔ لذت سے مراد تکلیف ہے

جو عشاق کو مرغوب ہے۔ اسی لیئے اسے لذت کہا ہے۔ غالب ؎

رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزن کی ‏ ‏ سمجھیو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے

٧۔ بہارِ ناز... مراد معشوق۔ بسکہ... بہت زیادہ۔ چونکہ ہم کو ایک بہارِ ناز معشوق نے قتل کیا ہے۔ اس لئے ہماری قبر میں خاک بالکل نہیں بلکہ ہر طرف جلوۂ گل ہے۔ اور یہ اس بہارِ ناز کا اثر ہے۔ طباطبائی لکھتے ہیں "جلوۂ گل اس کے تصور سے ہے۔ آتش نے دوسرا پہلو نکالا ہے"۔ چونکہ ہم شہید ہوئے تھے اس لئے اس کے ثواب میں ہماری قبر میں جنت موجود ہے"۔

٨۔ ہیولیٰ... مادہ۔ نیچے ناسور... مراد زخم۔ میرے خون کا ہر قطرہ مادۂ ناسور رکھتا ہے۔ گویا جہاں کوئی قطرہ گرتا ہے۔ وہیں ناسور بن جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ میرے جسم کے خون میں لذتِ درد بدرجہ اتم موجود ہے۔

٩۔ نخوت... غرور تکبر۔ قلزم آشامی... سمندر کے سمندر شراب کے پی جانا رگِ گردن... غرور کی نشانی ہے۔ ساقی کو اس بات پر بہت غرور تھا۔ کہ وہ شراب پلانے میں بڑا فیاض ہے لیکن میں اس قدر قلزم آشام نکلا۔ کہ میری بلانوشی سے اس کا غرور ٹوٹ گیا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ اس کی صراحی میں موجِ شراب کی رگِ گردن بھی کہ غرور تکبر کی نشانی تھی۔ آج نظر نہیں آتی۔ گویا ساقی کے غرور کے ساتھ شیشے کا غرور بھی ٹوٹ گیا۔

١٠۔ فشار... چاروں طرف سے دبانا۔ غلبہ ضعف نے مجھ کو ہر طرف سے دبا رکھا ہے۔ ایسی حالت میں میں ناتوانی کو بھی ظاہر نہیں کر سکتا۔ قد کا جھکنا ضعف کی علامت ہے۔ لیکن میں اس سے بھی معذور ہوں۔ کیونکہ فشارِ ضعف میں مبتلا ہوں۔ اس لئے میرے جسم میں قد کے جھکنے کی بھی گنجائش نہیں پھر اظہار ناتوانی ہو تو کیونکر ہو۔

۱۱۔ غربت ..... مسافری۔ بے تکلف ..... بلا مبالغہ۔ گلخن ..... بھاڑ بھٹی۔ مشتِ خس ..... گھانس پھونس مٹھی بھر۔ حالی اپنے تئیں مشتِ خس اور وطن کو گلخن سے تشبیہہ دی ہے مطلب یہ ہے پھونس گلخن میں ہوتا ہے تو جلتا ہے اور گلخن میں نہیں ہوتا۔ تو کچھ قدر نہیں ہوتی یہی حال میرا تھا کہ وطن میں تھا۔ تو جلتا تھا۔ اور اب پردیس میں ہوں تو بیقدر رہوں۔

سید ہاشمی رسالہ اُردو۔ راقم الحروف کو ان معنی میں کلام ہے۔ شاعر کا اصلی مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ دیس پردیس میں کہیں بھی میرے مخفی جوہر ظاہر نہ ہوسکے۔ اور دونوں جگہ میں ایسا ہی ناکارہ سمجھا گیا۔ جیسا کہ گھانس پھونس کا ایک ڈھیر جو بھٹی میں نہ ڈالا جائے۔ تو محض کوڑا ہے اور بادی النظر میں بالکل بیکار اور بے حقیقت شے ہے۔ حالانکہ اگر وہ اپنے موزوں مقام یعنی گلخن میں ہوتا۔ تو اس کے کمالات ظاہر ہوتے! وہ روشن اور منور ہو جاتا خس اور گلخن کے اس نادر مضمون کو مرزا صاحب نے ایک اور شعر میں بھی تحریر کیا ہے سہ

فنا کو سونپ گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا   فروغ طالع خاشاک ہے موقوف گلخن پر

طباطبائی (۱) ظاہر ہے مشتِ خس اگر اپنے وطن میں ہے تو خارزار میں ہے اور اگر وطن سے باہر نکل کر کہیں قدم رکھا۔ تو جاروب کشوں نے نکال باہر کیا۔ وطن میں اذیت اور غربت میں ذلت کا سامنا ہے۔ اس کے لئے اگر فروغ اور شان ہے تو گلخن میں ہے لو آسی (۲) اس شعر میں مذاق تصوف ہے یعنی جس طرح ہر شے آگ میں گر کر آگ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح عارف کو شاہد حقیقی کیساتھ اتصال ہو جاتا ہے۔ اور نہیں تو ایک مشتِ خس ہے جس کا وطن عدم اور غربت امکان ہے۔ اور امکان پر جس طرح عدم سابق ہے اسی طرح عدم لاحق بھی ہے۔ کہ امکان وجود بین العدمین کا نام ہے۔ جو ممکن عدم سے آیا ہے وہ عدم میں چلا بھی

جائیگا پس حیات ابدی اس میں ہے۔ کہ واجب الوجود سے ملحق ہو جائے۔ اور فنا فی الذات ہو کر ترانۂ انا لاغیری کو بلند کرے۔

۸۱۔ عہدے سے مدح ناز کے باہر نہ آسکا ۱ گر اک ادا ہو تو اسے اپنی قضا کہوں
حلقے ہیں چشمہائے کشادہ بسوئے دل ۲ ہر تار زلف کو نگہ سرمہ سا کہوں
میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش ۳ تو اور ایک وہ نشنیدن کہ کیا کہوں
ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ ۴ ہے ہے خدا نہ کردہ تجھے بے وفا کہوں

۱۔ ادا اور قضا میں رعایت لفظی ہے۔ اس کے ناز کی جتنی تعریف کرنی چاہیئے تھی۔ اتنی تعریف میں نہیں کر سکا اور اس کوتاہی کا سبب یہ ہے کہ اسکی ایک ادا نہیں۔ بلکہ ہزاروں ادائیں ہیں۔ جو قابل تعریف ہیں۔ اگر ایک ادا ہوتی تو مدح ناز سے میں یہ کہہ کر عہدہ برآ ہو جاتا۔ کہ وہ میری قضا ہے یعنی اس ادا پر میری جان جاتی ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے۔ کہ یہاں تو ہزاروں ادائیں ہیں۔ شاعر ادا کو اپنی قضا کہنا بہترین سمجھتا ہے چونکہ یہ تعریف ہر ادا پر صادق آتی ہے اس لئے پریشان ہے۔ تعریف کی خصوصیت یہ ہے۔ کہ وہ خاص کو عام سے ممیز کرے لیکن یہاں مشکل یہ آپڑی ہے۔ کہ یہ تعریف ہر ادا میں موجود ہے اس لئے اپنی ناقابلیت کو تسلیم کرتا ہے۔

۲۔ حلقے یعنی حلقہائے زلف، گھونگرہ ہیں چشم کشادہ۔۔۔ تاک میں ہیں۔ تیری زلفوں کے حلقے میرے دل کی طرف تاک لگائے ہوئے ہیں یعنی تیری زلفوں کے گھونگر آنکھوں کے حلقے ہیں جو میرا دل اڑانے کے لئے تاک میں بیٹھے ہیں۔ اس لئے اگر میں ہر تارِ زلف کو ان زلفوں کی آنکھوں کی نگاہ سرمگین کہوں تو بے جا نہیں۔ ظاہر ہے حلقہ ہائے زلف کو چشم اور تار زلف کو نگاہِ سرمہ سا قرار دیا ہے۔ کیونکہ آنکھ کے لئے نگاہ لازم ہے۔

۳- نوا ..... نالہ - میں تو لاکھوں جگر خراش نالے کرتا ہوں - مگر تو ہے - کہ سنتا ہی نہیں - عجب اندھیر ہے - آسی لکھتے ہیں - کیا کہوں سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے - کہ تو سنتا نہیں - اس لئے مجھے خاموش ہونا پڑتا ہے اور یوں "کیا کہوں" - ایک عام محاورہ ہے -

۴- منفعل ..... شرمندہ - خدا نہ کردہ ..... خدانخواستہ - خدا نہ کرے تو بہ - توبہ - ظاہر ہے - کہ عاشق اور اس کے دل میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے - دل کہتا ہے - کہ محبوب بے وفا ہے - عاشق کہتا ہے کہ وہ با وفا ہے اس کشمکش میں عاشق محبوب سے کہتا ہے - کہ اے ظالم مجھے میرے گمان سے شرمندہ نہ کرنا کہیں ایسا نہ ہو - کہ تمہارے ظلم و ستم مجھے مجبور کر دیں - اور خدانخواستہ میں تمہیں بے وفا کہنے لگوں (تمام منفق) حسرت لکھتے ہیں - مجھ کو میرے گمان سے شرمندہ نہ کر - بھلا میں تجھ کو بے وفا خیال کر دوں -

۸۲

۱ مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

۲ ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

۳ زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

۱- اگر میری اور تمہاری رنجش ہو گئی تو اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ میں نے تمہارا عشق ترک کر دیا ہے - بلکہ جب بھی تم مجھے محبت سے بلاؤ میں حاضر ہوں - میں گیا وقت نہیں ہوں - کہ دوبارہ واپس نہ آ سکوں مطلب یہ ہے کہ میرا آنا اور نہ آنا تمہارے رحم و کرم پر منحصر ہے - باہمی رنجیدگی سے جذبۂ عشق محو نہیں ہو سکتا -

۲- خیال یہ ہے کہ طعنۂ اغیار برداشت کرنا بہت مشکل ہے - لیکن ناچاری یہ آ پڑی ہے - کہ عاشق کو ضعف نے بہت بیحال کر دیا ہے - اس لئے وہ

کہتا ہے۔ کہ حالت ضعف میں طعنۂ اغیار کا بھی کوئی شکوہ نہیں رہا۔ کیونکہ طعنۂ اغیار سر نہیں ہے بلکہ میں حالت ضعف میں اُسے اٹھا نہیں سکتا۔ اس لئے سب کچھ گوارا ہے مطلب یہ ہے۔ کہ حالت ضعف میں "بات اٹھانا" اس قدر دشوار نہیں جس قدر سر کا اُٹھانا مشکل ہے۔ انتہائی ضعف کا اظہار ہے۔

۳۔ حالی جب کہتے ہو۔ کہ اس کو فلاں کام کرنے کی قسم ہے۔ تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں۔ کہ اس کو اس کام کے کرنے سے انکار ہے۔ بس عاشق معشوق کے ملنے کی قسم کیونکر کھا سکتا ہے۔ کہتا ہے کہ زہر کچھ تیرے ملنے کی قسم نہیں ہے کہ اس کو کھا نہ سکوں۔ مگر چونکہ وہ ملتا نہیں۔ اس لئے نہیں کھا سکتا آسی اور طبا طبائی لکھتے ہیں۔ آخری مصرعہ میں تین کاف جمع ہونے سے تنافر پیدا ہو گیا ہے۔

۴۔ ہم سے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایکدن ۱ ورنہ ہم چھیڑینگے رکھ کر عذر مستی ایکدن
غرۂ اوجِ بنائے عالم امکان نہ ہو ۲ اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایکدن
قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں ۳ رنگ لائیگی ہماری فاقہ مستی ایکدن
نغمہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے ۴ بے صدا ہو جائیگا یہ ساز ہستی ایک دن

دھول دھپا اُس سراپا ناز کا شیوا نہ تھا
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالبؔ پیش دستی ایک دن

اکھل جاؤ... بے تکلف ہو جاؤ۔ مے پرستی... شراب نوشی۔ عذر... بہانہ۔ کسی دن ہم سے شراب نوشی کے دوران میں بے تکلف ہو جاؤ اگر تم ایسا نہ کرو گے تو ہم نشہ کا بہانہ کر کے تم سے بے تکلفی پیدا کر لیں گے۔ چونکہ ایسا نشہ کی حالت میں ہو گا۔ اس لئے تم ہم سے اس بے تکلفی کی شکایت بھی نہ

کرسکو گے بجائے اس کے کہ ہم یہ صورت اختیار کریں تم خود ہی ہم سے کھل جاؤ اور یہاں تک نوبت نہ آنے دو۔

۲۔ غرہ.... مغرور۔ اوج.... بلندی۔ بنا.... بنیاد مراد عمارت عالم امکاں.... فانی دنیا۔ دنیائے فانی کی بلندی پر مغرور نہ ہو۔ کیونکہ اس بلندی کے نصیبوں میں ایک دن پستی یعنی فنا ہونا لکھا ہے عقلمند آدمی کو ایسی بات پر غرور زیب نہیں دیتا۔ جو فانی ہو۔ اس لئے دنیاوی عروج پر مغرور ہونا علامت حماقت ہے۔

۳۔ ایک دفعہ مرزا بہت قرضدار ہو گئے۔ قرض خواہوں نے نالش کر دی مرزا صاحب جواب دہی میں طلب ہوئے۔ انہوں نے یہ رقم شراب نوشی اور اس کے لوازمات پر صرف کی تھی۔ مفتی صدر الدین احمد خاں مفتی تھے۔ مرزا صاحب نے جواب دعوے کے طور پر یہ شعر فی البدیہہ کہہ کر پڑھا۔ مفتی صاحب سمجھ گئے۔ اور انہوں نے از راہ قدر دانی اور سخن شناسی تمام رقم اپنے پاس سے ادا کر کے مرزا صاحب کو رخصت کیا۔

۴۔ نغمہ ہائے غم.... نالہ ہائے درد۔ اے دل اگر نغمۂ شادی نہیں تو نوحۂ غم ہی کو غنیمت جان کیونکہ عنقریب ایک دن ایسا آئے گا کہ سازِ ہستی بالکل بے صدا ہو جائے گا۔ اس لئے وقت کی قدر کر۔ ع نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

۵۔ اس سراپا ناز کا شیوہ وصول و صیانہ تھا ہمیں نے ایک دن پہل کی تھی اس دن سے اس کو دست درازی کی عادت پڑ گئی ہے۔ اب برداشت کیجیے شکایت کیسی؟

۴۲۔ ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں ۱ اک چھیڑ ہے وگرنہ مرا امتحاں نہیں
کس منہ سے شکر کیجیئے اس لطفِ خاص کا ۲ پرشش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز ۳ نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

بوسہ نہیں، نہ دیجیے دشنام ہی سہی ۴ آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

ہر چند جاں گدازیِ قہر و عتاب ہے ۵ ہر چند پشت گرمیِ تاب و تواں نہیں

جاں مطربِ ترانۂ ہل من مزید ہے ۶ لب پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں

خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم ۷ دل میں چھری چبھو مژہ گر خونچکاں نہیں

ہے ننگِ سینہ دل اگر آتش کدہ نہ ہو ۸ ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب ۹ سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

کہتے ہو کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں ۱۰ گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے کلام کی ۱۱ روح القدس اگرچہ مرا ہمزباں نہیں

جاں ہے بہائے بوسہ ولے کیوں کہے ابھی

غالبؔ کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

۱- ہمارا محبوب ہماری وفاداری اور ہمارے عشق کی پائیداری پر اس قدر بھروسہ رکھتا ہے۔ کہ اس کو پورا پورا الیقین ہے کہ ہم اس کی جفاؤں سے ڈر کر ہرگز ترکِ وفا نہ کریں گے۔ گویا اس کی جفائیں صرف ہمیں چھیڑنے کی غرض سے ہیں۔ ورنہ اِن جفاؤں سے انہیں ہمارا امتحانِ وفا لینا مقصود نہیں ہے۔

۲- لطفِ خاص ... مراد اشارہ و کنایہ۔ پائے سخن ... بات گفتگو

محبوب کے اس لطفِ خاص کا کس منہ سے شکریہ ادا کروں کہ وہ اشاروں کنایوں سے میرا حال دریافت کرتا ہے اور پائے سخن درمیان نہیں آتا۔ ظاہر ہے معشوق کے اشارے کنائے عاشق کیلئے خاص لطف رکھتے ہیں اور لطف خاص کی نشانی ہیں۔ اگر یہ شعر حمد میں ہے تو پھر اس کی شرح یہ ہوگی۔ کہ میں خدا کی حمد کس زبان سے ادا کروں۔ کہ وہ بغیر گفتگو اپنے بندوں کی خبر رکھتا ہے۔

۳- ہم کو ستم عزیز ہے۔ اور وہ ہم پر ستم کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ وہ ستمگر ہم کو عزیز رکھتا ہے۔ اگر وہ ہم کو عزیز نہ رکھتا تو ہم پر ستم ہرگز نہ کرتا۔ کیونکہ ستم ہمیں عزیز ہے۔ چونکہ وہ ہم کو وہی چیز دیتا ہے جو ہم کو عزیز ہے۔ اس لئے ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ ہم اس ستمگر کو عزیز ہیں۔ اس سلوک خاص سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ وہ ستمگر اگر ہم پر مہربان نہیں ہے۔ تو نامہربان بھی نہیں کیونکہ اگر وہ نامہربان ہوتا تو ہماری آرزوئے ستم کو پورا نہ کرتا (سعید شہرت)

بیخود۔ ہم کو ستمگر اس لئے عزیز ہے کہ اس کا ستم ہماری قوت برداشت کے موافق ہوتا ہے۔ ایسا ظلم وہ نہیں کرتا جس سے ہم جاں بلب ہو جائیں اس واسطے ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ ہم بھی اس ستمگر کو عزیز ہیں۔ اگر عزیز نہ ہوتے تو ستم سے وہ ہماری جان لے لیتا۔ اس بیان سے دوسرے مصرعہ کا ثبوت بہم پہنچتا ہے۔

آسی (۱) ہم کو اس کا ستم عزیز ہے۔ اور تختۂ مشق جفا بنانے کے لئے وہ ہم کو عزیز رکھتا ہے۔ بہرحال نامہربانی سے اس کی مہربانی کا ایک پہلو نکلتا ہے (۲) وہ ہم کو پیارا ہے۔ کہ ہم پر ظلم کرتا ہے۔ اور ہم اس کو پیارے ہیں کہ ہم ستم سہتے ہیں۔ اس کا ہم سے کام نکلتا ہے اور ہمارا اس سے۔ تو اگر وہ مہربان نہیں ہے تو نامہربان بھی نہیں (۳) ہم خیال مؤلف۔

۴- بوسہ نہ دینے کا عذر تو تمہیں یہ ہاتھ آیا ہے کہ تمہارا دہن نہیں ہے۔ بہتر آپ بوسہ نہ دیجئے لیکن گالی دیتے ہیں کیا مضائقہ ہے۔ آخر آپ زبان تو رکھتے ہیں کس خوبصورتی سے ظاہر کیا ہے۔ کہ معشوق کا دہن نہیں ہوتا۔

۵- قہر و عتاب ... غصہ۔ جانگداز ... جان کو گھلا دینے والا۔ تپش گرمی

....سہارا: قوت - قطعہ بند ہے - کہتے ہیں - ہر چند- اس کا قہر و عتاب جان کو گھلانے والا ہے - اور ہماری قوتِ برداشت نے جواب دے دیا ہے لیکن پھر بھی -

۶-مطرب.... گانے والا- ہل من مزید... کچھ اور زیادہ - پردہ سنج .... نغمہ سنج - زمزمہ- ترانہ- گیت - الامان.... پناہ- الحذر- ہم اس کے قہر سے پناہ نہیں مانگتے - اور زبان پر الامان کا لفظ نہیں لاتے- بلکہ میری جان ترانہ ہل من مزید گاتی ہے یعنی عتاب مزید کی خواہاں ہے۔

۷-دونیم.... دو ٹکڑے- دوپارہ - اگر تیرا دل دوپارہ نہ ہو تو پھر تو اپنا سینہ خنجر سے چیر ڈال، تاکہ تیرا دل زخمی ہو جائے، اور اگر تیری مژگاں خونچکانی سے محروم ہوں تو اپنے دل میں چھری گھونپ کر مژگان میں خونچکانی کی صفت پیدا کر، کیونکہ؛-

۸-آذرفشاں....آتش فشاں- وہ دل سینے کے لئے باعثِ ننگ و عار ہے- جو آتشِ عشق سے آتشکدہ نہ بن گیا ہو، اور اسی طرح وہ سانس دل کے لئے باعثِ شرم ہے- جو شرر بار نہ ہو- مطلب یہ ہے کہ وہ سینہ ہی کیا جس میں آتشِ عشق نہ ہو- اور وہ دل ہی کیا- جس میں سے نفس آتش فشاں نہ نکلے۔

۹-اگر جنون سے میرا گھر برباد ہوتا ہے - تو مجھے کچھ نقصان نہیں - کیونکہ میرے گھر میں بہت ہوگی - تو سو گز زمین ہوگی - جنون کی بدولت مجھے سو گز زمین کے بدلے ایک پورا بیابان ملتا ہے - ظاہر ہے یہ کچھ مہنگا سودا نہیں

۱۰-سرنوشت... تقدیر- جبیں.... ماتھا- وہ فرماتے ہیں- کہ میری تقدیر میں کیا لکھا ہے؟ ذرا ستم ظریفی اور سادگی ملاحظہ ہو- میرے ماتھے

پر تو بتوں کو سجدے کرتے کرتے گٹا پڑ گیا ہے۔ اور یہی میرا نوشتۂ تقدیر ہے پھر خبر اچہ ترا اگر نوشتۂ تقدیر پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ میری سرنوشت میری پیشانی ہی سے ظاہر ہے۔

۱۱۔ روح القدس... حضرت جبرئیل۔ حالی: "یہاں ہم زبان" کے لفظ میں ایہام ہے۔ ظاہری معنی تو یہ ہیں۔ کہ انسان اور فرشتے کی زبان ایک نہیں ہوسکتی۔ اور در پردہ اس میں یہ اشارہ ہے۔ کہ جیسی فصیح میری زبان ہے ویسی روح القدس کی نہیں"۔ لیکن پھر بھی اپنے کلام کی داد مجھے اس سے مل رہی ہے یہ بھی مطلب ممکن ہے۔ کہ میرا کلام سراسر الہام ہے۔

۱۲۔ بہا... قیمت۔ اس کے ایک بوسے کی قیمت جان ہے لیکن ابھی وہ کیوں کہے گا۔ کہ جان دے کر بوسہ لے لوں۔ کیونکہ ابھی تو مجھ میں جان باقی ہے جب مجھ میں پوری جان نہ رہے گی۔ اور میں نیم جان ہو جاؤں گا۔ تو اس وقت کہے گا۔ کہ جان دو اور بوسہ لے لو۔ ظاہر ہے۔ نیم جان پوری جان کہاں سے لائے گا۔ جو بوسے کا طالب ہوگا

۸۵۔ مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں | ۱ | ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں
شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں | ۲ | جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں
حسرتِ لذتِ آزار رہی جاتی ہے | ۳ | جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں
رنجِ نومیدیِ جاوید، گوارا رہیو | ۴ | خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں
سر کھجاتا ہے جہاں زخمِ سر اچھا ہو جائے | ۵ | لذتِ سنگ باندازۂ تقریر نہیں
جب کرم رخصتِ بیباکی و گستاخی دے | ۶ | کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ

"آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں"

۱۔ حالی چکر، پھرنے کی دھن ۔ کہتے ہیں ۔ کہ اس کے پاؤں میں چکر ہے یعنی اس کو پھرنے کی دھن ہے ۔ کہتا ہے ۔ کہ کوئی تدبیر مجھے دشت نوردی سے روک نہیں سکتی پس زنجیر جو اس غرض سے میرے پاؤں میں ڈالی گئی ہے اسے زنجیر نہ سمجھو ۔ بلکہ چکر سمجھو ۔

۲۔ میرا شوقِ جنوں مجھے اس دشت میں دوڑاتا ہے جہاں راستہ اس طرح معدوم ہے ۔ جیسے دیدۂ تصویر میں نگہ معدوم ہوتی ہے ۔ تمام متفق ۔ آسی دوسرے معنی یہ لکھتے ہیں جیسے کہ دیدۂ تصویر حیرت میں ہے اسی طرح وہاں اگر کوئی جادہ ہے تو جادہ حیرت ہے اور کچھ نہیں ۔ (سعید) حسرتؔ کے دوسرے معنی ملاحظہ ہوں ۔ شوق مجھ کو اس دشت میں لیئے جاتا ہے ۔ جہاں ہر شخص مثلِ تصویر محوِ حیرت ہو جاتا ہے ۔

۳۔ حالی ۔ جادہ یعنی بٹیا کو دمِ شمشیر سے تشبیہ دی ہے مطلب شعر کا یہ ہے کہ عشق کے آزار اور تکلیف میں جو لذت ہے جی تو یہی چاہتا ہے کہ اس لذت سے خوب دل کھول کر متمتع ہوں ۔ مگر چونکہ وفا کی راہ سراسر تلوار کی دھار پر ہے ۔ اس لئے پہلے ہی قدم پر موت نظر آتی ہے پس افسوس ہے کہ لذتِ آزار کی حسرت دل کی دل ہی میں رہ جاتی ہے ۔

۴۔ نومیدیٔ جاوید ۔۔۔۔ دائمی مایوسی ۔ زبونی کش ۔۔۔۔ ذلیل مراد احسان مند خدا کرے مجھے ہمیشہ یہ دائمی مایوسی اور ناامیدی گوارا رہے میں اس حالت سے بہت خوش ہوں ۔ کیونکہ اس طرح سے میرے نالے تاثیر کے احسان کی ذلت اٹھانے سے محفوظ رہتے ہیں ۔

۵۔ سر کھجانا ۔۔۔۔ سر میں کھجلی ہونا ، محاورہ میں شامت آنا پٹنے کی خواہش پیدا ہونا جہاں ۔۔۔۔ جس وقت ۔ اندازۂ تقریر نہیں ۔۔۔۔ بیان نہیں ہو سکتا

جس وقت میرا زخم سر اچھا ہو جاتا ہے۔ تو میرا سر کھجاتا ہے۔ گویا جی چاہتا ہے کہ لڑکے بالے مجھے اور پتھر ماریں۔ اور زخم لگائیں۔ اور پتھر کھانے میں کچھ ایسا لطف ہے جو احاطۂ تحریر سے باہر ہے۔ مرزا نے سر کھجانے کا محاورہ خوب صرف کیا ہے بقول بیخود۔ اندمال زخم کے بعد زخم میں جو کھجلی ہوتی ہے۔ اس کیفیت کو مرزا نے دوبارہ زخم کھانے کے شوق سے تعبیر کیا ہے۔

۶۔ رخصت۔۔۔۔ اجازت۔ تقصیر۔۔۔ قصور۔ خجلتِ تقصیر۔۔۔۔ از نکاب۔ قصور سے جھجکنا۔ جب یار کی مہربانیاں گستاخی کرنے کی اجازت دیں۔ تو اس وقت جھجکنا اور شرم کرنا سب سے بڑا قصور رہا ہے۔

۷۔ بے بہرہ۔۔۔ بدنصیب۔ غالب ہمارا القول ناسخ یہ عقیدہ ہے کہ جو شخص میر کو پیغمبر سخن نہیں مانتا۔ اور شاعری میں ان کی پیروی نہیں کرتا وہ بے بہرہ اور بدنصیب ہے۔

مت مردمکِ دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں ہیں جمع سویدائے دلِ چشم میں آہیں

مردمکِ دیدہ۔۔۔ آنکھ کی پتلی۔ سویدائے دل۔۔۔۔ دل میں ایک تل ہوتا ہے پتلی کو آنکھ کے دل کا سویدا قرار دے کر نگاہوں کو اس دل کی آہوں سے تشبیہہ دی ہے کہتے ہیں، یہ نہ سمجھو۔ کہ میری آنکھ کی پتلی میں نگاہیں ہیں۔ بلکہ یہ سمجھو کہ آنکھ کے دل کے سویدا میں آہیں جمع ہو گئی ہیں۔

۸۰۔ برشگالِ گریۂ عاشق ہے دیکھا چاہیئے ۱ کھل گئی مانند گل سو جا سے دیوارِ چمن

اُلفتِ گل سے غلط ہے دعوئ وارستگی ۲ سرو ہے باوصفِ آزادی گرفتارِ چمن

۱۔ برشگال۔۔۔ برسات۔ کھل گئی۔۔۔ شق ہو گئی۔ یہ گریۂ عاشق کی برسات ہے۔ دیکھا چاہیئے کہ کیا رنگ لاتی ہے۔ اس برسات سے دیوارِ چمن گل کی مانند سو جگہ سے کھل گئی ہے ظاہر ہے۔ جب دیوارِ چمن کا یہ عالم ہے۔ تو دیکھا چاہیئے چمن میں

کس قدر پھول کھلتے ہیں۔

۲۔ دعویٰ وارستگی ... دعویٰ آزادی۔ اُلفتِ گل سے کوئی وارستہ اور آزاد نہیں ہے۔ یہاں دعوے وارستگی و آزادی بالکل غلط ہے۔ سرو کو دیکھ لو۔ کہ آزاد کہلاتا ہے۔ مگر درحقیقت الفتِ گل میں گرفتار ہے کیا مجال کہ چمن سے باہر جا سکے۔ بس یہی ہے۔ اس کو آزادی کا دعویٰ ہ۔ حاصل شعر یہ ہے کہ کوئی کیسا ہی آزاد منش کیوں نہ ہو لیکن وہ دنیا میں عشق و محبت کے پھندے سے نہیں چھوٹ سکتا۔

۴۷۔ عشق تاثیر سے نومید نہیں ۱ جاں سپاری شجرِ بید نہیں
سلطنت دست بدست آئی ہے ۲ جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں
ہے تجلی تری سامانِ وجود ۳ ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں
رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے ۴ ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں
گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے ۵ غمِ محرومیِ جاوید نہیں
کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ ۶ ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

۱۔ جانسپاری ... جان دینا۔ جانبازی۔ شجرِ بید ... بید کے درخت میں کوئی پھل نہیں لگتا۔ عشق تاثیر سے ناامید نہیں ہے یعنی اس میں تاثیر ضرور ہوتی ہے۔ جان دینے کا کچھ نہ کچھ نتیجہ ضرور ملتا ہے۔ جانسپاری شجرِ بید نہیں ہے۔ کہ اس میں کوئی پھل ہی نہ آئے۔ مطلب یہ ہے کہ عشق میں جانبازی ضرور کچھ نتیجہ اور اثر دکھاتی ہے۔

۲۔ خاتم ... نگینہ۔ انگوٹھی۔ عام طور پر نگینہ پر نام کھدا ہوا ہوتا ہے جام مے کی سلطنت جمشید سے رندوں کو دست بدست ملی ہے۔ یہ جام مے خاتم جمشید نہیں ہے۔ کہ صرف جمشید ہی کے ہاتھ کے لئے مخصوص ہو اور دوسرے

اس سے محروم رہیں۔ صرف بعید کو جزوی اختلاف ہے۔ بکھتے ہیں سلطنت اور جام کو مرادف قرار نہیں دینا چاہیئے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ سلطنت واسطہ بواسطہ منتقل ہوتی رہتی ہے۔ جام سے خاتم جم یا سلطنت جم نہیں کہ صرف ایک شخص کے لئے مخصوص ہو اور اسی کی ذات پر ختم ہو جائے۔

۳۔ تیری تجلی وجودِ عالم کا سبب ہے۔ جس طرح ذرہ بغیر پرتو خورشید کے نمایاں نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح تمام موجوداتِ عالم تیری ذات کے پرتو کے بغیر ظاہر نہیں ہو سکتے۔ غالبؔ ؎

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے

۴۔ حالی۔ بھید کے معنی پوشیدہ بات کے ہیں۔ خواہ پوشیدہ مصلحت ہو۔ خواہ پوشیدہ قباحت ہو۔ یہاں پوشیدہ قباحت مراد ہے۔ اگر مر جانے کی جگہ نہ مرنے کا لفظ ہوتا۔ تو بھید کے معنی پوشیدہ مصلحت ہو جاتے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے مر جانے میں کوئی پوشیدہ قباحت نہیں ہے صرف خوف ہے تو اتنا ہے۔ کہ کہیں میرے مر جانے سے رازِ عشق فاش نہ ہو جائے گویا عاشق کا جان دینا معشوق کی رسوائی کا باعث نہ ہو۔ راز اور بھید میں رعایت لفظی ہے۔

۵۔ مجھے محرومیٔ جاوید کا غم نہیں ہے۔ کیونکہ محرومیٔ جاوید کی حالت میں ہمیشہ ایک سی حالت رہے گی۔ برخلاف اس کے عیش و نشاط کی کیفیت ہمیشہ نہیں رہتی۔ اس حالت میں ہمیشہ گردشِ ایام کا خوف لگا رہتا ہے اور فطرتِ انسان یہ ہے کہ راحت کے بعد رنج اسے بہت تکلیف دہ معلوم ہوتا ہے۔ ان کیفیتوں کو دیکھتے ہوئے ظاہر ہے۔ کہ رنگِ طرب سے نومیدیٔ جاوید بہتر ہے۔ کیونکہ اس میں کسی قسم کے انقلاب کا خوف نہیں۔ حسرت نے دوسرے معنی یہ لکھے ہیں۔

گردشِ رنگ طرب سے اس لیئے ڈر ہے۔ کہ محرومی کی حالت میں طرب کی جھلک سے رنجِ محرومی کا احساس اور بھی زیادہ ہوتا ہے۔

سہیؔ۔ دوسرے معنی۔ رنگِ طرب کی تبدیلیاں دیکھ کر مجھ کو یہ ڈر ہے کہ محرومی بھی ہمیشہ نہ رہ سکے گی۔ اس لیئے میں ڈرتا ہوں کہ محرومیٔ جاوید کا جو غم میں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ نہ ہُوا۔

آسیؔ۔ (۱) میرے ہم خیال (۲) اے وہ شخص کہ تجھ کو زمانہ عیش کے زوال کا دھڑکا لگا ہُوا ہے اور یہ کھٹکا تجھے کھائے جاتا ہے۔ تو اس سے نہیں ڈرتا اور ان لوگوں کا تجھے خیال نہیں جو محرومِ جاوید ہیں۔ مرطباً طبائی (۳) یہ غم نہیں کہ ایک وہ زمانہ بھی آنے والا ہے۔ جب تو ہمیشہ کے لئے عیش وعشرت سے محروم کردیا جائے گا۔ اور اس خیالِ زوالِ عیش تک سے بھی محروم ہوجائیگا مراد ہے زمانہ اجل سے۔

۴۔ (۱) مثل مشہور ہے۔ کہ دنیا بامید قائم۔ لیکن ہم ایسے شخص ہیں۔ کہ ہم کو جینے کی بھی امید نہیں۔ (۲) اُمید ہی سے زندگی ہے۔ جب کوئی امید نہیں تو زندگی سے نااُمید ہونا لازمی ہے۔ (۳) جب ہم کو جینے کی بھی امید نہیں۔ تو پھر ہم کس امید پہ جیتے ہیں۔ بقولِ حالیؔ۔ یہ شعر سہل ممتنع ہے۔ اس زمین میں اس سے بہتر شعر نکالنا مشکل ہے۔

۴۸

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں ۱ خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

دلِ آشفتگاں خالِ کنجِ دہن کے ۲ سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں

ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم ۳ قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری ۴ تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

سراغِ تفِ نالہ لے داغِ دل سے ۵ کہ شب رو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں۔

۱۔ خیابان..... پھولوں کی کیاری۔ ارم..... باغِ ارم، باغِ جنت، خیاباں خیابان..... بمعنی کثرتِ خیابان۔ یار کے نقشِ قدم کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ جہاں کہیں ہم تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں تو ہم کو تیرا ہر نقشِ قدم اک خیابانِ ارم دکھائی دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں تو قدم رکھتا ہے وہاں باغِ ارم کی طرح سرسبز و شاداب کیاریاں ہی کیاریاں نظر آتی ہیں۔

۲۔ وہ لوگ جو تیرے خالِ دہن پر عاشق ہیں، وہ اپنے سویدائے دل میں عدم کی سیر کر رہے ہیں۔ اس میں رمز یہ ہے کہ سویدائے دل خالِ دہنِ معشوق سے مشابہ ہے۔ اور دہنِ معشوق عدم یعنی معدوم ہے۔

۳۔ حالی۔ اس کے ایک معنی تو یہی ہیں کہ سروقامت سے فتنۂ قیامت کمتر ہے۔ اور دوسرے معنی یہ بھی ہیں۔ کہ تیرا قد آہی سے بنایا گیا ہے اس لئے وہ ایک قدِ آدم کم ہو گیا ہے۔ اور تیرا قد فتنۂ قیامت سے ایک قد بھر اور بڑھ گیا ہے۔

۴۔ تماشا کر..... دیکھ۔ آئینہ میں اپنے جمال کو دیکھ کر کیا محو ہو رہے ہو ذرا ادھر تو دیکھو۔ کہ ہم تمہیں کس حسرت سے دیکھ رہے ہیں (تمام متفق) آسی نے ایک پہلو یہ نکالا ہے۔ کہ اے محوِ آئینہ داری آئینہ کو چھوڑ۔ ہم کو دیکھ، تیری اس حالت آئینہ داری کے دیکھنے سے ہم آئینہ سے بھی کچھ زیادہ بن گئے ہیں چونکہ تجھ کو آئینہ اور آئینہ داری کا شوق ہے۔ لہٰذا تو ہم کو دیکھ۔

۵۔ سراغ..... کھوج۔ پتہ۔ تفِ نالہ..... نالہ کی حدت و گرمی۔ شب رو

.... رات کو چلنے والا۔ مسافر شب۔ نالۂ دل کو شب رو کہا ہے۔ کیونکہ نالہ اکثر رات کو بلند کیا جاتا ہے۔ اور داغ دل کو اس کا نقش قدم قرار دیا ہے جس طرح رات کو چلنے والے کا کھوج صبح کو اس کے نقش قدم سے لگا لیتے ہیں۔ کہ وہ کس طرف سے آیا۔ اور کس طرف کو گیا۔ اسی طرح تو بھی میرے داغ دل سے (جو شب رو کے نقش قدم سے مشابہ ہے) میرے نالۂ شب کی گرمی کا سراغ لگا۔

۶۔ ہم فقیر نہیں ہیں لیکن اہل کرم کا انداز کرم دیکھنے کے لئے ہم نے فقیروں کا بھیس بدل لیا ہے۔

ده ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں ۱ کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہان خراب میں ۲ شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر ۳ آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں ۴ میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دور جام ۵ ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

جو منکر وفا ہو فریب اس پہ کیا چلے ۶ کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں

میں مضطرب ہوں وصل میں خوف رقیب سے ۷ ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

میں اور حظ وصل خدا ساز بات ہے ۸ جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

تیوری چڑھی ہوئی ہے جو اندر نقاب کے ۹ ہے اک شکن پڑی ہوئی طرف نقاب میں

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا ۱۰ لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے ۱۱ جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں

وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے ۱۲ جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی ۱۳ پیتا ہوں روز ابر و شب ماہتاب میں

۱۔ نار... آگ۔ التہاب... گرمی، طپش۔ شعلہ زنی۔ آگ بگولا ہونا۔ مجھے جلانا۔ بات بات پر افروختہ ہونا خوئے یار ہے اور آگ میں یہی صفات موجود ہیں۔ اس مشابہت کی وجہ سے مجھ کو عذابِ نار میں بھی راحت ملتی ہے اور اس حقیقت سے میں انکار نہیں کر سکتا۔ اگر انکار کروں تو کافر ہوں۔

۲۔ میں نہیں بتا سکتا کہ اس جہانِ خراب میں کب سے زندگی بسر کر رہا ہوں معمولی سا اندازہ یہ ہے کہ جدائی کی ایک ایک رات ہزار ہزار سال کے برابر تھی خدا جانے کتنی جدائی کی راتیں گذر گئیں اور کتنے ہزار سال مجھے جہانِ خراب میں آئے ہوئے ہو گئے۔ اگر میں شب ہائے ہجر کو حساب میں لاؤں تو نہیں معلوم میری عمر کس قدر طویل ثابت ہو۔

۳۔ میں اس کا انتظار کرتے کرتے سو گیا۔ لیکن اس شوخ کو یہ بھی گوارا نہیں کہ میں انتظار کرتے کرتے سو جاؤں اور خواب ہی میں اس کو دیکھ لوں۔ اس دو گونہ لطف سے مجھے محروم کرنے کے لئے وہ میرے خواب میں آئے اور آنے کا وعدہ کر گئے تاکہ پھر انتظار میں مجھ کو عمر بھر نیند نہ آئے۔ گویا اب انتظار میں نہ مجھے نیند آئیگی اور نہ وہ خواب میں آئیں گے۔ خوب شعر ہے۔

۴۔ جب تک قاصد واپس آئے اُس وقت تک یا ایک اور خط لکھوں کیونکہ وہ جو کچھ جواب لکھیں گے۔ وہ مجھے معلوم ہی ہے اس لئے انتظارِ قاصد فضول ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ مجھے کچھ نہیں لکھیں گے۔ اس لئے میں ایک خط اور لکھ رکھوں۔ دوسرا مصرعہ کئی معنے پیدا کرتا ہے۔ مثلاً یہی کہ کچھ نہ لکھیں گے۔ انکار لکھیں گے یا خط لکھنے سے روک دیں گے۔

۵۔ حالی نے اس شعر میں پہلے مصرعہ کے بعد اتنا جملہ محذوف ہے (پھر آج جو خلافِ عادت جام کی نوبت مجھ تک پہنچی ہے) اس حذف نے شعر کا رتبہ

بہت بلند کر دیا ہے۔ ایسا حذف جس پر قرینہ دلالت کرتا ہو اور جو الفاظ حذف کئے گئے ہیں۔ وہ بغیر ذکر کے دونوں مصرعوں میں بول رہے ہیں۔ محسنات شعر میں شمار کیا جاتا ہے۔

ان کی بزم میں دورِ جام مجھ تک کب آتا تھا۔ پھر آج جو خلافِ عادت جام کی نوبت مجھ تک پہنچی ہے تو کیا تعجب ہے کہ ساقی نے شراب میں زہر ملا دیا ہو کیونکہ ان کی بزم کا ساقی بھی میرا رقیب ہے۔

۶ منکرِ وفا... جو شخص وفا سے انکار کرتا ہو یا کسی کی وفاداری کا اعتبار نہ کرتا ہو۔ دشمن... رقیب۔ دوست... محبوب۔ جو شخص پہلے ہی سے منکرِ وفا ہو۔ اس پر کسی کا فریبِ محبت کارگر نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میں خواہ مخواہ دوست سے بدگمان کیوں ہوں۔ اور یہ خیال کروں۔ کہ وہ رقیب کے فریبِ وفا میں آگیا ہے۔ بھلا منکرِ وفا کا اس کے فریب میں آنا ممکن ہو سکتا ہے؟ ع

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

۷ معشوق سے کہتے ہیں۔ میں تو وصل میں خوفِ رقیب کی وجہ سے پریشان ہوں کہ وہ کہیں کمبخت عین موقع پر ہی نہ آن دھمکے اور رنگ میں بھنگ ڈال دے لیکن یہ بتلایئے کہ آپ کو وہم نے کس پیچ و تاب میں ڈالا ہے۔

وہم کی تشریح غور طلب ہے بیخود وحسرت وطباطبائی۔ تم کو یہ وہم ہے۔ کہ میں کسی دوسرے معشوق سے چھپ کر آیا ہوں۔ اس لئے مضطرب ہو۔ سعید تمہارا یہ وہم ہے کہ میں کسی دوسرے معشوق کے خیال سے بے چین ہوں آسی۔ اگر معشوق کہے کہ جیسے تجھے رقیب کا خوف ہے ویسے ہی مجھے بھی ہے تو اس سے کہا جائے کہ آپ تو کہتے تھے۔ مجھے کسی کا خوف نہیں کیونکہ میں کسی سے ملتی ہی نہیں پھر کس بات کا وہم ہے معلوم ہوا۔ کہ آپکی وہ سب باتیں غلط تھیں مصنف نے

کا لفظ اپنے لئے اور وہم کا لفظ محبوب کے لئے استعمال کیا ہے۔خوف، اس لئے کہ رقیب عاشق کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اور معشوق کا وہم اس لئے کہ اس کا نقصان کا اندیشہ ایک وہم سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔

۸۔ مجھے اور حظ و لطف وصل حاصل ہو یہ ایک خدا سازبات ہے۔ ورنہ میں اس قابل کب تھا مجھے اس موقعہ پر اپنی جان قربان کر دینی چاہیئے تھی۔ لیکن اس غیر متوقع خوشی سے میرا دل ایسا مضطرب ہوا۔ کہ جان بھی نذر دینی بھول گیا۔ بیخود۔ خطِ وصل پڑھتے ہیں۔ گویا وعدۂ وصل کے خط پر جان قربان کر دینی چاہیئے تھی۔ باقی شارحین خطِ وصل کا مفہوم بہتر خیال کرتے ہیں۔

۹۔ عاشق پر محبوب کی برہمی مزاج کا ایسا اثر ہوتا ہے۔ کہ جب وہ نقاب میں شکن پڑی ہوئی دیکھتا ہے تو اس کو دیکھ کر وہ فوراً اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ محبوب کا مزاج برہم ہے برہمی کی وجہ سے اس کے ماتھے پر بل پڑے ہیں اور اس کا اثر نقاب پر ظاہر ہے۔ یعنی تیوری کے مقام پر نقاب میں شکن پیدا ہو گئی ہے۔

۱۰۔ حالی۔ یہاں لگاؤ سے مراد لگاوٹ ہے یعنی معشوق کا عاشق کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا جس سے اس کا التفات اور میلان طبع پایا جائے شعر کا مطلب ہے۔ کہ دوست کی لاکھوں لگاوٹیں ایک طرف اور دیکھ لگاوہ کا چرانا ایک طرف اور اس کے لاکھوں بناؤ سنگار ایک طرف اور ایک عتاب میں بگڑنا ایک طرف یہ شعر بھی سہل ممتنع ہے۔ اگر الفاظ کی طرف دیکھئے تو تعجب ہوتا ہے کہ کیونکر ایسے دو ہم وزن مصرعے بہم پہنچ گئے جن میں حسن ترصیع کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہے اور اگر معنی پر نظر کیجئے تو ہر ایک مصرعہ میں ایک ایسا معاملہ باندھا گیا ہے جو فی الواقع عاشق و معشوق کے درمیان ہمیشہ گزرتا رہتا ہے معشوق کی لگاوٹ عاشق کے لئے بہت بڑی چیز ہے مگر اس کا آنکھ چرانا جو لگاوٹ کی ضد ہے۔ وہ عاشق کی نظر میں لگاوٹ سے

بہت زیادہ دلفریب و دل آویز ہوتا ہے۔ اسی طرح بناؤ سنگار سے معشوق کا حسن بیشک دوبالا ہو جاتا ہے۔ مگر اس کا غصہ میں بگڑنا اس کے بناؤ سے بہت زیادہ خوش نما اور دل ربا معلوم ہوتا ہے۔ اس شعر کے متعلق یہ سب ظاہری اور اوپری باتیں ہیں جو ہم لکھ رہے ہیں۔ اس کی اصل خوبی وجدانی ہے جس کو صاحب ذوق کے سوا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ ایک روز مولانا آزردہ مرحوم کے روبرو کسی نے یہ شعر پڑھا چونکہ مولانا نہایت صاف اور سریع الفہم اشعار کو پسند کرتے تھے اس لئے مرزا کے کلام کو سن کر اکثر اُلجھتے تھے۔ اور ان کی طرز کو ہمیشہ نام رکھتے تھے۔ مگر اس روز اس شعر کو سن کر وجد کرنے لگے۔ اور متعجب ہو کر پوچھا کہ یہ کس کا شعر ہے کہا گیا۔ میرزا غالب کا۔ چونکہ وہ میرزا کے شعر کی کبھی تعریف نہ کرتے تھے اور اس روز لاعلمی میں بے ساختہ ان کے منہ سے تعریف نکل گئی تھی۔ غالب کا نام سنکر بطور مزاح کے جیسی کہ ان کی عادت تھی۔ فرمایا۔ اس میں میرزا کی کیا تعریف ہے۔ یہ تو خاص ہماری طرز کا شعر ہے۔ مگر فی الحقیقت یہ شعر بھی معناً و لفظاً ویسا ہی اچھوتا اور نرالا ہے جیسا کہ میرزا کا تمام کلام کسی کے کلام سے میل نہیں کھاتا جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے۔ یہ اسلوب بیان آج تک اس ہمرنگی کے ساتھ کسی کے کلام میں نہیں دیکھا گیا۔

۱۱۔ خس کے برابر، تھوڑا سا، ذرہ بھر۔ تعجب ہے میرا وہ نالہ جس سے آفتاب شق ہو جاتا ہے معشوق کے دل پر کچھ بھی اثر نہیں کرتا۔

۱۲۔ مدعا طلبی ... مطلب براری۔ سحر ... جادو۔ سراب ... چمکنے والی ریت جس کو دور سے دیکھ کر پانی کا دھوکا ہوتا ہے تعجب ہے کہ اس جادو سے بھی میری مطلب براری نہ ہو جس کے زور سے دریائے سراب میں کشتی رواں ہو جاتی ہے۔

۱۳۔ میں نے شراب پینی چھوڑ دی ہے۔ لیکن کیا کروں، چاندنی راتوں اور ابر کے دنوں میں نہیں رہا جاتا۔

۹۰۔ کل کیلئے کر آج نہ خست شراب میں ۱ یہ سوئے ظن ہے ساقیٔ کوثر کے باب میں
ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند ۲ گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں
جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع ۳ گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں
رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے ۴ نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں
اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے ۵ جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں
اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے ۶ حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
ہے مشتمل نمودِ صور پر وجودِ بحر ۷ یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں
شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی ۸ ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں
آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز ۹ پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں
ہے غیب غیب جسکو سمجھتے ہیں ہم شہود ۱۰ ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

غالبؔ ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
"مشغولِ حق ہوں بندگیٔ بوتراب میں

۱۔ کل ۔۔۔ مراد فردائے قیامت۔ خست ۔۔۔ کنجوسی۔ بخل۔ سوئے ظن ۔۔۔ بدگمانی۔ ساقیٔ کوثر ۔۔۔ کوثر حوضِ بہشت ہے اور حضرت علی علیہ السلام ساقیٔ کوثر ہیں۔ ساقی کل کے لئے شراب بچانی چاہتا ہے۔ اس لئے دل کھول کر شراب نہیں پلانا۔ کہتے ہیں اے ساقی تو کل کا خیال کر کے آج شراب پلانے میں کنجوسی نہ کر جس قدر پلا سکتا ہے آج ہی پلا دے کیونکہ ایسا کرنے سے ساقیٔ کوثر کی شان میں بدگمانی اور گستاخی ہوتی ہے بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کل یعنی روزِ قیامت ساقیٔ کوثر دل بھر کر نہ چھکائیں۔ پھر تجھے خست کرنے سے کیا حاصل ہے (آسی)

بیخود۔ کل یعنی فردائے قیامت کے لئے آج شراب دینے میں خست نہ کر۔ (مشہور ہے کہ دنیا میں جو شراب پئے گا۔ وہ آخرت میں شراب طہور سے محروم رہے گا) یہ سمجھنا کہ ساقی کوثر شراب طہور نہ دیں گے۔ ساقی کوثر کی ذیافی پر سوءظن ہے نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہاں بھی ضرور ملے گی۔

آسی (۱) روز قیامت کے خوف سے شراب دینے میں خست نہ کر۔ کیونکہ اس سے ساقیٔ کوثر کی شان میں سوءظن پیدا ہوتا ہے۔ اگر شراب بری ہوتی تو ساقیٔ کوثر کو یہ کام سپرد ہوتا (۲) میرے ہم خیال۔

معید۔ اے ساقی تو کل قیامت کے خیال سے شراب پلانے میں آج خست نہ کر کیونکہ ایسا کرنا ساقی کوثر کی شان میں گستاخی کرنا ہے بھلا یہ ان کے کب شایانِ شان ہے۔ کہ اگر تو آج شراب زیادہ پلا دے گا تو وہ کل اس کو منہا کر لیں گے۔

۲۔ حالی۔ اس کے ایک معنی تو یہ ہیں۔ کہ معشوق کو یا تو ہماری خاطر ایسی عزیز تھی کہ اگر بالفرض فرشتہ بھی ہماری نسبت کوئی گستاخی کرتا تو اس کو گوارا نہ ہوتی۔ اور یا اب ہم کو بالکل نظر سے گرا دیا گیا ہے۔ دوسرے عمدہ معنی یہ ہیں (کہ) اس شعر میں حضرت آدم اور فرشتوں کے اس قصہ کی طرف اشارہ ہے۔ جو قرآن مجید میں مذکور ہے۔ کہ جب اللہ تعالےٰ نے آدم کو پیدا کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ تو فرشتوں نے کہا۔ کیا تو دنیا میں اس شخص یعنی اس نوع کو پیدا کرنا چاہتا ہے جو اس میں فساد اور خونریزی کرے۔ وہاں سے ارشاد ہوا کہ تم نہیں جانتے۔ جو کچھ میں جانتا ہوں۔ اور پھر آدم سے ان کو زک دلوائی اور حکم ہوا۔ کہ آدم کو سجدہ کریں۔ کہتا ہے کہ آج ہم دنیا میں کیوں اس قدر ذلیل ہیں۔ کل تک تو ہماری ایسی حرمت تھی (بیخود، سعید، آسی اور طباطبائی نے دوسرا مفہوم لکھا ہے

۳۔ وجدِ سماع ۔۔۔ سماع کے وقت سماع یعنی سننا صوفیائے کرام ان اشعار کے سننے کو جو حمد و ثنا میں گائے جاتے ہیں سماع کہتے ہیں۔ چنگ و رباب ۔۔۔ آلاتِ موسیقی۔ اگر غذا کی آواز چنگ و رباب میں سمائی ہوئی ہے تو پھر ان کے نغموں کو سن کر روح میں بالیدگی پیدا ہونی چاہیئے لیکن یہ اس کا الٹا اثر کیسا ہے کہ سماع کے وقت ہمارے جسم سے جان نکلنے لگتی ہے۔

۴۔ رخش ۔۔۔ گھوڑا۔ حالی سواری کی بے اختیاری اور گھوڑے کا ہر کے اختیار سے باہر ہوتا چابک سواروں کی زبان میں اس سے بہتر بیان نہیں ہو سکتا اور عمر کے ایسے بے قابو گھوڑے سے تشبیہ دینی حسنِ تشبیہ کا حق ادا کر دینا ہے۔"

میرا توسنِ عمر بگٹٹ اڑا چلا جاتا ہے۔ میری حالت یہ ہے کہ نہ تو ہاتھ میں باگ ہے اور نہ پاؤں رکاب میں ہے۔ بالکل بے اختیار اس پر سوار ہوں۔ دیکھئے وہ کہاں جا کر تھمتا ہے یا کتنی دور جا کر مجھے اپنی پشت پر سے گراتا ہے۔ آزاد

جہازِ عمرِ رواں پر سوار بیٹھے ہیں سوار خاک ہیں بے اختیار بیٹھے ہیں

۵۔ حالی۔ غیر سے یہاں ماسوائے اللہ مراد ہے۔ جو صوفیا کے نزدیک بالکل معدوم ہے۔ اس لئے کہ وہ وجودِ واحد کے سوا سب کو معدوم سمجھتے ہیں۔ کہتا ہے کہ جس قدر وجودِ ماسوا کے وہم سے رات دن پیچ و تاب میں رہتا ہوں اتنا ہی مجھے اپنی حقیقت یعنی وجودِ واجب سے بُعد ہے۔ (نجوم، سعید)

آسی (۱) جس قدر کہ مجھ کو غیر کا وہم ہے۔ اور غیر کو غیر سمجھتا ہوں اسی قدر اپنی حقیقت سے دور ہوں۔ اپنی ذات سے بھی دور ہوں یعنی ماسوی اللہ ہر ایک سے علیحدہ ہوں وہ اپنی ذات ہو یا کوئی اور ہو۔ (۲) ہمنیال حالی۔

طباطبائی جس قدر غیر کو سمجھتا ہوں - اتنا ہی اپنے سے بیگانہ ہوں پس
عارف ذہنی وہ ہے - جسے غیر کے آئینہ رخسار میں اپنا منہ نظر آئے -

۶- شہود جمع شاہد کی، حاضر ہونا - جب سالک کو تمام موجودات عالم میں
حق ہی حق نظر آتا ہے تو اس کیفیت کو شہود کہتے ہیں - شاہد... محبوب لفظی
معنی دیکھنے والا - مشہود... جس کو دیکھا جائے - شہود، شاہد اور مشہود کی
اصل ایک ہے اس لئے مجھے حیرت ہے - کہ جب یہ تینوں چیزیں ایک ہی ہیں -
تو پھر مشاہدہ کیا چیز ہے - کیونکہ مشاہدہ شاہد و مشہود کے وجود کو علیحدہ
علیحدہ چاہتا ہے -

۷- حالی :- وحدت وجود اور کثرت موہوم کی تمثیل ہے قطرہ و موج و حباب
کے ہیچ دنا چیز ہونے کو ایک عام محاورہ میں اس طرح ادا کرنا کہ یہاں کیا دھرا
ہے منتہائے بلاغت ہے (سعید - بیخود)

آسی :- قطرہ، موج و حباب کی ہستی کوئی ہستی نہیں ہے - بلکہ یہ سب صورتیں
دریا کی بدولت نظر آ رہی ہیں - اور ان صورتوں کے ظاہر ہونے سے بحر کا پتہ
چلتا ہے یعنی ہستی موجودات وجود واجب کے ضمن میں ہے باقی کچھ نہیں ہے (طباطبائی)

۸- حسرت :- ان کا حجاب میں رہنا ہی ان کی بے حجابی پر دلالت کرتا ہے کیونکہ
پردے میں رہ کر وہ اپنے سے نہیں شرماتے - حالانکہ شرم حیا ایک ادائے ناز ہے
اس کے یہ معنی ہیں - کہ خود اپنی ذات سے بھی حیا آئے یا یہ مطلب ہوگا کہ ان کا حجاب
کرنا بھی ایک طرح کی بے حجابی ہے (تمام متفق) ؎

وہ چاہتے تھے نہ دیکھے کوئی ادا میری — چھپے جو مجھ سے تو کیا یہ بھی اک ادا نہ ہوئی

۹- ہر محبوب بناؤ سنگار اس لئے کرتا ہے کہ لوگ اسے دیکھیں اور اس پر
عاشق ہو جائیں - چنانچہ ہمارے محبوب نے بھی خوب بناؤ سنگار کئے — اور

اپنے اس مطلب میں کامیاب ہوا۔ جب سارا جہان اس پر عاشق ہو گیا۔ تو اُس نے آتشِ اشتیاقِ دید کو مشتعل کرنے کے لئے اپنے چہرے پر نقاب ڈال لی۔ نقاب ڈالنے کا اصلی مدعا یہ ہے کہ کوئی شخص اسے نہ دیکھے۔ جب کوئی اسے دیکھتا نہیں۔ تو پھر آرائشِ جمال کی ضرورت باقی نہیں رہتی لیکن ہمارے محبوب کو جمال آرائی کا اس قدر شوق ہے۔ کہ باوجود نقاب ڈالنے کے اسے آرائشِ جمال سے فراغت حاصل نہیں ہوتی۔ چنانچہ اس شوق کو پورا کرنے کے لئے وہ پردے میں بھی آرائشِ جمال کے لئے ہر وقت آئینہ پیشِ نظر رکھتا ہے (سعید۔ آسی)

طباطبائی۔ نقاب استعارہ ہے۔ حجاب قدس کا اور آئینہ اس میں "علمِ ما یکون وما کان" کا حکم رکھتا ہے۔ اور آرائشِ جمال سے فارغ ہونا تفسیر ہے "کلَّ یومٍ هو فی الشان" کی (بیخود)

۱۰۔ حالی۔ سالک کو تمام موجودات عالم میں حق ہی حق نظر آتے ہیں۔ کو شہود کہتے ہیں۔ اور غیب الغیب سے مراد مرتبۂ احدیتِ ذات ہے جو عقل و ادراک و بصیرت سے درالورا ہے۔ کہتا ہے جس کو ہم شہود سمجھے ہوئے ہیں۔ وہ درحقیقت غیب الغیب ہے۔ اور ہم اس کو غلطی سے شہود سمجھتے ہیں۔ ہماری ایسی مثال ہے۔ جیسے کوئی خواب میں دیکھے۔ کہ میں جاگتا ہوں۔ پس گو وہ اپنے تئیں بیدار سمجھتا ہے۔ مگر فی الحقیقت وہ ابھی خواب ہی میں ہے۔ یہ مثال بالکل نئی ہے اور اس سے بہتر اس مضمون کے لئے مثال نہیں ہو سکتی (بیخود۔ حسرت۔ سعید)

آسی۔ جن کو ہم شہود یعنی ظاہر باتیں سمجھے ہیں۔ یہ سب غیب الغیب ہیں۔ اور اس غیب الغیب کو شہود سمجھنے کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی

حالت خواب میں سمجھے۔ کہ ہم جاگتے ہیں مگر درحصل وہ خواب میں ہے۔

طباطبائی۔ یعنی خواب میں خواب دیکھ رہے ہیں۔ تو یہ غیب میں غیب ہے۔۔

۱۲- ندیم ...... مقرب، ہم نشین۔ خدا کو دوست اور حضرت علی علیہ السلام کو ندیم دوست قرار دیا ہے۔ بوتراب ...... حضرت علی کی کنیت ہے۔ چونکہ دوست کے ہم نشین (یعنی حضرت علی) کے جسم سے مجھے بوئے دوست (یعنی بوئے خدا) آتی ہے۔ اس لیے میں بندگی ہمنشین (عبادت علی) کو عبادت خدا خیال کرتا ہوں اور انہی کی عبادت میں مشغول ہوں۔

۹۱- حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں ۱ مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں
چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں ۲ ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں
جانا پڑا رقیب کے در پہ ہزار بار ۳ اے کاش جانتا نہ تری رہگزر کو میں
ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے ۴ کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں
لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے ۵ یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں
چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ ۶ پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں
خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار ۷ کیا پوجتا ہوں اس بت بیداد گر کو میں
پھر بیخودی میں بھول گیا راہ کوئے یار ۸ جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں
اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہل دہر کا ۹ سمجھا ہوں دلپذیر متاع ہنر کو میں

غالب خدا کرے کہ سوار سمند ناز
دیکھوں علی بہادر عالی گہر کو میں

۱- نوحہ گر ...... بین کرنے والا، عزا کرنے والا۔ میرے دل و جگر دونوں فنا ہو گئے ہیں۔ اب میں حیران ہوں کہ کیا کروں۔ دل کو روؤں کہ جگر کو پیٹوں۔ بیک وقت دونوں کا ماتم کیسے کر سکتا ہوں۔ اگر مجھے مقدور ہوتا تو میں نوحہ گری

خدمات حاصل کر لیتا۔ پھر یہ حیرانی اور پریشانی نہ ہوتی۔ نہ جگر کا ماتم کرتا ہیں
دل کو رو لیتا۔ اس طرح سے دونوں کا ماتم ہو جاتا۔ بیخود لکھتے ہیں۔ نہ عزیز
مرنے والوں کا ماتم دار ایک شخص ہو۔ تو مرنے والوں کی کسرِ شان ہے اس لئے
نوحہ گر کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔

۲۔ رشک کے مارے میری یہ حالت ہے۔ کہ تیرے گھر کا پتہ بھی کسی سے
دریافت نہیں کر سکتا۔ مقامِ رشک یہ ہے۔ کہ کوئی تیرا نام سنے گا۔ تو میرا رقیب
بن جائے گا۔ اس لئے میں ہر ایک سے اتنا پوچھتا ہوں کہ میں کدھر کو جاؤں بھلا
اس طرح معشوق کا پتہ چلتا ہے؟ لیکن رشک کا کیا کیا جائے۔ ظاہر ہے پتہ نہ ملنے
سے کس قدر بےچینی اور اضطراب بڑھتا ہے یہی کیفیت دکھانی مقصود ہے (تمام متفق)
سعید لکھتے ہیں۔ مجھ کو اپنی زبان پر رشک آتا ہے۔ اس لئے معشوق کا نام
تک نہیں لیتا۔ بلکہ یہ پوچھتا ہوں کہ کدھر جاؤں۔

۳۔ چونکہ تو عام طور پر رقیب کے گھر میں رہتا ہے اس لئے مجھے اس کے گھر
پر ہزار بار جانا پڑا۔ ظاہر ہے۔ رقیب کے گھر پر جانا عاشق کے لئے باعث
ذلت ہے۔ اس لئے کہتے ہیں۔ اے کاش مجھے اس بات کا پتہ ہی نہ ہوتا تو میں یا
اس ذلت سے بچ جاتا۔ مومن۔ س۔ ۵۔

اس نقشِ پا کے سجدے نے یاں تک کیا ذلیل میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا۔

۴۔ ہے کیا... یعنی کچھ نہیں۔ کمر کسنا... مستعد ہونا۔ ہمت باندھنا
شاعروں کے نزدیک معشوق کی کمر نہیں ہوتی۔ تم جب مجھے یہ دھمکی دیتے ہو کہ ہم نے
تجھے قتل کرنے کے لئے کمر باندھ لی ہے۔ تو تمہاری اس دھمکی سے میری بلا ڈرتی
ہے کیونکہ میں جانتا ہوں تمہارے کمر ہی نہیں۔ تو کسو گے کیا۔ گویا میں اچھی طرح
جانتا ہوں کہ یہ سب دھمکیاں ہی دھمکیاں ہیں۔

۵- سمجھئے ملاحظہ فرمایئے جن کے لئے ہم نے اپنا گھر بار لٹا دیا اور تباہ ہوگئے وہی فرماتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے۔ اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ وہ ہم کو یہ طعنہ دیں گے تو ہم اپنے گھر کو لٹا کر آج یہ بات نہ سنتے۔

۶- حالی- طالب راہِ خدا کو جو حالت ابتدا میں پیش آتی ہے اس کو تمثیل میں بیان کیا ہے طالب اول اول جس شخص میں کوئی کرشمہ یا وجد یا سماع و جوش و خروش دیکھتا ہے اسی کے ہاتھ پر بیعت کرنے کا ارادہ کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ پھرتا ہے پھر جب کوئی اس سے بڑھ کر نظر آتا ہے تو اس کا تعاقب کرتا ہے وھلم جرّا'' اور وجہ اس تذبذب اور تزلزل کی یہی ہوتی ہے کہ وہ کاملین کو پہچان نہیں سکتا'' بقول طبا طبائی- ایک گم کردہ راہ کی تصویر کھینچ دی ہے کہتے ہیں میں منزل کا راستہ نہیں جانتا- رہبر کو نہیں پہچانتا- تلاش منزل میں سرگرداں اور حیراں ہوں- آرزو یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح منزل پر پہنچ جاؤں جس شخص کو تیز رفتار دیکھتا ہوں سمجھتا ہوں کہ یہ منزل کا پتہ جانتا ہے اس لئے اسی کے ساتھ ہو جاتا ہوں آگے بڑھ کر کسی اور کو تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے دیکھتا ہوں- تو اسی کو رہبر خیال کر کے اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہو جاتا ہوں- گویا تلاشِ منزل میں دیوانہ ہو رہا ہوں- (آسی- طبا طبائی)

۷- احمق لوگ خواہش کو پرستش قرار دیتے ہیں- بھلا خواہش اور پرستش ایک چیز کیسے ہو سکتی ہے- اسی غلط فہمی کی بناء پر اکثر لوگ سمجھتے ہیں کہ میں اس بتِ بیداد گر کی پرستش کرتا ہوں- حالانکہ امر واقعہ اس کے بالکل برعکس ہے مجھے تو محض اس کی خواہش اور آرزو ہے میں اس کا پجاری نہیں (سعید- آسی)

جیوو- طبا طبائی- معنی باریک اس شعر میں یہ ہیں کہ شاعر حیران ہو کر پوچھتا

ہے کہ کیا میں اسے پوچھتا ہوں۔ اسے خبر نہیں۔ کہ معشوق کے سامنے جاکر اظہار نیاز پرستش کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ یا خواہش کی حد تک رہتا ہے اور حیرت کے علاوہ دوسرا پہلو تشنیع کا بھی ہے۔ آسی نے پرستش اور خواہش میں یہ فرق نکالا ہے کہ جب پرستش کی جائے گی، تو وہ خواہش دل ہی سے ہوگی۔ خواہ اس میں کسی قدر استغراق کیوں نہ ہو۔ اور جس امر میں خواہش دل شامل ہے وہ عبادت نہیں ہوسکتی۔ تو ثابت ہوا کہ عبادت حق کوئی بجا نہیں لاسکتا۔ صرف دنیا پابند ان خواہش کو عابد کا خطاب دیتی ہے۔

۸۔ میں کوچہ یار میں گیا تھا۔ وہاں جاکر ایسا بیخود ہوا کہ اپنے آپ کو وہیں بھول گیا۔ جب سے وہاں سے آیا ہوں۔ بیخود اور فراموش ہوں۔ اس بیخودی میں اس کی گلی کا راستہ بھی بھول گیا۔ اگر میرے ہوش و حواس درست ہوتے تو ایک دن اس کی گلی میں اپنی خبر لینے کے لئے جاتا۔ کہ وہاں مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔

طباطبائی۔ یعنی آپ سے جو میں باہر ہو گیا ہوں تو کہیں اور تھوڑا ہی گیا ہوا ہوں۔ کوئے یار ہی میں گیا ہوں گا۔ وہی جگہ ایسی دلکش ہے۔ کہ کوئی وہاں جاکر نہیں پلٹتا میں بھی وہیں ہوں۔ اسی سبب سے آپ میں نہیں آتا۔ اور آپ میں نہ ہونے کے سبب سے راہ بھی بھول گیا نہیں تو اپنی خبر کو ایکدن وہاں جاتا بیخود سعید

آسی۔ میں اپنے حواس اسکی گلی میں چھوڑ آیا تھا۔ جب سے وہاں سے آیا ہوں بیخود ہوں۔ لہذا اس کی گلی کا راستہ بھی بھول گیا ہوں۔ اور اس لئے اب جان و دل اور ہوش و حواس کی بھی خبر نہیں لاسکتا۔ کہ ان پر کیا گزری اور اب وہ کس حال میں ہیں۔

۹۔ جیسا میں خود ہوں ویسا ہی اہل دنیا کو سمجھتا ہوں مطلب یہ ہے۔ کہ

میں متاع ہنر کا قدردان ہوں۔ اسی طرح اہل دہر کو بھی ہنر کا قدردان خیال کرتا ہوں لیکن امر واقعہ اس کے خلاف ہے۔ اہل دہر میری طرح متاع ہنر کو دلپذیر خیال نہیں کرتے اور نہ اس کی قدر کرتے ہیں۔ گویا عوام کے نزدیک ہنر متاع کاسد ہے۔

۱۰- سمندِ ناز ..... وہ گھوڑا جو ناز و انداز سے قدم اٹھائے۔ خدا کرے کہ عالی گہر علی بہادر کو میں سمندِ ناز پر سوار دیکھوں۔

۹۲- ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں ۱ غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دور نہیں۔

وعدۂ سیر گلستاں ہے خوشا طالع شوق ۲ مژدۂ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں

شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم ۳ لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن ۴ ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں

حسرت اے ذوق خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی ۵ عشق پر عربدہ کی گوں تن رنجور نہیں

میں جو کہتا ہوں کہ ہم لینگے قیامت میں تمہیں ۶ کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ ہم حور نہیں

ظلم کر ظلم اگر لطف دریغ آتا ہو ۷ تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں

صاف دردی کش پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ ۸ وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب
۹
میرے دعوی پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

۱- انہیں مجھ سے اس قدر نفرت ہو گئی ہے کہ اگر غیر ان کے سامنے میری بدی کرنا چاہتا ہے تو وہ برائی سے بھی میرا ذکر سننا گوارا نہیں کرتے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ غیر کو میری برائیاں کرنے کی عادت ہے۔ کیا عجیب ہے کہ اس بنا پر وہ غیر سے بھی ناراض ہو جائیں۔ کیونکہ وہ میری برائیاں کرنے سے باز نہیں آ سکتا۔ غالب

دشمنی نے میری کھویا غیر کو
کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیے۔

۲ بقدر .... پوشیدہ بطلب - میرے شوق کا نصیبہ جاگ اٹھا کہ اس نے مجھ سے گلستان میں سیر کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ اس وعدہ میں مژدۂ قتل بھی پوشیدہ ہے جس کا اس نے ذکر نہیں کیا - کاش کہ ایسا ہی ہو (آسی)

بیخود لکھتے ہیں وہ پھولوں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھے گا۔ اور میں ان کو رقیب سمجھ کر رشک سے قتل ہو جاؤں گا۔

سعید - سیر گلستان سے اس کی مراد یہ ہے کہ وہ میرا خون بہائے جو مثل لالہ و گل کے ہے۔

۳ - حسرت - غالب دنیا کے موہوم ہونے کو یہ غلو بیان کرتے ہیں۔ کہتے ہیں - لوگ کہتے ہیں - کہ عالم شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے اگر اس سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے - کہ جس طرح شاہد کی کمر نہیں ہوتی، اسی طرح سے وجود عالم بھی موہوم ہے لیکن ہم کو یہ منظور نہیں - کیونکہ جب کہتے ہیں - کہ "عالم شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے" تو اگرچہ اس کے معنی یہی ہوتے ہیں - کہ عالم معدوم ہے - لیکن "ہے" کا لفظ ہم ایک شے معدوم کے لئے کسی طرح استعمال نہیں کر سکتے (سعید - آسی)

طباطبائی - عالم کو ہستی کے ساتھ ایسا ہی تعلق ہے - جیسا کہ کمر کو معشوق کے ساتھ کہ اس کا نام ہی نام سنتے ہیں اور دکھائی نہیں دیتی بمصنف نے لفظ منظور کو یہاں مبصرا اور مرئی کے معنی پر استعمال کیا ہے - محاورہ اس کے مساعد نہیں - (بیخود)

۴ - میں وہ قطرہ ہوں - جو حقیقت میں دریا ہے یعنی فنا فی البحر ہے - گویا میں فنا فی الذات کا مرتبہ رکھتا ہوں لیکن میں منصور کی طرح کم ظرف نہیں ہوں - کہ انا الحق کا دعویٰ کر بیٹھوں، اور اس طرح سے اپنی تنگ ظرفی کا ثبوت بنوں۔

اس لئے میں منصور کی تقلید نہیں کرتا۔ حقیقت کا لفظ قابلِ تعریف ہے۔

۵۔ عشق پُرعربدہ...... جنگجو عشق۔ گیں..... قابل۔ ڈھب۔ ذوق بربادی و خرابی کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ تباہ و برباد ہونے کی حسرت میرے دل ہی میں رہ گئی۔ اور وہ اس وجہ سے کہ میرے تنِ رنجور و کمزور میں پہلے جیسی طاقت نہیں رہی۔ جو میں جنگجو عشق سے مقابلہ کرتا۔ ظاہر ہے۔ جب جنگجو عشق ان میں مقابلہ کی طاقت پاتا۔ تو ان کو اچھی طرح تباہ کرتا۔ اب وہ مرے ہوئے کو کیا مارے گا۔ ایک طرح سے اپنی کمزوری کا اظہار کیا ہے۔

۶۔ رعونت...... غرور۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ جنت میں حوریں ملیں گی شاعر خیال کرتا ہے کہ یہ حسین ہی جنت میں حوریں بن جائیں گے۔ ان خیالات کے ماتحت وہ جب معشوق سے کہتا ہے۔ کہ اچھا تم ہم سے نہیں ملتے۔ تو نہ ملو جنت میں چل کر دیکھا جائے گا۔ قیامت کے دن جب ہمیں اختیار ہو گا کہ جس حور کو ہم چاہیں پسند کر لیں، اس دن تم کیا کرو گے۔ وہ از راہِ شوخی جواب دیتا ہے کہ جناب ہم حور نہیں ہیں جو آپ کو قیامت کے دن مل جائیں گے۔ اسی خیال کو اس طرح بھی ادا کیا ہے۔ ؎

ان پریزادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے اگر حوریں یہی واں ہو گئیں

۷۔ اگر تجھ کو مجھ پر لطف و کرم کرنے میں دریغ ہے تو ظلم ہی کر۔ مہربانی نہ سہی لیکن تغافل نہ کر۔ کیونکہ یہ تو محض ناآشنائی کی دلیل ہے۔ اس لئے مجھے یہ کیونکر گوارا ہو سکتا ہے (حسرت۔ طباطبائی) بیخود لکھتے ہیں تغافل تو اس حالت میں زیبا تھا۔ کہ جب تو ظلم کرنے سے معذور رہتا۔ سعید کا خیال ہے کیونکہ یہ ظلم بھی تغافل کی جو کہ تیرا شعار ہے۔ ایک ادا ہے۔ اور تو تغافل کی ہر ایک ادا

پر قادر ہے۔

آپ کی (۱) اگر لطف نہیں کرتا تو ظلم کر۔ کیونکہ حالت تغافل ہیں یہ دونوں باتیں تو کر سکتا ہے۔ مگر محض تغافل میں تو معذور نہیں رکھا جا سکتا۔ کیونکہ ہر کوئی تجھے مجھ سے غافل سمجھ کر یہ بھی قیاس کر سکتا ہے۔ کہ یہ عاشق پر جور و جفا کر رہا ہے اور یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ کہ اب یہ اپنے دلدادہ پر مہربان ہو گیا کہ اس نے ظلم کرنا چھوڑ دیا۔ (۲) عاشق و معشوق حسن اتفاق سے ملے ہیں۔ مصرعہ اولیٰ کا مضمون اس کے سامنے ادا کرتا ہے۔ وہ جواب دیتا ہے۔ کہ لوگ مجھے اس بات کا طعنہ دیں گے۔ کہ یہ اس سے ملا ہوا ہے تو عاشق اس کو اپنے اوپر مہربان کرنے کا حیلہ بتاتا ہے۔ کہ یہ تغافل جو تو نے اختیار کیا ہے اس کو چھوڑ دے۔ مجھ پر ظلم کیا کر تو اس میں میرا کام بھی ہو جائے گا۔ کہ تو مجھ پر کم سے کم اس قدر تو مہربان ہوا۔ کہ ظلم کیا اور لوگ بھی کہیں گے۔ سہ

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی ‍ ‍ ‍ ‍ تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی

دوسرے مصرعہ کا مفہوم یہ بھی ہے۔ کہ تغافل اختیار کر کے کچھ تو معذور اور مجبور تو نہیں ہو گیا ہے۔ بہر صورت تجھے اب بھی ظلم و مہربانی کا اختیار باقی ہے۔ جب چاہے اس کو چھوڑ کر یہ اختیار کر لے (ظاہر کہ یہ معنی بہت دور کے ہیں)

۸۔ دردی کش ...... تلچھٹ پینے والے۔ صاف اور درد میں (۱) یہ بات ہے شراب انگور جمشید کی ایجاد ہے۔ کہتے ہیں کہ شراب نوشی میں (۲) ہم جمشید کی تقلید کرتے ہیں۔ یہ بات تقلید جمشید کے خلاف ہے۔ کہ ہم ادنیٰ درجہ یا تلچھٹ پئیں لیں ہم کو اس شراب پر افسوس ہے۔ جو شراب انگوری نہ ہو۔

۹۔ خفا اور ظہور میں تقابل و تضاد ہے۔ خفا بمعنی مخفی و گمنام ظہوری بمعنی

مشہور و معروف مرزا صاحب ظہوری کے کلام کو بہت زیادہ پسند فرماتے اور اس کی تقلید پر فخر کیا کرتے تھے پس کہتے ہیں کہ چونکہ میں مشہور نہیں ہوں اس لئے ظہوری کے مقابلہ میں خفائی ہوں اور میرا مشہور نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ میں ظہوری کا مدِ مقابل ہوں۔

۹۲۔ نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں ۱ ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں
عشق و مزدوریٔ عشرت گہِ خسرو کیا خوب ۲ ہم کو تسلیم نکو نامیٔ فرہاد نہیں
کم نہیں وہ بھی خرابی میں پہ وسعت معلوم ۳ دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں
اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب ۴ لطمۂ موج کم از سیلیٔ اُستاد نہیں
وائے محرومیٔ تسلیم و بدا حالِ وفا ۵ جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں
رنگِ تمکینِ گل و لالہ پریشاں کیوں ہے ۶ گر چراغانِ سرِ رہگزرِ باد نہیں
سبدِ گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں ۷ مژدہ اے مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں
نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا ۸ دی ہے جائے دہن اُسکو دمِ ایجاد نہیں
کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت ۹ یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ
۱۰ تم کو بے مہریٔ یارانِ وطن یاد نہیں

۱۔ اے ستم ایجاد محبوب۔ نالہ و بکا سے میرا یہ مدعا نہیں کہ میں تیرے ظلم و ستم کا شکوہ و شکایت کروں۔ بلکہ اس نالہ کشی سے میرا مقصد تقاضائے جفا کے لئے حسنِ طلب ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں مطلب یہ ہے کہ تم یوں تو ہم پر جور و جفا کرتے نہیں لیکن میرے نالوں سے تنگ آکر تم خفا ہو گے اور خفا ہو گے تو ظلم کرو گے۔ اسی کو حسنِ طلب کہتے ہیں۔ غالبؔ:

گو سمجھتا نہیں پر حسنِ تلافی دیکھو شکوۂ جور سے بے مہر خفا ہوتا ہے

عشرت گہ... عشرت گاہ محل۔ نکو نامی.... نیک نامی۔ مشہور ہے۔ کہ فرہاد کو خسرو نے کہا کہ کوہ بے ستون کو کاٹے اور جوئے شیر نکالے، پھر شیریں سے وصال ہو سکے گا۔ فرہاد نے یہ شرط منظور کی۔ اور جوئے شیر لانے میں مصروف ہوگیا۔ جب خسرو نے دیکھا کہ فرہاد وصلِ شیریں کی شرط کو پورا کرنے کے قریب ہے تو اس نے ایک اور چال چلی۔ ایک بڑھیا کو سکھا بجھا کر فرہاد کے پاس بھیجا۔ اس نے فرہاد سے کہا کہ شیریں تو مرگئی اور تیری محنت اکارت گئی۔ یہ سنتے ہی فرہاد اپنا سر پھوڑ کر مرگیا۔ غرض اس فریب سے خسرو اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا شاعر اس واقعہ کو مدِ نظر رکھ کر فرہاد پر طعن کرتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ فرہاد نے عشق کی لاج رکھ لی اور اتنا بڑا کام کر دکھایا۔ لیکن ہمیں اس میں فرہاد کی کوئی نیک نامی کی صورت نظر نہیں آتی۔ اس لئے ہم اس کی نیک نامی کو تسلیم نہیں کرتے۔ کہتا ہے عشق صادق اور رقیب کے عشرت کدہ کی مزدوری دونوں متضاد چیزیں ہیں۔ گویا عاشق صادق کے لئے رقیب کے عشرت کدہ کو جوئے شیر سے زینت دینا باعثِ نیک نامی نہیں، بلکہ باعثِ بدنامی ہے۔

۴۳۔ خرابی.... ویرانی۔ میرا گھر خرابی اور ویرانی میں جنگل سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ لیکن اس میں جنگل جتنی وسعت نہیں ہے۔ میں دیوانہ ہوں۔ مجھے رم کرنے کے لئے بہت وسیع مکان چاہیئے۔ یہی وجہ ہے جنگل میں مجھے وہ عیش و آرام حاصل ہے۔ کہ گھر کبھی یاد ہی نہیں آتا۔

۴۴۔ اہلِ بینش.... عقلمند۔ اہلِ نظر۔ لطمہ موج.... موج کا تھپیڑا یعنی طوفانِ حوادث سیلی... طمانچہ، تھپیڑ۔ جو لوگ اہلِ نظر ہیں۔ وہ طوفانِ حوادث کو مکتب خیال کرتے ہیں۔ اور امواج کے تھپیڑوں کو وہ استاد کا تھپڑ سمجھتے ہیں۔ گویا

طوفانِ حوادث ان کے لئے سبق آموز ہے۔ اور وہ اس سے درسِ عبرت حاصل کرتے ہیں۔

۵ تسلیم ... صبر و رضا۔ بدا ... بہت بُرا۔ ہم تسلیم و رضا اور وفاداری کے خیال سے خاموش ہیں۔ اور نالہ و فریاد نہیں کرتے لیکن وہ سمجھتا ہے۔ کہ ہم میں طاقت فریاد نہیں ہے اس لئے ہم خاموش ہیں کس قدر افسوس ہے ہماری خوئے تسلیم و وفا پر کہ وہ ضبطِ فریاد اور خاموشی کی داد سے بھی محروم ہے

۶ تمکین ... خودداری۔ چراغاں سرِ راہ گذرباد ... وہ چراغ جو ہوا کے راستے میں رکھا ہو۔ جلد نہ بجھ جاتا ہے۔ مراد بے ثبات چیز۔ اگر گل و لالہ ہوا کی رہگذر کے چراغ نہیں ہیں۔ تو ان کا رنگ تمکین و خودداری اس قدر جلدی کیوں فنا ہوجاتا ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ گل و لالہ بے ثبات ہیں تشبیہہ نہایت حسین اور اچھوتی ہے۔

۷ سبدِ گل ... پھولوں کی ٹوکری جس میں گلچین پھول توڑ کر جمع کرتے ہیں اے مرغِ چمن تجھے مژدہ ہو کہ باغ میں صیاد موجود نہیں ہے۔ جو تجھ کو گرفتار کرکے چمن سے باہر لے جاتا۔ اور قفس میں قید کرتا۔ اس وقت باغ میں گلچین ہے۔ اس کے پاس دام و قفس نہیں۔ کہ وہ تجھے پکڑ کر پھولوں کی ٹوکری کے نیچے بند کردے گا۔ پھولوں کی ٹوکری کے نیچے قید میں لطف یہ ہے۔ کہ پھولوں سے اور بھی زیادہ قرب حاصل ہوگا۔ اور یہی مرغِ چمن کا اصلی مدعا ہے۔

آسی اور بیخود۔ اے مرغ سے مراد مرغ گرفتار لیتے ہیں۔ سعید و حسرت میرے ہم خیال ہیں۔

۸ نفی ... نہیں، انکار۔ اثبات ... ہاں، ثبوت، تراوش ... ٹپکنا ظاہر ہونا معشوق ہر بات پر "نہیں" "نہیں" کرتا ہے۔ اس کے "نہیں"

"نہیں" کہنے سے اس کے دہن کا ثبوت بہم پہنچتا ہے۔ اگر اس کے دہن نہ ہوتا تو وہ "نہیں" بھی نہ کرتا۔ (سعیدہ حسرت) غالب نے یہاں اثبات کو مؤنث باندھا ہے۔ دوسری جگہ لکھا ہے۔ ع۔

ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے۔

گویا ضلع کا لفظ ہے اور خوب آیا ہے۔ (آسی) اس کو بجائے دہن کے "نہیں" ملی ہے یا اس کو دہن تو ملا نہیں "نہیں" ملی ہے۔ کہ ہر بات پر وہ "نہیں" کہتا ہے اور اس "نہیں" سے اثبات کی نمائش ہوتی ہے یعنی کوئی چیز ضرور ہے جس سے وہ اس لفظ کو ادا کرتا ہے پہلی صورت میں دوسرے مصرعہ کے یہ معنی ہونگے کہ اگر "نہیں" بجائے دہن کے اس کو ملی ہے مگر ملی ضرور ہے (بیخود۔ طباطبائی)

۹۔ بہشت جلوہ گری میں تیرے کوچے سے کم نہیں ہے یعنی ایسی ہی جلوہ گری بہشت میں بھی ہے۔ اور اس کا نقشہ بھی بالکل ایسا ہی ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ وہ (بہشت) تیرے کوچے جتنی آباد نہیں ہے یہاں عاشقوں کا ہر وقت ہجوم رہتا ہے لیکن وہاں یہ بات نہیں۔ شاید یہ بات کہنا چاہتے ہیں۔ کہ تیرے عاشق زیادہ ہیں۔ خدا کے عاشق اتنے زیادہ نہیں ورنہ بندہ خدا کے لئے بہشت میں بھی خوب ہجوم ہوتا۔ عام شعرا کے خلاف اس شعر میں کوچۂ یار کو جنت سے تشبیہ دینے کے بجائے جنت کو کوچۂ یار سے تشبیہ دی ہے اور اس کو بہشت سے بڑھ کر ثابت کیا ہے۔

۱۰۔ غربت ۔ ۔ ۔ ۔ مسافری۔ تم کس برتے پر غربت کی کس مپرسی کی شکایت کرتے ہو۔ کیا تمہیں یاران وطن کی بے مہریاں یاد نہیں رہیں۔ جب اپنے اہل وطن اس قدر بے مہر اور دل آزار ہیں۔ تو پھر غیروں کی کیا شکایت۔ ؎

تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر بے تکلف ہوں وہ مشت خس جو گلخن میں نہیں

۴۹۔ دونوں جہان دیکے وہ سمجھے یہ خوش رہا ۱ یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

تھک تھک کے ہر مقام پہ دوچار رہ گئے ۲ تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم ۳ ہو غم ہی جانگداز تو غمخوار کیا کریں

۱۔ حالی۔ اپنی فراخ حوصلگی اور اس کے ساتھ شرافت نفس کا اظہار ہے یعنی جو دونوں جہان لے کر خاموش رہا۔ اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ میں ان پر قانع تھا۔ بلکہ مجھ کو زیادہ مانگنے اور تکرار کرنے سے شرم آئی۔ اس لئے خاموشی اختیار کی۔

۲۔ مقام یعنی مقام سلوک و معرفت۔ بہت سے لوگ مقاماتِ سلوک و معرفت طے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی مقام معرفت تک نہیں پہنچتا۔ کوئی ابتدائی منزلوں میں مایوس ہو جاتا ہے۔ کوئی درمیانی مقامات میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔ اس مضمون کو اس طرح ادا کرتے ہیں کہ تیری جلوہ گاہ تک کوئی نہیں پہنچ سکا۔ کوئی کسی منزل پر تھک کر رہ گیا۔ کوئی کسی مقام پر مایوس ہو کر بیٹھ رہا۔ غرض کوئی بھی مقام معرفت تک نہ پہنچا۔ ٹھیک ہے تیرا پتہ تو کہیں ملتا نہیں۔ وہ بچارے ناچار ہو کر ترکِ جستجو نہ کریں تو کیا کریں۔ مجبور ہیں۔ دوچار ناچار کے ضلع کا لفظ معلوم ہوتا ہے۔

۳۔ ہوا خواہ۔۔ ہمدرد، غم خوار۔ شمع کا ذکر بطور تمثیل ہے۔ غرض اپنے حال سے ہے۔ کیا اہلِ بزم شمع کے غمخوار نہیں ہیں؟ مطلب یہ ہے کہ ضرور ہیں لیکن جب غم ہی جان کو پگھلانے والا ہو۔ تو بیچارے غمخوار کیا کر سکتے ہیں مجبوری ہے۔ کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ ع

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا

ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر عشق کا اس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

معشوق پر رقیب کی جادو بیانی اور شیریں کلامی کا جادو چل گیا ہے۔ گویا وہ غیر کو عاشق صادق سمجھنے لگا ہے اس کے مقابلے میں ہم بے زبان ہیں۔ ہم اپنی زبان سے اپنے عشق کا یقین نہیں دلا سکتے یہی وجہ ہے کہ اس کو ہمارے عشق کا یقین نہیں۔ حالانکہ امر واقعہ یہ ہے۔ کہ ہم اس کے عاشق صادق ہیں

۹۵

قیامت ہے کہ حسن لیلیٰ کا دشت قیس میں آنا ؎ تعجب سے وہ بولا یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں

دل نازک پہ اس کے رحم آتا ہے مجھے غالب
نہ کر سرگرم اس کافر کو الفت آزمانے میں

۱۔ معشوق کا دل موم کرنے کے لئے اس کو لیلیٰ مجنوں کا قصہ سنایا اور یہ بتایا کہ مجنوں کے عشق کا یہ اثر ہوا کہ لیلیٰ بیتاب اور بے حجاب ہو کر دشت قیس میں آگئی۔ یہ قصہ سنکر بجائے اس کے کہ وہ جذب عشق سے ڈرتا اور ہم پر مہربان ہوتا معشوق متعجب ہوا اور کہنے لگا۔ کہ کہیں دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ معشوق عاشق کے پیچھے پیچھے اسے ڈھونڈھتا پھرے مطلب صرف اس قدر ہے۔ کہ معشوق عاشق کی خبر گیری کرنا خلاف معشوقیت خیال کرتا ہے۔

۲۔ معشوق کی آزمائش عاشق کی محبت کی قدر دانی پر منحصر ہے۔ پس اس کا امتحان اس طریقے سے ہو سکتا ہے کہ عاشق اپنے آپ کو ہلاک کر دے اگر معشوق عاشق کی ہلاکت سے ملول اور غمگین ہو تو ثابت ہو جائے گا کہ معشوق عاشق کا قدر داں ہے۔ اس مضمون کو ایک دوسرے شخص کی زبان سے کہلوانے میں لطف دوچند ہو گیا ہے۔ اس سے پایا جاتا ہے۔ کہ عاشق یہ سخت امتحان لینے پر آمادہ ہے گویا اپنی جان پر کھیلنے کو تیار ہے لیکن دیکھنے والے اسے معشوق کی نازک دلی کا واسطہ دے کر باز رکھتے ہیں۔

۹۶۔ دل لگا کر آ گیا اُن کو بھی تنہا بیٹھنا ۱ بارے اپنی بیکسی کی ہم نے پائی داد یاں

ہیں زوال آمادہ اجزاء آفرینش کے تمام ۲ مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگزر باد یاں

۱۔ جب سے انہوں نے کسی سے دل لگایا ہے۔ وہ تنہا بیٹھے رہتے ہیں یہ ہماری بیکسی کا صبر پڑا ہے جس طرح ہم ان کے عشق میں خلوت پسند تھے۔ وہ بھی ہو گئے پس یہی ہماری بیکسی کی داد ہے۔ جو اِن کے کسی پر عاشق ہونے سے ہم کو ملی ہے۔

۲۔ زوال ... آمادۂ زوال۔ اجزاء آفرینش کے ... کائنات کا ذرہ ذرہ۔ چراغِ رہگذر باد ... وہ چراغ جو ہوا کے راستے میں روشن ہو۔ بہت جلد بجھ جاتا ہے۔ گویا وہ آمادۂ زوال ہے۔ کائنات کا ہر ذرہ آمادۂ زوال ہے یہاں تک کہ خورشید بھی ایک ایسا چراغ ہے۔ جو ہوا کے راستے میں روشن ہو۔ اور اس کا آمادۂ زوال ہونا ظاہر ہے۔ کیا پتہ کونسا جھونکا اسے بھی فنا کر دے

۹۷۔ یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں ۱ کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے ۲ کبھی ہم اِن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو ۳ یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

ترے جواہرِ طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں ۴ ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

۱۔ بادِ صبا ہر جگہ بغیر روک ٹوک کے آتی جاتی ہے اس لئے شعرا اس سے پیغامبر کا کام لیتے ہیں۔ اور جب کوئی شخص کسی کے انتظار میں ہوتا ہے تو وہ بےچین ہو ہو کر اِدھر اُدھر دیکھتا ہے۔ کہتے ہیں۔ ہجر میں ہم جو کبھی دیوار کو دیکھتے ہیں اور کبھی ہماری نظر دروازے پر جاتی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ کبھی ہمیں یہ خیال آتا ہے۔ کہ کہیں بادِ صبا پیغامِ یار نہ لائی ہو۔ اور دروازے کو بار بار دیکھنے کی یہ وجہ ہے کہ ہمکو قاصد کے آنے کی انتظار ہے۔ ظاہر ہے صبا دیوار پر سے اور

قاصد دروازے میں سے آئے گا۔

۲۔ حالیؔ نے اپنے گھر میں معشوق کے آنے سے جو تعجب اور حیرت ہوتی ہے دوسرے مصرعہ میں اس کی کیا عمدہ تصویر کھینچی ہے یعنی کبھی معشوق کو دیکھتا ہے اور کبھی اپنے گھر کو دیکھتا ہے۔ کہ اس گھر میں اور ایسا شخص وارد ہو سبحان اللہ میری ایسی قسمت کہاں تھی۔

۳۔ معشوق نے میرے جگر پر بہت کاری زخم لگایا ہے۔ عاشق کے جگر پر کاری زخم لگانا قابلِ تحسین و آفرین ہے۔ کیونکہ معشوق کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے یہ بات ناممکن ہے۔ اس لئے جو شخص بھی زخم کو دیکھتا ہے معشوق کے دست و بازو کی تعریف کرتا ہے کہتے ہیں۔ میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ کہیں ان کے دست و بازو کو کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ اور اُن کی ناوک افگنی اور تیر اندازی کو نقصان پہنچے اس لئے بہتر یہ ہے۔ کہ یہ لوگ میرے زخمِ جگر کو نہ دیکھیں۔ نہ دیکھیں گے نہ تعریف کریں گے اور نہ نظر لگے گی۔ یہ شعر مرزا کے لاجواب شعروں میں سے ایک شعر ہے۔

۴۔ طرفِ کلہ ..... ٹوپی کا پہلو یا سرا۔ اوجِ طالع ..... نصیبے کی بلندی۔ خوش قسمتی۔ ہم ان جواہرات کو کیا دیکھیں جو تو نے اپنی کلاہ پر ٹانکے ہیں ہم تو لعل و گوہر کے نصیبے کی بلندی اور خوش قسمتی کو دیکھتے ہیں۔ کہ یہ سنگریزے تیری کلاہ میں ٹنک کر کس مرتبہ بلند کو پہنچے ہیں۔

۵۔ نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں ۱ شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں

کوئی کہے کہ شبِ مہ میں کیا برائی ہے ۲ بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں

جو آؤں سامنے اُن کے تو مرحبا نہ کہیں ۳ جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد نہیں

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں تو کہتے ہیں ۴ کہ آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب ۵ گدائے کوچۂ مے خانہ نامراد نہیں

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام ۶ دیا ہے ہمکو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

تم ان کے وعدے کا ذکر ان سے کیوں کرو غالب ۷ یہ کیا کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ یاد نہیں

۱- روزِ جزا... روزِ قیامت۔ یہ بات نہیں ہے۔ کہ مجھے قیامت پر اعتقاد نہیں ہے۔ میں قیامت پر ایمان رکھتا ہوں۔ صرف بات اتنی ہے کہ میں یہ سمجھتا ہوں۔ کہ عذابِ قیامت شبِ فراق کے عذاب سے زیادہ نہیں ہو سکتا گویا میرے نزدیک شبِ ہجر کی سختیاں اور شدائد عذاب قیامت سے بڑھ کر ہیں۔

۲- شراب پینے والے روزِ ابر اور شب ماہ میں شراب نوشی کو پسند کرتے ہیں غالب نے ایک اور جگہ بھی لکھا ہے۔ ؎

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

کہتے ہیں سو اتفاق سے آج روزِ ابر نہیں، اس لئے شراب نوشی کا کچھ لطف نہیں پھر اپنے دل کو اس طرح تسلی دیتے ہیں کہ کیا ہو گیا اگر ابر نہیں تو شب ماہتاب تو ہے۔ پھر کون سی برائی ہے۔ چاندنی رات میں مے نوشی کا خوب لطف آئے گا۔

۳- معشوق کی بے التفاتی کی شکایت کرتے ہیں کہتے ہیں۔ وہ میری طرف سے اس قدر بے پرواہ ہیں۔ کہ جب میں ان کی خدمت میں جاتا ہوں تو کبھی ان کے منہ سے خوش آمدید کے کلمات نہیں نکلتے۔ اور جب میں ان سے رخصت ہوتا ہوں تو اس وقت بھی الوداعی الفاظ نہیں کہتے ورنہ قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی غیر بھی آتا ہے تو مرحبا، خوش آمدید وغیرہ کہتے ہیں۔ اور رخصت کرتے وقت خیر باد، خدا حافظ اللہ نگہبان کہا جاتا ہے۔ اپنی کس مپرسی پر اظہار افسوس کرتے ہیں۔ کہ ہمارے

لئے یہ سہمی الفاظ بھی معشوق کی زبان پر نہیں آتے۔

۴۔ اوّل تو مجھے کبھی اپنی بزم میں یاد ہی نہیں کرتے، اور کبھی یاد آتا ہوں تو وہ بھی اس طرح سے کہ وہ حاضرین بزم سے دریافت کرتے ہیں۔ کیا بات ہے آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں، گویا مجھے وہ فتنہ پرداز اور فسادی خیال کرتے ہیں غور فرمایئے یہ ہے ہمیں یاد کرنے کا طریقہ۔ بیخود لکھتے ہیں۔ کہ فسادی اور فتنہ پرداز کہنے کا سبب یہ ہے۔ کہ میں بات بات پر رشک کی بدولت اہل بزم سے الجھتا ہوں

۵۔ عام طور پر عید کے دن محتاجوں اور فقیروں کو ہر جگہ خیرات دی جاتی ہے کہتے ہیں۔ یہ دستور مے خانہ کا نہیں ہے۔ کہ وہاں بھی عید ہی کے دن مے خانہ کے گداوں کو شراب تقسیم کی جائے۔ وہاں تو عید کے علاوہ اور دنوں میں بھی شراب تقسیم کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ گدائے کوچہ مے خانہ نامراد نہیں گویا ساقی مے خانہ کا فیض ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ سعید کوچہ سے کوچہ یار مراد لے کر شرح لکھتے ہیں۔

۶۔ لوگوں کا خیال ہے۔ کہ شادی و غم توام ہیں۔ یعنی غم اور خوشی ساتھ ساتھ ہیں کبھی خوشی ہے کبھی غم ہے۔ غرض اسی طرح سے زندگی بسر ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں۔ دنیا میں شادی و غم بہم ہی ہوں گے۔ لیکن ہمارے ساتھ تو یہ بات نہیں خدا نے ہم کو ایسا دل دیا ہے۔ جس کو خوشی کبھی نصیب ہی نہیں ہوتی ہمیشہ غم میں ہی مبتلا رہتا ہے۔ طباطبائی کی شرح لطف سے خالی نہیں لکھتے ہیں غم و شادی کا بہم ہونا اس مقام پر ذکر کرتے ہیں۔ جہاں دنیا کے رنج و خوشی سے نفرت ظاہر کرنا ہو اس شعر میں مصنف نے تازگی یہ پیدا کی ہے کہ غم اور شادی کے بہم ہونے پر حسرت ظاہر کی ہے۔ شادی مخلوط بالغم کی حسرت سے یہ معنی نکلتے ہیں۔ کہ شاعر کو انتہا کی غمزدگی ہے کہ ایسی ہیچ و ناکارہ خوشی کی تمنا رکھتا ہے۔ اور یہی وجہ بلاغت ہے۔

۷۔ معشوق کی وعدہ خلافی اور بد عہدی کے مضمون کو خوب آب و رنگ دیا ہے کہتے ہیں غالب تم انہیں ان کا وعدہ یاد نہ دلاؤ۔ بھلا یہ کیا کہ تم کہو کہ آپ نے وعدہ کیا تھا۔ اور وہ کہیں کہ ہمیں تو یاد نہیں کہ ہم نے وعدہ کیا تھا۔ مطلب یہ ہے خواہ مخواہ جھوٹے نہ بنو۔ اور ناحق کا صدمہ نہ اٹھاؤ۔

بیخود لکھتے ہیں کہ تم ان سے یہ کہو گے۔ کہ تم نے ہم سے وعدہ خلافی کی وہ کہیں گے تم جھوٹے ہو ہمیں اپنا وعدہ یاد نہیں۔ باہمدگر تکرار ہوگی۔ تکرار سے رنج نکلیگا۔ رنج سے جانِ عاشق پر مصیبت آئے گی۔ اس سے بہتر ہے کہ وعدہ یاد ہی نہ دلاؤ۔

۹۹۔ تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں ۱ ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں
آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے ۲ ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں
تیری فرصت کے مقابل اے عمر ۳ برق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں
قیدِ ہستی سے رہائی معلوم ۴ اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں
نشئہ رنگ سے ہے واشدِ گل ۵ مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں
غلطیہائے مضامیں مت پوچھ ۶ لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں
اہلِ تدبیر کی واماندگیاں ۷ آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں
۸ سادہ پرکار ہیں خوباں غالبؔ
ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

۱۔ توسن ... گھوڑا ــــ ہوا باندھنا ... رعب بٹھانا ہم تیرے گھوڑے کو ہوا سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ اس نادر تشبیہہ سے ہمارے مضمون کی ہوا بندھ جاتی ہے۔

۲۔ ہم آہ کر کے اس کے دل پر اپنا رعب بٹھاتے ہیں کہ شاید وہ اثر آہ کے خوف سے رام ہو جائے۔ ورنہ اثر آہ کی حقیقت ہمیں معلوم ہے۔

۳۔ پابہ حنا... سُست رفتار جس کے پاؤں میں مہندی لگی ہو، وہ چل نہیں سکتا ہے۔ اگر چلنا ہے تو بہت بچ بچ کر پنجوں کے بل، ایڑیوں پر اے عمر تو اس قدر تیز رفتار ہے کہ تیرے مقابلے میں ہم بجلی کو پابہ حنا باندھتے ہیں مطلب یہ ہے کہ عمر کی رفتار چشمک برق سے بھی زیادہ تیز ہے اسی لئے تیرے مقابلے میں ہم اسے سُست رفتار اور پابہ حنا کہتے ہیں۔

۴۔ انسان قید ہستی سے کسی صورت بھی آزاد نہیں ہو سکتا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اشک کو دیکھو وہ بے سر و پا ہے لیکن شعرا پھر بھی اسے رسن نظم سے باندھے بغیر نہیں چھوڑتے۔ دوسرے اشک کے لفظ کو شعرا باندھتے ہیں۔ چونکہ باندھنے کے معنی قید کرنے کے بھی ہیں۔ اس لئے یہ مضمون پیدا ہو گیا۔

طباطبائی۔ لطف یہ ہے کہ ممکن پر عدم سابق بھی ہے۔ اور عدم لاحق بھی۔ تو اشک کی طرح انسان بھی بے سر و پا ہے۔ اور اشک کو باوجود بے سر و پا ہونے کے باندھتے ہیں۔ اور کسی کے باندھنے سے بندھ جانا فرع ہے ہستی کی، غرض یہ کہ ہم ہستی کی قید میں ضرور رہیں گے اور مرتبہ فنا جو عین آزادی ہے۔ حاصل نہیں ہو گا (بیخود)

۵۔ واشد گل... پھول کھلنا۔ پھول نشۂ رنگ سے مست ہیں اور یہی نشہ اُن کی شگفتگی کا سبب ہے۔ کیونکہ مست لوگ اپنی قبا کے بند کب باندھا کرتے ہیں۔ گویا پھولوں کے بند ہائے قبا نشۂ رنگ کے اثر سے کھلے ہوئے ہیں۔

۶۔ مضامین... مضامین شعر۔ لوگ... شعرا۔ کہتے ہیں شعرا کے مضامین کی غلطیاں مجھ سے نہ دریافت کر معمولی سی غلطی یہ ہے کہ یہ لوگ نالے کو

رسا لکھتے ہیں۔ حالانکہ نالہ کبھی رسا نہیں ہوتا۔ اگر نالہ رسا ہوتا تو باندھنے کیسے اس کا بندھ جانا ہی نارسائی کی دلیل ہے۔

۷۔ واماندگی۔۔۔ پیچھے رہ جانا۔ یہاں مراد حماقت۔ کہتے ہیں۔ کہ ذرا اہل تدبیر کی حماقت ملاحظہ ہو کہ وہ آبلوں پر حنا باندھتے ہیں۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ ایسی تدبیر کرتے جس سے چلنے پھرنے میں معذوری نہ ہوتی اور باوجود آبلوں کے خوب بھاگا دوڑا جاتا لیکن انہوں نے آبلوں پر حنا باندھ کر چلنے پھرنے سے بالکل ہی معذور کر دیا۔ بیخود۔ سعید۔ طباطبائی۔ ان معنوں پر یہ اضافہ کرتے ہیں۔ اس مقابلے میں اہلِ جنون کی ستائش مقصود ہے۔ کہ وہ پائے پُر آبلہ سے دشتِ پُرخار پر دوڑتے ہیں۔

۸۔ سادہ۔۔۔ سیدھے سادے۔ پُرکار۔۔۔ ہوشیار۔ مکار۔ معشوق ظاہر میں تو بہت سیدھے سادے ہیں مگر دراصل بڑے ہوشیار ہیں اور کسی کے ساتھ بھی نہیں۔ وہ ہم جیسے تجربہ کار اور جہاندیدہ شخص سے ساتھ پیمان وفا باندھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں۔ کہ ہم ان کے پیمانِ وفا پر یقین کر لیں گے۔ سادہ اس لیئے کہا ہے۔ کہ وہ از راہ سادگی اس خیال میں ہے اور پرکار اس وجہ سے کہ وہ ہم جیسے ہوشیار شخص کو دھوکہ دینے کی فکر میں ہیں۔ "ہم" کو اگر زور دے کر پڑھا جائے تو یہ معنے ظاہر ہوتے ہیں۔ کہ کوئی اور نہیں بلکہ ہم سے۔ سہ

زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسدؔ   وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

سخت کم آزار۔۔۔ بہت کم آزار۔ بجان اسد۔۔۔ اسدؔ کی جان پر اسدؔ کی جان پر زمانہ بہت ہی کم ظلم وستم کرتا ہے۔ ورنہ ہمیں تو اس پر بے حد و حساب مصائب وآلام نازل ہونے کی توقع ہے (سعید۔ آسی)

طباطبائی۔ بیخود، قسم کھا کے کہتے ہیں۔ کہ زمانہ کے ہاتھ سے جس قدر آزار پہنچتا ہے۔ یہ بہت ہی کم ہے۔ ورنہ ہم اس سے زیادہ ستم سہنے کی آرزو رکھتے ہیں

۱۰۰

دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں ۱ خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل ۲ انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لئے ۳ لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے ۴ آخر گنہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے ۵ لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ ۶ رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوس کس لئے ۷ کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

غالبؔ وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

۱۔ مکان کے دروازہ کے آگے عموماً پتھر رکھ دیا کرتے ہیں.... کہ اترنے چڑھنے میں تکلیف نہ ہو۔ کہتے ہیں پتھر تیرے دروازے پر ہمیشہ پڑا رہتا ہے لیکن مجھے یہ بھی نصیب نہیں۔ ایسی زندگی پر افسوس ہے۔ کہ میں پتھر جیسی قسمت بھی نہیں رکھتا۔ مطلب یہ ہے۔ کاش میں تیرے سنگِ در کی طرح ہمیشہ تیرے در پر پڑا رہتا۔ بیخود۔ آسی۔ حسرت)

سعید۔ میں تیرے در پر پتھر کی طرح پڑا رہتا ہوں لیکن پھر بھی مطلب برآری نہیں ہوتی رکبھی مطلب برآری نہ ہونے کی وجہ سے اکتا کر کہتے ہیں کہ میں پتھر نہیں ہوں کہ اس طرح ہمیشہ تیرے در پہ پڑا رہوں۔

طباطبائی۔ اس زندگی سے پتھر ہونا بہتر تھا۔ کہ شاید تیرا سنگِ در رہتا اور اس

بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ ہمیشہ پتھر کی طرح پڑا رہتا ہوں لیکن دربار سے دُور ہوں۔ میں پتھر نہیں ہوں کہ اس طرح پڑا رہنا گوارا کروں۔

آسی نے چار مفہوم لکھے ہیں چوتھا یہ ہے کہ ہمیشہ میں تیرے دروازہ پر پڑا ہوا نہیں ہوں۔ ایسی بے حیائی کی زندگی کس کام کی کہ لوگ مجھ پر آوازے کسیں اور طعنے دیں۔ اور میں برابر سنا کروں میں آدمی ہوں پتھر تو نہیں ہوں۔

۲۔ دائمی گردش سے میرا دل کیوں نہ گھبرا جائے آخر میں انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں۔ پیالہ و ساغر بے جان ہیں۔ اگر وہ ہمیشہ گردش میں رہیں تو انہیں کچھ تکلیف نہیں ہوتی لیکن انسان حساس ہے وہ ساغر کی طرح شبانہ روز کی گردش برداشت نہیں کر سکتا۔ (بیخود۔ آسی۔ سعید)

آسی نے دوسرے معنی یہ لکھے ہیں کہ اس پریشان کن زندگی سے دل کیوں نہ گھبرا جائے۔ افسوس کہ میں انسان ہوں۔ پیالہ و ساغر نہیں ہوں۔ کاش وہی ہوتا۔

طباطبائی۔ جو لوگ شربِ مدام رکھتے ہیں۔ ان کا ساغر ہمیشہ دور میں رہتا ہے تو وہ تباہی ہے۔ اسی واسطے میں انسان ہوں۔ میرے لئے یہ گردش مدام کیسی ہے

۳۔ لوح .... تختی۔ حرف مکرر .... وہ لفظ جو مکرر لکھ دیا جائے زائد ہوتا ہے۔ اس لئے مٹا دیا جاتا ہے کہتے ہیں۔ اے خدا میری ہستی لوحِ جہاں پر لفظِ مکرر نہیں ہے کہ زمانہ اسے زائد سمجھ کر مٹا دیتا ہے آخر مجھے مٹانے کی کیا وجہ ہے؟

۴۔ عقوبت .... سزا، عذاب۔ ہر گناہ کی سزا کی ایک حد ہوتی ہے۔ اس لئے میرے گناہ کی سزا کی بھی ایک حد مقرر ہونی چاہیئے۔ آخر میں گنہگار ہوں کافر نہیں ہوں۔ کہ جس کی سزا کی کوئی حد ہی نہیں ہوتی۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے۔ کہ روزِ قیامت کافر عذابِ دائمی میں مبتلا رہیں گے لیکن مسلمانوں کے گناہوں کی سزا مقرر ہوگی جب وہ پوری ہو جائیگی تو ان کی نجات ہو جائے گی۔ اسی بنا پر

کہتے ہیں میں کافر نہیں ہوں کہ مجھ کو برابر سزا دی جا رہی ہے۔

۵۔ باقی تمام اشعار نعت میں ہیں۔ میں لعل، زر، زمرد یا گوہر نہیں ہوں کہ آپ کو مجھ سے نفرت ہے۔ رسول مقبول مال و منال سے متنفر تھے۔

۶۔ جب آپ نے شبِ معراج میں مہر و ماہ کو شرف قدم بوسی بخشنے میں دریغ نہیں فرمایا۔ تو پھر حضور میری آنکھوں پر قدم رکھنے سے کیوں دریغ فرماتے ہیں۔ میں رتبہ میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں۔

۷۔ آپ نے شب معراج میں آسمان کو قدم بوسی کا اعزاز بخشا۔ پھر میرے لئے قدم بوسی سے کیوں انکار۔ کیا میں آسمان کے برابر بھی مرتبہ نہیں رکھتا

۸۔ غالب تم بادشاہ کے وظیفہ خوار ہو۔ بادشاہ کو دعائیں دو۔ اب وہ دن گئے۔ جب تم بڑے افسوس کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ میں بیروزگار رہوں شکر کرو کہ اس غم سے آزاد ہو گئے۔ ادائے شکر کا نیا اسلوب اختیار کیا ہے الفاظ اور طرز بیان سے ظاہر ہے۔ کہ غالب کو استادِ شاہ بننے کی بڑی آرزو تھی۔

۱۰۱

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں	۱	خاک میں کیا صورتیں ہونگی جو پنہاں ہو گئیں
یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں	۲	لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں
تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں	۳	شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں
قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر	۴	لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں
سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے	۵	ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں
جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق	۶	میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں
ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام	۷	قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں
نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں	۸	تیری زلفیں جسکے شانوں پر پریشاں ہو گئیں

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستان کھل گیا ۹ بلبلیں سن کر مرے نالے غزلخواں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار ۱۰ جو مری کوتاہی قسمت سے مژگاں ہو گئیں

بس کہ روکا میں نے اور سینے میں ابھریں پے بہ پے ۱۱ میری آہیں بخیۂ چاک گریباں ہو گئیں

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب ۱۲ یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں

جانفزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا ۱۳ سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں

ہم موحد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم ۱۴ ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے ۱۵ مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

۱۶ یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہل جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

۱۔ خیال یہ ہے کہ پھول حسینوں کی خاک سے پیدا ہوا کرتے ہیں نیز جیسا حسین ہوتا ہے ویسے ہی خوبصورت پھول اس کی خاک سے پیدا ہوتے ہیں اس لئے لالہ و گل کو دیکھ کر افسوس کے لہجہ میں کہتے ہیں کہ خدا جانے کتنے اور کیسے کیسے حسین خاک میں مل کر خاک ہوئے ہیں۔ ان میں سے چند ایک حسینوں کی صورتیں تو لالہ و گل کی صورت میں ظاہر ہو گئی ہیں۔ باقی کا کہیں پتہ نہیں۔ بہترین شعر ہے۔

۲۔ رنگا رنگ ۔۔۔۔ رنگ برنگ کی۔ نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں یعنی ہم بھول گئے۔ ارباب شوق کی بزم آرائیاں دیکھ کر کمال حسرت سے کہتے ہیں کہ ایک زمانہ تھا جب ہم بھی بزم آرائیاں کیا کرتے تھے۔ وہ وقت گذر گیا۔ بزم آرائیاں ختم ہو گئیں۔ مگر ان کی یاد مدتوں دل کو بے چین کرتی رہی۔ اب ایسا زمانہ آیا ہے۔ کہ ان بزم آرائیوں کی یاد بھی باقی نہیں رہی۔ گویا وہ بزم آرائیاں طاق نسیاں کی زینت بن گئیں۔ طباطبائی، بیخود، سعید لکھتے ہیں۔ کہ تمہیں ہمارا حال دیکھ کر عبرت حاصل کرنی چاہیئے کہ شباب کو قیام نہیں۔

۳- بناتُ النعش ..... شمال کی جانب سات ستارے نکلا کرتے ہیں، عورتوں ان کو سات سہیلیوں کا جھمکا اور سات سہیلیاں بھی کہتی ہیں نیز چار ستاروں کو جنازہ اور تین کو جنازہ اٹھانے والے کہا جاتا ہے۔ میرزا صاحب نے بنات کے لفظ سے فائدہ اٹھایا ہے جس کے معنی لڑکیاں ہیں لیکن اہلِ عرب کے محاورہ میں بنات ابن کی جمع ہے مثلاً ابن العرس کی جمع بنات العرس ہے۔ چونکہ دن کے وقت ستارے نظر نہیں آتے۔ اس لئے کہتے ہیں کہ آسمان کی سات سہیلیاں دن کے وقت پردے میں چھپی ہوئی تھیں لیکن خدا جانے رات کو ان کے دل میں کیا آئی کہ وہ بے پردہ ہو گئیں۔

آسی - (۱) اپنے معشوق کو خطاب کر کے کہتے ہیں۔ کہ بنات النعش بڑی پردہ دار تھیں۔ دن کو منہ چھپائے رہیں مگر شب کا وقت آیا تو اپنا پردہ اٹھا دیا۔ تم ایسے ہو کہ شبِ وصل میں بھی مجھ سے شرمائے جاتے ہو حالانکہ یہ کوئی محل نہیں ہے۔

(۲) ایک عاشقانہ چال ہے۔ کہ معشوق سے کہتا ہے کہ دیکھو تم کہتے ہو معشوق کا کام عریاں ہونے کا نہیں ہے۔ دیکھو بنات النعش دن کو کیسی چھپی ہوئی تھیں آخر شب کو بے پردہ ہوئیں۔ پھر اگر رات بے پردہ ہونے کا محل نہیں تو وہ بے پردہ کیوں ہو گئیں۔

۴- روزنِ دیوارِ زنداں ..... بے نور۔ حالی۔ یعقوب کی آنکھوں کو روزنِ دیوارِ زنداں قرار دیا ہے۔ کس واسطے کہ روزنِ زنداں ہر وقت یوسف پر کُھلا رہتا تھا۔ اسی طرح یعقوب کی آنکھیں شب و روز یوسف کی طرف نگراں رہتی تھیں (نگراں) ایک طرف روزنِ دیوار زنداں ہونے سے مراد آنکھوں کا بے نور ہونا ہے۔ اور دوسری طرف یہ ظاہر کرنا ہے۔ کہ اگرچہ ظاہرا طور پر یعقوب نے یوسف کی خبر نہ لی لیکن درحقیقت ان کی آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو کر

ہر وقت حضرت یوسف کو دیکھتی تھیں۔ روزن اور نابینا آنکھوں کی مشابہت خوب ہے۔ جب آنکھوں کا نور زائل ہو جاتا ہے تو وہ سفید ہو جاتی ہیں۔ اور روزن کے ساتھ مشابہت تامہ رکھتی ہیں۔ روزن کبھی بند نہیں ہوتا۔ نابینا آنکھیں بھی اسی طرح کھلی رہتی ہیں۔ روزن سے اندھیرے میں روشنی آتی ہے اس لیے یعقوب کی آنکھوں کے روزن بننے سے یہ بھی مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ کہ یوسف زنداں کی تاریکی میں نہ گھبرائے۔ یہ شعر غالب کے بہترین اشعار میں سے ہے اور کمال جذبِ عشق کو ظاہر کرتا ہے۔

۵۔ ماہ کنعاں... حضرت یوسف، وہ کنعان میں رہتے تھے۔ زلیخا زنانِ مصر آواز سے کستی تھیں۔ کہ تم ایک غلام پر عاشق ہو گئی ہو۔ تم نے اس میں کیا خوبی اور رعنائی دیکھی ہے۔ آخر کار زلیخا نے تنگ آکر بہت سی عورتوں کو جمع کیا۔ انکے ایک ہاتھ میں چھری اور دوسرے میں ترنج دے دیئے اور کہا کہ جب یوسف تمہارے سامنے آئے۔ تو ترنج کو کاٹنا۔ جب سب اس طلوب سے بیٹھ گئیں۔ تو یوسف کو بلایا۔ تمام عورتوں نے حسب الحکم ترنج کاٹے لیکن وہ یوسف کے نظارہ میں اس قدر محو ہو گئیں تھیں۔ کہ بجائے ترنج کے اپنے ہاتھ کاٹ لئے عورتوں کی یہ بیخودی دیکھ کر زلیخا بہت خوش ہوئی۔ اس واقعہ کو پیش نظر رکھ کر غالب کہتے ہیں۔ دنیا کا قاعدہ ہے۔ عاشق اپنے رقیبوں سے جلتے ہیں لیکن زلیخا میں یہ بات نہیں وہ اپنے رقیبوں سے عام عادت کے خلاف خوش ہے۔ کہ وہ بھی اس کی طرح یوسف پر عاشق ہو گئیں۔ درحقیقت زلیخا کی خوشی کا سبب یہ تھا۔ کہ اب یہ عورتیں مجھے یوسف پر عاشق ہونے کا طعنہ نہیں دیں گی۔

۶۔ جوئے خوں... اشک خونین مغروراں.... روشن ہجر کی اندھیری رات ہے اور میں تابِ ہجر سے بے چین ہو کر اشکِ خونی بہا رہا ہوں اے میرے

ہمدرد ان تم مجھے رونے سے نہ روکو۔ میری آنکھوں سے جو ٹے خون بہنے دو۔
آج شامِ فراق ہے میں جس قدر بھی روؤں کم ہے ہجر کی تاریک شب میں جو میری آنکھوں سے اشکِ خونیں مسلسل بہیں گے۔ ان کو دو روشن شمعیں خیال کروں گا چونکہ اندھیرے میں روشنی باعثِ تسکین ہے۔ اس لئے اشکِ خونیں سے میرے دل کا بوجھ ہلکا ہوگا۔ اور اس کے ساتھ ہی ان کی روشنی سے میرا غمکدہ روشن ہوگا۔ بے مثال شعر کہا ہے۔

۷۔ عقیدہ یہ ہے۔ کہ جنت میں حوریں بطور کنیزوں کے ملیں گی۔ کہتے ہیں پہلی تو یہ پریزاد ہم پر خوب ظلم و ستم کرتے ہیں۔ اگر قدرتِ حق نے ان لوگوں کو جنت کی حوریں بنا دیا۔ تو مزہ آجائے گا۔ ہم ان کے ظلم و ستم کے گن گن کر ان سے بدلے لیں گے۔ کیونکہ حوریں بننے کے بعد یہ پریزاد ہمارے کسی ایک حکم سے بھی سرتابی نہیں کر سکیں گے۔

۸۔ مرزا کا یہ شعر بیت الغزل اور نشتر کہلاتا ہے شعر کا مفہوم یہ کہتا ہے کہ جس کے ساتھ تو ہمخواب ہوا اور جوشِ اختلاط میں جس کے شانوں پر تیری عنبریں زلفیں پریشان ہوئیں۔ اس کے دماغ کے کیا کہنے ہیں۔ نیند اس کی قابلِ رشک ہے۔ راتیں اس خوش قسمت شخص کی صحیح معنوں میں راتیں کہلانے کی مستحق ہیں۔ اور جس کو یہ لطف حاصل نہیں نہ اس کا دماغ ہے نہ نیند ہے نہ راتیں ہیں بلکہ وہ ہمہ تن رنج و تعب ہے۔

۹۔ دبستان . . . مدرسہ، مکتب، استاد کی غیر حاضری میں طلباء سبق یاد نہیں کیا کرتے لیکن جب استاد کو آتا دیکھتے ہیں۔ یا اس کی آواز سن پاتے ہیں تو وہ بہت زیادہ جوش و خروش سے اپنا سبق دہرانے لگتے ہیں پھر چمن میں جانا تھا کہ ایک مکتب کا سماں پیدا ہو گیا۔ بلبلیں میرے نالوں کو

شینے بھی اپنے اپنے نغمے نہایت جوش وخروش سے دہرانے لگیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بلبل دلکش آواز سُنکر نغمہ سنجی شروع کر دیتی ہے۔ آسی نے بلبل کی غزلخوانی کے مختلف وجوہ بیان کئے ہیں مثلاً (۱) ہم جنس کے ملنے کی خوشی (۲) مجھ کو دیوانہ سمجھ کر جوشِ مسرت کو وہ نہیں روک سکتی (۳) میں ایسا فصیح بیان ہوں ۔۔ کہ میری غزلیں سنکر وہ نغمہ سنجی شروع کر دیتی ہیں۔ ان معنوں پر سب متفق ہیں۔

۱۔ مژگاں ہو گئیں ۔۔۔۔ آنکھوں کا اتنا بند ہونا کہ پلکیں تقریباً آپس میں مل جائیں۔ یہ حالت دو موقعوں پر ہوتی ہے۔ بعض اوقات جوشِ مسرت سے آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ اور محض اتنی کھلی رہتی ہیں۔ کہ ان میں سے تھوڑا تھوڑا نظر آتا ہے۔ کبھی کسی چیز کو غور سے دیکھنے یا تغافل آمیز اور شرمیلی نگاہیں ڈالنے سے بھی یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ یارب وہ نگاہیں جو میری بد قسمتی سے مژگاں بن گئی ہیں۔ وہ میرے دل کے پار کیوں ہوئی جاتی ہیں دل کے پار تو اُس وقت ہو سکتی تھیں۔ جب وہ مژگاں نہ بنتیں یا وہ تلوار یا تیر ہوتیں۔ یہ میری کوتاہ قسمتی ہے۔ کہ باوجود کوتاہ ہونے کے میرے دل کے پار ہوئی جاتی ہیں۔

حالی: نگاہوں کے مژگاں ہونے سے یہ مراد ہے کہ شرم کے سبب سے اوپر نہیں اُٹھتیں بلکہ پلکوں کی طرح ہر وقت نیچے کو جھکی رہتی ہیں۔ (بیخود سعید۔ حسرت)

طباطبائی: نگاہوں کے مژگاں ہونے کو نگاہوں کو تاہ ہونا قرار دیتے ہیں اور اس کا کوئی سبب نہیں لکھتے۔

آسی لکھتے ہیں کہ میری کوتاہیِ قسمت (بد قسمتی) نے تلوار جیسی نگاہوں کو

میری جانب سے اتنا کوتاہ کیا کہ مژگاں بنا دیا۔ اس لیئے ہر وقت ایک کھٹک سی میرے دل میں رہتی ہے۔ مگر اب میں خیال کرتا ہوں کہ وہ دل کے پار ہوئی جاتی ہیں۔ اور میں مرا جاتا ہوں۔ آخر اس کا کیا سبب ہے۔ کہ وہ اس قدر چھوٹی ہیں۔ اور پھر بھی تیر کا کام دے رہی ہیں۔

۱۱۔ میں نے اپنی آہوں کو جس قدر زیادہ روکا۔ اتنی ہی وہ میرے سینے میں بار بار ابھریں۔ گویا میری آہیں بھی بخیہ چاک گریبان ہو گئیں۔ قاعدہ ہے کہ بخیہ کرتے ہوئے تاگہ بار بار ابھرتا ہے۔ اور پھر نیچے دباؤ میں آجاتا ہے۔ بخیہ اور چاک گریبان کی رعایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے آہ کے بار بار ابھرنے اور بار بار ضبط کرنے کو بخیہ کے تاگے سے تشبیہہ دی ہے نیز سینے اور بخیے میں ضلع بھی لطف سے خالی نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنی آہوں کو ضبط کیا۔ گویا چاک گریبان کو بخیہ کر لیا۔ لیکن پھر بھی بخیہ کے تاگے کی طرح بار بار ابھرتی رہیں۔ طبا طبائی اس شعر کو بے معنی لکھتے ہیں

۱۲۔ حالی۔ یعنی اب نئی دعا تو کوئی ذہن میں باقی نہیں رہی اور وہی مستعمل دعائیں جو دربان کو دے چکا ہوں۔ دوست کے حق میں صرف کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس شعر میں جو اصل خوبی اور لطافت ہے۔ وہ یہ ہے کہ گالیوں کے جواب میں دعائیں دینے کو ایک ایسی معمولی اور ضروری بات ہونا ظاہر کرتا ہے کہ گویا اس کو ہر شخص ضروری جانتا ہے۔ اس واسطے وہ سب سے حیران ہو کر پوچھتا ہے۔ کہ بتاؤ ان کی گالیوں کا کیا کیا جواب دوں گا۔ جب کہ دعائیں سب نبڑ چکیں۔

۱۳۔ شراب جانفزا ہے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے۔ کہ جس شخص کے ہاتھ میں جام شراب آجاتا ہے۔ اس کے ہاتھ کی تمام لکیریں گویا رگ جان بن جاتی ہیں یعنی

شراب بغیر پینے کے رگ و پے میں قوت پیدا کر دیتی ہے۔

سعید نے اس موقع پر غالب کے ایک خط میں سے یہ اقتباس پیش کیا ہے۔ سردی کی شکایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں "آگ میں گرمی سہی لیکن وہ آتش سیال کہاں کہ جب دو جرعے پیئے فوراً رگ و پے میں دوڑ گئی۔ دل توانا ہو گیا دماغ روشن ہو گیا۔ نفس ناطقہ کو تواجد بہم پہنچا۔"

طبا طبائی لکھتے ہیں۔ گویا کا لفظ اکثر اشعار میں بھرتی کا ہو کر آتا ہے۔ لیکن اس شعر میں ایسا نہیں۔ اگر یہاں یہ لفظ نکال ڈالا جائے تو مبالغہ حد امکان سے تجاوز کر جائے۔

۱۴۔ موحد ... توحید کے قائل۔ کیش ... مذہب، حالی۔ تمام ملتوں اور مذہبوں کو منجملہ دیگر رسوم کے قرار دیتا ہے جن کا ترک کرنا اور مٹانا موحد کا اصل مذہب ہے۔ اور کہتا ہے۔ کہ یہی ملتیں جب مٹ جاتی ہیں تو اجزائے ایمان بن جاتی ہیں لا بخود۔ سیند یا حسرت۔ جب ترکِ رسوم مذہب قرار پایا۔ تو ضمنی ملتیں مٹتی جاتی ہیں۔ وہ گویا اجزائے ایمان بنتی جاتی ہیں۔

۱۵۔ جب انسان رنج کا خوگر اور عادی ہو جاتا ہے۔ تو رنج کا احساس جاتا رہتا ہے چنانچہ مجھ پر اتنی زیادہ مشکلیں اور مصیبتیں آئیں جن کی کوئی حد نہیں لیکن اس نظریہ کے مطابق کہ "رنج سے خوگر ہو کر رنج نہیں معلوم ہوتا" وہ خود بخود آسان ہوتی چلی گئیں یعنی میں نے خوگرِ آلام ہونے کی وجہ سے انکو ہنسی خوشی روزانہ کی ایک معمولی بات کی طرح برداشت کر لیا۔

۱۶۔ بہت خوب شعر ہے کہتے ہیں۔ کہ اگر غالب اسی طرح روتا رہا تو تم دیکھنا کہ اس کے رونے کی وجہ سے یہ بستیاں چند دن میں ویران ہو جائیں گی گویا غالب کا لگاتار رونا بہت تباہ کن ثابت ہوگا۔ اس لئے اس کو رونے سے روکنے کی

کوئی تدبیر کرنی چاہیئے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ سننے والوں سے اس کے نالے سُنے نہ جائیں گے۔ اور وہ اپنے مکان چھوڑ کر کسی اور دیار میں جا رہیں گے۔ تیسرا مفہوم یہ ہے۔ کہ غالبؔ کا سیلابِ اشک مکانوں کو ڈھا کر بستیوں کو ویران کر دے گا۔

۱۰۲

دیوانگی سے دوش پہ زنار بھی نہیں	۱	یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں
دل کو نیاز حسرتِ دیدار کر چکے	۲	دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں
ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے	۳	دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں
بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں	۴	طاقت بقدرِ لذتِ آزار بھی نہیں
شوریدگی کے ہاتھ سے ہے سر وبالِ دوش	۵	صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں
گنجائشِ عداوتِ اغیار اک طرف	۶	یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں
ڈر نالہائے زار سے میرے خدا کو مان	۷	آخر نوائے مرغِ گرفتار بھی نہیں
دل میں ہے یار کے صفِ مژگاں سے رو کشی	۸	حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں
اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا	۹	لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

۱۰ دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا۔

دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

۱۔ عاشق کا مذہب صنم پرستی ہے۔ اور صنم پرستوں کی نشانی یہ ہے کہ وہ زنار پہنا کرتے ہیں۔ کہتا ہے۔ دیوانگی کی وجہ سے ہمارے دوش پر زنار بھی نہیں۔ گویا جوشِ دیوانگی میں ہم نے اپنا گریبان بری طرح پھاڑا ہے کہ ایک تار بھی جسم پر باقی نہیں رہا۔ کہ وہی زنار کا کام دیتا ہے۔ یاد رہے زنار کا نہ ہونا مذہب صنم پرستی کے خلاف ہے۔

۲- جب ہم نے اپنے دل کو حسرتِ دیدار کی نذر کر دیا۔ یعنی تمنائے دید میں مٹا دیا تو ہم کو احساس ہُوا کہ ہم میں تو طاقتِ دیدار بھی نہ تھی۔ بیچارے دل کو خاک میں ملایا (سعید)

بیخود۔ غور کرنے سے ثابت ہُوا کہ دل کے مٹ جانے نے طاقتِ دیدار کو بھی مٹا دیا۔ اب اگر وہ جلوہ دکھائے تو دیدار کی طاقت نہیں (طباطبائی آسی)

۳- حالی۔ ایک فیکٹ (واقعہ) کے بیان میں ایسے متناسب محاورات کا دستیاب ہو جانا عجیب اتفاق ہے اس مضمون کو حقیقت کی طرف لے جاؤ اور چاہو مزاح پر محمول کرو۔ دونوں صورتوں میں مطلب یہ ہے کہ اگر تیرا ملنا آسان نہ ہوتا یعنی دشوار ہوتا تو کچھ دقت نہ تھی۔ اس لئے کہ ہم مایوس ہو کر بیٹھے رہتے۔ اور شوق و آرزو کی خلش سے چھوٹ جاتے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ وہ جس طرح آسان نہیں اسی طرح دشوار بھی نہیں ہے اور اس لئے شوق و آرزو کی خلش سے کسی طرح نجات نہیں ہوتی (سعید، بیخود)

حسرت (۱) تحصیل دشوار آسان نہیں ہوتی۔ مگر ممکن ہوتی ہے۔ اور تحصیل محال سرے سے ممکن ہی نہیں ہوتی۔ شاعر کہتا ہے کہ ملنا تیرا آسان نہ ہو۔ یعنی دشوار ہو۔ تاہم سہل ہے۔ مگر مشکل تو یہ ہے کہ دشوار بھی نہیں محال ہے جس میں میرا کسی طرح قابو نہیں محض مجبور ہوں (۲) تیرا ملنا اگر سب کے لئے مشکل ہو۔ تو مجھ کو بھی صبر آ جائے۔ مشکل یہ ہے کہ اغیار کے لئے آسان ہے۔ میرے ہی لئے دشوار ہے (آسی، حسرت، طباطبائی کی پہلی شرح سے متفق ہیں۔

۴- عمر بغیر عشق کے کٹ نہیں سکتی۔ اور عشق میں آزار و تکلیفیں ضرور

پہنچتی ہیں۔ مگر ہم میں اتنی طاقت نہیں کہ ذرا سا آزار برداشت کر سکیں بڑی مشکل آ پڑی ہے۔ کیسے بنے گی۔

۵۔ شوریدگی ۔۔۔ جنوں۔ وبال ۔۔۔ مصیبت۔ دوش ۔۔۔ کندھا۔ عاشق محبت میں دیوانہ ہو گیا۔ صحرا میں مارا مارا پھرتا ہے۔ شدتِ جنون نے اس کی ایسی حالت بنا دی ہے۔ کہ سر بھی کندھوں پر وبال معلوم ہوتا ہے اس بوجھ سے پریشان ہو کر کہتا ہے۔ کہ اے خدا میں کیا کروں صحرا میں کوئی دیوار بھی تو نہیں ہے۔ کہ میں اس سے اپنا سر پھوڑ ڈالوں۔ اور یہ بارِ دوش سے نجات پاؤں۔ غالب۔ ؎

کہاں تک روؤں اس کے خیمے کے پیچھے قیامت ہے
مری قسمت میں یا رب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

۶۔ ضعف سے دل بالکل کمزور ہو گیا ہے۔ اور وہ کسی قسم کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں۔ ہوسِ یار میں تو کوئی بوجھ نہیں ہوتا لیکن ہمارا ضعفِ دل ایسا ہے۔ کہ ہوسِ یار کا بھی متحمل نہیں ہو سکتا۔ جب حالت ایسی نازک ہے تو گنجائشِ عداوتِ اغیار کیسے ہو سکتی ہے۔ حسنِ خیال یہ ہے کہ آرزوئے یار ہمیشہ خوش آیند ہوتی ہے۔ لیکن یہاں وہ بھی ناگوار ہے پھر عداوتِ اغیار کا کیا ذکر وہ تو سراسر بوجھ ہے۔ (طباطبائی۔ سعید)

آسی۔ مطلب یہ ہے۔ کہ اب دل سے آرزوئے وصالِ یار برداشت نہیں ہو سکتی۔ اور وہ اتنی زیادہ ہے کہ میرے دل میں سما نہیں سکتی۔ یا یوں کہیئے۔ کہ اب ہم نازک ہیں۔

بیخود۔ عشق و ہوس کا زمانہ گذر جانے کے بعد یہاں تک رہے بھی دل لگاؤ باقی نہیں رہا

۷۔ میرے نالہائے زار سے ڈر۔ خدا کا خوف کر۔ میرے نالے مرغِ گرفتار

کے نالوں کی طرح بے اثر نہیں ہیں۔ اُن کا اثر ہوگا اور ضرور ہوگا۔

۸۔ سرکشی...... مقابلہ۔ اگرچہ ضعف و نقاہت نے میرا ایسا حال بنایا ہے کہ مجھ میں کانٹے کی کھٹک برداشت کرنے کی بھی طاقت نہیں رہی۔ لیکن پھر بھی میرے دل میں یہ بات سمائی ہے کہ میں مژگانِ یار کی فوج کا مقابلہ کروں۔

۹۔ اے خدا ان کی سادگی پہ کون نہ مرجائے کہ وہ لڑتے ہیں۔ مگر ان کے ہاتھ میں تلوار بھی نہیں۔

بیخود۔ طباطبائی۔ لڑنے سے اختلاط میں ہاتھ پائی کرنا مراد ہے۔
آسی۔ گویا یہ سادگی بجائے تلوار کے ہے۔

۱۰۔ ہم نے اسدؔ کو خلوت اور جلوت دونوں حالتوں میں دیکھا ہے۔ آپ کہتے ہیں۔ کہ وہ دیوانہ نہیں ہے۔ معاف کیجئے۔ اگر وہ دیوانہ نہیں ہے۔ تو ہشیار بھی نہیں ہے۔

۱۰۳

۱ نہیں ہے زخم کوئی بخیے کے درخور مرے تن میں ہوا ہے تارِ اشکِ یاس رشتہ چشمِ سوزن میں
۲ ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا خانہ ویرانی کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں
۳ ودیعت خانۂ بیدادِ کاوش ہائے مژگاں ہوں نگینِ نامِ شاہد ہے مرا ہر قطرہ خوں تن میں
۴ بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی شبِ مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں
۵ نکوہش مانعِ بے ربطیِ شورِ جنوں آئی ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں
۶ ہوئے اس مہر وش کے جلوۂ تمثال کے آگے پر افشاں جوہر آئینے میں مثلِ ذرہ روزن میں
۷ نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں پر صحبت مخالف ہے جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں
۸ ہزاروں دل دیے جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو سیہ ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خوں تن میں
۹ اسدؔ زندانیِ تاثیرِ الفت ہائے خوباں ہوں خمِ دستِ نوازش ہو گیا ہے طوق گردن میں

۱۔ درخور ۔۔۔ قابل۔ چشم سوزن ۔۔۔ سوئی کا ناکہ۔ رشتہ ۔۔۔ تاگہ ۔۔۔ رشتہ سوزن کو تار اشک باس کہا ہے۔ میرے جسم پر کوئی زخم ایسا نہیں جو ٹانکے لگائے سینے کے قابل ہو۔ اس لئے تاگہ چشم سوزن میں مایوسی کی وجہ سے تار اشک بن گیا ہے گویا سوئی اس ناامیدی کے سبب سے روتی ہے۔ اور اس غم میں چشم سوزن سے آنسوؤں کا تار جاری ہے۔

۲۔ کف سیلاب۔ سیلاب کے جھاگ۔ پنبہ ۔۔۔ روئی۔ میں اشکوں کا سیلاب اس لئے لایا تھا۔ کہ میرا گھر تباہ و برباد ہو جائے۔ اور پھر میں در و دیوار کے روزنوں میں سے اپنی خانہ ویرانی کا تماشا دیکھوں لیکن افسوس کہ یہ ذوق تماشا پورا نہ ہو سکا۔ اور خانہ ویرانی ہی ذوق تماشا کو مانع آئی۔ کیونکہ سیلاب کے جھاگوں نے در و دیوار کے روزنوں کو روئی کے پنبہ کی طرح بند کر دیا اگر روزن میں پنبہ رکھ دیا جائے۔ تو سوراخ بند ہو جاتا ہے۔ اور جھانکا نہیں جا سکتا۔ یہ پنبہ اسی سیلاب اشک کا کف ہے جس سے گھر ویران ہوا ہے۔

۳۔ ودیعت خانہ ۔۔۔ امانت خانہ۔ شاہد ۔۔۔ معشوق میرے جسم کا ہر ایک قطرۂ خون ایک نگینہ ہے جس پر مژگان یار نے نہایت بیدردی سے اپنا نام (معشوق کا نام) کھودا ہے۔ اس لئے میں ان نگینوں (یعنی مژگان یار کی کاوش کے ظلم) کا امانت خانہ بن گیا ہوں۔ قاعدہ ہے کہ امانت پر مہر لگا دی جاتی ہے اسی طرح میرے خون کے ہر قطرہ پر کاوش مژگان کے ظلم و ستم کی مہریں لگی ہوئی ہیں۔ غالب ؂

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب ۔۔۔ خون جگر امانت مژگان یار تھا

۴۔ شبستان ۔۔۔ خوابگاہ۔ میرے سیاہ خانہ کی تاریکی کا حال کوئی بیان نہیں کر سکتا۔ وہاں تاریکی کا یہ عالم ہے کہ اگر اس کی دیواروں کے روزن میں پنبہ رکھ

زین تو یہ معلوم ہو کہ چاندنی رات ہے ۔جہاں تاریکی زیادہ ہوتی ہے وہاں ہر سفید چیز چمکتی ہے چنانچہ روزن میں روئی رکھنے سے بجائے تاریکی بڑھنے کے اتنی روشنی ہو جاتی ہے ۔ کہ شب ماہ معلوم ہوتی ہے ۔ غالب سے

کیا کہوں تاریکئ زندانِ غم اندھیر ہے پنبہ نور صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

۵۔ نکوہش .... ملامت ۔احباب نے میرے جوشِ جنوں اور بے ربطگی کو دیکھ کر مجھے ملامت کی ۔اور وہ میرے پاگل پن پر ہنسے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ۔ کہ میں خندہ احباب سے بچنے کے لئے جیب و دامن کو چاک کرنے سے باز رہا ۔گویا خندۂ احباب میرے چاک گریبان کا بخیہ بن گیا ۔

طباطبائی لکھتے ہیں کہ خندہ سے خندۂ دنداں نما مقصود ہے ۔ تاکہ اسے بخیہ سے مناسبت ہو جائے ۔

۶۔ مہر وش .... خورشید جمال ۔جلوہ تمثال .. عکس رخ پر افشاں .... اڑنے کے لئے پر پھڑپھڑانا ۔یہاں مراد اڑنا جس طرح روزن پر آفتاب کی روشنی پڑنے سے ذرات پرافشاں اور متحرک ہو جاتے ہیں ۔اسی طرح اس مہروش کے عکس رخ کے سامنے آئینے کے جوہر اڑنے لگتے ہیں ۔گویا اس کے عکس رخ کے سامنے آئینہ ماند پڑ جاتا ہے ۔

۷۔ گلخن .... بھاڑ ۔خس .... گھاس پھوس وغیرہ ۔یہ تو میں جانتا نہیں کہ میں اچھا ہوں یا برا ہوں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ میری صحبت مخالف ہے یعنی اگر میں گل ہوں ۔تو میری صحبت گلخن سے ہے ۔اور اگر میں خس ہوں ۔تو میری صحبت گلشن سے ہے ظاہر ہے کہ گل کی صحبت گلشن سے اور خس کی صحبت گلخن سے مناسب ہے ۔ورنہ گل اگر گلخن میں ہے تو بیکار ہے اور اگر خس گلشن میں ہے تو بار ہے مطلب ہے کہ صحیح صحبت ہر شخص اور چیز کے جوہروں کو چمکاتی ہے اور اسی سے شاعر

محروم ہے۔

۸۔ جوشِ جنوں... عشق سے میرا ہر قطرہ خون سیاہ ہو کر سویدا بن گیا ہے خیال سویدا دل میں ہوتا ہے۔ گویا جنون کے فیض سے ہم کو ہزاروں دل مل گئے۔ مطلب یہ نکلا۔ کہ فیضِ عشق سے ہزاروں دل مل گئے پہلے ایک دل کو معشوق کی یاد تڑپاتی تھی۔ اب ہزاروں دل اس کی یاد میں تڑپا کریں۔

۹۔ زندانی... قیدی۔ اسد میں حسینوں کی تاثیر محبت کا قیدی ہوں۔ انہوں نے جو کمال مہربانی سے میرے گلے میں بانہیں ڈالی ہیں وہ میری گردن کے لئے طوق بن گئی ہیں۔ گویا میں اسیر محبت ہو گیا ہوں۔

۱۰۴

۱ مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں | سوائے خونِ جگر، سو جگر میں خاک نہیں
۲ مگر غبار ہوئے پر ہوا اڑا لے جائے | وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں
۳ یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے | کہ غیر جلوۂ گل رہگذر میں خاک نہیں
۴ بھلا اسے نہ سہی کچھ مجھی کو رحم آتا | اثر مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں
۵ خیالِ جلوۂ گل سے خراب ہیں میکش | شرابخانے کے دیوار و در میں خاک نہیں
۶ ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ | سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

۷ ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ
کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں

۱۔ خاک نہیں... ہیچ ہیں، کچھ نہیں۔ دنیا کے تمام لطف اور لذتیں میری نظروں میں ہیچ ہیں۔ ہاں خونِ جگر پینے میں مجھے مزہ آیا کرتا تھا تو اب جگر میں بھی کچھ باقی نہیں رہا۔ گویا اس لطف سے بھی محروم ہو گیا۔

۲۔ مگر... شاید۔ میرے بال و پر میں اتنی طاقت نہیں کہ میں اڑ کر دہاں

تک جاؤں۔ شاید یہ ہوسکتا ہے۔ کہ میں فنا ہو کر خاک ہو جاؤں اور ہوا میرا غبار وہاں تک لے جائے۔ غبار و خاک کا تناسب پر لطف ہے وہاں سے مراد کوچۂ یار یا چمن ہو سکتا ہے۔

۳۔ بہشت شمائل۔۔۔ بہشت خصلت یا فردوس منظر۔ مراد معشوق کہتے ہیں۔ آج کس بہشت خصلت معشوق کی آمد آمد ہے۔ کہ راستے پھولوں سے پٹے پڑے ہیں۔ اور خاک کہیں نام کو نہیں۔ گویا معشوق کی آمد آمد سے عالم خاک عالم فردوس بن گیا ہے۔

۴۔ نفس۔۔۔ آہ و نالہ۔ اگر اسے میرے حال زار پر رحم نہ آیا تھا تو خود مجھی کو اپنی حالت پر رحم آنا چاہیئے تھا یعنی اپنے اوپر رحم کر کے میں نالہ کشی سے باز آجاتا بس معلوم ہو گیا۔ کہ میری آہ میں خاک اثر نہیں۔

طباطبائی لکھتے ہیں کہ نفس کو بے اثر کہہ کر پھر کہنا کہ اثر نہیں باعتبار معنی اس کی تاویل مشکل ہے لیکن محاورہ میں ٹھیک ہے۔

۵۔ شراب خانے کے دیوار و در میں تو کچھ باقی نہیں۔ اب اس سے مے خوار کیا مست ہوں گے۔ وہ تو جلوۂ گل (فصل بہار) کے خیال میں مست ہیں (سعید م)

طباطبائی۔ نشے کی کرامات سے آنکھوں میں سرسوں پھولی ہے ورنہ شراب خانے میں کیا ہے بیخود۔ طباطبائی کا مفہوم لکھ کر یہ مطلب نکالتے ہیں۔ کہ زندگی کو پر لطف بنانے والی شے محبت الٰہی ہے۔ ورنہ اس ناپائدار دنیا میں کیا رکھا ہے آسی نے بھی مندرجہ معنی لکھے ہیں تیسرا مفہوم یہ لکھتے ہیں۔ فصل بہار آ رہی ہے اور یہ خیال کہ اس موسم میں بغیر شراب کے کیونکر گذارہ ہوگا۔ ان کو خراب کئے ہوئے ہے اور حال یہ ہے۔ کہ مے خانہ میں کچھ بھی باقی نہیں۔ وہ بالکل تباہ ہو چکا ہے۔

۶۔ غارت گری۔۔۔ لوٹ مار۔ حسرت تعمیر۔۔۔ مکان بنانے کی آرزو۔ میں

عشق کی غارت گری اور لوٹ مار سے بہت ہی شرمندہ ہوں۔ اس نے مجھ کو ایسا برباد کیا۔ کہ میرے پاس کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ اگر ہے تو حسرت تعمیر ہے عشق اسے کیا لوٹے گا۔ گویا میں شرمندہ اس لیئے ہوں کہ عشق سے لٹوانے کے لئے میرے پاس خاک بھی نہیں۔

سعید لکھتے ہیں۔ کہ میرزا پچاس برس دہلی میں رہے لیکن ہمیشہ کرائے کے مکان میں، اپنا مکان بنانے کی حسرت دل ہی میں رہی۔ اس شعر میں اسی کا اظہار کیا ہے۔

۷۔ لوگ ہمارے اشعار کو تفریح طبع اور دل لگی کا سامان سمجھتے ہیں اس بات سے ظاہر ہے۔ کہ ہمارے شعر کہنے اور اظہار ہنر کرنے سے کچھ فائدہ نہیں کیونکہ نہ تو لوگ ہمارے فن کی قدر کرتے ہیں۔ اور نہ ہمارے اشعار کو سمجھتے ہیں بجُز دہم صرف دل بہلانے کی غرض سے شعر کہا کرتے ہیں ہم کو معلوم ہو گیا ہے۔ کہ اظہار کمال میں خاک بھی فائدہ نہیں بمطلب یہ ہے کہ اب نہ لوگ خوش گوئی کی قدر کرتے ہیں اور نہ شعر کی خوبی سمجھتے ہیں۔

۱۰۵

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں	۱	روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں
دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں	۲	بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں
جب وہ جمال دلفروز صورت مہر نیم روز	۳	آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں
دشنۂ غمزہ جاں ستاں ناوک ناز بے پناہ	۴	تیرا ہی عکس رخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں
قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں	۵	موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں
حسن اور اس پہ حسن ظن رہ گئی بوالہوس کی شرم	۶	اپنے پہ اعتماد ہے غیر کو آزمائے کیوں
واں وہ غرور عز و ناز یاں یہ حجاب پاس وضع	۷	راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بیوفا سہی ۸ جسکو ہو دین و دل عزیز اسکی گلی میں جائے کیوں

۹ غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا، کیجئے ہائے ہائے کیوں

۱۔ سنگ وخشت ... اینٹ پتھر۔ معلوم ہوتا ہے معشوق عاشق کو رونے سے روکتا ہے۔ اور عاشق کو ضبطِ گریہ کا یارا نہیں۔ وہ مظلومانہ انداز سے کہتا ہے کہ ہمارا دل ہے اینٹ پتھر تو نہیں ہے کہ تم ستائے جاؤ ہم برداشت کئے جائیں۔ اب ہمارے دل سے صبر نہیں ہوتا۔ ہاں ہاں ہم ہزار بار روئیں گے کوئی ہمیں کیوں ستائے۔ کوئی کا لفظ قابلِ تعریف ہے اس طرح عام طور پر خفگی کے موقعہ پر بولتے ہیں۔

۲۔ دیر ... بت خانہ۔ حرم ... خانہ کعبہ۔ اس شعر کو تعریف سے مستغنی خیال کیا جاتا ہے کہتے ہیں۔ ہم سرِ راہ بیٹھے ہیں۔ اور راستہ کسی کی ملکیت نہیں ہر شخص اس کو استعمال کرنے کا حق رکھتا ہے۔ یہ بت خانہ یا کعبہ نہیں۔ کہ کوئی ہمیں وہاں سے نکال دے۔ نہ یہ کسی کی دہلیز یا دروازہ ہے کہ ہم کو یہاں سے اٹھا دیا جائے پھر رقیب ہم کو یہاں سے اٹھ جانے کیلئے کیوں مجبور کرتا ہے

۳۔ جمالِ دلفروز ... دل کو روشن کرنے والا۔ مہر نیم روز ... دوپہر کو جبکہ سورج پوری طرح چمکتا ہے۔ اور کوئی اس کی طرف دیکھ نہیں سکتا۔ نظارہ سوز ... نظروں کو جلا دینے والا۔ وہ حسن جس کا نظارہ نہ ہو سکے۔ جب وہ جمالِ دلفروز دوپہر کے سورج کی طرح نظارہ سوز ہے۔ یعنی کوئی اس کو دیکھ نہیں سکتا تو پھر وہ اپنا چہرہ پردے میں کیوں چھپاتا ہے۔ اس کو چاہئے کہ وہ بے نقاب رہے (آسی۔ سعید)

دوسرا مفہوم یہ ہے۔ کہ وہ پردے میں چھپا ہوا نہیں۔ بلکہ آشکارا ہے۔ مگر

باوجود آشکار ہونے کے مہر نیمروز کی طرح کوئی اس کو دیکھ نہیں سکتا۔ کیونکہ کثرت نور سے نگاہیں اس کو دیکھنے سے قاصر ہیں۔ (طبا طبائی۔ بیخود)

۴۔ دشنہ ... خنجر غمزہ ... ناز و ادا۔ جانستان۔ جان لیوا، مہلک۔ ناوک ... تیر۔ تیرے ناز کے خنجر جان لینے والے ہیں اور تیری اداؤں کے تیر بے پناہ ہیں کسی کو ان سے امان نہیں مل سکتی۔ جب تیرے ناز و ادا کی جانستانی اور عکس رُخ تیرے سامنے پڑے گا تو اسکو بھی گزند پہنچیگا (سعید۔ آسی)

طبا طبائی: سبب یہ ہے کہ تیرے سامنے بھی کسی کا آنا اچھا نہیں۔ کوئی غیر آیا تو مارا پڑا۔ خود عکس تیرا اگر آئینہ میں بھی دشنہ و ناوک لیے ہوئے تیرے سامنے آیا۔ تیرا کیا حال ہوگا، (بیخود)

۵۔ حیات و غم کا مقابلہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ کہ قید حیات اور بند غم دونوں ایک ہیں۔ ان میں کسی قسم کا فرق نہیں جو آدمی زندگی کی قید میں رہتا ہے وہ بھی ہمیشہ مصائب و آلام میں مبتلا رہتا ہے۔ اور جو شخص مصیبتوں میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ وہ بھی رنج و غم میں پھنسا رہتا ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب تک انسان زندہ ہے۔ اس کو غم سے نجات نہیں مل سکتی۔ ہاں جب موت آجائیگی۔ تو غم بھی نہ رہے گا۔ مومن خاں اس مفہوم کو اس طرح ادا کرتے ہیں ؎

چھوٹ کر کہاں اسیر محبت کی زندگی　　ناصح یہ بند غم نہیں قید حیات ہے

۶۔ غالب اس شعر کی شرح ایک خط میں لکھتے ہیں "حسن عارض اور حسن ظن دو صفتیں محبوب میں جمع ہیں۔ یعنی صورت اچھی ہے۔ اور گمان اس کا صحیح ہے کبھی خطا نہیں کرتا۔ اور یہ گمان اس کو اپنی نسبت ہے کہ میرا مارا کبھی بچتا نہیں اور میرا تیر غمزہ خطا نہیں کرتا۔ پس جب اس کو ایسا بھروسہ ہے۔ تو رقیب کا امتحان کیوں کرے اس حسن ظن نے رقیب کی شرم رکھ لی۔ یہ رقیب

عاشق صادق نہ تھا۔ اگر پائے امتحان درمیان آتا۔ تو حقیقت کھل جاتی۔

۷۔ اس شعر میں لف و نشر مرتب ہے۔ کہتے ہیں۔ محبوب سے ہم راستے میں اس لئے نہیں ملتے۔ کہ ہم کو اپنی وضعداری کا خیال ہے۔ نیز غیرت اس بات کی اجازت نہیں دیتی۔ کہ ہم ان سے سر راہ باتیں کریں۔ ادھر وہ مجھ کو اپنی محفل میں آنے کی دعوت اس لئے نہیں دیتے۔ کہ مدعو کرنے میں ان کے غرور ناز میں فرق آتا ہے۔ ظاہر ہے ایسے حالات میں ان سے ملاقات ہو تو کیونکر ہو۔

۸۔ طباطبائی نے اس شعر کو بیت الغزل قرار دیا ہے۔ ہمدرد لوگ عاشق کو سمجھاتے ہیں۔ کہ تیرا معشوق بہت بے وفا اور مکار ہے۔ اس کے عشق سے توبہ کرو۔ اور ایسے شخص کے لئے اپنے دین و دل کو خراب نہ کرو۔ عاشق یہ سن کر بگڑ جاتا ہے اور کہتا ہے۔ جاؤ وہ بے وفا اور مکار ہی سہی۔ جس کو اپنا دین و دل پیارا ہو۔ وہ اس کی گلی میں نہ جائے۔ گویا تمہیں اپنا دین و دل پیارا ہے۔ تم اس کا عشق نہ کرو۔ ہم تو وہاں ضرور جائیں گے۔ اور اس کا عشق ہرگز ترک نہ کریں گے۔

۹۔ غالب مر گئے ہیں احباب ان کے غم میں زار زار رو رہے ہیں اور ہائے ہائے کر رہے ہیں۔ احباب کو تسکین دینے کے لئے کہا جاتا ہے کہ غالب خستہ کے مر جانے سے دنیا کے کون سے کام بند ہو گئے ہیں جن کی وجہ سے تم اس طرح روتے ہو۔ مطلب یہ ہے۔ اس کی ذات سے تو کسی کو کچھ خاص فائدہ نہ تھا۔ پھر رونے سے کیا حاصل ہے۔

۱۰۶

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں ۱ بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں
پرسش طرز دلبری کیجئے کیا کہ بن کہے ۲ اس کے ہر اک اشارہ سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں
رات کے وقت مے پئے ساتھ رقیب کو لئے ۳ آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

غیر سے رات کیا بنی، یہ جو کہا تو دیکھئے ۴ سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں

بزم میں اُس کے روبرو کیوں نہ خموش بیٹھئے ۵ اُس کی تو خامشی میں بھی ہے یہی مدعا کہ یوں

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیئے غیر سے تہی ۶ سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اُٹھا دیا کہ یوں

مجھ سے کہا جو یار نے جاتے ہیں ہوش کس طرح ۷ دیکھ کے میری بیخودی چلنے لگی ہوا کہ یوں

کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی ۸ آئینہ دار بن گئی حیرتِ نقشِ پا کہ یوں

گر ترے دل میں ہو خیال وصل میں شوق کا زوال ۹ موجِ محیطِ آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

۱۰ جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی

گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کے اُسے سنا کہ یوں

۱۔ غنچۂ ناشگفتہ۔۔۔ دہن تنگ۔ میں اُن سے پوچھتا ہوں کہ بوسہ کس طرح لیا جاتا ہے۔ تو دُور سے اپنا منہ جو غنچۂ ناشگفتہ کی مانند ہے۔ مجھے بنا کر دکھاتے ہیں۔ کہ دیکھو بوسہ اس طرح لیا جاتا ہے کہتے ہیں۔ یہ طریقہ درست نہیں۔ یہ کیا کہ دور سے بنا دیا۔ قریب آ کر بتاؤ کہ بوسہ لینے کی یہ صورت ہے بیخودؔ و طباطبائی لکھتے ہیں۔ کہ پاس آ کر اپنے منہ سے لے کر بتاؤ۔ کہ بوسہ یوں لیتے ہیں آسیؔ (سعید)

آسیؔ نے دوسرا مفہوم یہ لکھا ہے۔ کہ میں نے تم سے بوسہ لینے کی صورت دریافت کی ہے۔ تو اس پر خاموش کیوں کھڑے ہو یعنی خموشئ دہن کو غنچۂ ناشگفتہ کہا ہے۔

۲۔ طرزِ دلبری۔۔۔ دل لینے کا طریقہ۔ میں ان سے دل لینے کا طریقہ کیا پوچھوں بغیر دریافت کئے بنا چل رہا ہے۔ کیونکہ ان کا ہر ایک اشارہ زبانِ حال سے کہہ رہا ہے کہ دل اس طرح اُڑایا جاتا ہے۔

۳۔ خدا کرے کہ وہ رات کو خوب شراب پئے اور میرے گھر میں آئے لیکن خدا کرے

کہ وہ شراب پیئے اور رقیب کو اپنے ساتھ لیئے ہوئے میرے پاس آئے۔

۴۔ کیا بنی۔۔۔۔ کیا گذری۔ میں نے جو ان سے پوچھا۔ کہ کہیئے حضرت غیر کے ساتھ رات کیسی گذری؟ اس سوال کا جواب انہوں نے اس طرح دیا کہ وہ میرے سامنے آن بیٹھے۔ گویا یہ بتلایا۔ کہ ہم اور غیر یوں بیٹھے رہے (بیخود۔ آسی)

طباطبائی (۱) میرے سامنے آبیٹھنا اور غصے کی نگاہ سے میری طرف دیکھنا دیکھئے کہ یوں تم گستاخی کرنے لگے (سعید) (۲) میرے سوال پر ذرا دیکھنا اس کا سامنے آبیٹھنا اور ذرا دیکھنا کہ یوں ڈھٹائی سے سامنے آن بیٹھنا۔

آسی کا دوسرا مفہوم: اس سوال کے سنتے ہی وہ غصے سے میرے سامنے آبیٹھا۔ اور کہا کہ اب ہم آپ کے پاس آگئے ہیں۔ تو آپ یوں چھیڑ نکالیں گے اور یوں گستاخی کریں گے۔

۵۔ کیسے ہوسکتا ہے۔ کہ بزم میں اس کے سامنے ہم خاموش ہو کر نہ بیٹھیں۔ اس چپ چاپ رہنے کا مدعا یہی ہے۔ کہ ہماری طرح تم بھی خاموش بیٹھے رہو۔

۶۔ نہی۔۔ خالی۔ ستم ظریف۔۔۔ وہ شخص جس کی ظرافت میں ستم کی آمیزش ہو۔

میں نے ان سے کہا۔ کہ بزم ناز میں کوئی غیر شخص نہیں ہونا چاہیئے اور غیر سے میرا مدعا رقیب تھا۔ اس ستم ظریف معشوق نے یہ سن کر مجھی کو بزم سے نکال دیا اور کہا کہ یہی تمہارا مطلب ہے نا۔ یعنی اب تو محفل غیر سے خالی ہوگئی۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی نگاہوں میں میں ہی "غیر" تھا۔ حسرت لکھتے ہیں۔ کہ یہ شعر لفظ ستم ظریف کے مفہوم کی تشریح کرتا ہے۔

۷۔ جب یار نے مجھ سے دریافت کیا کہ ہوش کس طرح اڑتے ہیں؟ تو میری بیخودی کا عالم دیکھتے ہی ہوا چلنے لگی۔ کہ دیکھ ہوش اس طرح اڑا کرتے ہیں۔ جب عالم سرخوشی میں ہوا لگتی ہے۔ تو نشہ اور زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ مندرجہ بالا مفہوم

کے علاوہ آسی نے یہ نکتے اور نکالے ہیں۔ (۱) میری ہر شے دشمن ہے میں اس کے سوال کا جواب بھی نہ دینے پایا تھا کہ ہوا نے پہلے سے جواب دے دیا (۲) ہر شے میرے دردِ دل سے واقف ہے۔ اور ہر شے میری حالت پر گواہ ہے (۳) اس کی ہر چیز مطیع ہے۔ اور اس کے سوال کے جواب کے لئے تیار رہے۔

۸۔ مجھے معلوم نہ تھا۔ کہ کوچۂ یار میں کیونکر رہا جاتا ہے۔ حیرتِ نقش پا نے اپنی افتادگی اور حیرانی کی مثال پیش کر کے مجھ کو کوئے یار میں رہنے کا طریقہ سکھلا دیا۔ مطلب یہ ہے۔ کہ نقشِ پا نے مجھے بتا دیا۔ کہ اس طرح خاک میں مل کر اور جلوۂ یار سے حیرت زدہ ہو کر کوچۂ معشوق میں رہنا چاہیئے۔

۹۔ اگر تیرے دل میں یہ خیال ہے۔ کہ وصل سے عشق میں کیونکر کمی ہو جاتی ہے تو تو موجِ بحر کو دیکھ۔ وہ زبانِ حال سے بتا رہی ہے۔ کہ وصل سے شوق اس طرح زوال پذیر ہوتا ہے یعنی موج کے تموج اور طلاطم سے معلوم ہوتا ہے کہ موج وصلِ بحر سے دل سیر ہو گیا ہے۔ اور وہ واپس کنارے پر آنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے (حسرت ستعید)

طباطبائی۔ اگر تجھے یہ خیال ہو کہ مبداءِ حقیقی تک پہنچ کر کیونکر زوالِ شوق ہو جائے گا۔ اور کس طرح اتحاد پیدا ہو جائے گا۔ تو موجِ محیط کو دیکھ وہ بتا رہی ہے۔ کہ اس طرح دست و پا مارتے مارتے آخر اتحاد ہو جاتا ہے جو کہ مرتبۂ اطمینان و سکون ہے (بیخود)

آسی۔ اگر تیرے دل میں یہ خیال ہے۔ کہ وصل سے شوق میں زوال آ جاتا ہے تو موجِ دریا کو دیکھ وہ اپنے سر کو ٹیک رہی ہے اور ظاہر کرتی ہے۔ کہ وصل سے شوق زوال پذیر نہیں ہوتا۔ یعنی عاشق کو اگر معشوق سے وصال نصیب بھی ہو جاتا ہے تو اضطراب کم نہیں ہوتا۔ بلکہ بڑھ جاتا ہے۔ قطرات جب تک دریا

سے ملتے تھے۔ ان کو سکون تھا۔ اب دریا سے ملنے پر ان کی یہ صورت ہوئی۔ کہ بصورتِ امواج سر پٹکتے اور بزبان حال کہتے ہیں کہ گویا وصال سے زوالِ شوق ہوا کرتا ہے یعنی نہیں ہوتا۔

۱۰۔ جو شخص یہ کہے۔ کہ فارسی شاعری سے اردو شاعری کیونکر بہتر ہے تو اُس کو ایک مرتبہ غالب کا اُردو کلام پڑھ کر سنا دو اور یہ بتا کہ دیکھ اس طرح سے اُردو شاعری رشکِ فارسی ہے۔

ردیف "و"

۱۰۷

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرم تماشہ ہو ۱ کہ چشم تنگ شاید کثرت نظارہ سے وا ہو
بقدر حسرت دل چاہئے ذوق معاصی بھی ۲ بھروں یک گوشۂ دامن گر آب ہفت دریا ہو
اگر وہ سرو قد گرم خرام ناز آجاوے ۳ کفِ ہر خاکِ گلشن شکل قمری نالہ فرسا ہو

۱۔ حالی۔ یہ محض ایک خیالی مضمون نہیں ہے۔ بلکہ حقیقت واقعی کو ایک نہایت عمدہ پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ فی الواقع جب انسان گھر کی چاردیواری میں محصور، دنیا کے حالات سے ناواقف اور لوگوں کی ترقی و تنزل کے اسباب سے بے خبر ہوتا ہے۔ تو اپنی محدود جماعت میں سے کسی کو عمدہ حالت میں نہیں دیکھ سکتا لیکن جس قدر اس کا دائرہ تعارف زیادہ وسیع ہوتا جاتا ہے اسی قدر اس پر یہ بات کھلتی جاتی ہے۔ کہ لوگوں کی خوشحالی محض اتفاقی نہیں ہے جس پر حسد و رشک کیا جائے۔ بلکہ ان کی محنت اور تدبیر کا نتیجہ ہے۔ اور اس لئے

انفاق اور فیاضی اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ خود بھی کوشش و تدبیر کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اور بجائے حسد و رشک کے اوروں کی ریس اور پیروی کرنے پر متوجہ ہو جاتا ہے۔ شاعر اس معقول بات کو ایک محسوس تمثیل میں بیان کرتا ہے۔ کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو۔ جس طرح شعراء نے بخیل کے دل کو تنگ باندھا ہے۔ اسی طرح حاسد کی آنکھ کو تنگی کے ساتھ موصوف کیا ہے۔

طباطبائی۔ تجربہ کے بعد تجھے معلوم ہو جائے گا۔ کہ حسد کرنا بیجا ہے دنیا میں دولت کے لئے کوئی سبب نہیں درکار ہے۔ ہر جگہ یہی حال ہے۔

۲۔ ذوقِ معاصی.... ذوقِ گناہ۔ بھروں.... تر کروں۔ آب ہفت دریا.... سات سمندروں کا پانی۔ مراد کثرتِ معاصی۔ میرے دل میں گناہوں کی حسرت اس قدر زیادہ ہے۔ کہ اگر گناہوں کے سات سمندر بھی ہوں تو ان کے سارے پانی سے میرا ایک گوشۂ دامن تر ہوگا۔ ظاہر ہے پورا دامن تر کرنے کے لئے کتنے زیادہ سمندر درکار ہوں گے۔ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ دنیا میں عصیاں کم ہے اور میرا ذوقِ عصیاں بہت زیادہ ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ فارسی میں تر دامن گناہگار کو کہتے ہیں غالب سے

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک   میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

۳۔ کفِ ہر خاک.... ہر کفِ خاک یعنی خاک کی ہر مٹھی قمری کا رنگ خاکستری ہوتا ہے اور وہ سرو کی عاشق ہوتی ہے۔ اگر وہ سروقد معشوق محوِ خرامِ ناز ہو کر گلشن میں آ جائے۔ تو گلشن کی خاک کی ہر مٹھی قمری کی طرح اسکے عشق میں نالہ کشی کرنے لگے۔ قمری اور کفِ خاک کی مشابہت نے لطف پیدا کر دیا ہے

۱۰۸

کعبہ میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں   ۱   بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ ۲ دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسم ثواب سے ۳ ٹیڑھا لگا ہے قط قلم سرنوشت کو

غالب کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے

خرمن جلے اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

۱۔ کنشت... بت خانہ - اگر میں کعبہ میں رہنے لگا - تو مجھ کو طعنہ نہ دو۔ میں بت خانہ والوں کی صحبت کے حق کو بھولا نہیں ہوں۔ مجھے اس انقلاب کے بعد بھی ان کا خیال ہے - اور رہے گا۔ میں حق ناشناس نہیں ہوں۔ ان کی مہربانی اور احسان میرے دل پر نقش ہیں۔ تبدیل مذہب اور تعصب ان کو بھلا نہیں سکتا۔ بیخود لکھتے ہیں کہ اگر میں ہندوستان سے ہجرت کر کے کعبہ میں جا رہا تو...... الخ

۲۔ طاعت... عبادت خدا۔ انگبیں... شہد۔ لاگ... طمع - حالی۔ جب تک بہشت قائم ہے۔ لوگ عبادت اسی امید پر کرتے ہیں۔ کہ وہاں شہد اور شراب طہور وغیرہ ملے گی۔ پس بہشت کو دوزخ میں جھونک دینا چاہیئے۔ تاکہ لالچ باقی نہ رہے - اور لوگ خالصاً لوجہ اللہ عبادت کریں۔

۳۔ میں راہ و رسم ثواب سے کیونکر برگشتہ نہ ہوں۔ کاتب تقدیر نے جس قلم سے میری سرنوشت لکھی۔ سوء اتفاق سے اس پر قط ٹیڑھا لگا ہوا تھا۔ قط ٹیڑھا ہونے کی وجہ سے میری سرنوشت بھی ٹیڑھی لکھی گئی۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے مقدر ہی میں راہ ثواب سے منحرف رہنا لکھا ہے۔

۴۔ سعی... کوشش، جدوجہد۔ لہنا... فائدہ۔ ملخ۔ ٹڈی۔ کشت... کھیت۔ خرمن... اناج کا ڈھیر - بطور شکایت کے کہتے ہیں۔ اپنی جدوجہد سے فائدہ اٹھانا کچھ میری تقدیر ہی میں نہیں۔ اگر بالفرض ٹڈیاں میری کھیتی نہ کھائیں اور فصل تیار ہو جائے تو پھر بجلی میرے خرمن کو جلا کر خاک

کردے گی۔ طباطبائی لکھتے ہیں۔ کہ مقام شکایت ہیں ریاضت کے ثمرہ کو لہنا کہتے ہیں غالب نے اس مفہوم کو دوسرے الفاظ میں اس طرح ادا کیا ہے

خوشی کیا، کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آئے
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

١٠٩

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو ١ کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو
چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا ٢ ہے دل پہ بار نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو
ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ ٣ ہر چند بر سبیل شکایت ہی کیوں نہ ہو
پیدا ہوئی ہے، کہتے ہیں، ہر درد کی دوا ٤ یوں ہو تو چارۂ غم الفت ہی کیوں نہ ہو
ڈالا نہ بے کسی نے کسی سے معاملہ ٥ اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو
ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال ٦ ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو
ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہے انفعال ٧ حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو
وارستگی بہانۂ بیگانگی نہیں ٨ اپنے سے کر، نہ غیر سے، وحشت ہی کیوں نہ ہو
مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی ٩ عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

١٠ اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسدؔ
اس میں ہمارے سر پر قیامت ہی کیوں نہ ہو

١۔ وارستہ ..... آزاد، بے پروا۔ ہم اس بات کی پروا نہیں کرتے۔ کہ تم ہم سے ضرور محبت ہی کرو۔ اگر محبت تمہیں منظور نہیں ہے تو نہ سہی عداوت ہی سہی لیکن تم ہم سے بالکل قطع تعلق نہ کرو۔ آسی سعیدی سے

قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

بیخود۔ طباطبائی۔ اگر تم محبت نہیں کرتے تو عداوت ہی کرو لیکن مجھ سے کرو۔ غیر

کی شرکت عداوت میں بھی ناگوار ہے

۲۔اختلاط.... محبت۔ضعف نے مجھے اس قدر کمزور کر دیا ہے۔کہ طبیعت میں رنگِ اختلاط بھی باقی نہیں رہا۔ اب حالت یہ ہے۔کہ دل پر نقشِ محبت بھی بار معلوم ہوتا ہے۔غالبؔ ؎ یاں دل میں ضعف سے ہوس یار بھی نہیں

طباطبائی لکھتے ہیں۔کہ رنگ کا لفظ فقط تصویر کے مناسبات سے ہے ورنہ ضرورت نہ تھی۔بیخودؔ نے یہ مزید تشریح کی ہے۔کہ ضعف نے مجھے ایسا گھلا دیا ہے۔کہ میرے جسم میں خون باقی نہیں رہا۔اور خون نہ رہنے سے رنگ اختلاط بھی مٹ گیا۔میرے نزدیک یہ توجیہ بہت دور کی ہے۔

۳۔ہرچند تم نے مجھ سے غیر کا تذکرہ بطور شکایت کیا ہے لیکن پھر بھی مجھ کو تم سے یہ شکایت ہے۔کہ تم نے مجھ سے غیر کا ذکر ہی کیوں کیا۔چاہے وہ بطور شکایت ہی تھا۔

۴۔چارہ.... علاج۔لوگ کہتے ہیں۔کہ دنیا میں ہر درد کی دوا پیدا ہوئی ہے۔اگر یہ بات درست ہو۔تو مرض عشق کا علاج کیوں نہ ہو۔اور مریض عشق لاعلاج کیوں رہ جائے۔گویا یہ غلط ہے۔کہ ہر درد کی دوا پیدا ہوئی ہے۔

۵۔خجالت.... شرمندگی۔شکر ہے۔کہ بیکسی کی وجہ سے میرا کسی سے معاملہ نہ پڑا۔گویا مجھ پر بیکسی کا احسان ہے۔کہ اس نے مجھے اوروں کے احسان سے بچایا اور اپنا ممنون احسان رکھا۔اگر لوگوں کا مجھ پر کوئی احسان ہوتا۔تو اُن سے مجھے شرمندگی ہوتی۔اب بیکسی کی بدولت میں اُن سے شرمندہ نہیں۔اگر شرمندہ ہوں تو اپنی ذات ہی سے ہوں اور یہی غیرت کا تقاضا ہے۔بقول سعید بیکسی میں تسکین کا نیا پہلو نکالا ہے۔

بیخودؔ۔طباطبائی۔بیکسی کا احسان ہے۔کہ سب کے احسان سے بچا یا۔

لوگوں سے کچھ نفع نہ ہوتا۔ تو خجالت تو اُن سے ہوتی۔ اب خجالت بھی مجھے ہے تو اپنے ہی سے ہے آسی نے دونوں مفہوم لکھے ہیں۔

۶ کہتے ہیں۔ آدمی اگر تنہا بھی ہو۔ تو وہ ایک محشر خیال ہے یعنی جب وہ خلوت میں ہوتا ہے۔ تو تخیلات اور تصورات کا ایک ہنگامہ اس کے دل و دماغ میں برپا رہتا ہے یہی حالت ہماری ہے اس لئے اگر ہم خلوت میں بھی ہوتے ہیں۔ تو سمجھتے ہیں۔ کہ انجمن میں ہیں۔ کیونکہ ہمارے خیالات ہنگامہ آراء رہتے ہیں قاعدہ ہے۔ جب لوگ کسی مجلس میں جمع ہوتے ہیں۔ تو طرح طرح کی باتیں کیا کرتے ہیں اسی طرح خیالات کی ہنگامہ آرائی سے خلوت جلوت بن جاتی ہے۔

طباطبائی اور بیخود اس شعر کو عارفانہ شعر لکھتے ہیں نیز اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ تخلیۂ نفس بہت مشکل ہے اور خطرات قلب پر قابو پانا دشوار تر ہے۔

۷۔ انفعال۔۔۔۔ دوسرے کا اثر قبول کرنا۔ شرمندگی۔ زبونیٔ ہمت۔۔۔۔ کم ہمتی۔ چونکہ دوسروں کا احسان یا اثر قبول کرنا کم ہمتی کی دلیل ہے۔ اس لئے زمانہ سے عبرت بھی حاصل نہیں کرنی چاہیئے۔ کیونکہ زمانے سے عبرت حاصل کرنے سے زمانے کا احسان ہوگا۔ احسان سے شرمندگی ہوگی۔ اور شرمندگی اٹھانا زبونیٔ ہمت کی نشانی ہے۔

آسی کا دوسرا مفہوم ملاحظہ فرمایئے۔ کہاں سے کہاں پہنچے ہیں "انفعال سے کم ہمتی کا پتہ چلتا ہے۔ لہٰذا کم ہمتی کا خود کو متہم ٹھہرانا بہت بُرا ہے زمانے سے کچھ نہ کچھ حاصل کیوں نہ کیجئے۔ چاہے وہ عبرت ہی ہو یعنی بے حصول کمال دنیا میں محض انفعال سے کام نہیں چلتا"

۸۔ وارستگی۔۔۔۔ آزادی۔ وحشت۔۔۔۔ رمیدگی، بھاگنا۔ عام لوگ آزادی کے یہ معنی سمجھتے ہیں۔ کہ اپنے پرائے سے قطع تعلق کر لیا جائے۔ کہتے ہیں آزادی کا

مفہوم یہ نہیں ہے آزادی وحشت، رمیدگی اور بیگانگی محض اپنے نفس سے اختیار کرنی چاہیئے۔ نہ کہ دنیا اور اہل دنیا سے حقیقتاً یہ ہے۔ آزادی کا صحیح مفہوم کہ انسان بے غرض ہو کر زندگی بسر کرے۔

۹۔ فرصت... مہلت۔ وقت... فوت ہونا ضائع ہونا۔ عام خیال یہ ہے۔ کہ عمر کا بہترین مصرف عبادت و بندگی معبود ہے کہتے ہیں خواہ ساری عمر عزیز عبادت ہی میں صرف کیوں نہ ہو جائے لیکن پھر بھی عمر عزیز کے ضائع ہونے کا رنج ضرور ہوتا ہے۔ آسی لکھتے ہیں۔ کہ عمر عزیز ترین شے ہے۔

طباطبائی کا خیال ہے کہ عبادت کا جو ثمرہ ہے۔ اس سے بڑھ کر انسان حاصل کر سکتا ہے۔ پھر محض عبادت میں اگر مہلت حیات کو صرف کر دیا۔ تو کیونکر اس کا غم نہ ہوگا۔

۱۰۔ ہم اس فتنہ خو کے در پر آن بیٹھے ہیں اور اب ہم یہاں سے ہرگز نہیں اُٹھیں گے۔ چاہے ہمارے سر پر قیامت ہی کیوں نہ گزر جائے۔ لطف یہ ہے کہ روزِ قیامت ہر چیز اُٹھے گی۔ لیکن پھر بھی ہم نہیں اُٹھیں گے۔ یا یہ کہ قیامت تک بیٹھے رہیں گے۔ تیسرا مفہوم یہ ہے۔ چاہے ہمارے سر پر کتنے ہی ظلم و ستم کیوں نہ ہوں۔ ہم ہرگز نہیں اُٹھنے کے۔

۱۱۰

قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو ۱ مرا ہونا برا کیا ہے نوا سنجان گلشن کو
نہیں گر ہمدمی آساں ہو یہ رشک کیا کم ہے ۲ نہ دی ہوتی خدایا آرزوئے دوست دشمن کو
نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اس جراحت پر ۳ کیا سینے میں جس نے خونچکاں مژگانِ سوزن کو
خدا شرمائے ہاتھوں کو کہ رکھتے ہیں کشاکش میں ۴ کبھی میرے گریباں کو کبھی جاناں کے دامن کو
ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں ۵ نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو

۶ ہوئی چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا — کیا بیتاب کاں میں جنبشِ جوہر نے آہن کو

۷ خوشی کیا کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے — سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈھے ہے ابھی سے برق خرمن کو

۸ وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے — مرے بتخانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

۹ شہادت تھی مری قسمت میں جو دی تھی یہ خو مجھ کو — جہاں تلوار کو دیکھا جھکا دیتا تھا گردن کو

۱۰ نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا — رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

۱۱ سخن کیا کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے — جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو

میرے شاہِ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں غالبؔ

فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو

۱۔ شیون ... فریاد۔ میں قفس میں گرفتار اور نالہ و شیون میں مصروف ہوں۔ برخلاف اس کے نوا سنجانِ چمن شادکام اور آزاد ہیں۔ پھر وہ میرے نالوں کو کیوں بُرا سمجھتے ہیں۔ ایسی حالت میں تو میں لطفِ چمن میں ان کا حصہ دار بھی نہیں بن سکتا۔ آخر مجھ سے متنفر ہونے کی وجہ کیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے۔

۲۔ ہمدمی ... دوستی۔ میں یہ اچھی طرح سمجھتا ہوں کہ غیر کے لئے دوست کا ہمدم ہونا آسان بات نہیں ہے لیکن میرے لئے یہ غم کیا کم ہے۔ کہ غیر کو بھی میرے دوست کی آرزو ہے۔ اللہ میاں! کیا ہی اچھا ہوتا۔ جو تم رقیب کو آرزوئے دوست نہ دیتے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ اگر غیر کو آرزوئے دوست نہ ہوتی۔ تو میں رشک کی تکلیف سے بچ جاتا۔

۳۔ جراحت ... زخم سینہ ... ذو معنی ہے یعنی چھاتی اور سینا یا پرونا۔ تو کس قدر سنگدل ہے کہ اس زخم کو دیکھ کر تیری آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ ٹپکا۔ جس کو سینے میں ٹانکے لگائے ہیں، سوئی کی پلکوں تک سے خون ٹپکنے لگا جب زخم کو

سیا جاتا ہے تو سوئی کی نوک خون آلودہ ہو جاتی ہے۔ اور اس میں سے قطراتِ خون ٹپکنے لگتے ہیں (سعید)

طباطبائی۔ سوزن سے سوزنِ غم مراد ہے جس کا مقام سینے کے اندر ہے اور سوزن سے یہ استعارہ نہ لیں۔ تو شعر عامیانہ ہو جائے گا۔ جیسے نافہم شعراء غیر واقعی باتیں نظم کر دیا کرتے ہیں۔ ہاں اگر سینے کی جگہ سینا سمجھو تو استعارہ کی ضرورت نہیں۔ بیخود۔ تیری آنکھ سے ان زخموں کا حال سنکر ایک آنسو بھی نہ نکلا جن زخموں کو میرے دل میں دیکھ کر سوزنِ غم کی آنکھوں سے خون جاری ہو گیا۔ آسی نے یہی شرح لکھی ہے۔ صرف سوزنِ غم کی جگہ مژگان سوزن لائے ہیں۔

۴۔ کشاکش۔۔۔ کھینچا تانی۔ خدا کرے میرے اِن ہاتھوں کو شرم آئے اور یہ اپنی حرکت سے باز رہیں کہ یہ ہمیشہ کھینچا تانی میں مصروف رہنے میں۔ جب معشوق کھینچا تانی میں مصروف ہوتا ہے۔ تو اس وقت اس کے دامن کو پکڑ کر کھینچتے ہیں اور اگر وہ نہیں ہوتا تو غمِ فراق میں میرے گریبان کو پھاڑتے ہیں۔ بقول بیخود۔ اس شعر میں یہ شوخی ہے کہ اپنے جوشِ عشق اور وفورِ شوق کا الزام بیگناہ ہاتھوں پر لگایا ہے۔ آسی اور حسرت کا خیال ہے۔ اگرچہ جاناں کا دامن "دامنِ جاناں" کا صحیح ترجمہ ہے لیکن فصیح نہیں۔

۵۔ شناور۔۔۔ تیرتا ہوا۔ جوئے خوں۔۔۔ دریائے خوں۔۔۔ توسن۔۔۔ گھوڑا۔ ہم قتل گاہ کا نظارہ کرنا معمولی بات سمجھے ہوئے ہیں کیونکہ ابھی ہم نے دریائے خون میں تیرے توسن کو تیرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جب یہ منظر دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ قتل کا نظارہ کرنا کس قدر ہمت کا کام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قتل گاہ میں اتنے عاشقوں کا خون ہوگا کہ خون کا دریا بہہ جائے گا۔ اور اس میں تیرا گھوڑا تیرتا پھرے گا بھلا ایسا خونیں منظر کون دیکھنے کی ہمت رکھتا ہے۔

بیخودی کی تشریح مزید بالکل اچھوتی ہے لکھتے ہیں، ہم یہ سمجھتے ہمارا قاتل گروہ عشاق میں سے ایک خوش نصیب عاشق کو انتخاب کر کے خنجر ناز یا تیغ غمزہ سے شہید کر دے گا۔ یہ نہیں معلوم کہ اس تماشے کے بعد اتنے آدمی رشک سے اپنے گلے کاٹ لینگے کہ خون کا دریا بہہ جائے۔

۶۔ چرچا۔۔۔ شہرہ۔ جوہر کی چمک کو جنبش اور بیتابی سے تعبیر کیا ہے میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا جو شہرہ ہوا۔ تو لوہے کے جوہر نے لوہے کو کان کے اندر بیتاب کر دیا یعنی جوہر آہن اس لئے بیتاب ہوا۔ کہ اس کا لوہا میرے پاؤں کی زنجیر بنے۔ بقول طباطبائی مطلب یہ ہے کہ میری دیوانگی وہ رتبہ رکھتی ہے کہ آہن کو آرزو ہے کہ زنجیر بن کر میرے پاؤں میں پڑنے کا شرف حاصل کرے آسی۔ غالب کے اس مبالغہ کو اچھا نہیں سمجھتے۔ حالانکہ خوب ہے۔

۷۔ کسان جب ابر کو دیکھتا ہے۔ تو بہت خوش ہوتا ہے کہ اس کے برسنے سے کھیتیاں شاداب ہوں گی اور بڑی اچھی فصل اٹھے گی لیکن غالب کہتے ہیں۔ کہ اگر میری کھیتی پر سو بار بھی ابر آئے۔ تو مجھے کوئی خوشی نہیں ہوتی۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ بجلی ابھی سے میرے خرمن کو جلانے کیلئے ڈھونڈ رہی ہے یعنی جب مراد پوری ہونے سے پہلے نامرادی کا سامان نظر آرہا ہے پھر خوشی کیونکر ہو۔ یہ مضمون غالب کو بہت مرغوب ہے پہلے بھی کئی مرتبہ لکھ چکے ہیں۔

۸۔ حالی یعنی جب برہمن اپنی ساری عمر بت خانے میں کاٹ دے اور وہیں مر رہے۔ تو وہ اس بات کا مستحق ہے۔ کہ اس کو کعبہ میں دفن کیا جائے اس لئے کہ اس نے وفاداری کا پورا پورا حق ادا کر دیا۔ اور یہی ایمان کی اصل ہے" بقول طباطبائی۔ وفاداری: پائداری ہر حال میں یہاں تک کہ کفر میں بھی قابل قدر ہے

۹۔ کاتب ازل نے میری قسمت ہی میں شہید ہونا لکھا تھا اسی لئے میں جہاں

کہیں تلوار دیکھتا اپنی گردن جھکا دیتا تھا۔

طباطبائی۔ تلوار استعارہ ہے ناز و ادا اور جور و جفا سے اور گردن جھکانا کنایہ ہے گوارا کرنے سے اور شہادت سے خون آزاد مراد ہے۔ اگر معنی حقیقی پر ان لفظوں کو لیں تو شعر کا کوئی محصل نہیں رہتا۔

۱۰۔ آسی۔ اس شعر کو بیت الغزل کہتے ہیں۔ اگر میں دن کو لٹتا تو رات کو ایسا بے خبر ہو کر مزے سے کیونکر سوتا۔ مطلب یہ ہے۔ مجھے چوری کا خطرہ رہتا۔ اب میں لٹ گیا ہوں۔ اس لئے بے فکر ہوں اور آرام کی نیند سو رہا ہوں اور رہزن کو دعا دیتا ہوں کہ خدا تیرا بھلا کرے۔ تو نے مجھے غم اسباب اور فکر متاع سے آزاد کر دیا۔

طباطبائی اور بیخود لکھتے ہیں۔ تعلقات دنیوی تکلیف و تشویش سے خالی نہیں۔ جدائی اس سے ناگوار تو ہوتی ہے لیکن راحت اسی میں ہے۔

۱۱۔ جویا۔۔۔ تلاش کرنیوالا معدن۔۔ کان ہمارا جگر معدن اور ہمارے اشعار جواہرات ہیں۔ اگر ہم جگر کاوی سے جوہر سخن نہ نکال سکتے ہوں تو پھر ہم معدن کو کھود کر اس میں سے جواہرات نکالتے ہوئے اچھے لگیں۔ اب ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے بقول بیخود و طباطبائی مطلب یہ ہے کہ جگر کاوی کر کے شعر تر نکالنا معدن کو کھود کر جواہر نکالنے سے بہتر ہے۔

۱۲۔ سلیمان بہت بڑے بادشاہ تھے۔ ان کی جن و انس پر حکومت تھی۔ پیغمبر اولو العزم تھے۔ اور یہ بادشاہ جن کا مصرع ثانی میں ذکر ہے۔ اگرچہ بڑے بڑے بادشاہ تھے لیکن نہ تو مسلمان تھے۔ اور نہ ان میں وہ صفات تھیں جو میرے بادشاہ میں ہیں۔ پھر ان کو میرے بادشاہ سے کیا نسبت ہو سکتی ہے وہ تو سلیمان جیسے مرتبے والا ہے۔

۱۱۱

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اُس سیم تن کے پانو ۱ رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو

دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پانو ۲ ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیر زن کے پانو

بھاگے تھے ہم بہت سو اسی کی سزا ہے یہ ۳ ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پانو

مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور ۴ تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پانو

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعدِ مرگ ۵ ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پانو

ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف ۶ اڑتے ہوئے الجھتے ہیں مرغِ چمن کے پانو

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں ۷ دکھتے ہیں آج اس بتِ نازک بدن کے پانو

غالب مرے کلام میں کیونکر مزہ نہ ہو
پیتا ہوں دھو کے خسرو شیریں سخن کے پانو

۱- اظہارِ جوشِ محبت اور خاطر مدارات کے لئے اس سیمیں بدن محبوب کے پانو دھو کر ان کا دھوون پینا چاہتا ہوں تو ضدی معشوق لگن سے باہر پانو کھینچ لیتا ہے۔ گویا وہ مجھے اس قابل بھی نہیں سمجھتا کہ میں اس کے پاؤں بھی دھو سکوں یا بقول سعید اس کو مجھ سے اس قدر نفرت اور کینہ ہے۔

۲- پانو پڑنا۔۔۔۔ عاجزی دکھانا، منت سماجت کرنا۔ یہ محاورہ عورتوں کی زبان کا ہے۔ محبت اور ہمدردی دکھلانے کے لئے بولا جاتا تھا۔ یعنی میں اس کے پاؤں پڑوں۔ وہ کس مصیبت میں مبتلا ہے۔ ہیہات۔۔۔ افسوس۔ پیر زن میں تلمیح ہے۔ خسرو نے فرہاد سے وعدہ کیا تھا۔ کہ اگر وہ نہر کھود کر اس کے قلعہ تک لے آئیگا تو شیریں کو اس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ فرہاد نے نہر کھود نکالی اور محل تک پہنچا دی۔ خسرو کو بہت فکر ہوا کہ اب کیا ہوگا اس نے تو ایسی شرط پیش کی تھی۔ جس کا پورا کرنا امرِ محال تھا۔ آخر خسرو کی پریشانی دیکھ کر اس کے ایک مصاحب

نے ایک ترکیب سوچی۔ وہ ایک بڑھیا کا بھیس بدل کر فرہاد کے پاس گیا اور اس
کو دیکھ کر چیخیں مار کر رونے لگا۔ فرہاد نے کہا۔ کہ بڑی بی کیوں روتی ہو؟ اس
سوال پر اور زیادہ روئی۔ اور سخت اصرار کے بعد بتایا۔ کہ میں شیریں کی
دایہ ہوں میں نے اس کو پالا ہے۔ وہ آج ایک دم مرگئی۔ اور تو ہے کہ اس کے
خیال میں ہمہ تن مصروف۔ فرہاد یہ سن کر دیوانہ ہو گیا۔ اور اس نے وہی تیشہ
جس سے وہ پہاڑ کاٹ رہا تھا۔ اپنے سر میں مارا۔ اور وہیں ڈھیر ہو گیا۔
غالب ہمدردی کے لہجہ میں کہتے ہیں۔ فرہاد نے کس سادگی سے ایک بڑھیا کے
فریب میں آکر جان دے دی۔ افسوس اس بڑھیا کے پاؤں کیوں نہ ٹوٹ
گئے۔ کہ وہ وہاں تک پہنچ نہ سکتی۔

بیخود لکھتے ہیں۔ پاؤں پڑنا بیوقوف بنانے کے محل پر بولتے ہیں۔ طبا طبائی
اور دیگر شارحین کا خیال ہے کہ یہ محاورہ جوش محبت میں اظہار ہمدردی
کرنے کے معنوں میں صرف کیا گیا ہے۔

۳۔ ہم راہزن سے ڈر کر بھاگے تھے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ تقدیر ہی میں یہ
لکھا تھا۔ کہ راہزن ہمیں لوٹ لے، لوٹ کر قید کرلے اور پھر ہم قیدی اور
غلام بن کر اس کے پاؤں دبایا کریں۔ گویا ہم تقدیر الٰہی سے باوجود کوشش کے
بچ نہ سکے۔ اور ہماری کوشش کا نتیجہ برعکس برآمد ہوا۔ (سعید۔ بیخود)

طبا طبائی لکھتے ہیں۔ اس شعر کے جو معنی حقیقی ہیں۔ وہ تو شاعر کے طرز کلام
سے نہیں معلوم ہوتے۔ ہاں اگر یہ باتیں استفادہ سمجھو۔ تو وہ کبھی صاف نہیں
آسکتی تائید کرتے ہیں۔

۴۔ میرا جسم زخمی تھا۔ میں زخموں کے لئے مرہم کی تلاش میں بہت دُور دُور پھرا۔
اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھ خستہ تن کے پاؤں میرے زخموں سے زیادہ فگار ہو گئے

اس شعر میں بھی گذشتہ شعر کا مفہوم ہے بقول بیخود مطلب یہ ہے کہ گوہر مراد ہمیشہ نہیں ملتا کبھی مل جاتا ہے طباطبائی لکھتے ہیں کہ جس چیز سے بھاگتے ہیں۔ اسی کا سامنا ہوتا ہے اور جس آفت کی چارہ جوئی کریں۔ اسی میں پھنستے ہیں۔

۵۔ مجھے دشت نوردی اور صحرا گردی کا اس قدر شوق تھا۔ کہ مرنے کے بعد بھی کفن کے اندر میرے پاؤں ہلتے ہیں۔ طباطبائی لکھتے ہیں۔ حالت ذوق و شوق میں خود بخود پاؤں ہلنا خلقت فطری ہے۔

بیخود نے تشریح مزید فرمائی ہے کہتے ہیں۔ زندگی میں دنیا کے جنگلوں میں پھرتا تھا موت کے بعد میدان عدم طے کر رہا ہوں۔ بالکل اچھوتا خیال ہے اسی لئے اس شعر کو بیت الغزل قرار دیا ہے۔

۶۔ اس مرتبہ بہار میں اس قدر جوش گل ہے۔ کہ اڑتے وقت مرغان چمن کے پاؤں پھولوں کے جال میں پھنسے جاتے ہیں آخری مصرعہ سے دو مفہوم پیدا ہیں۔ ایک تو یہ کہ اس قدر پھول ہیں۔ کہ مرغان چمن کو پرواز کرنے کے لئے بھی جگہ نہیں ملتی۔ اور دوسرے یہ کہ پرندے جلوۂ گل دیکھ کر وہیں رہ جاتے ہیں۔ چمن سے باہر نہیں جا سکتے۔ سعید نے پہلا مفہوم لکھا ہے بیخود نے دوسرا اور باقی شارحین نے دونوں)

۷۔ آج اس نازک بدن محبوب کے پاؤں دُکھ رہے ہیں۔ شاید وہ خواب میں غیر کے ہاں گیا ہوگا گویا ایسے نازک بدن معشوق کا رقیب کے گھر پاؤں سے چل کر جانا ناممکن ہے جس کے پاؤں خواب میں کسی کے گھر جانے سے دُکھنے لگیں۔

۸۔ غالب میرا کلام کیونکر مزید ارنہ ہو۔ میں بادشاہ شیریں سخن کے پاؤں

دھو دھو کر پیتا ہوں۔ اس لئے میرے کلام کا پر لطف اور خوش ذائقہ ہونا یقینی ہے، الفاظ نہایت مناسب صرف کئے ہیں۔ مثلاً مزہ پینا۔ شیریں۔ خسرو وغیرہ اس شعر میں صنعت مراۃ النظیر ہے۔ اپنے کلام کو مزیدار کہنے کے لئے بادشاہ کو خسرو شیریں سخن کہا ہے۔

۱۱۲

(۱) اس کو ہول دل ہے تو یاں ہیں یہ عرض شرمسار ۱ یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو
اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقِ ستم تو دیکھ ۲ آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

۱۔ہول دل... ایک مرض ہے جس میں دل کی حرکت بڑھنے سے خفقان کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ معشوق ہول دل میں مبتلا ہے۔ عاشق اس خیال سے شرمندہ ہو رہا ہے۔ کہ کہیں یہ ہول دل میری آہ کی تاثیر ہی سے نہ ہو گیا ہو۔ طبا طبائی لکھتے ہیں۔ معشوق کا وسواسی اور خفقانی ہونا ادائے معشوقانہ ہے۔ آسی کا خیال ہے۔ کہ معشوق کا ہول دل محض رقیب کی جدائی میں ہے۔

بیخود۔ جوش محبت کی کیا خوب تصویر کھینچی ہے۔ معشوق کو کوئی تکلیف ہوتی ہے تو عاشق اسے اپنی آہ کا اثر سمجھا کرتا ہے۔

۲۔ تاکہ... جب تک۔ نخچیر... شکار، مراد عاشق سے۔ اس ستمگر کا ذرا ذوقِ ستم دیکھنا۔ جب تک۔ کہ چشم نخچیر (دیدہ عاشق) کا آئینہ نہ ہو۔ وہ اپنی شکل ہی نہیں دیکھتا۔ یعنی وہ ہمیشہ دیدۂ عاشق کے آئینہ میں صورت دیکھ کر آرائش کرتا ہے۔ وہ کوئی اور آئینہ استعمال میں نہیں لاتا۔

۱۱۳

(۱) پہنچا ہوں جو غش نہ آتا ہے ہم کو ۱ صدرہ آہنگ زمیں بوس قدم ہے ہم کو

دل کو میں اور مجھے دل محوِ وفا رکھتا ہے ۲ کس قدر ذوقِ گرفتاریِ ہم ہے ہم کو

ضعف سے نقشِ پئے مور ہے طوقِ گردن ۳ تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو

جان کر کیجیے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو ۴ یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں ۵ نالۂ مرغِ سحر تیغِ دو دم ہے ہم کو

سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا ۶ ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو

دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ ولیکن ناچار ۷ پاسِ بے رونقیِ دیدہ اہم ہے ہم کو

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو ۸ ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی ۹ ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو

مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر ۱۰ عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

۱۱ لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

۱- پے ہم ... پیہم، پے در پے، مسلسل۔ صد رہ ... سو طرح سے، سو بار۔ واں سے مراد کوچۂ یار۔ آہنگ ... ارادہ۔ کوچۂ یار میں پہنچکر جو مجھ کو بار بار غش آتا ہے اس کا سبب یہ ہے۔ کہ میں اپنے قدموں کی زمین چومنے کا سو سو طرح سے ارادہ کرتا ہوں۔ کیونکہ باوجود ناتوانی کے وہ مجھ کو وہاں لیجاتے ہیں۔ لفظِ پیہم بلا اضافت دونوں طرح صحیح ہے۔ لیکن اردو میں بے اضافت بولا جاتا ہے۔ اور محاورۂ زبان کی پیروی کرنا ہی فصاحت ہے۔

مندرجہ بالا شرح پر سارے شارحین متفق ہیں۔ سہا نے دوسرا مفہوم یہ لکھا ہے کہ وہاں پہنچکر مجھے جو بار بار غش آتا ہے۔ گویا ان کی قدم بوسی کا بہانہ مل جاتا ہے۔

۲- دل کو میں اور مجھ کو دل گرفتار رکھتا ہے اس سے اندازہ کیجئے کہ ہم

دونوں کو کس قدر ذوقِ گرفتاری یعنی شوقِ آزار ہے۔

۳۔ نقشِ پائے مور... چیونٹی کے پاؤں کا نشان۔ طاقتِ رم.. بھاگنے کی طاقت۔ اس قدر ضعف و نقاہت ہے کہ چیونٹی کے پاؤں کا نقش بھی میرے لئے طوقِ گردن ہے ایسی حالت میں جبکہ میری گردن میں پائے مور کا بھاری طوق پڑا ہوا ہے تو پھر میں تیرے کوچے سے کیوں کر بھاگ سکتا ہوں۔ اللہ رے ضعف۔

۴۔ نگاہِ غلط انداز... ناآشنا نظروں سے دیکھنا میں تم سے نہیں کہتا۔ تم میری طرف سے غافل نہ ہو۔ شوق سے تغافل برتو لیکن مجھے اپنا عاشق سمجھتے ہوئے۔ کیونکہ جان کر تغافل کرنے میں ایک قسم کا التفات پایا جاتا ہے۔ اور رحم و کرم کی کچھ نہ کچھ امید رہتی ہے لیکن ایسی ناآشنا نگاہیں جن سے تم مجھے دیکھتے ہو میرے لئے زہر کا اثر رکھتی ہیں۔ اور میری تمام امیدوں کو ختم کر دیتی ہیں۔

۵۔ ہم طرحی... ہم رنگی، ایک جیسا ہونا تیغ دودم... دو دھاری تلوار، مرغ سحر کا نالہ میرے لئے دو دھاری تلوار ہے۔ اس کی ایک دھار رشکِ ہمرنگی ہے۔ اور دوسری بار خود اس کی فریاد کا درد و اثر ہے مطلب یہ ہے۔ کہ ایک طرف تو اس رشک سے مرتا ہوں کہ وہ بھی میری طرح اس کا عاشق ہے۔ اور میری طرح صبح کے وقت نالہ و فریاد کرتا ہے۔ اور دوسری طرف اس کے غمناک نالوں کی درد بھری آواز مجھے مارے ڈالتی ہے (آسی بیخود طباطبائی)

سعید نے ہمطرحی اور درد و اثر بانگ حزیں دونوں کو رشک کا منصف قرار دیا ہے

۶۔ حالی اس شعر میں "تیرے سر کی قسم ہے ہم کو" کے دو معنی میں ایک یہ ہے

کہ تیرے سر کی قسم ہے۔ ہم ضرور تیرا سر اٹھائیں گے اور دوسرے یہ کہ ہم کو تیرے سر کی قسم ہے یعنی کبھی ہم تیرا سر نہ اڑائیں گے۔ جیسے کہتے ہیں کہ آپ کو تو ہمارے ہاں کھانے کی قسم ہے یعنی کبھی کبھار ہمارے ہاں کھانا نہیں کھاتے۔ آسی لکھتے ہیں۔ کہ ہنسنا اور سر اڑانے پر سر کی قسم کھانا لطیف مضمون ہے

۷۔ دل کے خون کرنے کی محض یہ وجہ ہے۔ کہ بغیر خوں فشانی کے آنکھیں بے رونق معلوم ہوتی تھیں اور ہم کو آنکھوں کی بے رونقی کا بہت زیادہ خیال تھا اس لئے مجبور ہو کر ہم نے دل کو خون کر کے اپنی آنکھوں کو پُر رونق کر لیا ہے۔

۸۔ تم ایسے نازک ہو کہ تم کو میری خموشی بھی فغاں معلوم ہوئی۔ اور ہم اس قدر عاجز اور کمزور و ناتواں ہیں کہ تم نے جو ستم کو ترک کر کے تغافل اختیار کیا۔ تو ہم نے اس کو ستم قرار دیا۔

۹۔ باقی اشعار قطعہ بند ہیں۔ کہتے ہیں لکھنؤ آنے کا کچھ سبب معلوم نہیں ہوا۔ کہ آخر ہم یہاں کیوں آئے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہم سیر و تفریح کے لئے آئے ہیں تو یہ بھی غلط ہے۔ کیونکہ سیر تماشے کی ہوس ہمیں بالکل نہیں۔ یا اگر ہے تو بہت تھوڑی ہے۔

۱۰۔ مقطع ۔۔۔ خاتمہ یہ شہر ہمارے سلسلۂ شوق کا مقطع نہیں ہے کہ یہاں سفر ختم ہو جائے۔ بلکہ ہمارا ارادہ نجف اشرف کی زیارت اور طواف حرم رسول کا بھی ہے یعنی یہ سلسلہ وہاں جا کر ختم ہوگا۔ نجف میں حضرت علیؓ کا روضہ ہے۔

۱۱۔ غالب ہم جہاں کہیں بھی جا رہے ہیں وہاں ہمیں ایک امید لئے جاتی ہے اور لطف کرم کا در کشاف ہمارے لئے جادۂ راہ بنا ہوا ہے۔ یہ شعر اس وقت کے ہیں جب میرزا لکھنؤ اور بنارس ہوتے ہوئے اپنی پنشن جاری کرانے کے لئے کلکتہ

تشریف لے گئے تھے۔

۱۱۴

۱ مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو — تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو

۲ قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو — بچتے نہیں مواخذۂ روز حشر سے

۳ مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو — کیا وہ بھی بے گنہ کش و حق ناشناس ہیں

۴ مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو — ابھرا ہوا نقاب میں ہے ان کے ایک تار

۵ مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو — جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید

۶ لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو — سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست

۷ غالب بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں
دنیا ہو یا رب اور مرا بادشاہ ہو

۱۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ محبوب کو بہت روکا کہ وہ غیر سے ملنا جلنا ترک کر دے لیکن وہ باز نہیں آیا۔ بلکہ انہی سے تعلقات منقطع کرنے پر آمادہ ہو گیا آخر تنگ آ کر کہتے ہیں خیر چلو تم خوش رہو ہمیں رشک رقابت بھی گوارا ہے غیر سے تمہارے جو بھی تعلقات ہیں تم جانو اور تمہارا کام جانے ہمیں کچھ سروکار نہیں لیکن اگر ساتھ کے ساتھ مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کونسی بڑی بات ہے۔

۲۔ مواخذہ... پکڑ دھکڑ، پرسش۔ تم نے روز حشر کی جوابدہی سے بچنے کے لئے مجھ کو رقیب سے قتل کروا دیا۔ یاد رہے۔ تم اس حیلے سے مواخذۂ حشر سے بچ نہیں سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ رقیب قاتل ہے لیکن تم گواہ تو ہو۔ اس لئے تم سے پرسش ضرور ہو گی۔ آسی اس شعر کو بیت الغزل لکھتے ہیں بیخود کے نزدیک رقیب قاتل اس لئے ہے کہ اس کی طبع رشک نے قتل کیا ہے، سعید لکھتے ہیں۔ اگر قاتل رقیب ہی ہے لیکن بنا تو تم ہی ہو۔

۳۔ بے گناہ کُش۔۔۔۔ بے گناہوں کو مارنے والا حق ناشناس۔۔۔ حق نہ پہچاننے والا۔ آپ کہتے ہیں ہمیں آدمی نہ کہو بلکہ سورج کہو، چاند کہو، ہم نے مان لیا کہ آپ واقعی سورج اور چاند ہیں۔ لیکن کیا سورج اور چاند بھی آپکی طرح بیگناہوں کا خون بہانے اور حق کو نہ پہچاننے والے ہیں۔ مطلب یہ ہے۔ کہ وہ ایسے نہیں۔

۴۔ ان کی نقاب پر ایک تار اُبھرا ہُوا ہے میں اُسے دیکھ کر رشک کے مارے مرا جاتا ہوں۔ اور ڈرتا ہوں۔ کہ خدانخواستہ کہیں یہ کسی کی نگاہ کا تار نہ ہو۔

۵۔ حالیؔ۔ "اس شعر میں ازراہ تہذیب اس کا ذکر نہیں کیا جس کے کرنے کے لئے مسجد و مدرسہ و خانقاہ کو مساوی قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میکدہ جہاں حریفوں کے ساتھ شراب پینے کا لطف تھا۔ جب وہی چھٹ گیا۔ اب مسجد میں مل جائے تو، اور مدرسہ و خانقاہ میں ہاتھ آجائے تو سب جگہ پی لینی برابر ہے۔ مسجد وغیرہ کی تخصیص ازراہ شوخی کی گئی ہے۔ یعنی یہ مقامات جو اس شغل کے بالکل لائق نہیں ہیں۔ وہاں بھی میکدہ چھٹنے کے بعد پی لینے سے انکار نہیں ہے اور شراب پینے کی تصریح نہ کرنا عین مقتضائے بلاغت ہے"۔ یہ بہترین شعر ہے۔

۶۔ واعظوں کی زبانی جسقدر ہم بہشت کی تعریفیں سنتے ہیں۔ وہ سب ہم کو تسلیم ہیں لیکن خدا نہ کرے وہاں تیرا دیدار نصیب نہ ہُوا۔ تو پھر وہ ہمارے نزدیک ہیچ ہے یہ شعر مجاز میں بھی ہو سکتا ہے اور حقیقت میں بھی۔

۷۔ اوّل تو یہ ضروری ہے کہ غالبؔ جیسا باکمال شاعر تیرے ساتھ رہے لیکن خیر اگر غالب نہ بھی ہو تو کچھ مضائقہ نہیں۔ میری دعا تو یہ ہے کہ خدایا دنیا ہو اور میرا بادشاہ ہو گویا وہ ہمیشہ زندہ رہے اور بامراد زندگی بسر کرے۔ بس

یہی کافی ہے۔ (بیخود۔ آسی)

سعید۔ میری عمر بادشاہ پہ قربان ہو جائے۔ طبا طبائی۔ میری عمر بھی بادشاہ کو ملے۔

۱۱۵

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیونکر ہو ۱ کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیونکر ہو

ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال ۲ کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیونکر ہو

ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجئے ۳ حیا ہے اور یہی گومگو تو کیونکر ہو

تمہیں کہو کہ گذارا صنم پرستوں کا ۴ بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیونکر ہو

الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ ۵ جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا ۶ وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

ہمیں پھر ان سے امید اور انہیں ہماری قدر ۷ ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیونکر ہو

غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلی کا ۸ نہ ملنے دیدۂ دیدار جو تو کیونکر ہو

بتاؤ اس مژہ کو دیکھ کر کہ مجھ کو قرار ۹ یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو تو کیونکر ہو

مجھے جنوں نہیں غالبؔ ولے بقولِ حضور

فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو۔

۱- کہے سے کچھ نہ ہوا ... یعنی گفتگو ہونے پر بھی کچھ نہ ہوا۔ وہ وقت گذر گیا جب ہم یہ سوچا کرتے تھے۔ کہ اگر ان سے گفتگو کا موقع ہاتھ آئے تو کس طریقے سے گفتگو کی جائے۔ کہ ہمارا سکہ ان کے دل پر بیٹھ جائے خوش قسمتی سے ہمیں ایسا موقع مل گیا۔ لیکن ہماری گفتگو کا کچھ نتیجہ برآمد نہ ہوا یعنی وہ ہم پر پھر بھی مہربان نہ ہوئے اب کہو کیا کیا جائے دوسرا مفہوم یہ ہے کہ پہلی گفتگو سے کچھ حاصل نہ ہوا۔ تو پھر بتاؤ اب کیا ہو اور ہم کیا کریں یعنی جب پہلے کچھ نتیجہ نہ نکلا تو اب کیا نکلیگا

سعید و بیخود نے پہلا مفہوم لکھا ہے۔ اور آسی و طباطبائی نے دونوں۔

۲۔ ہمارے ذہن میں وصال کے معنی یہ ہیں۔ کہ ہم اس فکر میں غرق رہیں کہ اگر وصال نصیب نہ ہو۔ تو ہم کہاں جائیں۔ اور اگر ہو تو کیونکر ہو۔ گویا اگر ہو تو اس کے لئے کیا سامان ہونے چاہئیں اور اگر نہ ہو تو کس قسم کی کوشش کرنی چاہیئے طباطبائی لکھتے ہیں کہ اسی فکر میں ہم خوش رہتے ہیں کہ وصال کبھی نصیب نہیں ہوتا۔

۳۔ ایک طرف ہمارے دل میں ان کا لحاظ و ادب ہے۔ اور دوسری طرف اپنے دلی ارمانوں کا خیال ہے۔ گویا ہم اس کشمکش میں مبتلا ہیں کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں یہ تو ہماری حالت ہے۔ اور ان کی حالت یہ ہے کہ ان کو حیا مانع ہے اور وہ گومگو کے عالم میں پھنسے ہوئے ہیں۔ کہ کیا کریں کیا نہ کریں۔ بتاؤ پھر کام بنے تو کیونکر بنے۔

آسی۔ اگر ہمارا یہی ادب یہی اُلجھن یہی گومگو اور ان کا یہی حیا کا عالم ہے تو آخر کیونکر کام بنے گا اور کیا ہوگا۔

۴۔ ہم تم ہی سے پوچھتے ہیں۔ کہ اگر تمہاری جیسی عادت تمام دنیا کے معشوقوں کی ہو۔ تو عاشقوں کا گذارہ اس دنیا میں کیونکر ہو۔ مطلب یہ ہے کہ تم جیسے سخت گیر معشوق دنیا میں ہوں تو عاشق عشق کو ترک کر دیں۔ لیکن یہ ہماری ہی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی عشق سے باز نہیں آتے۔

۵۔ حالی۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ تم جیسے نازک مزاج شہر میں ایک دو اور ہوں تو شہر کا کیا حال ہو۔ اور دوسرے معنی یہ ہیں۔ کہ جب تم کو اپنے عکس کا بھی اپنی مانند ہونا گوارا نہیں تو شہر میں اگر فی الواقع تم جیسے ایک دو حسین موجود ہوں تو تم کیا قیامت بپا کر دو۔ آسی اور طباطبائی نے فقط پہلا مفہوم لکھا ہے۔

۶۔ جس بدنصیب شخص کو مجھ جیسا روز سیاہ نصیب ہو۔ وہ شخص مجبور ہے۔ کہ دن ہی کو رات کہے۔ کیونکہ ایسے روز سیاہ کو ہرگز دن نہیں کہا جا سکتا۔ اندازہ کرنا چاہیئے۔ کہ اس دن کی سیاہی کیسی ہوگی۔ جس کے آگے رات بھی دن معلوم ہوتی ہے۔

۷۔ جب وہ ہماری بات ہی نہ پوچھیں تو پھر ہمیں ان سے کوئی امید کیونکر ہو اور ان کو ہماری قدر کیونکر ہو۔ مطلب یہ ہے۔ کہ بات کرنے ہی سے یہ دونوں باتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ شعر میں تعقید ہے۔ اور قافیہ بنانے کے لئے "وہ" کو "دو" بنایا ہے۔ ایک اور جگہ بھی تصرف کیا ہے۔ لیکن یہ قابل اعتراض نہیں ہے

کہتے تو ہو تم سب کہ بت غالیہ مو آئے ایک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ دو آئے

۸۔ دیدار جو ..... دیدار کا طلبگار۔ ہمارے دل کو یقین تھا۔ کہ ان کا خط آنے سے ہمارے دل کو تسلی ہو جائے گی۔ اور یہ غلط نہ تھا۔ کیونکہ معشوق کے خط سے تسلی خاطر ہو ہی جاتی ہے۔ چنانچہ دل کو تسلی ہو گئی۔ لیکن دیدار کی طلبگار آنکھوں کی تسلی نہیں ہوتی۔ وہ اس کو دیکھنے ہی پر مصر ہیں، اب کیا بنے۔

۹۔ نیش ..... نشتر۔ ڈنگ۔ مژۂ یار کو نیش سے تشبیہ دی ہے پہلے کوئی اس کی مژہ کو دیکھے اور پھر مجھے بتلائے۔ کہ جس شخص کی رگ جان کے اندر ایسا نشتر چبھا ہوا ہو۔ اس کو کیونکر قرار آ سکتا ہے۔

۱۰۔ مصرعہ ثانی بہادر شاہ ظفر کا ہے۔ طبا طبائی لکھتے ہیں یہ ان کی زمین کی غزل ہے۔ مجھے جنوں نہیں ہے۔ کہ میں آپ ہی آپ بیقرار ہوں۔ فراق یار میں تسکین کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا۔ پھر تسکین ہو تو کیونکر ہو۔

۱۱۶

کسی کو دیکے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو ۱ نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں ۲ سبک بنکے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو ۳ نہ لائے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو

وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھہرا ۴ تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم ۵ گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ ۶ کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو

غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو جرم کس کا ہے ۷ نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے ۸ ہوئے تم دوست جسکے دشمن اسکا آسماں کیوں ہو

یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں ۹ عدو کے ہو لئے جب تم تو میرا امتحاں کیوں ہو

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی ۱۰ بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے اے غالبؔ

ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

۱۔ اگر کوئی کسی کو دل دے دے تو پھر اس کی فریاد کیوں کرے۔ جب ایک چیز دے چکے تو پھر اس کے لئے رونے کا کیا مطلب ہے۔ اس کے علاوہ جب سینے میں دل ہی نہ ہو۔ تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو۔ مطلب یہ ہے کہ زبان کو بھی ان ہی کی نذر کر دینا چاہیئے۔ کیونکہ دل کے بغیر زبان بیکار ہے۔ جب دل نہ رہیگا تو زبان کس کی ترجمانی کریگی۔ بیخود لکھتے ہیں۔ کہ زبان ہی کو کاٹ کر پھینک دینا چاہیئے یا کیل دینا مناسب ہے (آسی اور سعید میرے ہمخیال ہیں)

۲۔ خو... عادت۔ وضع... خودداری یا ضبط کی عادت۔ سبک سر... حقیر ہیٹے۔ سرگراں... ناراض۔ انہیں ناراض ہونے کی عادت ہے اور ہم ضبط کے خوگر ہیں۔ نہ ہم اپنی وضعداری کے خلاف جا سکتے ہیں اور نہ وہ اپنی عادت کو چھوڑ سکتے ہیں پھر ہم اُن سے یہ بات پوچھ کر حقیر کیوں بنیں۔ کہ تم ہم سے خفا کیوں ہو

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے

بقول طباطبائی اس شعر کے وہ بندش ہائی ہے۔ کہ نثر میں بھی ایسے برجستہ فقرے نہیں ہو سکتے۔

۳۔ میرے غمخوار نے مجھے بدنام کر دیا۔ اور اس کی وجہ یہ ہوئی۔ کہ وہ میرے رنج و غم کو برداشت نہ کر سکا۔ وہ ہر ایک سے کہتا پھرا۔ کہ دیکھنا میرا دوست فلاں پر عاشق ہو گیا ہے۔ دن رات مچھلی کی طرح تڑپتا ہے۔ اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ چونکہ عشق کرنا برا خیال کیا جاتا ہے۔ اور موجب رسوائی عاشق و معشوق ہوتا ہے۔ اس لئے میں زمانہ بھر میں بدنام ہو گیا۔ کہتے ہیں ایسی محبت کو آگ لگے اور میں ایسے غمخوار سے باز آیا۔ جو غم کی تاب بھی نہیں لا سکتا۔ پھر وہ میرا رازدان بننے کی کیوں جرأت کرتا ہے طباطبائی لکھتے ہیں۔ کہ انشاء پردازی داد طلب ہے

۴۔ کیسی وفا اور کہاں کا عشق جب سر ہی پھوڑنا ٹھہرا تو پھر اے سنگدل تیرا ہی سنگ آستاں ہونا کیا ضرور ہے۔ جہاں جی چاہے گا۔ سر پھوڑ لیں گے۔ غالب ؎

جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

بقول طباطبائی یہ شعر رنگ و سنگ میں گوہر شاہوار ہے آسی لکھتے ہیں کہ اس شعر کی بندش میں وہ چستی ہے جس کی تعریف غیر ممکن ہے۔

۵۔ طباطبائی لکھتے ہیں۔ اس قدر معانی ان دو مصرعوں میں سما گئے ہیں کہ ان کی تفصیل یہاں لطف سے خالی نہیں (۱) ایک طائر چمن نشیمن سے جدا ہو کر اسیر ہو گیا۔ اس مضمون پر صرف ایک لفظ قفس اشارہ کر رہا ہے (۲) اس نے اپنی آنکھوں سے باغ میں بجلی گرتے ہوئے دیکھی ہے اور قفس میں منتظر و بے

کہ نہ جانے میرا آشیانہ بچا یا جل گیا۔ اس تمام معانی پر فقط کل کا لفظ دلالت کر رہا ہے (۳) ایک اور طائر جو اس کا ہم صفیر اور ہمدم ہے۔ وہ سامنے کسی درخت پر آ بیٹھا ہے۔ اور اسیر قفس نے اس سے رودادِ چمن کو دریافت کرنا چاہا ہے مگر اس سبب سے کہ اسی کا نشیمن جل گیا ہے۔ طائر ہم صفیر مفصل حال کہتے ہوئے پس و پیش کرتا ہے۔ کہ اس کو اسیری میں نشیمن کے جلنے کی خبر کیا سناؤں یہ اس تمام مضمون پر فقط یہ جملہ دلالت کرتا ہے۔ کہ مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم (۴) علاوہ اس کثرتِ معانی کے اس مضمون نے جو دوسرے مصرعے میں ہے تمام واقعہ کو کیسا دردناک کر دیا ہے۔ یعنی جس گرفتارِ قفس پر ایک ایسی تازہ آفت و بلائے آسمانی نازل ہوئی ہے۔ اس نے کیسا اپنے دل کو سمجھا کر مطمئن کر لیا ہے کہ باغ میں ہزاروں آشیانے ہیں۔ کیا میرے نشیمن پہ بجلی گری ہوگی۔ یہ حالت ایسی ہے۔ کہ دیکھنے والوں کا اور سننے والوں کا دل کڑھتا ہے اور ترس آتا ہے۔ اور یہ ترس آجانا وہی اثر ہے۔ جو شعر نے پیدا کیا ہے۔

غرضیکہ یہ شعر ایک مثال ہے۔ ان جلیل الشان مسئلوں کی جو کہ آدابِ کائناتِ شاعری میں اہم اصول ہیں۔ ایک مسئلہ تو یہ کہ "خیر الکلام ما قل و دل" اور دوسرا مسئلہ یہ کہ "الشعر کلام ینقبض بہ النفس و ینبسط" اور یہاں انقباض خاطر کا اثر پیدا ہوا ہے۔

۶۔ تم مجھ سے یہ تو کہہ نہیں سکتے ہو کہ ہم تیرے دل میں نہیں ہیں، اچھا پھر یہ بتاؤ۔ کہ جب میرے دل میں تم ہی ہو۔ تو پھر تم میری نظروں سے کیوں پوشیدہ ہو۔ پہلے مصرعہ میں استفہام انکاری ہے۔ سعید لکھتے ہیں۔ کہ اس میں معشوقِ حقیقی کو مخاطب کیا ہے۔ آسی نے اس کے علاوہ دوسرا مفہوم یہ لکھا ہے "بیشک تم یہ کہہ سکتے ہو۔ کہ ہم دل میں نہیں ہیں لیکن اس حالت میں کہ جب تم یہ کہو کہ ہم دل میں

ہیں۔ تو پھر یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ آنکھوں سے نہاں کیوں ہو۔

۷۔ جذب دل ... کشش دل۔ تمہارا یہ شکوہ غلط ہے کہ میری کشش دل تم کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ذرا غور کرو۔ اور دیکھو۔ کہاں ہیں قصور کس کا ہے میرا ہے یا تمہارا۔ اگر تم اپنے آپ کو نہ کھینچو تو پھر کشاکش کیوں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرا جذب دل تمہیں اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اور تم مجھ سے کھنچتے دگر بز کرتے ہو اس لئے کشاکش کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر تم اپنے آپ کو نہ کھینچو تو پھر کشاکش نہ ہو۔

۸۔ یہ فتنہ ... تمہاری دوستی۔ تمہارا کسی پر مہربان ہونا اور اس کا دوست بننا اس کی خانہ ویرانی کے لئے کچھ کم ہے۔ جو آسمان بھی اس کا دشمن بنے۔ اور مفت میں اپنا نام دشمنوں میں لکھوائے۔

۹ جب تم ہمیشہ کے لئے دشمن کے ہو چکے تو میرا امتحان محبت کیوں لیتے ہو۔ اگر اس کا نام آزمانا ہے۔ تو ستانا کس کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آزمایش تو اس صورت میں درست تھی۔ جب تم نے دشمن کے حق میں فیصلہ نہ کیا ہوتا اب یہ آزمانا نہیں ہے بلکہ ستانا ہے۔ آسی نے اسی مضمون کا داغ کا شعر نقل کیا ہے۔ خوب ہے ؎

ہو چکا قطع تعلق تو جفائیں کیوں ہوں ۔۔۔ جن کو مطلب نہیں رہتا وہ ستاتے بھی نہیں

۱۰ بقول طباطبائی وحسرت۔ اس شعر کی بندش نہایت دلپذیر ہے۔ ہم نے معشوق سے کہا۔ دیکھو غیر سے ملنے میں رسوائی ہے۔ باز آجاؤ پچھتاؤ گے۔ یہ بات کا اس نے نکتی سے یہ جواب دیا کہ غیر سے ملنے میں رسوائی کیوں ہونے لگی؟ ہم نے جواب دیا۔ ہاں بندہ پرور آپ بجا فرماتے ہیں۔ سچ فرماتے ہیں۔ غور اپھر دوبارہ کہنا کہ ہاں رسوائی کیوں ہونے لگی۔ مطلب یہ ہے کہ اگر غیر سے ملنے میں

بدنامی و رسوائی نہیں ہے۔ تو پھر اور کس کام میں رسوائی ہے۔

۱۱-اے غالب تم اسے طعنہ دے کر اپنا کام نکالنا چاہتے ہو۔ بھلا کہیں ایسا ممکن ہے۔ کہ وہ تمہارے دم میں آجائے۔ اور تمہارے بے مہر کہنے سے وہ تم پر مہربان ہو جائے۔

بیخود نے طعن کی نہایت خوب تشریح کی ہے لکھتے ہیں کہ محبوب ہمیشہ کہنے کے خلاف کیا کرتا ہے۔ اور یہ بات سمجھ کر اسے نامہربان کہا ہے کہ وہ اپنی عادت کے ماتحت مہربان ہو جائے۔

۱۱۷

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو ۱ ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے ۲ کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار ۳ اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

۱-اب کا لفظ بتا رہا ہے کہ جو لوگ ہمدم و ہم سخن اور ہمسایہ و ہم وطن ہیں۔ اُن سے کوئی رنج ضرور پہنچا ہے یہی وجہ ہے کہ شاعر ان سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔ اور چاہتا ہے۔ کہ کسی ایسی جگہ جا کر رہے جہاں ان لوگوں میں سے کوئی نہ ہو تاکہ پھر رنج پہنچنے کا کوئی امکان ہی نہ رہے اقبال سے

دنیا کی محفلوں سے اُکتا گیا ہوں یارب کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

۲-اب ہمیں ایک بے در و دیوار سا گھر بنانا چاہیے۔ جب در نہیں ہوگا۔ تو پاسباں بھی نہ ہوگا۔ اور دیوار نہ ہوگی تو کوئی ہمسایہ بھی نہ ہوگا۔ مطلب یہی ہے کہ ہمسایوں اور پاسبانوں سے بھی نفرت ہو گئی ہے۔

۳-چونکہ یہ لوگ منافق ہیں۔ اور ان کے ہاتھوں شاعر کو دکھ پہنچا ہے اس لئے وہ ایسے لوگوں کی تیمارداری اور نوحہ خوانی بھی پسند نہیں کرتا کس طمینان قلب کیا

کہتا ہے۔ کہ وہاں کس قدر آرام و سکون ہو گا۔ کہ اگر ہم بیمار پڑ جائیں گے تو کوئی تیمار دار نہ ہوگا۔ اور اگر مر جائیں گے تو کوئی نوحہ خواں نہ ہو گا۔ گویا وہ لوگ جن سے نفرت ہے اور جن کی شکل دیکھنی بھی گوارا نہیں وہ کسی صورت بھی سامنے نہ آئیں گے۔

ردیف "ہ"

از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ ــــ طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ

سورج سے لے کر ذرہ تک ہر چیز دل ہی دل ہے اور دل بصورت آئینہ ہے گویا طوطی کو ہر سمت آئینے ہی آئینے اپنے مقابل نظر آتے ہیں وہ آئینہ خانے میں ہے اور ہر طرف سے اسے اپنی شکل نظر آتی ہے۔ آئینہ اور طوطی کا مضمون مشہور ہے) مطلب یہ ہے کہ تمام کائنات وجود واحد کا پرتو ہے (حسرت ناستی) طباطبائی نے اس کی یہ تاویل نکالی ہے۔ کہ عالم میں رخ و سرخ اور دل و دل باہم دگر آئینہ ہیں یعنی ان کو ان میں اپنی صورت دکھائی دیتی ہے اور اس کو اس میں غرض یہ کہ سارا عالم متحد بوجود واحد ہے۔ اور ایک دوسرے سے غیر نہیں۔ یہ اس میں اپنے تئیں اس طرح دیکھتا ہے جیسے آئینہ میں کوئی دیکھے جب یہ حالت ہے تو طوطی جس طرف رخ کرے آئینہ سامنے موجود ہے اور طوطی محض استعارہ ہے مراد اس سے وہ شخص ہے جسے یہ اتحاد دکھائی دے اور وجد و حال میں نعرۂ انا الحق بلند کرے۔ بیخود اور سعید دونوں بسر سے ہمخیال ہیں فقط بیخود نے طوطی سے مراد عارف لیا ہے۔ اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ کہ ہستی مطلق کے سوا اور کوئی ہستی نہیں۔

ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غمکدہ ۱ جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

ناچار بے کسی کی بھی حسرت اٹھائیے ۲ دشواریٔ رہ و ستم ہمرہاں نہ پوچھ

۱۔ جب کوئی مکان مدتوں غیر آباد اور منہدم پڑا رہتا ہے تو بارشوں سے اس میں سبزہ اُگ آتا ہے کہتے ہیں۔ میرے غمکدہ میں میری گریہ زاری کی برسات سے ہر طرف سبزہ اُگ آیا ہے۔ گویا میرا غمکدہ سبزہ زار بن گیا ہے اور اس میں بہار آئی ہے۔ گھر میں سبزہ اُگنا ویرانی کی نشانی ہے جس گھر کی بہار یہ ہے۔ کہ وہ بالکل ہی ویران ہو گیا ہے اور خزاں سے بھی بدتر ہے اس کی خزاں کی بابت نہ پوچھو۔ کہ وہ کس قیامت کی ہو گی ؎

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالبؔ
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر ۔ مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

۲۔ ہمرہاں ۔۔۔ ہمراہی۔ معینٰ۔ ایک تو راستہ ہی دشوار تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ ہم کو جو ساتھی ملے وہ بھی ظالم نکلے۔ قطع نظر اس کے ہم اپنے آپ کو بیکس بھی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ گو وہ ظالم ہی تھے۔ لیکن ہمارے ساتھ تو موجود تھے پس مجبوراً بیکسی کی حسرت دل ہی میں رہی (حسرت)

آسی۔ مجبوراً ہم کو اب بیکسی کی بھی حسرت اُٹھانی پڑتی ہے یعنی ایسی چیز کی حسرت کرتے ہیں جس کی کوئی حسرت نہیں کرتا۔ مگر بیکسی کو ہم ایسے ہمراہیوں کے ہونے سے اچھا جانتے ہیں جو ظالم ہیں اور جن کی وجہ سے راستہ طے ہونا دشوار ہو گیا ہے۔

بیخود۔ راہ کی دشواریاں اور ہمراہیوں کے ستم کا حال مجھ سے نہ پوچھو وہ اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ مجبور ہو کر میں نے یہ ارادہ کر لیا ہے کہ اب بیکسی اور تنہائی کی حسرت اٹھانی چاہیئے۔ ایسے دشوار گذار راستے میں ان خود ظالموں کا ساتھ

ٹھیک نہیں ہے۔

طباطبائی نے دوسرے مصرعہ کو دشواری رہ وستم ہمرہان نہ پوچھ، سمجھ کر شرح لکھی ہے یعنی ہمراہیوں کے ہاتھ سے جو ستم مجھ پر ہوتا ہے۔ اس مصیبت کا کاٹنا دشوار ہے۔ کہ اس کی دشواری کچھ نہ پوچھو حسرت ہوتی ہے کہ کاش ہم بیکس و تنہا ہوتے۔

ردیف "ی"

۱۱۹

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے	۱	طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے
ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق	۲	یعنی ہنوز منتِ طفلاں اٹھائیے
دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم	۳	اے خانماں خراب نہ احساں اٹھائیے
یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجئے	۴	یا پردۂ تبسمِ پنہاں اٹھائیے

۱۔ صد جلوہ ... سینکڑوں جلوے۔ مژگاں اٹھایئے ... نظر اٹھا کر دیکھئے۔ اگر ہم آنکھ اٹھا کر دیکھیں محبوب حقیقی کے سینکڑوں جلوے نظر آتے ہیں۔ مگر ہم میں اتنی تاب و طاقت نہیں۔ کہ نظارہ کا احسان اٹھائیں مطلب یہ ہے کہ وہ تو سینکڑوں صورتوں سے جلوہ گر ہے۔ ہم ہی میں اتنی طاقت نہیں کہ اس کو دیکھ سکیں۔

۲۔ برات ... وہ کاغذ یا فرمان جس کی رو سے خزانہ سے روپیہ وصول کیا جاتا ہے یعنی چک معاشِ جنون کا فرمان پتھروں پر لکھا گیا ہے اور نشانہ سنگ

طفلاں ہونا لوازمات جنوں میں سے ہے۔ اس لیئے ہمیں جنون و دیوانگی میں بھی پتھر مارنے والے لڑکوں کا احسان اٹھانا پڑے گا۔ مطلب یہ ہے جنون میں کسی کا احسان اُٹھانے کی ضرورت باقی نہ رہنی چاہیئے تھی لیکن معلوم ہُوا کہ جنون عشق میں دیوانہ ہو کر بھی احسان اُٹھانا پڑتا ہے کیونکہ جنون کی معاش سنگِ طفلاں مقرر ہوتی ہے۔

۳۔ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ دُنیا میں کسی کا احسان نہیں اُٹھانا چاہیئے۔ کیونکہ احسان ایسا بوجھ ہے جس کو بے جان دیوار بھی برداشت نہیں کر سکتی پھر انسان کا کیا ٹھکانہ ہے۔ دیوار کے جُھک جانیکو مزدور کے احسان کا نتیجہ قرار دیکر خانماں خراب شخص کو عبرت دلاتے ہیں۔ کہ وہ مکان کی تعمیر سے باز آئے۔

۴۔ میرے دل میں رشکِ رقیب کی وجہ سے گھاؤ پڑ گئے ہیں اور محبوب یہ کہہ کر مجھے رسوا کرتا پھرتا ہے کہ یہ رشک سے مرا جاتا ہے اور ہر وقت جلتا ہے کہتے ہیں۔ یا تو آپ میرے زخمِ رشک اس طرح رسوا نہ کریں۔ یا یہ جو آپ رقیب کے ساتھ چھُپ چھُپ کر ہنستے ہیں۔ اس پردہ کو اُٹھا دیں یعنی اس طرح سے ہنسنا چھوڑ دیں۔ کیونکہ آپ کے تبسم ہائے پنہاں کی موجودگی میں میرا رشک کرنا بجا و درست ہے آسی لکھتے ہیں کہ زخمِ رشک کو رسوا کرنا محض پردہ اور تبسم پنہاں کی رعایت سے کہا ہے۔ یہ شعر بیت الغزل ہے اور اس کی بندش بے انتہا چست۔

۱۲۰

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیئے ۱ بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیئے

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر ۲ آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیئے

دے داد اے فلک دلِ حسرت پرست کی ۳ ہاں کچھ نہ کچھ تلافیِ مافات چاہیئے

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوّری ۴ تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیئے
مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو ۵ اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیئے
ہے رنگِ لالہ و گل و نسرین جدا جدا ۶ ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیئے
سر پائے خم پہ چاہیئے ہنگامِ بیخودی قطعہ رُو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیئے
یعنی بحسبِ گردشِ پیمانہ صفات ۸ عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیئے
۹ نشو و نما ہے اصل سے غالبؔ فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیئے

۱۔خرابات...... شراب خانہ۔آنکھ کو بوجہ مستی شراب خانہ اور محراب ابرو کو محراب مسجد سے مشابہت ہے۔ اسی مشابہت کو مسجد و شراب خانے کے قریب قریب ہونے کی دلیل قرار دیا ہے۔قبلۂ حاجات سے واعظ کی طرف اشارہ ہے اے قبلۂ حاجات یعنی حضرتِ واعظ دیکھ لیجیے۔ اللہ تعالےٰ نے آنکھ کے پاس ابرو کو بنایا ہے۔ اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ کہ مسجد کے زیر سایہ شراب خانہ ضرور ہونا چاہیئے۔ آسی اور حسرتؔ کا خیال ہے کہ کعبوں کا لفظ یہاں بہت برا معلوم ہوتا ہے۔

۲۔مکافات...... بدلہ تلافی۔خداوند تعالےٰ عادل ہے۔وہ ظالم کو ظلم کی سزا ضرور دیتا ہے۔آپ نے اپنے عاشق پر ظلم کیئے۔ آخر خداوند تعالےٰ نے اس کی تلافی اس طرح سے کی۔ کہ آپ کسی پر عاشق ہو گئے۔اب آپ کو اس کے ظلم ہماری طرح برداشت کرنے پڑیں گے۔ گویا آپ کو ان ظلموں کا بدلہ ملے گا۔ جو آپ نے ہم پر کیئے ہیں بس آپ کے ستم کی مکافات ہے۔

۳۔مافات...... جو گذر چکا۔ اے فلک تو نے میری حسرتوں کا خون کر دیا اب کوئی آرزو تو پوری کر دے۔ کہ جس سے میری خون شدہ حسرتوں کی کچھ نہ کچھ

تلافی ہوجائے۔ لفظ ہاں سے شعر میں جان پڑ گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے فلک کو آمادہ ہی کر رہے ہیں۔ دوسرا لطیف پہلو یہ ہے۔ کہ اگر کوئی حسرت پوری نہ کی جائے تو خیر کچھ مضائقہ نہیں۔ اب میرے دلِ حسرت پرست کی کچھ داد ہی دیدے تاکہ کچھ تلافی مافات ہو جائے۔

۴۔ ملاقات کرنے کے لئے ہمیشہ کسی تقریب کی ضرورت ہوا کرتی ہے اور حسینوں کو فنِ مصوری سے خاص دلچسپی ہوتی ہے۔ اس لئے ہم نے مصوری سیکھ لی ہے۔ تاکہ اس سلسلے میں ہماری ان سے ملاقات ہو سکے۔ گویا وہ اپنی تصویر اتروانے کے لئے ہمیں بلایا کریں۔

طباطبائی اور بیخود کا خیال ہے کہ مصوری سے شاعری مراد ہے۔ غالبؔ

خود را همی به نقش طرازی علم کنم   تا با تو خوش نشینم و نظاره هم کنم

۵۔ شراب نوشی سے میرا مقصد عیش و نشاط ہرگز نہیں۔ بلکہ تو شراب محض بیخود اور خود فراموش ہونے کے لئے پیتا ہوں۔ تاکہ رنج و تعب میرے دل و دماغ پر محیط نہ ہونے پائیں۔ اور میں شب و روز اپنے آپ کو بھولے رہوں۔

۶۔ اثبات ...... ثابت کرنا۔ لالہ۔ نسرین (سیوتی) گل وغیرہ کے رنگ علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں۔ لیکن اہلِ نظر کے نزدیک رنگ اور صورت کا اختلاف کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ان کو ہر رنگ میں بہار کا ثبوت ملتا ہے بقول سعید۔ گو کائنات کی مختلف شکلیں ہیں۔ لیکن جلوہ حقیقی ہر ایک میں موجود ہے۔

۷۔ (قطعہ) بیخودی کے عالم میں سرپائے خم پر اور دعا کے وقت منہ قبلہ کی طرف ہونا چاہیئے (تمام متفق)

سعید لکھتے ہیں۔ صوفیا کے نزدیک کفر بھی مظہرِ ذات ہے۔ کیونکہ کفر دین کی

ضد ہے۔ اور اضداد کا مخرج وہی واجب الوجود ہے۔ پس اگر بیخودی اور استغراق کے وقت سر پائے خُم پر رکھا ہو اور دعا کے وقت منہ قبلہ کی طرف کر لیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔

۸۔ یعنی پیمانۂ صفاتِ الٰہی کی گردش کے مطابق عارف کو ہمیشہ مے ذات سے مست و بےخود رہنا چاہیے۔ کیونکہ صفات بھی لوازمِ ذات ہیں۔

۹۔ فروع ۔۔۔۔ فرع۔ شاخ، ٹہنی، اصل ۔۔۔ جڑ۔ خاموشی کو اصل (جڑ) اور باتوں کو فروع (شاخیں) قرار دیا ہے کہتے ہیں۔ اے غالبؔ جس طرح جڑ سے شاخوں کی نشو و نما ہوتی ہے اسی طرح جو بات نکلتی ہے وہ خاموشی ہی سے نکلتی ہے۔ انسان کا قاعدہ ہے۔ کہ وہ بات کرنے سے پہلے خاموش ہو جاتا ہے کچھ سوچتا ہے اور پھر زبان سے کہتا ہے گویا ہر بات کی اصل خاموشی ہے۔

بقول حسرتؔ دوسرا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ جو بات چاہیے وہ خاموشی ہی سے نکلتی ہے۔ یہاں "یہ بات نکلتی ہے" یعنی محاورۂ مشہور لیا جائے گا مثلاً کہتے ہیں کہ فلاں کی دیوانگی میں بھی ایک بات نکلتی ہے۔

۱۲۱

۱ بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی — سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی

۲ رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے — تکلف برطرف تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی

۳ خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے — مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی

۴ نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم — کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی

۵ نہ اتنا بُرّشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ — مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی

۶ مئے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے — لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

۷ مرے دل میں ہے غالبؔ شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں — خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

ا۔میرے بساطِ عجز میں محض ایک دل تھا۔اور وہ بھی ایک قطرۂ خون سے زیادہ حقیقت نہ رکھتا تھا۔اب اس کی یہ حالت ہے۔کہ رنج وغم سے ہر وقت وہ سرنگوں رہتا ہے۔اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی ابھی ٹپک جائے گا۔

سعید۔اپنے دل کو خون کے ایک ٹپکتے ہوئے قطرے سے تشبیہہ دے کر اس کی لاچاری اور عاجزی کی کیا خوب تصویر کھینچی ہے۔بقول آسی۔غالب نے ترقی در ترقی کا منظر دکھایا ہے۔بساطِ عجز، اس میں ایک دل دل بھی ایک قطرۂ خون، قطرۂ خوں بھی آمادۂ چکیدن آمادۂ چکیدن بھی بحالت سرنگونی۔لطف سے خالی نہیں۔

۲۔ہم اس شوخ سے چند دن تکلف اور تصنع سے آزردہ اور ناراض رہے تکلف برطرف وہ بھی ہمارا ایک اندازِ جنون تھا۔ورنہ حقیقتاً ہم اس سے خفا نہ تھے۔طباطبائی اور بیخود لکھتے ہیں۔کہ دوسرے معنی میں تکلف کے معنی شرم ولحاظ کے ہیں۔آسی۔دوسرا مفہوم تکلف سے ہم اس سے آزردہ تھے۔تکلف کو اٹھا دیا تو معلوم ہوا۔کہ وہ ایک اندازِ جنوں تھا۔ورنہ معشوق سے آزردہ ہونا اپنے آپ سے آزردہ ہونا ہے۔

سعید کی مزید تشریح ملاحظہ ہو۔بناوٹ سے آزردگی اس لئے تھی کہ وہ مہربانی سے پیش آئے۔لیکن اب صاف کہنا پڑتا ہے۔کہ وہ بھی ایک اندازِ جنون تھا۔ورنہ معشوق کہیں ایسی باتوں سے پگھلا کرتے ہیں۔

۳۔صیدِ زبوں ... مرغِ شکار۔تمنا کو دام اور خیالِ مرگ کو صیدِ زبوں قرار دیا ہے۔صرف موت کا خیال میرے دلِ آزردہ کو کیا تسکین دے سکتا ہے کیونکہ میرے تمنا کے جال میں خیالِ مرگ جیسے سینکڑوں شکار پھنسے ہوئے ہیں۔ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔تسکین تو اس وقت ہوتی جب تمنائے مرگ سب سے زبردست

تمنا ہوتی اور وہ دامِ تمنا میں گرفتار ہوتی ۔ مشکل یہ آپڑی ہے ۔ کہ وہ ایک صیدِ زبوں ہے ۔ اس لئے اس کے پھنس جانے سے کوئی خاص تسلی نہیں ۔ قاعدہ ہے ۔ کہ موٹے شکار کو پھنسا کر دل خوش ہوا کرتا ہے ۔ پھر صیدِ زبوں کے شکار سے کیا خوشی اور تسلی ہو سکتی ہے ۔

۴ ۔ اے ہمدم میرا خیال تھا ۔ کہ نالہ کرنے سے دل کی بھڑاس نکل جائیگی اگر مجھے اس بات کا پہلے سے اندازہ ہوتا ۔ کہ اس سے دردِ دل بڑھ جائیگا ۔ تو میں ہرگز نالہ نہ کرتا ۔

۵ ۔ بُرش ۔ ۔ ۔ ۔ کاٹ ، تیزی ۔ بُرش کو بربنائے جوہر موج سے تشبیہ دی ہے آپ اپنی تیغِ جفا کی بُرش پر اتنا ناز نہ کریں میرے نزدیک آپ کی تیغِ جفا کی بُرش معمولی چیز ہے ۔ کیونکہ میرے دریائے بیتابی میں یہ بُرش ایک موجِ خون سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی ۔ یہاں ایسی سینکڑوں موجیں تلملا رہی ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ میں محض آپ کی تیغ تیز ہی کا کشتہ نہیں ۔

۶ ۔ ایک دو ۔ چار ۔ ۔ ۔ ۱+۲+۴ = ۷ ، آسمان سات ہیں ۔ جامِ واژگوں ۔ ۔ ۔ ۔ اوندھے جام یعنی خالی جام ہم ساقیٔ گردوں سے شرابِ عیش کی آرزو کیا خاک کریں ۔ وہ تو خود ہی ایک ۔ دو ۔ چار ۔ سات الٹے (خالی) پیالے لئے بیٹھا ہے بھلا اس کے پاس شرابِ عیش کہاں ۔

۷ ۔ میرے دل میں وصل کا شوق اور ہجر کا شکوہ بھرا ہوا ہے ۔ خدا وہ دن کرے ۔ کہ میں ان کے سامنے وصل کے شوق کا اظہار کروں اور ان کو ہجر کا شکوہ سناؤں اس شعر میں تخلص ذو معنی استعمال ہوا ہے جس سے شعر کا لطف دوچند ہو گیا ہے ۔

۱۲۲

ہے بزمِ بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے ۔ تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے

ہے دورِ قدح وجہ پریشانی صہبا ۲ یکبار لگا دو خمِ مے میرے لبوں سے

زندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں زاہد ۳ زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں سے

بیدادِ وفا دیکھ کہ جاتی رہی آخر ۴ ہر چند مری جان کو تھا ربط لبوں سے

۱۔ خوشامد طلب معشوقوں سے ہم ایسے تنگ آتے ہیں کہ سخن لبوں سے آزردہ ہوگیا ہے۔ گویا ان کی محفل میں اب بات چیت کرنے کو بھی ہمارا جی نہیں چاہتا۔ دوسرا مفہوم یہ ہو سکتا ہے۔ کہ محفل معشوق میں سخن لبوں سے اٹھ گیا ہے اور چاہتا ہے۔ کہ میں اس کی خوشامد کروں تو وہ لب تک آئے۔ گویا رعبِ حسن سے معشوق کے سامنے بات بھی منہ سے نہیں نکلتی۔

۲ صہبا... شراب۔ دورِ قدح... باری باری یا ٹھہر ٹھہر کر شراب پینا خم... مٹکا شراب کا۔ ٹھہر ٹھہر کر تھوڑی تھوڑی شراب پینا شراب کی پریشانی کا باعث ہے۔ کیونکہ اس طرح سے شراب تقسیم ہو جاتی ہے۔ اس لئے مناسب یہ ہے کہ ایک ہی بار شراب کا خم میرے منہ سے لگا دو۔ تاکہ شراب بھی پریشان نہ ہو اور میرا دل بھی سیر ہو جائے۔ اس ترکیب سے فائدہ یہ متصور ہے کہ جس طرح خم میں شراب ایک جگہ تھی۔ اسی طرح میرے دماغ میں بھی یکجا محفوظ رہیگی ذا گڑ گڑ پینے کا خوب پُر لطف سبب نکالا ہے۔

۳۔ طرف نہ ہونا... منہ نہ لگنا۔ اے زاہد رندانِ درِ میکدہ نہایت گستاخ اور منہ پھٹ واقع ہوتے ہیں۔ دیکھنا ان سے کہیں کچھ کہہ نہ بیٹھنا، یہ آپ کے وعظ و نصیحت کی تاب ہرگز نہ لائیں گے۔

۴۔ جاتی رہی... جان جاتی رہی، جدائی ہوگئی۔ ربط... تعلق، دوستی۔ میری جان ہمیشہ لبوں پر رہا کرتی تھی۔ اس لئے اس کو لبوں سے بہت محبت تھی۔ لیکن بیدادِ وفا نے اس کو لبوں سے جدا کر دیا۔ اور دو دوستوں کو جدا کرنا

بہت بڑا ظلم ہے۔

۱۲۳

تاہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا ۱ سن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے
غالب ترا احوال سُنا دیں گے ہم اُن کو ۲ وہ سُن کے بلا لیں یہ اجارا نہیں کرتے

۱۔معشوق کی شوخی اور سفاکی بیان کی ہے کہتے ہیں محض اس لئے کہ ہمیں یہ شکایت کرنے کا موقع نہ ملے۔ کہ آپ کو ہمارے ذکر سے بھی نفرت ہے وہ ہمارا ذکر تو سن لیتے ہیں لیکن اس کو سُن کر وہ اپنی زبان سے کچھ نہیں کہتے۔ افسوس وہ یہ نہیں سمجھتے کہ یہ ہم پر اور بھی زیادہ ظلم ہے۔ کیونکہ اُن کی اس روش سے شکایت دُور نہیں ہوتی۔

۲۔اجارہ ... ٹھیکہ، ذمہ یہ شعر نہایت بلیغ اور دقیق ہے۔ کہتے ہیں۔ غالب ہم تیرا احوال ان کو کسی نہ کسی طرح سُنا تو ضرور دیں گے۔ لیکن اس بات کا ذمہ نہیں لیتے۔ کہ وہ اسے سُن کر تجھ کو اپنے پاس بلا لیں۔ پہلے مصرعہ سے عاشق کی زار حالی اور بیتابی کا پتہ چلتا ہے۔ اور دوسرے سے معشوق کے غرورِ حسن اور غمزہ و ناز کا۔

گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اُسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے

میرے گھر رکھا ہی کیا تھا کہ غمِ عشق اس کو غارت و برباد کرتا۔ ہاں ایک حسرتِ تعمیر تھی۔ سو وہ ابھی تک غمِ عشق کی دستبرد سے محفوظ ہے کاش کہ وہ اُس کو بھی غارت کر دیتا۔ غالب ؎

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

۱۲۴

غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اُٹھانے کی ۱ فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی
کھلیگا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا یارب ۲ قسم کھائی ہے اس کافر نے کاغذ کے جلانے کی
لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے ۳ ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی
انہیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا ۴ اٹھے تھے سیرِ گل کو دیکھنا شوخی بہانے کی
ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا ۵ ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی
لکد کوبِ حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی ۶ مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی

۷ کہوں کیا خوبیٔ اوضاعِ ابنائے زماں غالبؔ
بدی کی اس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

۱۔ حالی یعنی جب غمِ دنیا سے سر اٹھانے کی فرصت ملتی ہے۔ تو سر اُٹھاتے ہی آسمان پر نظر جا پڑتی ہے۔ اور چونکہ وہ جفا پیشہ ہے۔ اس کے دیکھتے ہی تو یاد آجاتا ہے۔ اب دوسرا غم شروع ہو جاتا ہے۔ غرض کہ کسی حالت میں غم سے نجات نہیں۔" مطلب یہ ہے کہ اول تو دنیا کی وجہ سے بالکل فرصت نہیں ملتی اگر فرصت ملتی ہے تو پھر غمِ عشق دامنگیر ہو جاتا ہے

۲۔ کسی بات کی قسم کھانا۔ یعنی کسی کام کو نہ کرنے کا عہد کر لینا کہتے ہیں۔ پہلے وہ میرے خط کو جلا دیا کرتا تھا۔ اور خط کے جلنے سے اس پر میرے سوزِ غم کا حال واضح ہو جاتا تھا۔ لیکن اب اس کافر نے عہد کر لیا ہے۔ کہ وہ میرے خط کو ہرگز نہ جلائیگا۔ اے خدا اب میرے سوزِ غم کا حال اسے کیونکر معلوم ہو گا۔ بخود طباطبائی (حسرت) سعید اور آسی لکھتے ہیں۔" اے خدا میرے مکتوبِ شوق کا مضمون اس پر کیونکر ظاہر ہو گا۔ کیونکہ اس کافر نے قسم کھائی ہے۔ کہ اب اس کاغذ کو جو بطریق خط میرے پاس آئیگا یا ہر کاغذ کو میں جلا دوں گا۔ تو یقیناً اب وہ میرے مکتوب سے باخبر نہیں ہو

سکتا"۔ یہ مفہوم محاورہ کے خلاف ہے۔

۳۔ پرنیاں ... حریر، ریشم، ایک قسم کا ریشمی کپڑا جس کو آگ لگ جاتی ہے باریک ریشمی کپڑے کو اگرچہ بہت جلد آگ لگ جایا کرتی ہے۔ مگر انسان اُس میں شعلۂ آتش کو لپیٹ سکتا ہے۔ لیکن دل میں سوزِ غم کو نہیں چھپا سکتا۔ پس ثابت ہوا۔ کہ دل پرنیاں سے بھی زیادہ نازک ہے۔ اور وہ سوزِ غم کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ شعلۂ آتش اور سوزِ غم کا فرق ظاہر ہے۔

۴۔ اِن کا ارادہ یہ تھا۔ کہ وہ اپنے زخمیوں کو جا کر دیکھ آئیں۔ ذرا اِن کے بہانے کی شوخی ملاحظہ ہو۔ کہ انہوں نے سیرِ گل کا بہانہ کیا۔ گویا وہ زخمیوں کو دیکھنے کو سیرِ باغ خیال کرتے ہیں۔ شاعر نے اسی کو بہانے کی شوخی قرار دیا ہے

۵۔ یہ ہماری سادگی تھی کہ ہم تیرے التفاتِ ناز پر مر مٹے۔ گویا یہ سمجھے کہ یہ تو نے خاص التفات فرمایا ہے کہ یہاں تک آیا ہے۔ اے ظالم تو بیشک آیا لیکن تو نے آتے ہی کہنا شروع کیا۔ کہ بس ہم جاتے ہیں۔ یہ تیرا آنا نہ ہُوا۔ بلکہ تیرے چلے جانے کا پیش خیمہ ٹھہرا۔ اس لئے ہم تیرے التفاتِ ناز پر مرنے کو سادگی قرار دیتے ہیں التفات کو التفاتِ ناز سمجھتے ہیں۔ ناز و انداز کا پہلو یہ ہے۔ کہ ابھی آئے اور ابھی چلے۔

۶۔ لگد کوب ... لات مارنا۔ لینا ڈ۔ پہلے مجھ میں اتنی طاقت تھی۔ کہ میں بتوں کے ناز بخوبی اٹھا لیا کرتا تھا لیکن اب یہ حال ہے۔ کہ میں حادثات کی لگد کوبی کو بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ شاعر کے خیال میں بتوں کے ناز حوادثات سے بہت بڑھے ہوئے ہیں

آسی نے دوسرا مفہوم یہ نکالا ہے۔ کہ میری طاقت ضامن اس بات کی تھی۔ کہ بتوں کے ناز اٹھائے۔ آخر یہ اس کے ساتھ لگد کوب حوادثات کا طوفان کیسا آیا میری طاقت اس کا تحمل کرنے کے لئے تیار نہیں۔

۷۔ اوضاع ... جمع وضع کی۔ ابنا ... جمع ابن کی۔ ابنائے جہاں یعنی اہلِ جہاں

بطور طنز کہتے ہیں کہ میں اہل دنیا کی خوبیٔ وضع کیا بیان کروں بس یہ سمجھ لو کہ جس سے ہم نے بار ہا نیکی کی اس نے ہمارے ساتھ ہمیشہ بدی کی گویا ہمیں نیکی کا صلہ بدی ملا۔

۱۲۵

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ اے آرزو خرامی ۱ دل جوشِ گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی

اس شمع کی طرح سے جسکو کوئی بجھاوے ۲ میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

۱۔ حاصل.... پیداوار، محصول۔ ہاتھ دھو بیٹھ... ناامید ہو جا۔ آرزو خرامی... طبا طبائی نے اس کے معنی خرام حسبِ آرزو قرار دیئے ہیں اور آرزو کا چکر لگانا اور گشت کرنا مراد لیتے ہیں۔ ڈوبی ہوئی آسامی... وہ کاشتکار جس سے لگان وصول ہونے کی امید نہ ہو۔ دل کو ڈوبی ہوئی آسامی اس لئے کہا ہے کہ جوشِ گریہ سے کسی فائدے کی امید معلوم نہیں ہوتی۔ طبا طبائی۔ جوشِ گریہ سے کوئی ثمرہ حاصل نہ ہوگا کہ حسبِ آرزو اور موافق مراد خرام کر سکوں۔ دل کو ڈوبی ہوئی آسامی سمجھنا چاہیئے کہ اس کا ریاض بے ثمر رہا۔

بیخود۔ اے آرزو تو گریہ پر بھروسہ کرکے اپنی مراد حاصل کرنی چاہتی ہے اور گریہ کی بے اثری دل کو لے ڈوبی ہے۔ تیرے حسبِ مراد کوئی کام نکلتا معلوم نہیں ہوتا۔

آسی۔ آرزو۔ تو جو دل میں پھرتی ہے۔ اور امید رکھتی ہے کہ جوشِ گریہ سے کوئی نفع حاصل ہوگا۔ یہ خیال خام ہے۔ اس سے ہاتھ دھو بیٹھ یعنی ناامید ہو جا۔

۲۔ ہوں داغِ ناتمامی... مجھ کو اپنے ناتمام رہنے کا افسوس (داغ) ہے۔ میں اس شمع کی مثل ہوں جسے جلتے جلتے کسی نے بجھا دیا ہوں۔ اور وہ پوری طرح نہ جلنے پائی ہو یعنی میں پوری طرح جلنے نہ پایا تھا۔ کہ مجھ کو کسی نے بجھا دیا ہے

لئے مجھے اپنے ناتمام رہ جانے کا افسوس ہے ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔ ع

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے

اے ناتمامیٔ نفسِ شعلہ بار حیف

۱۲۶

جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے ۱ کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے ۲ ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
غافل کو میرے شیشے پہ مے کا گمان ہے ۳ حالانکہ ہے یہ سیلیٔ خارا سے لالہ رنگ
آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے ۴ کی اس نے گرم سینۂ اہل ہوس میں جا
بس چپ ہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے ۵ کیا خوب تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا
فرماں روائے کشورِ ہندوستان ہے ۶ بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں
کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے ۷ ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
غالب ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہربان ہے ۸ ہے بارے اعتمادِ وفاداری اس قدر

۱۔ بیضۂ مور... چیونٹی کا انڈا۔ بہت چھوٹی چیز ہے ہم ستم زدوں کا جہان اس قدر تنگ ہے کہ اس کا آسمان ایک چیونٹی کا انڈا ہے۔ آسمان چونکہ روئے زمین پر محیط ہوتا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جائے گا۔ کہ ستم زدوں کا جہان اس آسمان سے کتنا چھوٹا ہو گا۔

سعید لکھتے ہیں۔ کہ ہم اس قدر مظلوم اور ستم زدہ ہیں کہ چیونٹی کا انڈا بھی جس کی کوئی حقیقت نہیں ہم پر ظلم کرنے کو آسمان بنا ہوا ہے۔ اسی کا گمان ہے کہ جہان میں ہمارے لئے کوئی ٹھکانا نہیں۔ مجبوراً اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ کہ مظلوم آدمی یہ سمجھ لیتا ہے کہ میرے لئے دنیا سمٹ کر بہت ہی تنگ دائرہ میں آ گئی ہے۔ نہ میرا کوئی معاون ہے نہ فریاد رس۔

۲۔ ذرہ ایک بے جان چیز ہے۔ لیکن جب آفتاب کا پرتو اس پر پڑتا ہے۔ تو اس میں جان پڑ جاتی ہے چنانچہ سورج کی روشنی میں لاتعداد ذرات ہمیں حرکت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ بالکل اسی طرح تیرے ذوق کی بدولت کائنات میں جان پڑ گئی ہے۔ اور وہ بتقاضائے فطرت ذرات کی مانند تیری طرف دوڑ رہی ہے۔ گویا کائنات کی حیات تیرے پرتو سے ہے ؎

ہے تجلی تری سامانِ وجود　　　ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں۔

۳۔ سیلی .... تھپڑ، خارا۔ پتھر یعنی ضربِ سنگ۔ میرا شیشہ پتھر کی ضرب سے لالہ رنگ (سُرخ) ہو رہا ہے۔ لیکن غافل یہ سمجھتا ہے۔ کہ اس میں سُرخ شراب بھری ہوئی ہے۔ طباطبائی اعتراض کرتے ہیں۔ کہ پتھر کی چوٹ سے شیشہ ٹوٹ جاتا ہے۔ لالہ رنگ نہیں ہوتا لیکن قیاس یہ کہتا ہے۔ کہ مصنف نے شیشہ سے دل کا استعارہ لے کر اس کو لالہ رنگ کہا ہے۔

۴۔ جا گرم کرنا۔ جب کوئی شخص کسی مقام پر دیر تک بیٹھے تو جگہ گرم ہو جاتی ہے اسی لئے جا گرم کردن فارسی کا محاورہ ہے۔ اور اس سے مراد مستقل طور پر کسی جگہ قیام کرنا ہے۔ اہلِ ہوس .... رقیب۔ اُس نے سینہ اہلِ ہوس میں اپنی مستقل جگہ بنا لی ہے بھلا اس کو اہلِ ہوس کا سینہ پسند کیوں نہ آئے گرمیٔ عشق اس میں بالکل نہیں۔ اس لئے وہ ٹھنڈا مکان ہے۔ اور ٹھنڈے مکان کو ہر شخص پسند کرتا ہے۔

۵۔ حالی۔ ہمارے بھی منہ میں زبان ہے"۔ اس میں دو معنی رکھے ہیں ایک یہ کہ ہمارے پاس ایسے ثبوت ہیں۔ کہ اگر ہم بولنے پر آئے تو تم کو قائل کر دینگے اور دوسرے شوخ معنی یہ ہیں۔ کہ ہم زبان سے چکھ کر بتا سکتے ہیں کہ غیر نے بوسہ لیا ہے یا نہیں۔

۶۔ کشور..... سلطنت، ملک۔ وہ عاشق جو یار کی دیوار کے سائے میں بیٹھا ہے۔ وہ گویا ہندوستان کی سلطنت کا فرمانروا ہے۔ شارحین نے سایۂ دیوار سے یہ لطیف مضمون پیدا کیا ہے کہ سایہ میں تیرگی ہوتی ہے اور ہندوستان کالا ملک کہلاتا ہے۔ اس لئے سایۂ دیوار میں بیٹھنے والا فرمانروائے ہندوستان بن گیا۔ بعض لوگ کشورِ ہندوستان کی ترکیب پر معترض ہیں۔ کہ اعلانِ نون جائز نہیں۔ غالب کے دور تک یہ تصرف جائز تھا۔

۷۔ کثرتِ غم نے میرے جگر کی ہستی کو بالکل مٹا دیا۔ اب اگر کسی سے میں کہوں کہ میرا داغ اصل میں جگر کا نشان ہے۔ تو کسی کو اعتبار نہیں آئے گا۔ اور کوئی یہ یقین نہیں کرے گا کہ واقعی اس کے پہلو میں جگر بھی تھا اور یہ داغ اسی کا نشان ہے۔ بقول طباطبائی یہ مضمون بالکل نیا ہے اور خاص غالب کا نتیجۂ فکر ہے۔

۸۔ ہم اس کے نامہربان ہونے سے بھی خوش ہیں۔ کیونکہ اس کی نامہربانی اور جفاکاری سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ اُسے ہماری وفاداری پر اعتماد ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ اگر میں ظلم بھی کروں گا۔ تو ہماری محبت میں کمی واقع نہیں ہوگی۔

۱۲۷

درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے ۱ کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے
تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ ۲ تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے
کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال ۳ دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے
عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا ۴ عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے
زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی ۵ یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے
گلفشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا ۶ خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے
شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں ۷ ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے

خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی ۸ اُٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے
ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا ۹ دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے
کس طرح کاٹے کوئی شبہائے تارِ برشگال ۱۰ ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے
گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال ۱۱ ایک دل تسپر یہ نا امیدواری ہائے ہائے
عشق نے پکڑا نہ تھا غالبؔ ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

یہ پوری غزل سوز و گداز میں ڈوبی ہوئی ہے۔ اور اس کے اکثر شعر لکھائیہ میں معلوم ہوتا ہے۔ کسی محبوب کی وفات پر مرثیہ لکھا ہے۔

۱معشوق دم توڑ رہا ہے۔ اس کی حالت کو دیکھ کر عاشق درد سے بیقرار ہو جاتا ہے۔ معشوق اس حالت میں عاشق کی بیقراری دیکھ کر بے چین ہو جاتا ہے عاشق کہتا ہے۔ اے ظالم وہ تیری غفلت شعاری کیا ہوئی۔ جب ہم تیرے دردِ محبت سے تڑپتے تھے۔ اور تجھے پروا بھی نہ ہوتی تھی۔ اس وقت بھی اس غفلت شعاری کو کام میں لا اور میرے درد کی پروا نہ کر۔

۲۔آشوب۔ . . . تکلیف، مصیبت۔ اگر تجھ کو غم کی سختیاں اُٹھانے کا حوصلہ نہ تھا۔ تو پھر تو نے میری غمگساری کیوں کی تھی۔ مناسب تھا کہ تو میرے حال سے بیخبر رہتا۔ اور اس طرح میرے غم سے اثر پذیر نہ ہوتا۔

۳۔ اگر میری غم خواری کا تجھ کو خیال نہ آیا ہوتا۔ تو آج تو ان حالوں کو نہ پہنچتا۔ افسوس صد افسوس مجھ سے اظہار ہمدردی کر کے تو نے اپنے ساتھ دشمنی کی (سعید، آسی) طباطبائی اور بیخود۔ میرے ساتھ غمخواری کر کے تو نے اپنے آپ کو رسوا کیا۔ پھر شرم رسوائی سے اپنی جان دے دی۔

۴۔ اگرچہ تو نے مجھ سے عمر بھر وفادار رہنے کا عہد کیا مگر وہ کس کام کا۔ کیونکہ

کمبخت عمر ہی پائدار نہیں ۔ دیکھ لے آخر اس نے تجھے دغا دی اور دنیا سے اُٹھا لیا۔

۵۔ مجھے اب آب و ہوائے زندگی زہر معلوم ہوتی ہے ۔ کیونکہ اس نے تجھ سے موافقت نہیں کی جو میرا موافق نہیں ۔ تیری محبت کی وجہ سے میں اس کا رفیق نہیں ہو سکتا ۔ لہٰذا میں اس سے بیزار ہوں۔

۶۔ ایک زمانہ تھا ۔ کہ تیرا جلوہ گل فشانی کیا کرتا تھا ۔ افسوس اب اُسے کیا ہو گیا ۔ یعنی موت نے اُسے خاک میں مل دیا ۔ اب تیری قبر پر پھول پڑے ہوئے ہیں ۔ گلفشانی اور لالہ کاری کی لفظی رعایت سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

۷۔ تو عشق کی رسوائی کی تاب نہ لا سکا ۔ اور اس شرم سے پردہ خاک کے پیچھے جا چھپا ۔ تجھ پر الفت کی پردہ داری ختم ہے ۔ اس سے زیادہ کوئی عشق کی رسوائی کو اور کیا چھپائیگا ۔

۸۔ تو نے مجھ سے عمر بھر کے لئے پیمان وفا باندھا تھا ۔ تیرے مر جانے سے وہ عہد ٹوٹ گیا ۔ اس لئے ناموس پیمانِ محبت خاک میں مل گئی ۔ گویا دوستی کی راہ و رسم ہی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا ۔ شکایت سے درد مترشح ہے۔

۹۔ مجھے امید تھی ۔ کہ تو مجھے خوب چھریاں مارے گا ۔ اور میرے دل کو درد کی دولت سے مالا مال کر دے گا لیکن افسوس کہ ابھی دل پر ایک زخم کاری بھی نہ لگنے پایا تھا ۔ کہ دستِ قاتل بیکار ہو گیا اور میں ہمیشہ کے لئے لذتِ درد سے محروم رہ گیا ۔ ع

رہیں دل کی دل ہی میں حسرتیں کہ نشان قضا نے مٹا دیا

۱۰۔ شب ہائے تار برشگال ۔ ۔ ۔ برسات کی اندھیری راتیں ۔ خو کردہ ۔ ۔ ۔ عادی ۔ اب برسات کی اندھیری راتیں کیونکر کٹیں گی ۔ ہم کو تو عادت ہو گئی تھی۔

کہ محبوب کے انتظار میں تارے گن گن کر راتیں کاٹا کرتے تھے۔ برسات استعارہ ہے رونے سے اور شبہائے غم کو شب ہائے تار کہا ہے۔

۱۱۔ میرے کان پیامِ یار سے مہجور اور آنکھیں جمالِ دوست سے محروم ہیں ہائے ہائے ایک دل ہے۔ اور اس پر اس درجہ نا امیدیاں قیامت ہے۔

۱۲۔ میرے عشق نے ابھی وحشت کا رنگ نہ پکڑا تھا یعنی ابھی ہرزہ گردی اور دشت نوردی کی نوبت نہ آئی تھی۔ کہ معشوق اس دنیا سے رخصت ہوا میرا عشق ناتمام اور ذوقِ رسوائی دل کا دل ہی میں رہ گیا۔

۱۲۸

سرگشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے ۱ تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے
لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر ۲ اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے
کیجے بیاں سرورِ تپِ غم کہاں تلک ۳ ہر مو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے
ہے وہ غرورِ حسن سے بیگانۂ وفا ۴ ہر چند اس کے پاس دلِ حق شناس ہے
پی جس قدر ملے شبِ مہتاب میں شراب ۵ اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے
۶ ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

۱۔ سرگشتگی ... جنونِ عشق۔ نوید ... خوشخبری، مژدہ۔ سرگشتگی کی وجہ سے زندگی سے بالکل مایوس ہو گیا ہوں۔ اب تسکیں کو خوشخبری دو۔ کہ تیری بلائیں دور ہونے کا وقت آپہنچا ہے یعنی وقتِ مرگ قریب ہے ظاہر ہے کہ موت آجانے سے جنون و سرگشتگی کو ہمیشہ کے لئے تسکین ہو جائے گی۔

۲۔ معشوق یہ سمجھتا ہے۔ کہ میرا دل اب تک میرے ہی پاس ہے اس لئے اس کی خبر نہیں لیتا۔ حالانکہ وہ آوارہ ہو چکا ہے۔ اور میرے پاس نہیں رہا۔

میرے ہی پاس ہے"۔ یہ بھی مفہوم پیدا کر رہا ہے۔ کہ معشوق سمجھتا ہے۔ کہ دِل اسی کے پاس ہے۔ اس لئے وہ اس سے بے فکر ہے۔

۳۔ جب تپ چڑھتی ہے۔ تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ شاعر نے انہیں زبانِ شکر گذار قرار دیا ہے۔ کہتا ہے ہیں تپ غم کا سرور کہاں تک بیان کروں بس یہ سمجھ لو۔ کہ اس کی شکر گذاری میں میرے تن بدن کا ہر رونگٹا زبان سپاس بن گیا ہے۔

۴۔ آتی معشوق حق شناس دل رکھتا ہے۔ اور وہ وفا کی قدر کرنے والا ہے۔ محض غرورِ حسن کی وجہ سے وہ مائل بہ جفا ہے اور بیگانۂ وفا ہے۔

دیگر شارحین اور طبا طبائی۔ میرا دل حق شناس اسی کے پاس ہے اور اس نے حقِ وفا سے اُسے آگاہ کر دیا ہے۔ مگر وہ غرورِ حسن میں کب سنتا ہے اگر دل حق شناس سے معشوق کا دل مراد لیں۔ تو محاورہ کے خلاف ہوگا۔ یہ کوئی نہیں کہتا۔ کہ اس کے پاس چشمِ روشن اور دل بینا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اس کا دل روشن ہے اور چشم بینا۔

۵۔ شبِ مہتاب میں جس قدر بھی شراب ملے "پی جا"۔ کیونکہ شبِ ماہتاب ٹھنڈی ہونے کی وجہ سے بلغمی مزاج ہے۔ اور بلغمی مزاج کو اطبا ٹھنڈی دوائیں نہیں دیتے۔ بلکہ اس کے لئے گرم ادویات تجویز کرتے ہیں۔ گویا برودت کو قطع کرنے کے لئے خوب شراب پینی چاہیئے۔ دوسرا مفہوم یہ ہے۔ کہ چاندنی رات ٹھنڈی ہوتی ہے اور میرا مزاج بلغمی ہے۔ پھر کیونکر شراب نہ پیوں۔ شراب میرے لئے اس موسم میں از حد مفید ہے۔

۶۔ مکین۔۔۔۔ مکان میں رہنے والا۔ شرف۔۔۔۔ عزت۔ مکان کی عزت ہمیشہ مکین سے ہوتی ہے۔ مجنوں کا مکان جنگل تھا اور وہ اس کے دم سے آباد

تھا۔ اب وہ مرگیا ہے۔ تو جنگل اداس معلوم ہوتا ہے گویا جنگل کی رونق مجنوں
کے قدم سے تھی۔ اُس کے اُٹھ جانے سے جنگل پر اداسی چھا گئی۔

١٢٩

١ خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے — گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
٢ دل فردِ جمع و خرچ زباں ہائے لال ہے — کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ
٣ رحمت کہ عذر خواہِ لبِ بے سوال ہے — کس پردہ میں ہے آئینہ پرداز اے خدا
٤ اے شوقِ منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے — ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی
٥ نافِ زمیں ہے نہ کہ نافِ غزال ہے — مشکیں لباسِ کعبہ علی کے قدم سے جان
٦ دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے — وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ ہے

٧ ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

١۔ اگر خاموشی سے یہی فائدہ ہے۔ کہ حالِ دل پوشیدہ رہے تو میں بہت خوش ہوں۔ کیونکہ مجھے خاموش ہونے سے یہ فائدہ حاصل ہے یعنی میری بات ہی کوئی نہیں سمجھتا۔ بقول بیخودؔ۔ خاموشی اور گفتگو کو مساوات کا درجہ دینا نہایت بلیغ خیال ہے بعض لوگوں کا خیال ہے۔ اس میں اپنا کلام عام فہم نہ ہونے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ طباطبائی حال سے وارداتِ قلبی مراد لیتے ہیں۔ آسی نے دوسرا مفہوم یہ لکھا ہے۔ ”لوگ کہتے ہیں۔ جو لوگ بیوقوف ہیں انکو خاموش رہنا مناسب ہے۔ تاکہ ان کے راز کسی پر نہ کھلیں۔“ اگر یہ واقعی ہے تو میں بہت خوش ہوں مگر مجھے ہر وقت خاموش بیٹھے رہنے کی عادت ہو گئی ہے میرا راز کوئی نہ سمجھ سکے گا۔ اگر یہ خیال غلط ہے۔ میری خاموشی ایسی ہے جو میرے لئے الٹی غمّاز ثابت ہوگی۔“ یہ مفہوم قرینِ قیاس نہیں۔

۱۔ فردِ جمع و خرچ ... جمع و خرچ کا دفتر۔ زبان ہائے لال ... گونگی زبانیں مختلف شرحیں ملاحظہ ہوں۔ حسرت کی شرح سب سے بہتر ہے۔

حسرت۔ ہزاروں حسرتیں ایسی تھیں۔ جن کے اظہار کی حسرت دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ پس گویا دل زبان ہائے لال کی فردِ جمع و خرچ ہے یعنی شکووں کا ایک دفتر ہے۔ (سعید)

طباطبائی۔ حسرتِ اظہار زبان کے گویا نہ ہونے سے گلہ مند ہے کہ کس کے آگے اس گلہ کو بیان کروں۔ اور فردِ جمع و خرچ سے طومارِ شکایت مراد ہے یعنی اظہارِ شوق زبان سے نہ ہو گا۔ تو دل میں زبان کی شکائیتیں بھری ہوئی ہیں مصنف نے زبان کو جمع اس اعتبار سے کہا ہے۔ کہ بہت سے موقعوں پر زبان نے اظہارِ شوق میں کوتاہی کی ہے۔ اور ممکن ہے کہ احباب کی زبانیں مراد لیں

بیخود۔ حسرتِ اظہار ان لوگوں سے گلہ مند ہے۔ جو گونگوں کی طرح زبانوں کو منہ میں رکھتے ہیں یعنی مجھ سے میری مصیبتوں کا حال نہیں پوچھتے۔ باوجودیکہ میرے چہرے سے حسرتِ اظہار ہو رہی ہے۔

آسی۔ میں اپنی حسرتِ اظہار کا کس کے سامنے گلہ کروں۔ بس میرا دل ہی اس کو خوب جانتا ہے۔ کہ کس قدر مجھے حسرتِ دل کا اظہار کرنا چاہیئے تھا اور زبان سے کس قدر اظہار ہو سکا۔ گویا میرا دل ایک جمع اور خرچ کی فرد ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جس قدر حسرتِ اظہار اس میں جمع ہے وہ زبان کے ذریعہ سے کچھ بھی خرچ نہیں ہو سکی۔

۲۔ آئینہ پرداز ... جلوہ گر۔ محوِ آرائش۔ اے خدا تیری رحمت جو لبِ بے سوال کی عذر خواہ ہے وہ کس پردے میں آئینہ پرداز ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ میں لبِ بے سوال رکھتا ہوں۔ اور راضی برضا ہوں۔ وہ میری عذر خواہی میں کہیں

دیر کر رہی ہے۔

طباطبائی۔ لب بے سوال کا بےنفس ہونا ضرور ہے۔ اور لب کو بے سوال اور بے نفس اس مناسبت سے کہا ہے کہ نفس کے پہنچنے سے آئینہ مکدر ہو جاتا ہے، تو ضرور ہوا کہ آئینہ پرداز سے ملنے کی خواہش لبِ بے سوال سے کرنا چاہیئے۔ اور آئینہ پرداز وہ جو آئینہ کو جلا کرے رحمت کا فعل محذوف ہے یعنی رحم کر ظاہر ہے۔ یہ شرح بہت ہی مبہم ہے۔

بیخود نے مزید شرح یہ لکھی ہے۔ میرے لب رحمت کا سوال اس شرم سے نہیں کرتے کہ میں نے بے انتہا گناہ کئے ہیں۔ اور میری یہ خاموشی گویا میرے گناہوں کا عذر ہے۔ اس صورت میں اظہارِ رحمت ضروری ہے۔

۴۔ منفعل... شرمندہ ہونا۔ اے شوق تو اپنے اس خیال پر شرمندہ ہو۔ بھلا وہ اور تیرے ساتھ خدانخواستہ دشمنی کریں گے۔ یہ بالکل غلط خیال ہے دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اے شوق تو اس غلطی پر شرمندہ ہے کہ تو نے دشمن کو دوست سمجھا۔ یہ تیری شرمندگی بیجا ہے، وہ دشمن نہیں ہو سکتا۔

۵۔ مشکیں لباس... کعبہ پر سیاہ غلاف چڑھایا جاتا ہے اور اس پر طرح طرح کے عطر لگائے جاتے ہیں۔ نافِ غزال... نافہ کستوری کی تھیلی جو ایک قسم کے ہرن کی ناف میں ہوتی ہے۔ غزال... ہرن۔ نافِ زمین... مرکز زمین۔ کسی زمانے میں کعبہ مرکز زمین تھا۔ حضرت علیؓ کعبہ میں تولد ہوئے تھے اس لئے کہتا ہے۔ کہ غلاف خانہ کعبہ کو حضرت علیؓ کے قدم سے مشکین سمجھ اور نہ کعبہ نافِ زمین ہے۔ نافِ غزال نہیں ہے۔ کہ وہ مشکین ہوتا۔ گویا غلافِ کعبہ حضرت علی کے دم قدم سے مشک آگین ہے۔

۶۔ عرصۂ آفاق... میدانِ عالم۔ عرقِ انفعال... وہ پسینہ جو شرمندگی سے آجاتا ہے۔ میری وحشت اور آوارگی کے لئے زمین کی وسعت بہت کم تھی۔ اس

لئے زمین عرقِ شرم سے تربتر ہو گئی۔ یہ دریا وغیرہ جو نظر آتے ہیں یہ اسی شرمندگی کا نتیجہ ہیں اور عرق انفعال کا حکم رکھتے ہیں۔

۷۔ خیال۔۔۔۔ وہم۔ کرۂ زمین کو حلقہ دامِ خیال سے تشبیہہ دی ہے کہتے ہیں۔ دیکھنا اسد تم ہستی کے فریب میں نہ آجانا۔ تمام عالم وہم و خیال کے جال کا ایک حلقہ ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ تمام عالم ایک خیالی دام ہے جس میں تمام عالم پھنسا ہوا ہے۔ گویا ہستی کو ہستی نہیں بلکہ نیستی خیال کرنا چاہیئے۔ ب

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی | ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

١٣٠

تم اپنے شکوہ کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو ١ | حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے
دلا یہ درد والم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر ٢ | نہ گریۂ سحری ہے نہ آہ نیم شبی ہے

١۔ کھود کھود کر پوچھنا۔۔۔۔ کرید کرید کر پوچھنا۔ حذر کرو۔ ڈرو۔ برائے خدا تم اپنی شکایتیں مجھ سے کرید کرید کر نہ پوچھو۔ تم ان باتوں کو شکوہ سمجھتے ہو یہ شکوہ نہیں بلکہ آگ ہے جو میرے دل میں دبی ہوئی ہے اس لئے ان باتوں کو جانے دو۔ اگر یہ آگ بھڑک اٹھے گی تو قیامت آجائے گی۔

بیخود اور طبا طبائی حذر کرو کی توجیح یہ کرتے ہیں۔ کہ اظہار شکایت سے اکثر آتشِ عناد مشتعل ہو جاتی ہے۔

٢۔ مغتنم۔۔۔ غنیمت۔ اے دل تو دردِ الم کو غنیمت جان۔ کیونکہ چند روز کے بعد نہ یہ گریۂ سحری رہیگا۔ نہ آہِ نیم شبی۔ دوسرا مفہوم یہ ہے۔ کہ آخر کار یہ درد و الم ہمارا کام تمام کر کے ہمیں تکلیف و اذیت سے ہمیشہ کے لئے نجات دلائے گا۔

نغمہ ہائے دل کو بھی اے دل غنیمت جانیئے | بے صدا ہو جائیگا یہ سازِ ہستی ایک دن

۱۳۱

ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے ۱ ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا وہ بھی مٹ گیا

ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے ۲ جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں

ہر کوئی درماندگی میں نالے سے لاچار ہے ۳ آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا

جس کے جلوہ سے زمیں تا آسماں سرشار ہے ۴ ہے وہی بدمستیِ ہر ذرہ کا خود عذر خواہ

زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے ۵ مجھ سے مت کہہ تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی

تجھ پہ کھل جاوے کہ اس کو حسرتِ دیدار ہے ۶ آنکھ کی تصویر سرنامہ پہ کھینچی ہے کہ تا

۱۔ غلط بردار اس کاغذ کو کہتے ہیں جس پر سے حرف بہ آسانی کزلک وغیرہ سے اڑ سکے۔ اور کاغذ پر اس کا نشان باقی نہ رہے۔ مگر یہاں ازراہِ ظرافت غلط بردار کے معنی یہ لئے ہیں۔ کہ جس پر سے حرف خود بخود اڑ جائے۔ کہتا ہے۔ کہ تو نے اپنے خط میں صرف ایک جگہ حرفِ وفا لکھا تھا۔ سو وہ بھی مٹ گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے خط کا کاغذ غلط بردار ہے کہ جو بات سچے دل سے اس پر نہیں لکھی جاتی۔ وہ خود بخود مٹ جاتی ہے۔

۲۔ میرا دل ذوقِ فنا کی ناتمامی پر کیوں نہ جلے۔ کیونکہ باوجود نفس کی آتش باری کے ہم نہیں جلتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہمارا ذوقِ فنا ناتمام یعنی ناقص ہے اور یہی دل کے جلنے کا سبب ہے (حسرت۔ آسی)

دوسرا مفہوم یہ ہے۔ کہ انسان کے سینے میں ایک شعلہ روشن ہے، سانس کی آمد و رفت اس کو ہر دم مشتعل کرتی رہتی ہے۔ اس آگ کی گرمی سے تخریب اور تعمیر کے عمل کے ساتھ ساتھ انسان کی زندگی قائم رہتی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر انسان کو فنا کا ذوق ہے۔ لیکن ہمارا دل اس ذوقِ فنا کی ناتمامی پر جلتا ہے۔ کہ ہم اس نفسِ شعلہ بار سے ایکدم ہی کیوں نہ جل گئے۔ یہ مضمون غالب کو بہت

مرغوب ہے کئی جگہ اس کا اعادہ کر چکے ہیں۔ ؎

جلتا ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے   اے ناتمامیٔ نفس شعلہ بار حیف

۳۔ شاعر کے دل میں یہ خیال ہے۔ کہ آگ خاموشی سے جلتی ہے لیکن جب اس کو پانی میں ڈال کر بجھاتے ہیں تو اس میں سے بجھنے کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ وہ اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہے۔ کہ درماندگی کی حالت میں انسان کے منہ سے نالہ نکل ہی جاتا ہے دیکھو آگ جیسی خاموش جلنے والی چیز بھی اس حالت میں خاموش نہیں رہ سکتی۔

۴۔ حالی۔ ہر ذرہ یعنی ہر مخلوق عذر خواہ یعنی معافی چاہنے والا یا معذور رکھنے والا ہے۔ اس شعر میں دعوے ایسے طریقہ سے کیا گیا ہے۔ کہ خود دعوے متضمن دلیل واقع ہے مطلب یہ ہے کہ ذرات عالم یعنی ممکنات جو فی الحقیقت معدوم محض ہیں۔ ان کی بدمستی و غفلت کا عذر خواہ وہی ہے جس کے پرتوِ وجود سے یہ تمام معدومات وجود کا دم بھرتے ہیں (یادگار، سپتھر)

آسی جس کے جلوہ سے زمین سے لیکر آسمان تک کائنات کا ایک ایک ذرہ بدمست اور سرشار ہو رہا ہے۔ وہ اس بدمستی کا خود ہی عذر خواہ بھی ہے کہ میرا جمال اور حسن ایسا ہے کہ جس سے ہر کسی کو بدمست اور سرشار ہونا چاہیئے

۵۔ معشوق عاشق کو خفا دیکھ کر اس سے کہتا ہے۔ تم ہمیں اپنی زندگی کہا کرتے تھے۔ یہ کیا بات ہے؟ عاشق جواب دیتا ہے۔ تم میرے سامنے ان لفظوں کو نہ دہراؤ۔ کیونکہ آج کل میرا دل زندگی سے بھی بیزار ہے۔ خوب پُر لطف شعر ہے۔ باوجود زندگی سے بیزار ہونے کے معشوق سے بیزار ہونا گوارا نہیں۔

۶۔ یہ نامہ۔۔۔۔۔ لفافہ کھل جائے۔ ظاہر ہو جائے۔ میں نے خط کے لفافہ پر آنکھ کی تصویر کھینچ دی ہے۔ تاکہ تجھ کو دیکھتے ہی معلوم ہو جائے۔ کہ مجھے دیدار کی حسرت ہے۔

پینس پہ گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے — کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

سُنا ہے کہ مولانا آزردہ ایک دن غالب کے مکان کے سامنے سے گذرے مگر چونکہ اُس وقت جلدی میں تھے۔ اس لئے انہوں نے غالب کے پاس ٹھہرنا نہ چاہا۔ کہاروں سے تاکید کی جلد چلو وہ کندھا بدلنے لگے۔ مگر آزردہ صاحب مرحوم نے اِن کو کندھا نہ بدلنے دیا۔ غالب نے یہ حالت دیکھ لی۔ اور فوراً یہ شعر لکھ کر اِن کے پاس بھیج دیا جس کی معذرت کے لئے وہ خود آئے۔

۱۳۲

مری ہستی فضائے حیرت آبادِ تمنا ہے — ۱ — جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

خزاں کیا فصلِ گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو — ۲ — وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

وفائے دلبراں ہے اتفاقی ورنہ اے ہمدم — ۳ — اثر فریادِ دلہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

نہ لائی شوخیٔ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی — ۴ — کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

۱۔ اس نظریہ کے پیشِ نظر کہ حیرت کے عالم میں انسان آہ و فغاں بھی بھول جاتا ہے۔ اپنی ہستی کو حیرت آبادِ تمنا اور نالے کو اس عالمِ حیرت کا عنقا قرار دیا ہے عنقا ایک پرندہ ہے جو موجود ضرور ہے۔ لیکن اس کا کہیں پتہ نہیں ملتا۔

اسی طرح نالہ عالمِ حیرت میں موجود ہے لیکن مثلِ عنقا مفقود ہے کہتے ہیں میری ہستی حیرت آبادِ تمنا کی ایک فضا ہے۔ اور اس میں نالہ کا مثلِ عنقا کہیں پتہ نہیں ملتا۔ گویا مطلب صرف اس قدر ہے۔ کہ میری حیرت ہی فریاد ہے کیونکہ حیرت میں انسان نالہ کرنا بھول جاتا ہے۔

بایں ہمہ میری ہستی حیرت آبادِ تمنا کو رونق بخشنے والی ہے۔ نالہ و فریاد جس آواز کا نام اہلِ دنیا نے مقرر کر لیا ہے۔ وہ اس عالم کا عنقا ہے یعنی کسی قسم کی آواز بلند نہیں ہوتی۔ صوفیا کی اصطلاح میں مقامِ حیرت اس مقام کو کہتے ہیں۔ جہاں

طالب پر تجلیٔ ذات نازل ہوتی ہے۔

۲۔ ہمیں کوئی مطلب نہیں کہ خزاں کیا ہے۔ اور فصلِ بہار کسے کہتے ہیں غرض کوئی موسم ہو یہاں تو ہمیشہ اپنے بال و پر ہی کا ماتم رہتا ہے۔ اس شعر کی بندش نہایت چست ہے چھ جملے دو مصرعوں میں نہایت صناعی سے نظم کئے ہیں اور لطف یہ ہے۔ کہ بلبلِ اسیر کی زبانی ادا کئے ہیں۔

۳۔ کہنا یہ چاہتے ہیں۔ کہ نالہ و فریاد میں کوئی اثر نہیں ہوتا۔ لوگوں نے ڈھکوسلا بنا رکھا ہے کہ آہ میں بڑی تاثیر ہوتی ہے کہتے ہیں۔ اے ہمدم معشوقوں کی وفا کو اتفاقی خیال کر۔ ورنہ نالہ و فریاد میں یہ تاثیر نہیں کہ وہ کسی کو اپنے اثر سے مہربان بنا دے۔

۴۔ تجدیدِ تمنا۔۔۔ از سر نو امید کرنا۔ جب کوئی چیز ضائع ہو جاتی ہے تو انسان ہاتھ مل مل کر اس کا افسوس کرتا ہے۔ نیز جب کوئی نیا عہد کیا جاتا ہے تو اس وقت بھی ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہیں۔ اس طرح سے کفِ افسوس ملنا گویا تجدیدِ تمنا ٹھہرا یعنی ہاتھ مل کر جس چیز کا ہم افسوس کرتے ہیں۔ ساتھ کے ساتھ اس کی تمنا بھی کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ میری شوخیٔ اندیشہ یاسی کا رنج نہ اٹھا سکی۔ اس نے ناکامی پر کفِ افسوس ملا اور اس سے ظاہر ہوا۔ کہ وہ پھر تجدیدِ تمنا کا عہد کر رہی ہے۔

۱۳۳

رحم کر ظالم کہ کیا بود چراغِ کشتہ ہے ۱ نبضِ بیمارِ وفا دودِ چراغِ کشتہ ہے
دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں ۲ ورنہ یاں بے رونقی سود چراغِ کشتہ ہے

۱۔ بود۔۔۔ ہستی۔ چراغِ کشتہ بیمار وفا سے استعارہ ہے فرماتے ہیں اے ظالم تو بیمارِ وفا (چراغ کشتہ) پر رحم کر۔ اس کی ہستی ہی کیا ہے۔ اس کی نبض۔ تجھے

ہوئے چراغ کے دھوئیں کی مانند ہے۔ کہ بہت تھوڑے دفعہ میں غائب ہو جائیگی۔ لطف یہ ہے کہ نزع کے وقت نبض کی کیفیت ایسی ہوتی ہے اور اطباء اس کو دودی کہتے ہیں۔ آسی کہتے ہیں کہ طبا طبائی نے آخری نبض کو دودی لکھا ہے دودی کمزور ضرور کرتی ہے۔ مگر وہ بالکل قوت کو ساقط نہیں کرتی۔ ان کے نزدیک آخری مصرعہ کی شرح یہ ہونی چاہیئے۔ "بیمار وفا کی نبض چراغ کشتہ کا دھواں ہے۔ کہ وہ بتدریج کم اور سرد اور کمزور ہوتا جاتا ہے۔ اسی صورت سے آخری وقت کی نبض ہوتی ہے۔

۲۔ شود ۔۔۔۔ فائدہ۔ ہم کیا کریں مجبور ہیں۔ کہ دل لگی کی آرزو ہمارے دل کو بے چین رکھتی ہے ورنہ ہم ہرگز عشق نہ کریں۔ کیونکہ ہم روزانہ دیکھتے ہیں کہ رونق چراغ یعنی چراغ کا جلنا چراغ کے لئے باعثِ نقصان ہے کہ جلنے سے چراغ کا تیل اور بتی دونوں جل جاتے ہیں اور اگر وہ نہیں جلتا۔ تو اس کو یہ نقصان نہیں پہنچتا۔ اس لئے نہ جلنا اور بے رونق رہنا اس کے لئے نفع کا باعث ہے اسی طرح اگر ہم بھی شعلہ عشق سے نہ جلیں تو ہمیں بھی یقیناً فائدہ پہنچے۔ لیکن کیا کریں۔ دل لگی کی آرزو سے مجبور ہیں۔

۱۳۴

۱ سرمہ تو کہوے کہ دودِ شعلۂ آواز ہے ۔۔۔ چشمِ خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
۲ نالہ گویا گردشِ سیارہ کی آواز ہے ۔۔۔ پیکرِ عشاق سازِ طالعِ ناساز ہے
۳ یک بیاباں جلوۂ گل فرشِ پا انداز ہے ۔۔۔ دستگاہِ دیدۂ خونبارِ مجنوں دیکھنا

۱۔ نوا پرداز ۔۔۔ گویا۔ سخن گو۔ تو کہوے ۔۔۔ یعنی تو گوئی۔ گویا کہ معشوقوں کی آنکھیں خاموشی کی حالت میں بھی باتیں کرتی ہیں (نوا پرداز سے مراد اشارہ گردش چشم ہے) گویا ان کی آنکھوں کا کاجل شعلۂ آواز پر بنایا گیا ہے یہ بات

عام طور پر مشہور ہے۔ کہ جو شخص سرمہ کھا لے اُس کی آواز ہمیشہ کے لئے بیٹھ جاتی ہے۔ اور وہ بات نہیں کر سکتا۔ مرزا صاحب کہتے ہیں کہ معشوق کا سرمہ وہ سرمہ نہیں۔ بلکہ یہ کاجل شعلۂ آوازہ پر بنایا گیا ہے۔ اس لئے اس کا اثر عام سرمہ جیسا نہیں۔ بلکہ اس کا اثر قوتِ گویائی بخشتا ہے۔ جیسا کہ حالتِ خاموشی میں معشوقوں کی آنکھوں کی گویائی سے ثابت ہے۔ معشوق کو شمع۔ اس کی آواز کو شعلہ اور شعلہ کے دھوئیں کو ایسا سرمہ قرار دینا جو سرمہ کی عام خاصیت کے خلاف گویائی بخشے۔ شاعرانہ لطف سے خالی نہیں۔ اور یہ مرزا صاحب کی شاعری کا ادنےٰ کرشمہ ہے۔

۲۔ پیکر۔۔۔ جسم۔ساز۔۔۔ باجہ۔ طالع ناساز۔۔ گردشِ سیّارہ بدقسمتی۔ عشاق کا جسم بدنصیبی اور بدبختی کا ساز ہے۔ اور ان کا نالہ و فریاد گردشِ سیارہ کی آواز ہے۔ عاشقوں کے ہمہ تن نالہ و فریاد ہونے کے سبب سے ان کے جسموں کو طالع ناساز کا ساز کہا ہے۔ اور بقول طباطبائی لفظِ عشاق اس مقام پر ساز کے ضلع کا لفظ ہے۔ اہلِ فارس کی موسیقی میں مقامِ عشاق ایک راگ کا نام ہے۔

۳۔ دستگاہ۔۔۔۔۔ قدرت، کمال۔ دیدۂ خونبار۔۔۔ چشم خونفشاں یک بیابان یعنی کثرت۔ فرش پا انداز۔۔۔ وہ فرش جو راستے میں بچھا دیا جاتا ہے یہ عام طور پر سرخ بانات کا ہوتا ہے۔ مجنوں کی چشم خونفشاں کا کمال ملاحظہ فرمایئے اس نے اس قدر خون بہایا ہے۔ کہ ایک صحرا کو خونی اشکوں سے گلزار رنگین بنا دیا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجنوں کا فرشِ پا انداز جلوۂ گل سے بنا ہے۔ اشک خونی اور گل کی تشبیہ ظاہر ہے۔ نیز فرشِ پا انداز پھولوں کا بنانے سے مجنوں کی بلند پایگی کا ثبوت بہم پہنچتا ہے۔ دستگاہ اور پا انداز میں بھی

رعایت لفظی ہے۔

۱۳۵

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی ۱ میری وحشت تری شہرت ہی سہی
قطع کیجے نہ تعلق ہم سے ۲ کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی ۳ اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی
ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے ۴ غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی
اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو ۵ آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی
عمر ہر چند کہ ہے برق خرام ۶ دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی
ہم کوئی ترک وفا کرتے ہیں ۷ نہ سہی عشق مصیبت ہی سہی
کچھ تو دے اے فلک نا انصاف ۸ آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے ۹ بے نیازی تری عادت ہی سہی

۱۰ یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

۱۔ تم میرے عشق کو وحشت اور دیوانگی قرار دیتے ہو چلو یونہی سہی لیکن یہ کیا کم ہے کہ میری وحشت تمہاری شہرت کا باعث ہے۔ آسیؔ

سعیدؔ: اگر میرے عشق سے تمہاری کو بدنامی ہوتی ہے۔ اور اس کو وحشت کہنا تمہارے لئے شہرت کا باعث ہو سکتا ہے۔ تو تم میرے عشق کو وحشت ہی کہو۔ مجھے یہ بھی منظور ہے۔

طباطبائی: "جو تو میرے اظہار عشق پہ کہتا ہے کہ دیوانہ ہو گیا ہے جو ایسی وحشت ہوئی ہے۔ کہ اس کا جواب یہ ہے کہ عشق مجھ کو نہیں۔" الخ"

۲۔ آپ ہم سے قطع تعلق نہ کریں۔ اگر محبت نہیں کرتے تو کیا مضائقہ ہے

عداوت ہی کیجیے۔ اس مضمون کو مرزا نے متعدد مرتبہ نظم کیا ہے اور ہر جگہ نئے اسلوب سے۔ سہ

ایسے جفلے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا

وار ستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجیے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

تا ہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا
سُن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے

۳۔ مجھ سے کھُلم کھُلا ملنے میں تمہاری کیا رسوائی ہے، اگر تم مجھ سے مجلس میں ملنا باعثِ رسوائی خیال کرتے ہو۔ تو در پردہ خلوت ہی میں سہی۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ بقولِ حسرتؔ۔ اس لئے کہ ہم پاکدامن ہیں۔

طبا طبائی لکھتے ہیں۔ لے دے کا لفظ اس میں بہت رکیک ہے اہلِ زبان ہی اس کو سمجھیں گے۔ واضح ہو کہ یہ غالب کے دور کی زبان ہے۔

۴۔ اگر غیر سے تمہیں محبت ہے۔ تو یوں ہی سہی۔ ہم اپنے دشمن نہیں ہیں کہ یہ بات جانتے ہوئے ہم تمہارے عشق کے دُکھ اور رشک کی تکلیف برداشت کریں۔ بحض آسی کو اس شرح سے اختلاف ہے لکھتے ہیں "بھی" اور "نہی" اس بات کے شاہد ہیں۔ مصنف یہ کہنا چاہتا ہے۔ کہ تجھ کو غیر سے محبت ہے تو سہی ہم بھی جانتے ہیں۔ مگر ہم بھی تو دشمن نہیں ہم بھی تو اپنے ہی ہیں۔ ہم کو بھی تجھ سے محبت ہے۔ پھر ہم کو اس مقابلے پر ذلیل کیوں سمجھا جاتا ہے

۵۔ جو کچھ حاصل کرنا چاہیئے۔ وہ اپنی ذات اور اپنی ہستی ہی سے حاصل کرنا چاہیئے۔ اگر اپنی ذات سے آگہی اور معرفت حاصل نہیں ہو سکتی۔ تو پھر غفلت ہی حاصل کرنی چاہیئے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ دوسرے کا احسان اٹھانا درست نہیں۔ اس شعر میں تصوف کا بھی پہلو نکلتا ہے حدیث نبوی ہے "مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ"۔ یعنی اپنی ہستی سے آگاہی عین عرفانِ الٰہی ہے اور اگر

نفس سے آگاہی حاصل نہ ہو۔ تو پھر اپنی ہستی سے غافل ہو جانا چاہیئے کیونکہ جب انسان اپنے آپ کو نیست سمجھ لیتا ہے۔ تو پھر اسے جلوۂ حق نظر آتا ہے۔ مطلب وہی نکلا کہ آگاہی اور غفلت کا تعلق اپنی ہستی سے رکھنا چاہیئے

۶۔ برقِ خرام ۔۔۔ برق رفتار۔ جلدی سے غائب ہونے والی۔ فرصت ۔۔۔ مہلت۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ عمر بجلی کی طرح بہت جلد گزر جاتی ہے لیکن زندگی میں اتنی مہلت اور فرصت تو ضرور ملتی ہے کہ دل کو خون کر لیا جائے (بیخود) بقول طباطبائی (آسی)۔ وجہ مناسبت یہ ہے۔ کہ برق بھی خون رگِ ابر ہے۔

۷۔ ہم عشق کو تکلیفوں کی وجہ سے ہرگز ترک نہ کریں گے۔ اگر عشق میں مصائب سے نجات نہیں۔ تو ہم عشق کو عشق نہ سمجھیں گے۔ بلکہ اسے مصیبت ہی خیال کر لیں گے۔

۸۔ رخصت ۔۔۔ اجازت۔ اے ناانصاف آسمان میں تجھ سے یہ نہیں کہتا۔ کہ تو میری مراد ہی پوری کر۔ اور کچھ نہیں تو تو مجھے آہ و فریاد کی اجازت ہی دے دے۔ خوب شعر ہے ؎

دے داد اے فلک دلِ حسرت پرست کی　　ہاں کچھ نہ کچھ تلافیٔ مافات چاہیئے

۹۔ ابھی ہماری طبیعت میں بے نیازی کی خو نہیں ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ بے نیازی تیری عادت ہے۔ اور تو ہمارے عجز و نیاز کی کوئی پروا نہیں کرتا ہم بھی تسلیم و رضا کی عادت ڈال ہی لیں گے۔ تاکہ تیری بے نیازی سے ہم بددل نہ ہونے پائیں۔ اور اس کو برداشت کرنے کے خوگر ہو جائیں۔

۱۰۔ حسرت سے مراد اظہارِ حسرتِ وصل ہے یار سے کچھ نہ کچھ چھیڑ جاری رہنی چاہیئے۔ اگر وصل میسر نہیں تو نہ سہی۔ اظہارِ حسرتِ وصل ہی سہی۔ لطف یہ ہے کہ

اظہارِ حسرت دل ہی سے چھیڑ کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ خاموش ہو جانا چھیڑ پیدا نہیں کرتا۔ بقول سہا۔ آخر زندگی کے لئے کوئی شغلہ چاہیئے۔

آسی۔ اس سے یہ لطیف معنی بھی پیدا ہوتے ہیں۔ کہ ہم جو اس کو حال سنانے کے لئے مجبور کرتے ہیں۔ تو وہ اس کو چھیڑ سمجھتا ہے۔ اچھا خیر۔ یہ چھیڑ جاری رہنی چاہیئے

۱۳۶

صبحِ وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے	۱	ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے
جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے	۲	ڈھونڈھے ہے اس مغنیٔ آتش نفس کو جی
تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے	۳	مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیٔ خیال
آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے	۴	کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے	۵	کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

۱۔ آرمیدگی ۔۔۔۔ آرام طلبی۔ نکوہش ۔۔۔۔ ملامت۔ بجا ۔۔۔۔ درست صبح کو خندۂ دنداں نما اس کی سفیدی کی وجہ سے کہا ہے۔ میں اپنی آرام طلبی کی وجہ سے واقعی قابلِ ملامت ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ صبحِ وطن میرے اوپر ہنس رہی ہے۔ گویا جستجوئے یار میں مجھے آوارگی اختیار کرنی چاہیئے۔ چونکہ عاشق اپنے فرض کو ادا نہیں کرتا۔ اس لئے ادائے فرض کا خیال دل میں بے چینی پیدا کر دیتا ہے۔ یہاں تک کہ صبح کی سفیدی اسے خندۂ دنداں نما معلوم ہونے لگتی ہے۔ خوب شعر کہا ہے۔

۲۔ مغنی ۔۔۔۔ گانے والا۔ آتش نفس ۔۔۔۔ ایسا نفس یا آواز جو دل میں سوز و گداز پیدا کرے۔ میرا دل اس گانے والے کو ڈھونڈھ رہا ہے جس کی آواز میں ایسا سوز و گداز ہو کہ وہ فنا کر دینے والی بجلی کی طرح مجھ پر گرے اور مجھے جلا کر

خاک کر ڈالے۔ یہ آرزو عشق کا معمولی کرشمہ ہے۔

۳۔ بازگشت۔۔۔ واپسی میں وادیٔ خیال کے راستے کو مستانہ وار طے کر رہا ہوں۔ تاکہ اس بے خودی کے عالم میں مجھے واپس آنے کا ہوش نہ رہے۔ لطف اس شعر میں یہ ہے۔ کہ جب کوئی بیہوشی کی حالت میں راستہ طے کرتا ہے تو پھر اس کو راستوں کے موڑ توڑ اور ہیر پھیر یاد نہیں رہ سکتے۔ اور وہ اسی راستے سے واپس نہیں آسکتا۔ شاعر وادیٔ خیال میں اسی استغراق سے گامزن ہونا چاہتا ہے۔ اور یہ نہیں چاہتا۔ کہ دوبارہ ہوش میں آئے اور اپنے مقام پر واپس آسکے۔

۴۔ چونکہ تو باغ میں نگہتِ گل کے سامنے بہت زیادہ بے حجابیاں کرتا ہے اس لئے مجھے نگہتِ گل سے شرم آنے لگی ہے۔

شرم آنے کے اور بھی سبب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً بقول آسیؔ وہ میری ایک کتاب بیاض رقیب ہے۔ اس لئے میری نظر اس کے سامنے نہیں اٹھتی۔ بقول بیدؔ و بیخود و طباطبائی۔ میں تو نگہتِ گل کو بے حجاب کہا کرتا تھا۔ اب تیری بے حجابیاں دیکھ کر بوئے گل کو کیسے بے حجاب کہوں۔ کیونکہ تو اس سے بھی زیادہ بے حجاب نکلا۔

۵۔ جس قسم کی انسان کی طبیعت اور خیالات ہوتے ہیں۔ وہ ویسے ہی اشعار پسند کرتا ہے۔۔۔۔۔۔ کہتے ہیں۔ کہ میرے دلی معاملات اور پوشیدہ راز کسی کو معلوم نہ ہوتے لیکن شعروں کے انتخاب نے میرا بھانڈا پھوڑ دیا۔ گویا ان کے ذریعہ سے لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ میں عاشق مزاج ہوں

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالبؔ ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

" اس شکل سے محاورہ ہے یعنی بُرے حالوں سے۔ بعض نسخوں میں

"رنگ" سے" اس کے بھی وہی معنی ہیں۔ مطلب یہ ہے۔ کہ جب ہماری زندگی ایسے برے حالوں میں گذری۔ کہ کبھی کوئی آرزو ہی پوری نہ ہوئی۔ تو ہم بھی کیا یاد کریں گے۔ کہ ہمارا بھی کوئی خدا تھا۔

۱۳۷

۱ بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کئے	اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کئے
۲ میں اور جاؤں در سے ترے بِن صدا کئے	دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا
۳ مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کئے	رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہن مے
۴ حضرت بھی کل کہیں گے کہ ہم کیا کیا کئے	بے صرفہ ہی گذرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضر
۵ تو نے وہ گنجہائے گرانمایہ کیا کئے	مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
۶ کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کئے	کس روز تہمتیں نہ تراشا کئے عدو
۷ دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے	صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو
۸ بھولے سے اس نے سینکڑوں وعدے وفا کئے	ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں

۹ غالب تمہیں کہو کہ ملے گا جواب کیا
مانا کہ تم کہا کئے اور وہ سنا کئے

۱۔ میں اس کی بزم میں بے حیا بنا بیٹھا رہا۔ اگرچہ لوگ آپس میں اشارے کیا کئے۔ اور مجھ پر آوازے کستے رہے میں کیا کرتا۔ مجبور تھا کیونکہ بغیر بے حیا بنے میں وہاں بیٹھ نہ سکتا تھا۔ (سعید، طبا طبائی۔ بیخود)

بیخود لکھتے ہیں۔ کہ غیر سے ان کے اشارے ہوتے رہے۔ آسی نے دونوں مفہوم لکھے ہیں۔

۲۔ سیاست۔۔۔ سزا، خوف۔ آخر دل ہی تو ہے۔ کوئی فولاد یا پتھر کا ٹکڑا نہیں۔ وہ شومیٔ اتفاق سے درباں سے ڈر گیا ورنہ میں تیرے در پر بغیر صدا لگائے

چلا آیا ۔ ورنہ ایسا ممکن ہوسکتا ہے ۔ کہ میں تیرے دروازے پر سے بغیر صدا کئے چلا جاتا ۔

۳ ۔ خرقہ ۔۔۔۔ گودڑی، لباس فقرا ۔ سجادہ ۔۔۔۔ مصلیٰ ۔ رہنِ مے ۔ شراب کے بدلے گروی رکھنا ۔ دعوتِ آب وہوا ۔۔۔ یعنی دعوتِ بہار میں اپنی گودڑی اور مصلیٰ شراب کے بدلے گروی رکھتا پھرتا ہوں ۔ کیونکہ موسم بہار کی دعوت کئے ہوئے مدت ہوگئی ہے ۔ بقول بیخود اس شعر میں شوخی یہ ہے ۔ کہ ایک چیز سے قیمتِ شراب ادا نہ ہوسکی ۔ اس لئے دونوں چیزوں کو ملاکر گروی رکھا ہے ۔

۴ ۔ بے صرفہ ۔۔۔ بے فائدہ ۔ کل ۔۔۔۔ روزِ قیامت ۔ مطلب یہ ہے کہ عمر چاہے کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو ۔ پھر بھی دنیاوی مخمصوں کی وجہ سے مہلت نہیں ملتی ۔ اور وہ یونہی گزر جاتی ہے ۔ چنانچہ حضرت خضر بھی کل قیامت کے دن باوجود اتنی طویل عمر کے یہی کہیں گے ۔ کہ ہم کیا کیا کیئے ۔ یعنی ہم نے کچھ نہیں کیا

۵ ۔ لئیم ۔۔۔۔ کنجوس، بخیل ۔ گنج گرانمایہ ۔۔۔ بیش قیمت خزانے ۔ اگر مجھے مقدور ہو تو میں زمین سے دریافت کروں کہ اے کنجوس وہ قیمتی خزانے جو تجھ میں دفن تھے ۔ وہ تو نے کیا کئے ۔ مطلب یہ ہے ۔ کہ تو نے اِن خزانوں کو بیکار ضائع کردیا ۔ نہ خود اُن سے کچھ فائدہ اٹھایا ۔ نہ دوسروں کو اٹھانے دیا ۔ بقول آسی ۔ مقدور کا لفظ پتہ دیتا ہے مصنف یہ کہنا چاہتا ہے ۔ کہ اگر یہ دولت میرے پاس جمع ہوجائے ۔ تو میں لوگوں کو فائدہ پہنچاؤں اور زمین کو طعنہ دوں کہ آخر تو نے اس قدر خزانوں سے کیا کام لیا ۔ یا کسی کو فائدہ پہنچایا ۔ دیگر شارحین گنج گرانمایہ سے وہ لوگ مراد لیتے ہیں ۔ جو زمین میں دفن ہیں ۔

۶ ۔ ہر روز دشمنوں نے ہم پر تہمتیں اور الزام لگائے ۔ اور ہمیشہ انہوں نے ہم پر سخت ترین ظلم کئے ۔ تہمت تراشنا اور آرے چلانا میں رعایت ہے ۔

۷۔ معشوق بغیر التجا کیے بوسہ دیتا ہے۔ اس بات سے عاشق کے دل میں یہ وہم پیدا ہوتا ہے کہ پہلے تو یہ بات نہ تھی۔ ہم بار بار التجائیں کرتے تھے۔ پھر کہیں جاکر بوسہ ملتا تھا۔ اس خلافِ عادت عنایت سے وہ فوراً اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ کہیں یہ عادت اُسے رقیب کی صحبت میں نہ پڑی ہو بہر حال شاعر نے اس شعر میں اس عاشق کی دلی کیفیت دکھائی ہے جو اس قدر خوگرِ غم ہو چکا ہے۔ کہ خوشی میں بھی غم کا پہلو ڈھونڈھ نکالتا ہے۔

۸۔ ضد کی اور بات ہے۔ جب اُسے ضد پڑ جاتی ہے۔ تو واقعی وعدہ وفا نہیں کرتا۔ لیکن اس کی عادت بری نہیں۔ چنانچہ جب کبھی وہ اپنی ضد کو بھول گیا ہے۔ تو اس نے سینکڑوں وعدے وفا کیے ہیں۔

حسرتؔ نے دوسرا مفہوم یہ پیدا کیا ہے۔ کہ یعنی سہو کی خو جس کی بنائ پر اس نے بھولے سے سینکڑوں وعدے وفا کیے ہیں۔

۹۔ ہم نے مان لیا کہ تم اپنے دل کی بات ان سے کہتے رہے۔ اور وہ تمہاری باتوں کو سنتے رہے۔ لیکن یہ بتلاؤ کہ تمہاری باتوں کا وہ کیا جواب دیں گے مطلب یہ ہے کہ اول تو وہ تمہاری بات کا جواب ہی نہ دیں گے۔ اور اگر بالفرض جواب بھی دیا۔ تو نفی میں ہوگا۔

۱۳۸

رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب ہے ۱ اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے

مینائے مے ہے سروِ نشاطِ بہار سے ۲ بالِ تدرو جلوۂ موجِ شراب ہے

زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا ۳ نے بھاگنے کی گوں نہ اقامت کی تاب ہے

جادادِ بادہ نوشیٔ رنداں ہے شش جہت ۴ غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

نظارہ کیا حریف ہو اس برقِ حُسن کا ۵ جوشِ بہار جلوے کو جس کے نقاب ہے

میں نامرادیِ دل کی تسلّی کو کیا کروں ۶ مانا کہ تیرے رُخ سے نگہ کامیاب ہے

۷ گذرا اسدؔ مسرتِ پیغامِ یار سے
قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

۱- رہِ اضطراب ... وہ راستہ جو عالمِ اضطراب میں طے ہو سال سے مراد عمر۔ جس طرح سال کا حساب گردشِ آفتاب سے طے کرتے ہیں اسی طرح عمرِ گریزاں کے سال کا حساب رفتارِ آفتاب کے بدلے رفتارِ برق سے کرنا چاہیئے مطلب یہ ہے کہ انسان کی مدتِ عمر ایک چشمکِ برق کے برابر ہے اس کی عمر کے سال پلک جھپکنے میں گذر جاتے ہیں چونکہ عمر راہِ اضطراب کو طے کر رہی ہے اس لئے برق کو آفتاب قرار دے کر انسان کی عمر کے سالوں کا حساب کرنا چاہیئے۔

۲- مینائے مے ... شراب کی صراحی، تذرو ... چکور، بالِ تذرو سے ابر کا استعارہ کیا ہے۔ شراب کی صراحی بہار کی خوشی میں سرو بہارِ مے بن گئی ہے اور بالِ تذرو موجِ شراب کا نظارہ پیش کر رہا ہے۔

طبا طبائی۔ نشاط بہار میں مینائے سبز رنگ کشیدہ بالا سرو کا انداز دکھا رہا ہے۔ اور شراب سرجوش کی لہر بالِ تذرو کی جھلکی دکھا جاتی ہے حاصل یہ ہے کہ صحبتِ شراب میں تماشائے باغ کا مزہ آ رہا ہے۔

۳- پاشنہ ... ایڑی ثبات ... استقلال و پائداری۔ گوں ... مراد ہمت۔ پائے ثبات کی ایڑی زخمی ہوگئی ہے۔ اب میدانِ عشق میں نہ بھاگنے کی ہمت ہے۔ اور نہ ٹھہرنے کی قوت۔ مطلب یہ ہے کہ ایڑیاں رگڑنے کی نوبت آگئی ہے۔ ایک اور جگہ لکھا ہے ؎

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی ۔ نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

۴۔جاداد......یعنی جائداد گیتی خراب......آوارہ، بے سروسامان یعنی بالکل مفلس شش جہت......تمام دنیا۔غافل تو یہ خیال کرتا ہے۔کہ ہم رند لوگ بالکل بے سروسامان اور آوارہ ہیں نہیں، حقیقت یہ ہے۔کہ تمام دنیا رندوں کی بادہ نوشی کی جاگیر ہے نشہ کی ترنگ رند کو بادشاہ بنادیا کرتی ہے۔

طباطبائی۔بادہ سے عرفان اور رند سے عارف مراد ہے اور عالم کے خراب و ویران ہونے سے یہ مطلب ہے کہ کوئی صانع و مدبر اس کے زعم میں نہیں ہے۔جو شخص جلوہ حقیقت سے غافل ہے (بیخود)

۵۔حریف......مقابل۔نظارہ میں یہ طاقت نہیں کہ اس برقِ حسن کا نظارہ کرسکے۔جس کے جلوہ کے لئے جوشِ بہار نقاب بن گئی ہے یعنی بہار کی رنگینی کا جوش نقاب کا کام دے رہا ہے۔یا اس کے جلوہ میں اس قدر جوش بہار ہے۔کہ اس نے جلوہ کو چھپا لیا ہے (آتشی بحسرت) سہ

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

طباطبائی۔عالمِ اجسام کا ظہور حُسنِ شاہدِ حقیقی کے لئے حفاظت کا باعث ہے۔اس کو نظر کیونکر دیکھ سکتی ہے۔نظر جب پڑے گی۔نقاب ہی پر پڑے گی یعنی آنکھ جب دیکھے گی۔اجسام ہی کو دیکھیگی۔جوشِ بہار ظہور عالم سے استعارہ ہے۔اور نقاب اسے اس وجہ سے کہا کہ جس طرح نقاب چہرے کی آڑ کر لیتی ہے۔اسی طرح تماشائے عالمِ اجسام صوفیا کے نزدیک عالمِ لاہوت تک جانے سے مانع ہے (بیخود)

۶۔نامراد کا تعلق دل اور ہیں دونوں کے ساتھ ہو سکتا ہے کہتے ہیں میں مانتا ہوں۔کہ میری نگاہ تیرے دیدار سے لطف اندوز ہوتی رہی ہے۔لیکن

ہیں اپنے دلِ نامراد کو تسلی کیونکر دوں وہ کسی اور چیز کا طلبگار ہے یعنی دل کو تسلی محض دیدار سے نہیں ہو سکتی۔ آسی لکھتے ہیں۔ کہ میں نے مان لیا کہ چشم تصور سے میں ہر وقت تم کو دیکھ رہا ہوں۔ یا یوں ہی تمہارے رُخ پر میری نگاہیں پڑ رہی ہیں۔ مگر میں تو نامراد ہوں۔ اس سے بھی میری مراد بر نہ آئی یعنی دل کی تسلی نہ ہوئی۔ ایک اور جگہ لکھا ہے سے

غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلی کا — نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیونکر ہو

۲۔ گذرا … باز آیا۔ یار کا پیغام آنا یقیناً مسرت بخش ہے لیکن میں ایسی خوشی سے باز آیا۔ کیونکہ میں قاصد کا ان سے سوال و جواب کرنا برداشت نہیں کر سکتا۔ شاعر کے نزدیک معشوق کا قاصد سے ہمکلام ہونا ناقابل برداشت رشک ہے۔ اس لئے وہ پیغامِ یار ہی سے درگذرا۔

۱۳۹

۱ میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے — دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے

۲ آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے — ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشہ میں ہے

۳ گرچہ یا بھی اُس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے — غیر کو یارب وہ کیونکر منع گستاخی کرے

۴ دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے — شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جایئے

۵ نغمہ ہو جاتا ہے واں گر نالہ میرا جائے ہے — دُور چشم بد تری بزمِ طرب سے واہ واہ

۶ پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے — گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دار رازِ عشق

۷ مثلِ نقشِ مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے — اس کی بزم آرائیاں سنکر دلِ رنجور یاں

۸ رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اڑتا جائے ہے — ہو کے عاشق وہ پری رُخ اور نازک بن گیا

۹ کھینچتا ہے جسقدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے — نقش کو اسکے مصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں

۱۰ پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے — سایہ میرا مجھ سے مثلِ دُود بھاگے ہے اسد

۱- انتہائے رشک یہ ہے۔ کہ عاشق کو اپنے سے رشک پیدا ہوگیا ہے۔ اور وہ یہ گوارہ نہیں کرتا۔ کہ خود اس کو دیکھے یہ اس لئے اپنی قسمت پر افسوس کرتا ہے کہ رشک نے اُسے دیدار سے بھی محروم کر دیا۔ رشک کے مضمون غالب نے ہر جگہ بڑھ چڑھ کر باندھے ہیں۔ ؎

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے　　مرتے ہیں مگر اُن کی تمنا نہیں کرتے
تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی　　وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ

۲- گرمیٔ اندیشہ سے اندیشہ و فکر کا وہ اثر مراد ہے جو دل و دماغ کو بیچین اور معطل کر دیتا ہے۔ اسے تندیٔ صہبا سے اور دل کو آبگینہ سے تشبیہہ دی ہے اگر اندیشہ (فکر) میں یہی گرمی ہے تو دل سے ہاتھ دھو لیجئے۔ کیونکہ دل یہ گرمی برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ ایسی تند شراب ہے کہ شیشۂ دل اس سے پگھلا جاتا ہے۔

۳- حالی۔ یہ شعر معاملہ ہے جو طالب و مطلوب کے درمیان اکثر گزرتا ہے اور شاعرانہ نزاکت دوسرے مصرعہ میں پائی جاتی ہے۔ ظاہر ہے۔ حیا آنی اور شرما جانا در حقیقت ایک ہی چیز ہے۔ پھر اس کے کیا معنی؟ کیا حیا بھی آتی ہے۔ تو شرما جاتا ہے۔ بات یہ ہے۔ کہ اس مقام پر حیا آنے کا متعلق اور ہے اور شرما جانے کا متعلق اور۔ اگر حیا بھی اس کو آتی ہے یعنی غیر کی گستاخی اور خواہش بیجا سے اور شرما جائے ہے۔ یعنی غیر سے یا اس کے ساتھ تکرار کرنے سے۔

آسی (۱) غیر کے چھیڑنے اور گستاخی کرنے سے اس کو شرم آتی ہے۔ تو وہ اس شرم سے بھی شرما جاتا ہے۔ (۲) اس کو شرم ضرور آتی ہے۔ مگر وہ شرمانے سے بھی شرماتا ہے۔

۴۔ لت .... بُری عادت ۔ اُدھر شوق کو یہ بُری عادت پڑی ہے کہ وہ ہر دم نالہ کشی کا تقاضا کرتا ہے ۔ اور اِدھر کمزوری اور ناتوانی کے سبب سے دل کی یہ حالت ہے ۔ کہ وہ سانس تک لینے کی تکلیف سے گھبراتا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ سانس لینے کی طاقت نہیں ۔ نالہ کیسے کروں ۔ آسی نے دوسرا مفہوم یہ لکھا ہے ۔ جیسا میرا شوق دیوانہ ہے ۔ ایسا ہی دل ہے ۔ کہ میں دم لیتا ہوں یعنی ذرا نالہ کشی سے باز رہتا ہوں تو گھبراجاتا ہے غرض دونوں یکساں ہیں اور میری حالت تباہ کر رہے ہیں ۔

۵ ۔ خدا تیری بزمِ مسرت کو نظرِ بد سے بچائے ۔ اس کی تاثیر ایسی ہے ۔ کہ اگر میں نالہ کرتا ہوں ۔ تو وہاں پہنچکر نغمہ بن جاتا ہے ؎

ہم نشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزمِ عیش ِ دوست　　　واں تو میرے نالے کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

طبا طبائی لکھتے ہیں ۔ کہ اس اثر سے مقصود تشنیع ہے ۔ یعنی میرے نالے سے تو خوش ہوتا ہے ۔

۶ ۔ ہم اس پر عاشق ہیں ۔ لیکن اپنا عشق اس پر ظاہر کرنا نہیں چاہتے کہ کہیں وہ ہم پر ظلم و ستم نہ کرنے لگے ۔ اس لئے ہم نے طرزِ تغافل اختیار کر رکھی ہے ، تاکہ وہ رازِ عشق کو معلوم نہ کر سکے ۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ جب ہم اس کے سامنے جاتے ہیں ۔ تو بالکل کھوئے جاتے ہیں ۔ اور وہ ہماری یہ غیر حالت دیکھ کر ہمارے عشق کو پا جاتا ہے (حسرت ہمخیال) اس سے ذرا ہیچ کر کہتے ہیں ؎

کل تم جو بزمِ غیر میں آنکھیں چُرا گئے　　　کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

سعید ۔ اگرچہ معشوق کے طرزِ تغافل سے ہمارے عشق کی پردہ پوشی ہوتی ہے لیکن اس کے تغافل سے مجھے ایسی شرمندگی ہوتی ہے کہ لوگ تاڑ جاتے ہیں کہ اس کو ضرور عشق ہے ۔

طباطبائی، بیخود، آسی۔ اگرچہ وہ ہم سے ہمارا رازِ عشق چھپانے کے لیے بزم میں تغافل برت رہا تھا۔ مگر وائے برحالِ ما کہ اس تغافل سے ہم حیران و پریشان ہو جاتے ہیں اور وہ اس کو سمجھ جاتا ہے۔ مجبوراً اس کو ہم پر ستم کرنا پڑتا ہے۔

۷۔ بیٹھنا کا تعلق دو لفظوں سے ہے۔ یعنی ایک تو بیٹھنا نقشِ مدعائے غیر کا یعنی رقیب کا مدعا بر آنا۔ دوسرے عاشق کے دل کا بیٹھنا بے طاقتی اور مایوسی کے سبب ہے۔

جب میں اغیار کے ساتھ اس کی بزم آرائیوں کا حال سنتا ہوں تو میرا دل رنجور یہاں اس طرح بیٹھتا ہے۔ جیسے رقیب کا نقش بزمِ یار میں بیٹھتا ہے۔ بیخود لکھتے ہیں کہ اس طرح جیسے رقیب کی وفا کا سکہ اس کے دل پر بیٹھتا ہے۔

۸۔ عشق میں رنگ سفید ہونے کو رنگ کے کھلنے سے تعبیر کیا ہے۔ کہتے ہیں۔ وہ پری وش عاشق ہو کر اور بھی زیادہ حسین و نازک بن گیا۔ زیادہ حسین اس لئے بنا کہ اس کا رنگ اڑ کر اور کھل گیا۔ اور نزاکت اس لئے بڑھی۔ کہ وہ عشق کے صدمے سے کمزور ہو گیا ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ عشق عموماً لوگوں کی شکل بگاڑ دیتا ہے لیکن معشوق کا عشق سب سے نرالا ہے۔ کہ اس سے حسن و خوبصورتی میں اضافہ ہو گیا۔

۹۔ اس کی تصویر مصوّر سے کیا کیا ناز کرتی ہے سو وہ جس قدر اُسے کھینچتا ہے۔ تصویر اس سے اتنی ہی کھینچتی چلی جاتی ہے۔ یعنی کھنچتی نہیں۔ شاید اس لئے کہ وہ مصوّر کو بھی اپنا عاشق سمجھتی ہے۔ نقش کے ساتھ کھنچنا جلائے ہے "خاص لطف رکھتا ہے۔

۱۰- دُود ...... دھواں۔ مجھ سے میرا سایہ اس طرح بھاگتا ہے جیسے دھواں آگ سے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ میں آتش بجاں ہوں میری جان میں ایک آگ سلگ رہی ہے۔ اس لئے میرے قریب میرا سایہ جو دھوئیں کی مانند ہے نہیں ٹھہر سکتا۔ مطلب یہ ہے۔ کہ جب کسی کے دل میں عشق کی آگ سلگتی ہے۔ تو اور لوگوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ سایہ بھی جدا ہو جاتا ہے۔

۱۴۰

۱ تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے — گرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے

۲ لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے — نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم

۳ کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے — کثرت آرائیٔ وحدت ہے پرستاریٔ وہم

۴ عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے — ہوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا

۱- نہالی ... فرش۔ بستر۔ شکلِ نہالی، وہ حسین تصویر جو بستر یا فرش پر بنائی جاتی ہے۔ برد ..... سردی۔ لیالی ..... جمع لیل کی معنی رات۔ شبِ ہجر میں شکلِ نہالی کو دیکھ کر میں نالہ و فریاد کرنے لگا۔ کیونکہ اس کو دیکھ کر مجھے اپنے معشوق کی شکل یاد آ گئی۔ اور اس خیال نے میرے دل کو بے چین کر دیا۔ کہ یہ شکل میرے سامنے ہو اور میرا معشوق میرے پہلو میں نہ ہو۔ غرض گرمیٔ فریاد کی بدولت مجھے شب ہائے ہجر کی سردی سے امان ملی۔ ورنہ شبِ فراق کی سردی میرا خاتمہ کر دیتی۔

۲- نسیہ ..... اُدھار، قرض۔ میری عالی ہمتی نے مجھ کر مجھ سے لے لیا۔ گویا میری عالی ہمتی نے یہ گوارا نہ کیا۔ کہ میں نقدِ دنیا اور عقبیٰ کے عوض بک جاؤں کیونکہ اُن کی قیمت میری خریداری کے لئے کافی نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ میری بلند ہمتی کی وجہ سے میرا رتبہ دنیا و عقبے دونوں سے بلند ہے۔ کیونکہ وہ غمِ کونین

سے مستغنی ہے۔

۳۔ عام قاعدہ یہ ہے۔ کہ لوگ، وحدت کو کثرت میں جلوہ گر بتاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ کہ ہر جگہ اسی وحدت الوجود کا جلوہ ہے۔ شاعر کہتا ہے۔ یہ خیال کفر اور ہم پرستی ہے۔ اور اسی اصنام خیالی نے یعنی وحدت کو کثرت میں جلوہ گر سمجھنے نے مجھ کو کافر بنا دیا۔ کیونکہ وحدت کو وحدت نہ سمجھنا ہی شرک و کفر ہے

۴۔ جب تک پر و بال تھے۔ اس وقت تک مجھے ہوسِ گل تھی۔ لیکن جب پر و بال نہ رہے۔ تو مجھے ہوسِ گل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا۔ گویا بے پر و بالی نے مجھے تمام فکروں سے آزاد کر دیا۔ اور میں آرام سے سو گیا۔ ؎

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو آرام سے سوتا رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

۱۴۱

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے ۱ برقِ خرمنِ راحت، خونِ گرمِ دہقاں ہے
غنچہ ناشگفتن ہا، برگِ عافیت معلوم ۲ باوجودِ دلجمعی خوابِ گل پریشاں ہے
ہم سے رنجِ بیتابی کس طرح اٹھایا جائے ۳ داغِ پشتِ دستِ عجز، شعلہ خس بدنداں ہے

۱۔ غالب نے ان تینوں شعروں کی شرح عودِ ہندی میں اپنے قلم سے لکھی ہے۔ داغ ساماں مثلِ انجم انجمن وہ شخص کہ داغ جس کا سرمایہ و ساماں ہو۔ موجودیت لالہ کی منحصر نمائش داغ پر ہے۔ ورنہ رنگ تو اور پھولوں کا بھی لال ہوتا ہے بعد اس کے یہ سمجھ لیجئے۔ کہ پھل کے درخت یا غلہ جو کچھ بویا جاتا ہے دہقان کو جوتنے بونے پانی دینے میں مشقت کرنی پڑتی ہے۔ اور ریاضت میں لہو گرم ہو جاتا ہے۔ مقصود شاعر کا یہ ہے۔ کہ وجود محض رنجِ دعنا ہے۔ مزارع کا وہ لہو جو کشت و کار میں گرم ہوا ہے۔ وہی لالہ کی راحت کے خرمن کا برق ہے حاصل موجودیت داغ اور داغ مخالف راحت اور صورت رنج ہے۔

حسرت۔ دہقان کی سعی گل کے خرمن راحت کے لئے برق کا کام دیتی ہے، دیکھو وہ لالہ کے درخت پر اس قدر کوشش کرتا ہے لیکن اس کا نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے۔ کہ گل لالہ داغ بدل ہو جاتا ہے۔

۲۔ کلی جب نئی نکلے، بصورت قلب صنوبری نظر آئے اور جب تک پھول نہ بنے برگ عافیت معلوم، یہاں معلوم بمعنی معدوم ہے۔ اور برگ عافیت بمعنی مایۂ آرام مصرعہ:۔ برگ عیشے بگور خویش فرست، برگ بمعنی ساز و سامان ہے۔ خواب گل تخصیص گل کا باعتبار خاموشی و برجاماندگی، پریشانی ظاہر ہے۔ یعنی شگفتگی وہی پھول کی پنکھڑیوں کا بکھرا ہوا ہونا غنچہ بصورت دل جمع ہے۔ باوصف جمیعت دل۔ گل کو خواب پریشان نصیب ہے"۔

طباطبائی کی تشریح مزید ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں۔ کلی جب تک کھلے کھلے ساز و برگ عافیت کا حاصل ہونا یعنی آفت سے اس کا محفوظ رہنا کہاں سے معلوم ہے۔ جب یہ حال ہوا تو گل کو باوجود دلجمعی پریشانی ہے اور غنچہ کو دل سے تشبیہ دی ہے۔ اور جمیعت دل کی صورت بھی اس سے ظاہر ہے اسی طرح گل شگفتہ کی پنکھڑیوں کا بکھرا ہوا ہونا پریشانی کی صورت ظاہر کر رہا ہے اور گل کی خاموشی اور برجاماندگی خواب کا عالم دکھا رہی ہے غرض یہ کہ تینوں حالتیں گل پر طاری رہتی ہیں۔ تو باوجود دلجمعی خواب گل پریشان رہتا ہے۔ اور سبب پریشانی کا یہ ہے کہ اندیشہ ہے۔ کہ دیکھیے ساز و برگ عافیت اس دار بلا میں ممکن ہوتا ہے یا نہیں۔

۳۔ پشت دست صورت عجز اور حسن بدنداں اور کاہ بدنداں گرفتن بھی اظہار عجز ہے یعنی جس عالم میں کہ داغ نے پشت دست زمین پر رکھ دی ہو اور شعلہ نے تنکا دانتوں میں لیا ہو۔ ہم سے رنج و اضطراب کا تحمل کس طرح ہو۔

ان اشعار کے متعلق مرزا لکھتے ہیں:- "ابتدائے فکر و سخن میں بیدل و اسیر و شوکت کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا۔ چنانچہ ایک غزل کا مقطع ہے ؎

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا　　اسد اللہ خاں قیامت ہے

۱۵- برس کی عمر سے ۲۵ برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھے گئے- دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا- آخر جب تمیز آئی- تو اس دیوان کو دور کیا اوراق یک قلم چاک کئے- دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوان حال میں رہنے دیئے۔

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالبؔ　　ہم بیابان میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

یہ موضوع بھی غالب کو بہت مرغوب تھا- اسے دوسرے الفاظ میں اس طرح نظم کیا ہے ؎

اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشہ کر　　مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

گھر میں گھاس اگنا ویرانی کی نشانی ہے- لیکن شاعر عالمِ وحشت میں اسے بہار قرار دیتا ہے- کہتا ہے ہم جنگلوں میں خاک چھانتے پھرتے ہیں اور ہمارے نہ ہونے سے گھر اس قدر ویران ہوا ہے- کہ اس کی در و دیوار پر سبزہ اُگ آیا ہے- گویا بہار آگئی ہے- اس شعر سے مختلف مفہوم پیدا ہوتے ہیں (۱) جب گھر میں اس قدر ویرانی ہے- تو پھر بیابانوں میں ہم ناحق پھرتے ہیں (۲) ہم دیوانے ہوئے ہیں کہ گھر کی بہار کو چھوڑ کر جنگلوں میں پھرتے ہیں- اور بہار کی پروا نہیں کرتے- (۳) اپنی دیوانگی اور بدنصیبی کی تصویر نہایت سادہ الفاظ میں کھینچ دی ہے- (۴) یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ گھر کو چھوڑے ہوئے مدتیں گزر چکی ہیں- اس لئے ویرانی کے سبب سے گھر جنگل بن گیا ہے (۵) نیز اس خانہ ویرانی کو دیکھنے کے لئے دل اس طرح بے چین ہے- جیسے جلوۂ بہار کو دیکھنے کے لئے ہوتا ہے۔

۱۴۲

سادگی پر اس کے مرجانے کی حسرت دل میں ہے ۱ بس نہیں چلتا کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے
دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا ۲ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے بایں ہمہ ۳ ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے
بس ہجومِ ناامیدی خاک میں مل جائیگی ۴ جو اک لذت ہماری سعیٔ بے حاصل میں ہے
رنجِ رہ کیوں کھینچیے واماندگی کو عشق ہے ۵ اٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے
جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی ۶ فتنۂ شورِ قیامت کس کی آب و گل میں ہے

۷ ہے دلِ شوریدۂ غالبؔ طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنا پر کہ کس مشکل میں ہے

ا ۔ میرے دل میں حسرت ہے کہ میں اِن کی سادگی پر جان دیدوں ۔ مگر یہ حسرت پوری ہوتی نظر نہیں آتی ۔ کیونکہ قتل کرنے کے لئے اُن کے ہاتھ میں خنجر ہے جب خنجر سے قتل کر دیں گے ۔ تو پھر میں سادگی پر کیسے جان دوں گا ۔ گویا مجھے کشتۂ خنجر ہونا پڑے گا ۔ اور دل کی حسرت نہ نکلے گی ۔

طباطبائی ۔ سادگی سے یہاں ترکِ زینت و آرائش مراد ہے ۔ جو کہ بے تلوار کے قتل کرتی ہے یعنی بے تلوار باندھے ہوئے جو عالم اُس پر ہوتا ہے ۔ میں اسی انداز پر گلا کاٹ کر مرجانے کی حسرت میں ہوں لیکن وہ گلا کاٹنے نہیں دیتا اور خنجر اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے ۔ خنجر اس کے ہاتھ میں ہونے سے دو وجہوں سے حسرت نہیں نکل سکتی ۔ ایک تو یہ کہ جب خنجر اس کے قابو میں ہے ۔ تو ہم گلا کیونکر کاٹیں ۔ اور دوسری وجہ یہ کہ جب خنجر اس کے ہاتھ میں ہو ۔ تو وہ سادگی کہاں رہی جس پر ہم جان قربان کرتے تھے ۔ اور پھر کے لفظ سے یہ معنی نکلتے ہیں کہ پہلے بھی ایسا ہو چکا ہے ۔ کہ ہم گلا کاٹتے تھے مگر اس نے خنجر ہاتھ میں لے لیا کہ پھر وہ سادگی باقی

رہی جس انداز پر ہم جان دیتے تھے ۔ نہ خنجر ہی پہ ہم قابو پا سکے (بیخود، آسی)

حسرت (۱) میرے ہم خیال (۲) اس کی اس سادہ لوحی پر مر جانے کی حسرت ہے جو ہم کو خنجر سے مارنا چاہتا ہے۔ اور یہ نہیں جانتا کہ وہ ہمیں بغیر خنجر ہی شہید کر سکتا ہے۔

۲۔ حالی کسی کے حسن بیان کی اس سے بہتر تعریف نہیں ہو سکتی کہ جو بات قائل کے منہ سے نہ نکلے۔ وہ سامعہ کے دل میں اس طرح اتر جائے۔ کہ اس کو یہ شبہ ہو کہ یہ بات پہلے ہی سے میرے دل میں تھی (سعید، حسرت، بیخود)

آسی (۱) ہم خیال حالی (۲) جو بات وہ کہتا ہے میں خیال کرتا ہوں کہ اسی بات کے سننے کی مجھے حسرت ہے (۳) اس کی ہر بات اتنی دلفریب ہے کہ اس کے ہونٹوں سے نکلتے ہی میرے دل میں اتر جاتی ہے۔

۳۔ عاشق اپنے دل کو تسلی دیتا ہے۔ کہ میرا ذکر مجھ سے بہتر ہے کہ انکی محفل میں ہے چاہے بہت زیادہ برائیوں کے ساتھ ہی سہی۔ مگر یہ بھی کیا کم شرف ہے۔ کہ وہاں مذکور ہے۔ کیونکہ میں تو باوجود کوششوں کے وہاں تک نہیں پہنچ سکا

۴۔ اے ہجوم ناامیدی بس بس کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ لذت جو ہمیں سعی سے حاصل ہوتی ہے۔ پامال ہو جائے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ ہم جانتے ہیں کہ ہماری سعی و کوشش بیکار ہے لیکن پھر بھی ہمیں اس میں ایک قسم کی لذت حاصل ہوتی ہے بقول طباطبائی ناامیدی کی حالت بری اور سعی گو بے نیل و مرام ہو۔ مگر لذت سے خالی نہیں۔

۵۔ رنج رہ ..... راستے کی تکلیفیں۔ واماندگی .. تھکان۔ ماماندگی کو میرے قدم سے عشق ہو گیا ہے۔ اور وہ نہیں چھوڑتی کہ میں منزل مقصود کی طرف جاؤں اور منزل کے راستے کی تکلیفیں اٹھاؤں۔ اس لئے جو قدم راہ منزل

میں لکھا ہے۔ درماندگی کی بدولت وہیں کا وہیں پڑا ہے۔

حسرت کے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے "چونکہ درماندگی سے ہمارا عاشقانہ تعلق ہے۔ اس لئے ہمارا جو قدم اٹھ نہیں سکتا (یعنی درماندہ ہے) وہ گویا منزل ہی ہے یعنی اپنے مقصد کو پہنچ چکا ہے بس پھر ہم رنج راہ کیوں اٹھائیں" سعید نے دونوں مفہوم لکھے ہیں۔ آسی۔ حسرت کے ہم خیال ہیں طباطبائی (۱) میرے ہم خیال (۲) ہم درماندگی کے نیاز مند ہیں کہ اس کی بدولت اٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل ہی ہے"۔

۶۔ معشوق عاشق سے کہتا ہے۔ کہ تمہارے دل میں دوزخ کی آگ بھری ہوئی ہے۔ عاشق جواب دیتا ہے۔ کہ اچھا یونہی سہی۔ کہ ہمارا دل جلوہ زارِ دوزخ ہے۔ مگر مہربانی فرما کر یہ بتلایئے کہ فتنۂ شورِ قیامت کس کے خمیر میں ہے یعنی اگر میرا دل جلوہ زارِ دوزخ ہے تو تمہارا خمیر بھی تو فتنۂ شورِ قیامت سے اٹھایا گیا ہے اس شعر میں نکتہ یہ ہے کہ آتش دوزخ قیامت ہی کے دن بھڑکائی جائے گی۔

۷۔ غالب کا دلِ شوریدہ ایک طلسم پیچ و تاب بنا ہوا ہے اور تمہاری تمنّا اس میں پھنسی ہوئی ہے۔ اس لئے تم اپنی تمنّا پر رحم کرو۔ اور اس کو اس طلسم پیچ و تاب سے نکال لو مطلب یہ ہے کہ اگر تم غالب پر رحم نہیں کرتے تو نہ کرو لیکن اپنی تمنّا پر تو رحم کرو۔ کہ وہ سخت مشکل میں پھنسی ہوئی ہے خوبی اس شعر میں یہ ہے۔ کہ تمنا اپنی نکالنی چاہتے ہیں۔ لیکن اس کو معشوق کی تمنّا قرار دے کر معشوق کو آمادہ کرتے ہیں۔ کہ اپنی تمنّا پر رحم کرے۔ اس شعر میں تمنّا کے بر آنے کے مضمون کو بالکل نئے انداز سے ادا کیا گیا ہے۔

دل سے تیری نگاہ جگر تک اُتر گئی ۱ دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی
شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذّتِ فراق ۲ تکلیفِ پردہ داریٔ زخمِ جگر گئی
وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں ۳ اُٹھیے بس اب کہ لذتِ خوابِ سحر گئی
اڑتی پھرے ہے خاک مری کوئے یار میں ۴ بارے اب اے ہوا ہوسِ بال و پر گئی
دیکھو تو دلفریبیٔ اندازِ نقشِ پا ۵ موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی
ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی ۶ اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی
نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا ۷ مستی سے ہر نگہ تیرے رُخ پر بکھر گئی
فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا ۸ کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گذر گئی

۹ مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمہیں
وہ ولولے کہاں وہ جوانی کدھر گئی

۱- تیری نگاہ کا تیر دل کو چیرتا ہوا جگر تک پہنچ گیا چونکہ دل و جگر دونو نیز نگاہ سے زخمی ہونے کے آرزومند تھے - اس لئے وہ دونوں اس ادا سے خوش ہو گئے ۔

۲- عاشق کو زخم جگر کی پردہ داری سے سخت تکلیف تھی ۔ جب اس کا سینہ شق ہو گیا تو اس کو عجب سرور حاصل ہوا کیونکہ اُسے زخمِ جگر کو چھپائے رکھنے کی تکلیف سے نجات مل گئی ۔ اور وہ کھلم کھلا لذتِ فراق کے لطف اٹھانے لگا ۔

۳- وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں ختم ہو گئیں ۔ کہ ساری ساری رات شراب نوشی میں مشغول اور بدمست رہا کرتے تھے ۔ جب صبح کی ٹھنڈی ہوا چلتی تو بےخبر ہو کر سو جاتے اور نیند کا لطف اٹھاتے تھے ۔ پس اب بیدار ہو

چاہیئے کہ وہ لذتِ خوابِ سحر جاتی رہی۔

طبا طبائی لکھتے ہیں۔ اگر اس شعر کے الفاظ معنیٔ حقیقی پر محمول کریں تو کچھ لطف نہیں۔ غالبؔ مصنف کو استعارہ مقصود ہے یعنی بادۂ شبانہ سے نشۂ شباب اور سحر سے پیری کا استعارہ ہے۔ اور اُٹھنے کا خطاب اپنے نفسِ غافل کی طرف ہے۔ جملہ شارحین نے یہی معنی بیان کئے ہیں۔

۴۔ بقول طبا طبائی یہ مضمون بہت ہی پامال ہے۔ اور غالب کے مرتبۂ کلام سے گرا ہوا ہے۔

میری خاک کوچہ یار میں اڑتی پھرتی ہے۔ اور یہی میری دلی تمنا تھی۔ ہوا کو خطاب کر کے کہتے ہیں کہ اے ہوا میں تیرا ممنون ہوں کہ تیری اس مہربانی کی بدولت میرے دل میں سے بال و پر کی ہوس جاتی رہی۔ اگر تو یہ مہربانی مجھ پر صرف نہ کرتی۔ تو پھر مجھے بال و پر کی آرزو ہوتی کہ اڑ کر اس کی گلی میں جاؤں اور اپنی دیرینہ آرزو پوری کروں۔

۵۔ گل کترنا۔۔ شگوفہ چھوڑنا۔ یعنی کوئی ایسی بات کرنا جس سے فساد پیدا ہو۔ اور آپ الگ رہیں۔ خرامِ یار کو موج اس لئے کہا ہے۔ کہ موج کے تحرک سے سطحِ آب پر نقش پیدا ہو جاتے ہیں کہتے ہیں: جہاں جہاں سے موجِ خرامِ یار گذری ہے وہاں گل بکھیرتی چلی گئی ہے گویا اس کے نقشِ قدم دیکھنے والے اُن پر فدا ہو رہے ہیں (آسی)

دوسرا مفہوم۔ موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر (شگوفہ چھوڑ) گئی ہے کہ اس کے دلفریب نقوش کو دیکھ کر عشاق و اغیار میں باہم فساد ہو رہا ہے یا اس کا نقشِ قدم ایسا دلفریب ہے۔ کہ دنیا اس کے پھندے میں پھنسی ہوئی ہے (سعید) بیخود نے دونوں مفہوم لکھے ہیں۔

۶ - بوالہوس ..... ہوس پرست - حسن پرستی اصل میں اہلِ نظر کا شیوہ تھا کہ وہ حسن کی خوبیوں کو دیکھ کر اس کی قدر کیا کرتے تھے - لیکن اس زمانے میں ہوس پرستوں نے حسن پرستی کو اپنا شعار بنا لیا ہے چونکہ ان کا عشق صادق نہیں ہوتا - اور ہوس پرستی پر مبنی ہوتا ہے - اس لیئے اہلِ نظر یعنی عشاق صادق کا اعتبار اور وقار بھی جاتا رہا ہے - مطلب یہ ہے کہ حسن پرستی اب معزز لوگوں کا شیوہ نہیں رہا - بلکہ ایسے ویسے لوگوں کا پیشہ ہو گیا ہے - اس لیئے اہلِ نظر کے عشقِ صادق کی قدر جاتی رہی ہے -

۷ - میری نگاہ تیرے رُخ پر پہنچکر ایسی خود رفتہ اور بدمست ہوئی - کہ وہ بکھر گئی اور بکھر جانے سے وہ دیدار میں مانع ہوئی - گویا نگاہ بکھر جانے اور مانعِ دیدار ہونے سے نقاب بن گئی -

نگاہ کو تار سے تشبیہ دی ہے - اس مضمون میں ندرت یہ ہے کہ تارِ نگاہ کے بکھر کر مانعِ دید ہونے سے نقاب کا تصور پیدا ہوا ہے - کیونکہ نقاب بھی تاروں سے بنائی جاتی ہے -

۸ - دی ..... گذشتہ کل - فردا ..... آنے والی کل - حالی کہتا ہے کہ تمہارے جاتے ہی بسبب خود رفتگی و خود فراموشی کے یہ حالت ہو گئی - کہ آج اور کل کی مطلق تمیز نہیں رہی اور ایسا ہی قیامت کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہاں ماضی و مستقبل دونوں مبدل بہ زمانہ حال ہو جائیں گے - پس تم کیا گئے گویا ہم پر قیامت گذر گئی - قیامت گذر جانے کے دو معنی ہیں - نہایت سختی کا زمانہ گزر جانا اور خود قیامت کا آ جانا -

سیدھے اور صاف معنی یہ ہیں - کہ کل جب ہمارے پاس سے چلے گئے تو ہماری ایسی بری حالت ہوئی - کہ قیامت ہی برپا ہو گئی اور اس حالت میں

فرداؤدی کا تفرقہ یکبار مٹ گیا۔ گویا گذشتہ کل ہی میرے لئے فردائے
قیامت بن گئی۔ (آسی، سعید)

۹۔ افسوس صد افسوس اسد اللہ خاں تمہیں زمانے نے مار ڈالا یعنی
محبّت کی بدولت تم موت آنے سے پہلے مر گئے۔ اب وہ تمہارے جوش
اور ولولے اور جوانی کیا ہوئی۔ مطلب یہ ہے۔ کہ سب غارت ہو گئے۔
بقول طباطبائی۔ نام کے ساتھ خاں کا لفظ لانے سے یہ معنی نکلتے
ہیں۔ کہ کسی زمانے میں قوت وسطوت حاصل تھی۔ جواب نہیں رہی۔

۱۴۴

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے ۱ حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے
اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل ۲ میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے
ساقی گری کی شرم کرو آج ورنہ ہم ۳ ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے
تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم ۴ میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے
تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا ۵ فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے
لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں ۶ جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

۷ اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا
تم کو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے

۱۔ تسکینِ قلب اس طرح سے ہو سکتی ہے۔ کہ تو مل جائے اور ذوقِ
نظر سے یہ مطلب ہے۔ کہ تو نہیں تو کوئی تیرا ہمشکل ہی مل جائے اور اسکو دیکھ کر
ہمارا ذوقِ نظر پورا ہو جائے دیکھنا ہے اگر جنت میں ہمارا ذوقِ نظر پورا ہو جائے
تو ہم تسکینِ قلب کا ماتم نہ کریں۔ اور اسی پر قناعت کر لیں۔ مگر مصیبت یہ ہے
کہ بہشت میں کوئی حور تیری ہمشکل نہیں۔ اسی لئے ہم ذوقِ نظر ...

اور تسکینِ قلب دونوں سے محروم ہیں۔

۲ مجھ کو قتل کرنے کے بعد تو مجھے اپنی گلی میں دفن نہ کر کیونکہ رشک کی وجہ سے مجھے یہ گوارا نہیں کہ میرے مدفن کے پتہ سے لوگوں کو تیرا گھر ملے۔ اس شعر کے کئی پہلو ہیں۔ مثلاً لوگ یہ کہیں گے۔ کہ جس گلی میں غالبؔ کی قبر ہے وہاں فلاں شخص رہتا ہے۔ تیرے قاتل ہونے کا حال کھل جائیگا اور تجھ سے مواخذہ ہوگا۔ یا تیری بدنامی ہوگی۔ اس لیئے تیرے نام کے ساتھ میں اپنا ذکر پسند نہیں کرتا۔ یا یہ کہ مجھ کو عشق میں قتل ہونے سے شہرت مطلوب نہیں۔

۳۔ ویسے تو ہر شب کو جتنی تھوڑی بہت شراب ہمیں مل جاتی ہے ہم پی ہی لیتے ہیں۔ لیکن آج تم ساقی بنے ہو۔ اپنی ساقی گری کی لاج رکھو۔ اور خوب جی بھر کر پلا دو۔ بقول حسرتؔ سے باندازۂ حوصلہ دو۔ آسی اس شعر کی تصویر ان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔ ساقی دو۔ چار جام پلا چکا ہے اور ان کا دل سیر نہیں ہوا۔ برابر سوال جاری ہے۔ وہ کہتا ہے بس جتنی تو پیتا ہے۔ اس کے موافق ہم تجھ کو پلا چکے۔ اب ہم نہ دیں گے۔ یہ کہ ساقی گری کی۔ الخ۔۔۔

۴۔ غالبؔ ایک خط میں اس کی شرح لکھتے ہیں:۔ شاعر کو ایک قاصد کی ضرورت ہوئی مگر کھٹکا یہ کہ قاصد کہیں معشوق پر عاشق نہ ہو جائے ایک دوست اس عاشق کا ایک شخص کو لایا۔ اور اس نے عاشق سے کہا کہ یہ آدمی وضعدار اور معتمد الیہ ہے۔ میں ضامن ہوں کہ یہ ایسی حرکت نہ کریگا خیر اس کے ہاتھ خط بھیجا گیا، قضارا عاشق کا گمان سچ ہوا۔ قاصد مکتوب الیہ کو دیکھ کر دلدادہ شیفتہ ہو گیا۔ کیسا خط، کیسا جواب۔ دیوانہ پن کپڑے پھاڑ جنگل کو چل دیا اب عاشق اس واقعہ کے بعد ندیم سے کہتا ہے کہ غیب دان تو خدا ہے کسی کے

باطن کی کسی کو کیا خبر ہے اے ندیم تجھ سے کچھ کلام نہیں لیکن اگر نامہ بر کہیں مل جائے۔ تو اس کو میرا سلام کہیو کہ کیوں صاحب کیا کیا دعوے عاشق نہ ہونے کے کر گئے تھے۔ اور انجام کار کیا ہوا۔

۵۔ بیخودؔ لکھتے ہیں۔ اگر غم پنہاں کی کشاکش سے ہمیں نجات مل جائے یعنی اگر غم دل ہماری روک تھام نہ کرے۔ تو پھر ہم تمہیں بتائیں کہ مجنوں نے.... کیا کیا تھا اور ہم کیا کر سکتے ہیں۔ "مجنوں نے کیا کیا" معنی خیز ہے۔ مثلاً یہ کہ ہم مجنوں کی طرح جنگل میں نکل جائیں۔ اور مجنوں کا نمونہ بن کر دکھائیں، یا یہ ثابت کر دکھلائیں۔ کہ مجنوں نے کچھ نہ کیا تھا۔ اور ہم کچھ اس سے بڑھ چڑھ کر کر سکتے ہیں۔

بیخودؔ لکھتے ہیں۔ کہ غم پنہاں سے اپنی پردہ دری اور رسوائی کا خیال ہے کہ وہ ہمیں جنگل کی طرف جانے سے روکتا ہے۔ اور کھینچ کھینچ کر واپس لے آتا ہے ورنہ ہم تمہیں دکھاتے کہ مجنوں نے عاشقی کو کس حد تک ترقی دی ہے۔

۶۔ خضر بھٹکے ہوئے مسافروں کی رہنمائی کرنے کے لئے مشہور ہیں کہتے ہیں۔ ہم پر یہ لازم نہیں آتا۔ کہ ہم حضرتِ خضر کی پیروی کریں۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ راہِ سلوک میں ہم گامزن تھے۔ اور اس سفر میں ہمیں ایک بزرگ ہمسفر مل گئے تھے۔ جو حضرت خضر کہلاتے تھے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ جیسے ہم بھٹکے ہوئے تھے ویسے ہی خضر بھی تھے۔ ہمارا مرتبہ سلوک، ان سے کچھ کم نہ تھا

۷۔ اے ساکنانِ کوچۂ دلدار، اگر تمہیں کہیں غالبؔ خستہ چلتا پھرتا یا گرا پڑا مل جائے۔ تو ذرا دیکھنا کہ اس کی کیا حالت ہے۔ یا اس کا خیال رکھنا۔

اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے ۱ کوئی دن گر زندگانی اور ہے
سوزِ غمہائے نہانی اور ہے ۲ آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں
پر کچھ اب کے سر گرانی اور ہے ۳ بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں
کچھ تو پیغام زبانی اور ہے ۴ دے کے خط منہ دیکھتا ہے نامہ بر
وہ بلائے آسمانی اور ہے ۵ قاطع اعمار ہیں اکثر نجوم

۶ ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

۱۔ طباطبائی لکھتے ہیں۔ بندش کی خوبی اور محاورہ کے لطف نے اس شعر کو سنبھال لیا۔ ورنہ آخری مصرعہ مبہم ہے حسرتؔ، بیخودؔ اور سعیدؔ اس کے یہ معنی لیتے ہیں۔ کہ اگر کچھ روز اور زندگی ہوئی تو ہم ترکِ محبت کی کوشش کریں گے۔

غالبؔ نے اپنے ایک خط میں اس شعر کی شرح ان الفاظ میں بیان کی ہے۔ "اس شعر میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ جو لفظ ہیں۔ وہی معنی ہیں شاعر اپنا مقصود کیوں بتائے کہ میں کیا کروں گا مبہم کہتا ہے۔ کہ میں کچھ کروں گا۔ خدا جانے شہر یا نواحِ شہر میں تکیہ بنا کر فقیر ہو کر بیٹھ رہے یا دیس چھوڑ پردیس کو چلا جائے"۔ (سعیدؔ) حقیقتاً دوسرا مصرعہ بہت سے معانی پیدا کرتا ہے۔ جو عین فصاحت ہے (آسیؔ)

۲۔ حق یہ ہے۔ کہ آتشِ دوزخ میں بہت گرمی ہے۔ لیکن اس میں ایسی گرمی نہیں جیسی کہ سوزِ غم ہائے نہانی میں ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سوزِ غم آتشِ دوزخ سے زیادہ سخت ہے۔

۳۔ سرگرانی .... رنجش، خفگی۔ ہم نے اس کی رنجشیں اور خفگیاں بارہا دیکھی ہیں لیکن اب کی مرتبہ ان کی خفگی کسی اور ہی قسم کی ہے۔ گویا یہ خفگی ایسی نہیں۔ کہ پھر صفائی ہو جائے۔

۴۔ نامہ بر نے ان کا خط مجھے دے دیا ہے لیکن وہ خط دے کر میرا مُنہ تک رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس خط کے علاوہ ان کا کچھ زبانی پیغام بھی ہے جسکو پہنچانے میں وہ ہچکچا رہا ہے۔ بقول طبا طبائی، شاید کچھ گالیاں بھی کہلا بھیجی ہیں۔ کہ ان کو دہرانے میں وہ حجاب کرتا ہے یا بقول آسی یہ کہہ دیا ہے۔ کہ اب تو میں نے جواب دے دیا ہے آیندہ مجھے کوئی خط نہ لکھنا

۵۔ قاطع.. قطع کرنے والے۔ اعمار... جمع عمر کی۔ نجوم ... ستارے بلائے آسمانی .... مراد معشوق ستمگر۔ اکثر ستارے عمروں کو قطع کرنیوالے ہیں یعنی ان کے اثر بد سے انسان مرجاتا ہے لیکن جس بلائے آسمانی دستمگر معشوق سے میرا سابقہ پڑا ہے۔ وہ ان ستاروں سے بھی زیادہ تباہ کن ہے۔ جو قاطع زندگی ہیں مطلب یہ ہے۔ کہ معشوق عمر قطع کر کے مصائب کا خاتمہ نہیں کر دیتا۔ بلکہ وہ زندگی کو موت سے بدتر بنا دیتا ہے۔ گویا وہ قضائے مبرم ہے۔

۶۔ مرگِ ناگہانی ... . وہ موت جو بن کہے ایک دم آجائے کہتے ہیں سب بلائیں ہم پر ختم ہو چکیں اور ہم نے ان کو برداشت کر لیا۔ اب فقط مرگِ ناگہانی باقی رہ گئی ہے۔ طبا طبائی لکھتے ہیں۔ کہ یہاں مرگِ ناگہانی سے محض موت مراد ہے۔ چونکہ موت کہہ کر نہیں آتی۔ بلکہ ناگہانی آتی ہے۔

۱۴۶

کوئی امید بر نہیں آتی ۱ کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معین ہے ۲ نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی ۳ اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد ۴ پر طبیعت اِدھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں ۵ ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
کیوں نہ چیخوں کہ یاد کرتے ہیں ۶ میری آواز گر نہیں آتی
داغِ دل گر نظر نہیں آتا ۷ بو بھی اے چارہ گر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی ۸ کچھ ہماری خبر نہیں آتی
مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی ۹ موت آتی ہے پر نہیں آتی

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی۔

۱۔ نہ تو میری کوئی امید بر آتی ہے۔ اور نہ امید بر آنے کی صورت نظر آتی ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ تمام عمر نامرادی میں بسر ہو گئی اور آئندہ بھی یہی امید ہے۔ اسی لئے دوسرا مفہوم یہ لکھا ہے۔ کہ آئی امید بھی پوری نہ ہوئی۔ کہ کوئی صورت معشوق کے وصل کی نظر آ جائے۔

۲۔ موت تو اس لئے نہیں آتی۔ کہ اس کے آنے کا دن مقرر ہے۔ لہذا وہ اپنے وقت پر آئے گی۔ لیکن نیند کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ موت تو نہیں ہے کہ وہ بھی وقت پر ہی آئے گی۔ اسے تو آنا چاہیئے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ جب موت کا ایک دن مقرر ہے۔ تو پھر موت کے خوف کی وجہ سے نیند رات بھر کیوں نہیں آتی

۳۔ اس شعر کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ بقول طباطبائی۔ میر کو بھی اس پر رشک کرنا چاہیئے۔ کہتے ہیں پہلے یہ حالت تھی۔ کہ کبھی مجھے اپنے حالِ زار پر ہنسی آ جاتی تھی۔ کہ میں نے اپنی کیسی شکل بنالی ہے لیکن اب افسردگی کا یہ عالم ہے کہ مجھے اپنے حال پر ہنسی بھی نہیں آتی۔

۴۔ طاعت ۔۔۔ عبادت میں عبادت و زہد کے ثواب کو اچھی طرح جانتا ہوں لیکن کیا کروں۔ اپنی طبیعت سے مجبور رہوں۔ کہ وہ اس طرف مائل ہی نہیں ہوتی مطلب یہ ہے۔ کہ عبادت خلوص قلب سے کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ مرتبہ ابھی حاصل نہیں ہوا۔

۵۔ کچھ ایسی ہی بات ہے جس کی وجہ سے میں بات نہیں کرتا۔ ورنہ یہ بات نہیں کہ میں بات کرنی نہیں جانتا۔ پہلا مصرعہ بہت سے پہلو رکھتا ہے مثلاً میرے خاموش رہنے میں کچھ مصلحت ہے جس کو میں ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔ یا رسوائی معشوق کے خوف سے بات نہیں کرتا۔ اسے معشوق کے کچھ راز معلوم ہو گئے ہیں۔ یا یہ کہ دل گلہ مند ہے۔ اور منہ کھلیگا تو شکائتیں ہی منہ سے نکلیں گی۔ شکائتیں سنکر وہ ناراض ہو جائے گا۔ یا یہ شکائتیں کون سنتا ہے اس لئے خاموش رہنا ہی بہتر ہے۔ ممکن ہے معشوق ہی نے بولنے سے منع کر دیا ہو۔ یا عشق نے منہ پر مہر لگا دی ہو۔ ؎

نہ شکر و شکایت نہ حرف حکایت
ہمیں عشق میں میرؔ چپ لگ گئی ہے

۶۔ اگر میں نہ چیخوں اور ان تک میری گریہ وزاری کی آواز نہ پہنچے۔ تو وہ کہتے ہیں۔ آج وہ شور مچانے والا کہاں گیا۔ اس کی آواز نہیں آتی۔ اس کے کئی ایک پہلو ہیں۔ مثلاً یہ کہ میری نالہ کشی وہ پسند کرتے ہیں۔ اور اس میں ان کو لطف آتا ہے۔ اس لئے میں کیوں نہ چیخوں (۲) میری گریہ و زاری کو وہ اپنی شہرت کا ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ (۳) اگر میں نہیں روتا۔ تو وہ مجھ کو بلاتے ہیں اور بلا کر نالہ و فریاد کی تاکید کرتے ہیں۔ (۴) مجھ پر ظلم کرتے ہیں۔ تاکہ میں ضرور نالہ کشی کروں۔

۷۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چارہ گر کو یقین نہیں آتا۔ کہ عاشق کے دل میں

داغ ہے۔ عاشق اس سے کہتا ہے ۔ اے چارہ گر تجھے داغِ دل نظر نہیں آتا تو کیا اس کی بو بھی نہیں آتی۔ گوشت جلنے کی بو بہت جلد آجاتی ہے اس لئے اس سے کہتے ہیں۔ کہ اگر تو کوتاہ نظر ہے تو کیا تیری قوت شامہ بھی سلب ہو گئی ہے۔ دوسرے مصرعہ میں استفہام انکاری استفہام اقراری بن کر طنز کی صورت پیدا کر رہا ہے۔ آسی لکھتے ہیں۔ کہ اے چارہ گر تجھے میری محبت سے انکار ہے تو کیا تو میرے انداز محبوبانہ سے بھی پہچان نہیں سکتا۔

۸۔ اب تو ہماری خود رفتگی اس درجہ بڑھ گئی ہے۔ کہ ہمیں خود بھی اپنے حال کی کچھ خبر نہیں رہی۔ پھر دوسروں کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔

۹۔ میں مرنے کی آرزو میں مرا جاتا ہوں۔ یعنی مجھے موت کا بیحد شوق اور انتظار ہے۔ مگر موت نہیں آتی۔ گویا مجھے آرزوئے موت میں موت آتی ہے لیکن حقیقی معنوں میں میں نہیں مرتا۔ موت کے آنے نہ آنے سے زندگی عجب کشمکش میں مبتلا ہے بیخود لکھتے ہیں۔ کہ رات دن سینکڑوں آدمیوں کا مرنا سنتے ہیں۔ مگر مجھ کو موت نہیں آتی۔

۱۰۔ مگر ... شاید۔ غالب تم خانہ کعبہ کی زیارت کا ارادہ رکھتے ہو۔ شاید تمہیں وہاں جاتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ بندۂ خدا ساری عمر تو تم نے شاہد پرستی شراب خوری اور قمار بازی میں صرف کی۔ اب وہاں جا کر خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے۔

۱۴۷

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے ۱ آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار ۲ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں ۳ کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود ۴ پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں ۵ غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

شکن زلفِ عنبریں کیوں ہے ۶ نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے

لالہ و گل کہاں سے آئے ہیں ۷ ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

ہم کو اُن سے وفا کی ہے امید ۸ جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا ۹ اور درویش کی صدا کیا ہے

جان تم پر نثار کرتا ہوں ۱۰ میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ

مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

۱۔ درد سے مراد دردِ عشق ہے۔ اپنے دل کو ملامت کرتے ہیں کہ اے نادان تجھے کیا ہوا ہے۔ ہوش کر۔ باز آ۔ جس مرض میں تو مبتلا ہو رہا ہے۔ اس کا کوئی علاج نہیں۔ دوسرا پہلو یہ ہے۔ کہ تجھے ہوا ہی کیا ہے جس کا معالجہ کیا جائے "نیسرا مفہوم یہ: دلِ ناداں تجھے کیا ہو گیا ہے۔ اپنا مرض بتا۔ زیادہ نہ چھپا۔ تاکہ میں اس کا علاج کروں۔ یا یہ کہ تو اپنی حرکتوں سے باز آئے تو تیرے علاج کی طرف رجوع کروں۔

۲۔ حالیؔ۔ گویا ابھی عشق کے کوچہ میں قدم رکھا ہے اور معشوق و عاشق میں جو راز و نیاز کی باتیں ہوتی ہیں۔ اُن سے ناواقف ہے۔ اس لئے باوجود اپنے مشتاق ہونے کے بیزار ہونے پر تعجب کرتا ہے۔ بقول بیخودؔ۔ یہ شعر بھی مرزا کے نشتروں میں سے ہے۔ آسیؔ کی شرح ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں "یہ سنا ہے کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ مگر یہاں عجب حالت ہے۔ کہ ہم اس کے مشتاق ہیں اور وہ ہم سے بیزار ہے۔"

۳۔ معشوق عاشق سے کوئی بات نہیں کرتا۔ عاشق خاموش رہتا ہے لیکن دل ہی دل میں اُبل رہا ہے۔ اور تلا بیٹھا ہے کہ ذرا سا موقعہ مل جائے تو داستانِ دل کے دفتر کھول بیٹھے۔ آخر مایوس ہو کر کہتا ہے میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں گونگا نہیں ہوں۔ کاش تم مجھ سے میرا مدعائے دل پوچھو، تو پھر میں اپنی داستان بیان کروں (آسی۔ سعید)

بیخود و طباطبائی۔ تم غیروں سے استفسار حال کرتے ہو۔ مجھے بھی خدا نے زبان دی ہے۔ مجھ سے پوچھ کر دیکھو کہ میرا مدعا کیا ہے۔

۴:۔ یہاں سے اشعار قطعہ بند ہیں۔ اے خدا جبکہ تیرے سوا کوئی اور موجود نہیں ہے۔ تو پھر یہ ہنگامہ کیا ہے۔ یعنی

۵۔ یہ پری چہرہ اور حسین لوگ کیسے ہیں اور یہ اِن کے ناز و انداز کیا چیز ہیں

۶۔ یہ عنبریں زلفوں کے شکن کیسے ہیں۔ اور یہ نگہ چشم سرمگین کیا بلا ہے۔

۷۔ یہ سبزہ و گل اور بہار کہاں سے آئی ہے۔ ابر کیا ہے ہوا کیا ہے ان پے در پے استفسارات سے مطلب یہ ہے۔ کہ جب خدا کی ذات کے سوا، تمام چیزیں ہیچ اور معدوم ہیں تو پھر یہ چیزیں کیا ہیں۔ جو انسان کے دل کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ اور اس کو اطمینان سے ذات باری کی طرف رجوع ہونے سے روکتی ہیں۔ اشعار متذکرہ اِن ہنگامہ خیز اشیاء کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ اور اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں۔ کہ ہم ضرور ذات باری کی طرف رجوع کریں لیکن یہ دلفریبیاں ہمارے دامنِ دل کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ اور سکونِ قلب سے ذات باری کی طرف متوجہ نہیں ہونے دیتیں۔

۸۔ عشق نے عقل خبط کر دی ہے۔ کیوں کہ ہم ان لوگوں سے وفا کی امید لگائے بیٹھے ہیں جن کو معلوم نہیں کہ وفا کس چیز کا نام ہے۔ بقول آسی جفا کاروں سے

امیدِ وفا خیال خام ہے۔ طبا طبائی و بیخود لکھتے ہیں وہ کمسنی کی وجہ سے ایسے نادان ہیں۔ کہ وفا ہی کو نہیں جانتے۔

۹۔ ہم درویشوں کی یہی صدا ہے۔ کہ ہاں بھلا کر تیرا بھلا ہوگا۔ الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ خود ایک فقیر ہیں! اور یہ صدا لگا کر معشوق کو بھلائی کرنے پر آمادہ کر رہے ہیں۔

۱۰۔ میں اوروں کی طرح خالی دعائیں دینی نہیں جانتا۔ بلکہ اپنی جان تم پر نثار کرتا ہوں۔ آسی نے دوسرا مفہوم یہ پیدا کیا ہے۔ کہ میں اپنے مرنے کی دعا کیوں مانگوں۔ اے لو۔ اپنی جان دیتا ہوں۔

۱۴۸

۱ اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ وہ آئے
کہتے ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مو آئے

۲ کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے پوچھنے کو آئے
ہوں کشمکشِ نزع میں ہاں جذبِ محبت

۳ آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آئے
ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم

۴ ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے
ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین

۵ ہم جانتے ہیں ہیں سے جس بھیس میں جو آئے
جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے

۶ دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے
ہاں اہلِ طلب کون سُنے طعنۂ نایافت

۷ اُس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو آئے
اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں

۸ اچھے رہے آپ اُس سے مگر مجھ کو ڈبو آئے
کی ہم نفسوں نے اثر گریہ میں تقریر

۹ اُس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے غالبؔ
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

۱۔ غالیہ۔ اس مرکب خوشبو کو کہتے ہیں۔ جو مشک و عنبر اور کافور وغیرہ کو ملا کر بناتے ہیں۔ غالیہ مو مشکیں و معنبر زلفوں والا محبوب۔ اے ہمدمو تم میری

حالتِ زار کو دیکھ کر یہ دعا کرتے ہو۔ کہ خدا کرے کہ وہ عنبرین زلفوں والا محبوب آجائے۔ تاکہ غالب کو سکونِ قلب حاصل ہو جائے لیکن میری تمنا یہ ہے۔ کہ تم میں سے کوئی گھبرا کر کہے کہ لو وہ واقعی آگئے۔

۲۔ میں کشمکشِ نزع میں مبتلا ہوں۔ اس لیئے اُن سے کلام کرنے کی مہلت نہیں لیکن اے جذبۂ اُلفت اتنا تو کر کہ تو اِن کو میری عیادت کے لیئے کھینچ لا۔ تاکہ اور کچھ نہیں تو مرتے وقت میں اِن کو دیکھ ہی لوں۔

۳ صاعقہ... گرنے والی بجلی سیماب... پارہ۔ یہ تمام چیزیں ایک جگہ قرار نہیں پاتیں۔ کہتا ہے۔ معشوق اگرچہ آیا۔ لیکن اس کا آنا میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ وہ بجلی کی طرح تڑپتا۔ شعلہ کی طرح بھڑکتا اور سیماب کی طرح مچلتا ہوا آیا ہے۔ گویا ایک دم بھر بھی چین سے نہ بیٹھا کہ چل دیا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ ہم لوگوں کو دنیا میں آنا سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ شعلۂ برق و سیماب کی طرح ایکدم کو قرار نہیں۔ لہٰذا جتنی مدت زندہ رہتے ہیں بیقرار ہی رہتے ہیں۔

۴۔ حالی۔ نکیرین وہ فرشتے جو دفن ہونے کے بعد مردے کا حساب لینے قبر میں آتے ہیں۔ بادۂ دوشینہ... یعنی رات کی پی ہوئی شراب جو مرنے سے پہلے پی تھی۔ از راہ شوخی کہتا ہے۔ کہ نکیرین کے سوال و جواب سے بچنے کی کوئی تدبیر اس کے سوا نہیں کہ شراب پی کر مریں تاکہ نکیرین اس کی بو کی کراہت سے بغیر سوال و جواب کیئے چلے جائیں۔

۵۔ یہ شعر تصوّف میں ہے کہتے ہیں۔ کہ ہم ہر چیز میں محبوب حقیقی کا جلوہ دیکھتے ہیں۔ اس لیئے نہ تو جلّاد سے جھگڑتے ہیں اور نہ واعظ سے لڑتے ہیں گویا ہم یہ خوب سمجھتے ہیں کہ یہ تو وہی ہے کہ اپنا بھیس بدلکر مختلف شکلوں میں ظاہر ہوا ہے

بہر رنگے کہ خواہی جامہ مے پوش من انداز قدت را می شناسم

۶۔ ئے اہل طلب یہ طعنہ کون سنتا کہ اس نے سر معرفت کو ڈھونڈا۔ اور نہ پایا۔ اس لئے جب میں نے دیکھا۔ کہ وہ کسی طرح نہیں ملتا۔ تو اپنے آپ ہی کو کھو دیا۔ تاکہ یہ طعنہ نایافت سننے کی صلاحیت ہی باقی نہ رہے۔

۷۔ شیوہ۔۔۔۔ دستور۔ اپنا طریقہ اور دستور یہ نہیں ہے کہ مایوسی ہونے پر پاؤں توڑ کر بیٹھ جائیں۔ جب ہم نے دیکھا کہ معشوق مجازی کے در پر ہمیں بار نہیں تو ہم خانہ کعبہ ہی سے ہو آئے۔ کہ وہ معشوق حقیقی کا گھر ہے مطلب یہ نکلا۔ مایوسی نے ہمارے درجہ کو اور بھی بلند کر دیا۔

آسی۔ طبا طبائی اور سعید کا خیال ہے۔ کہ شاعر خانہ کعبہ کو جانا ہرزہ گردی اور مشغلہ بیکاری سمجھتا ہے بیخود لکھتے ہیں۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ اس کا پتہ کہیں نہیں ملتا۔ تو جا کر خانہ کعبہ کی زیارت سے مشرف ہو آئے یعنی یہاں یار نہ ملا۔ تو یار کے گھر ہی کو دیکھ آئے۔

۸۔ ہم نفس۔۔۔۔ دوست۔ اثر گریہ میں یعنی اثر گریہ کے بارے میں میرے دوستوں نے از راہ ہمدردی معشوق کے پاس جا کر اثر گریہ کے بارے میں گفتگو کی اور کہا کہ غالب دن رات روتا ہے اور رو رو کر اس کا برا حال ہو گیا ہے۔ دیکھنا اس کی گریہ و زاری تمہیں برباد کر دے گی۔ اس بیان سے معشوق پر ثابت ہو گیا کہ عاشق کے رونے کا معشوق پر کوئی اثر نہیں ہوتا کیونکہ اگر گریہ میں اثر ہوتا۔ تو اس پر ضرور کچھ نہ کچھ اثر ہوتا۔ چنانچہ اس نے میرے دوستوں کو بھی دلائل پیش کر کے قائل کر دیا۔ اور انہوں نے بھی مان لیا کہ ہاں واقعی گریہ و زاری میں کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کے ہم خیال ہونے سے معشوق خوش ہو گیا۔ گویا یہ لوگ تو اس سے اچھے رہے۔ لیکن مجھ کو ڈبوا دیا۔ "ڈبو آئے" کے متعدد مفہوم ہیں۔ بقول بیخود میرے گریہ کی بے اثری کا قائل ہو جانا

میرے لئے شرمندگی کا سبب تھا۔ بقول آسی، کبھی کبھی جو میں اُس کو اپنے نالہ و فریاد کے اثر کی دھمکی دیتا تھا۔ اب وہ بھی گئی۔ بقول حسرت ہاسعید اس طرح سے اس پر میرے رونے کی بے اثری ثابت ہو گئی۔ بیخود نے دوسرا مفہوم یہ لکھا ہے۔ کہ معشوق سے میرے گریہ کا حال کہہ دیا۔ جس کو ہمیشہ پوشیدہ رکھتا تھا۔ اب اس حال کے ظاہر ہو جانے کے بعد میں اس کی نگاہوں میں حقیر ہو جاؤں گا۔

آسی کی شرح میں "اچھے رہے آپ اس سے" کی شرح درست نہیں لکھتے ہیں۔ کہ اس حساب سے دوست تو اچھے رہے۔ کہ انہوں نے میرے اوپر احسان ثابت کر دیا۔ سعید نے بھی "اس سے" کی شرح مبہم رکھی ہے لکھتے ہیں ایسا کرنے سے وہ اپنے آپ تو سرخرو بن گئے۔

۹۔ تقدیر سے مراد بری تقدیر ہے کہتے ہیں۔ اس بزم ناز کی کیا بات ہے۔ یعنی وہ ایسی پر لطف ہے۔ کہ اس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ ہم وہاں گئے اور اس سے لطف اندوز ہوئے۔ اس وقت معاً ہمیں یہ خیال آیا کہ غالب افسوس تیری قسمت کہ تو اس انجمن ناز کے لطف صحبت سے محروم ہے۔

دوسرے مصرعہ کی شرح میں طبا طبائی لکھتے ہیں۔ تیرے صدمۂ دوری کا حال ہم اس سے جا کر بیان کر آئے۔ آسی نے دونوں مفہوم بیان کئے ہیں

۱۸۹

سینہ جویائے زخم کاری ہے	۱	پھر کچھ اک دل کو بیقراری ہے
آمدِ فصل لالہ کاری ہے	۲	پھر جگر کھودنے لگا ناخن
پھر وہی پردہ عماری ہے	۳	قبلۂ مقصد نگاہِ نیاز
دل خریدارِ ذوقِ خواری ہے	۴	چشم دلّال جنس رسوائی

وہی صد رنگ نالہ فرسائی ۵ وہی صد گونہ اشکباری ہے
دل ہوائے خرام ناز سے پھر ۶ محشرستانِ بے قراری ہے
جلوہ پھر عرض ناز کرتا ہے ۷ روز بازارِ جاں سپاری ہے
پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں ۸ پھر وہی زندگی ہماری ہے
پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز ۹ ق گرم بازارِ فوجداری ہے
ہو رہا ہے جہان میں اندھیر ۱۰ زلف کی پھر سرشتہ داری ہے
پھر دیا پارۂ جگر نے سوال ۱۱ ایک فریاد و آہ و زاری ہے
پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب ۱۲ اشکباری کا حکم جاری ہے
دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا ۱۳ آج پھر اس کی روبکاری ہے

۱۴ بے خودی بے سبب نہیں غالبؔ
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

۱۔ میرا دل پھر بے چین ہو رہا ہے۔ اور میرا سینہ عشق کا کاری زخم کھانے کا مشتاق ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ دل و جگر کسی کی تیز نگاہ کا نشانہ بننا چاہتے ہیں۔

۲۔ چونکہ آمدِ فصل لالہ کاری ہے۔ اس لئے میرا ناخن غم پھر جگر کاوی کرنے لگا۔ الفاظ نہایت مناسب صرف کئے گئے ہیں۔ کاری۔ کاشتن۔ بونا۔

۳۔ نیاز۔۔۔۔ حاجت۔ پردۂ عماری یعنی وہ محمل جس میں معشوق فروکش ہے۔ کہتے ہیں پھر ہماری نگاہِ نیاز مند کا قبلہ وہی پردۂ عماری بن گیا ہے جس میں معشوق فروکش ہے۔ یعنی ہم پردۂ عماری کی طرف متوجہ ہیں۔۔۔ پردۂ عماری اور غلاف خانہ کعبہ کی رعایت ملحوظ ہے۔

۴۔ ہماری آنکھ دلال ہے۔ اور جنسِ رسوائی کی دلالی کر رہی ہے فعق

خواری کی وجہ سے دل اس جنس رسوائی کا خریدار بنا ہے مطلب یہ ہے کہ آنکھ ہی دلالی کر کے سودائے عشق میں پھنساتی ہے۔

۵۔ پہلے شعر کی تفصیل اس شعر میں بیان کرتے ہیں۔ کہ دل پھر اسی طرح سو سو رنگ سے نالہ فرسائی میں مشغول ہے۔ اور میں پھر وہی سینکڑوں طرح سے بیقرار ہوں۔ گویا کسی پہلو چین نہیں۔

۶۔ یار کے خرامِ ناز کی آرزو میں میرا دل پھر محشرستان بے قراری بن گیا ہے خرام یار کو محشر سے تشبیہہ دیا کرتے ہیں۔ اندر محشرستان اس مقام کو کہتے ہیں جہاں بیشمار قیامتیں برپا ہوں۔ دل کے محشرستان بیقراری بننے سے یہ مطلب ہے۔ کہ دل میں بیقراریوں کے ہزارہا حشر برپا ہیں۔

۷۔ حسرت۔ یعنی جلوۂ یار پھر سرِ ناز ہے۔ اور جاں سپاری عشق کا بازار گرم ہے۔ یہ شرح سب سے بہتر ہے (سعید)

طباطبائی۔ جاں سپاری عاشق کا روز بازار ہے۔ کہ جلوۂ معشوق متاعِ ناز کو عرض کر رہا ہے۔ کہ کون اس کا خریدار ہے۔

آسی۔ جلوۂ یار نے ظاہر ہو کر سر بازار جاں سپاری عاشق کو تاب و تاب اور رونق دی ہے۔ اور جاں سپاری کا بازار گرم ہے۔

بیخود۔ جلوۂ یار متاعِ ناز و غرور کو دکھا کر کہہ رہا ہے کہ کون عاشق جانباز اس کا خریدار بنتا ہے۔ گویا بازار جاں سپاری کی ہر روز گرم بازاری ہے۔

۸۔ پھر اسی بے وفا پر مرتے ہیں۔ اور ہماری زندگی پھر پہلی طرح وقفِ آلام ہے۔ طباطبائی۔ جس پر مرتے ہیں، اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں۔

۹۔ عدالتِ ناز کے دروازے پھر کھل گئے ہیں اور پھر فوجداری کا بازار گرم ہو گیا ہے یعنی عدالتِ ناز کے کھلنے سے عشاق میں دار و گیر ہونے

نکیں - اور ان کے مقدمات عدالت میں پیش ہونے لگے۔ بقولِ بیخود، فصل گل کے آتے ہی پھر جنون وعشق کے ولولے دلوں میں پیدا ہونے شروع ہو گئے۔

۱۰- جہاں میں ایک اندھیر ہو رہا ہے کیونکہ فلسفہ سر رشتہ داری کے عہدہ پر فائز ہے۔ اس لئے اس نے تھلکہ مچا رکھا ہے۔ سر رشتہ اور اندھیر زلف کے مناسبات ہیں۔

۱۱- "سوال دینا"۔ قانونی زبان میں درخواست دینے اور دعویٰ دائر کرنے کو کہتے ہیں۔ پھر پارۂ جگر نے دعویٰ دائر کیا ہے۔ اس لئے فریاد آہ وزاری جوابدہی کے لئے جمع ہوئی ہیں۔ کہ یہ دعویٰ جھوٹا ہے۔

۱۲- اس مقدمہ میں گواہ عشق پھر طلب ہوئے۔ کہ اپنا بیان دیں۔ اور اشکباری کا حکم جاری ہوا ہے یعنی اشک باری کو بھی طلب کیا گیا ہے

۱۳- روبکاری.... پیشی۔ تاریخ۔ حاضری۔ دل اور مژگان کے درمیان جو مقدمہ تھا۔ آج پھر اس کی تاریخ ہے۔ کہ اپنا اپنا دعوےٰ اور جواب دعوےٰ پیش کریں۔

۱۴- غالب یہ بیخودی اور خود فراموشی بے سبب نہیں ہے۔ کچھ نہ کچھ بات ضرور ہے۔ جس کو چھپانے کے لئے بے خودی کی آڑ لی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ راز عشق کو چھپانے کی غرض سے تم نے بیخودی اختیار کی ہے۔

آسی لکھتے ہیں۔ کہ مقطع بھی قطعہ میں شامل ہے۔ گویا پوچھا گیا ہے کہ اگر تم کو مژگان نے نہیں ستایا۔ تو تم یہ بتاؤ کہ بے خود کیوں ہو۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ قصور تمہارا ہے۔ اور تم اس کو چھپاتے ہو۔ یعنی تم کو عشق ہے اسی وجہ سے تم کو بیخودی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مژگان کا کوئی قصور نہیں۔

نمک پاش خراشِ دل ہے لذتِ زندگانی کی ۱ جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی
ہوئی زنجیرِ موجِ آب کو فرصت روانی کی ۲ کشاکشہائے ہستی سے کرے کیا سعی آزادی
شرارِ سنگ نے تربت پہ میری گلفشانی کی ۳ پس از مردن بھی دیوانہ زیارتگاہ طفلاں ہے

۱- اگر رنج یا تکلیف کی حالت میں انسان کو تھوڑی سی راحت یا آرام مل جائے تو اس کے بعد تکلیف کا احساس اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ شادمانی کی "شادمانی کردم" کا ترجمہ ہے فرماتے ہیں۔ اگر ہم نے کسی قدر لطف زندگی اور شادمانی حاصل کی۔ تو اس سے ہمارے جنون پر تسکین کا الزام نہیں لگایا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ شادمانی تو زخم دل پر اور بھی زیادہ نمک پاشی کرتی ہے (حسرت سبیدم۔ طبا طبائی۔ اگر میں نے شادمانی کی تو اس سے مجھ پر تسکین کی تہمت نہیں لگ سکتی بلکہ میری شادمانی نمک پاشی زخم دل کے سبب سے ہے نہ کہ تسکین کے سبب سے اور لذت زندگانی کا نمک پاش ہونا یہ مطلب رکھتا ہے کہ انسان برے حالوں جیتے رہنا زخم دل پر نمک چھڑکنا ہے اور زخم دل پر نمک چھڑکنے سے اور سوزش زیادہ ہوتی ہے۔ تسکین کجا (بیخود، آسی)

آسی کا دوسرا مفہوم۔ اے جنون چونکہ ہم نے کچھ خوشی کی ہے تو تجھ پر اس سے تسکیں کی تہمت جو تیرے لئے باعثِ ننگ ہے نہیں رکھی جا سکتی۔ بلکہ اگر ہم نے لذت زندگی کچھ اٹھائی ہے۔ تو وہ اس لئے اٹھائی ہے کہ کچھ دیر بعد وہ ہم سے چھین جائیگی۔ یا ہم اس کو چھوڑ دیں گے۔ تو وہ اور بھی ہمارے زخم دل کے لئے باعثِ نمک پاشی ہو جائیگی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو عیش فانی ہو وہ اور بھی باعث تکلیف ہے۔

۲- چونکہ زندگی کی کشاکش سے کوئی شخص آزاد نہیں ہو سکتا۔ اس

لئے سعی آزادی فضول ہے۔ اس کے ثبوت میں یہ مثال پیش کرتے ہیں۔ کہ موجِ آب کو دیکھیے۔ اس کی روانی ظاہرا طور پر یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ آزاد ہے۔ لیکن اگر بہ نظرِ غور دیکھیں تو وہ آزاد نہیں بلکہ وہ اپنی روانی ہی کی وجہ سے پابند ہے۔ کیونکہ موج کی روانی زنجیر کی صورت پیدا کرتی ہے اور جس کے پاؤں میں زنجیر پڑی ہوئی ہے۔ اس کو آزاد نہیں کہا جاتا پس معلوم ہوا کہ موج گرفتار ہے اور وہ سعی آزادی بھی برابر کر رہی ہے لیکن باوجود متواتر کوششوں کے اس کی سعی آزادی کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ بلکہ اور زیادہ الجھتی چلی جاتی ہے۔ آسی نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے۔ کہ یہاں کی آزادی بھی گرفتاری ہے۔

۳۔ مرنے کے بعد بھی تیرا دیوانہ لڑکوں کی زیارت گاہ بنا رہا۔ وہ پتھر جو انہوں نے مجھ دیوانے کی قبر پر مارے۔ ان کے شراروں سے میری قبر پر خوب گلفشانی ہوئی وہ قبریں جو زیارت گاہ بن جاتی ہیں۔ ان پر ہمیشہ پھول چڑھائے جاتے ہیں۔ چونکہ یہ عشق کے دیوانے کی قبر تھی۔ اس لئے اس پر گلہائے آتشیں چڑھائے گئے۔ جو سنگباری سے پیدا ہوئے۔

۱۵۱

نکوہش ہے سزا فریادیٔ بیدادِ دلبر کی ۱ مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبحِ محشر کی

رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے ۲ اگر بووے بجائے دانہ دہقاں نوکِ نشتر کی

پرِ پروانہ شاید بادبانِ کشتیٔ مے تھا ۳ ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی

کروں بیدادِ ذوقِ پرفشانی عرض کیا قدرت ۴ کہ طاقت اڑ گئی اڑنے سے پہلے میرے شہپر کی

کہاں تک روؤں اس کے خیمہ کے پیچھے قیامت ہے ۵ مری قسمت میں یا رب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

۱۔ نکوہش ... ملامت۔ چونکہ بیدادِ دلبر کی فریادی کی سزا آئینِ عشق کے مطابق ملامت مقرر ہے۔ اس لئے میں ڈرتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ اسی قانون کے

مطابق قیامت کے دن صبح محشر بھی اس پر خندہ زن ہو یا خندہ دنداں نما کرے
طبا طبائی، بیخود، آسی، اسعید (حسرت کا خیال ہے۔ کہ مبادا رفع تعجب کے لئے
لائے ہیں۔

۲- ریشگی بمعنی خلش مشہور ہے۔ کہ ایک مرتبہ لیلیٰ نے فصد کھلوائی۔ اس کا اثر
مجنوں پر یہ ہوا کہ اُس کے ہاتھ سے خود بخود خون جاری ہو گیا۔ اس شعر میں اسی
واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ فرماتے ہیں، اگر دشت مجنوں میں دہقان بجائے
دانہ بونے کے نشتر کی نوک بوئے تو اتحاد حسن و عشق کے اثر سے نوک نشتر
کی خلش لیلےٰ کو بھی اسی طرح محسوس ہو جس طرح لیلیٰ کی فصد کھلنے سے مجنوں
کی فصد خود بخود کھل گئی تھی (حسرت) باقی شارحین ریشگی سے مراد اُگنا لیتے
ہیں یعنی اگر دشتِ مجنوں میں دہقان دانہ کی جگہ نوکِ نشتر بوئے تو اس زمین
میں سے رگِ لیلےٰ اُگے۔ طبا طبائی کا خیال ہے۔ کہ کاتب نے نقطے لگا کر دست
کو دشت بنا دیا ہے۔ آسی کہتے ہیں، دستِ مجنوں سے یہ لطیف معنی پیدا نہیں
ہوتے اور نہ لفظ خاک بامعنی رہتا ہے۔

۳- کشتیِ مے۔ وہ سینی جس میں شراب کے لبریز ساغر رکھ کر مے نوشوں کے
سامنے پیش کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ شاید پروانے کا پر کشتیِ مے کا بادبان تھا
کیونکہ جب محفل گرم اور شمع روشن ہوئی تو پروانے آ گئے۔ اور پروانوں کے
آتے ہی کشتیِ مے گردش کرنے لگی ہے۔ یعنی ساغر کا دور چلنے لگا۔ اس شعر
میں یہ خوبی ہے۔ کہ ہوا گرمی سے تحرک میں آتی ہے۔ اور جب ہوا میں حرکت
پیدا ہوتی ہے تو بادبانوں کی مدد سے کشتی کو بھی حرکت ہوتی ہے۔ بقول
حسرت۔ دورِ ساغر کی روانی گرمیِ مجلس پر منحصر تھی۔ اور گرمیِ محفل سوزِ پروانہ
پر اس لیے پرِ پروانہ گویا کشتیِ مے کا بادبان ٹھہرا کہ اس کی وجہ سے دورِ ساغر

وکشتیٔ مے ظہور میں آیا۔

۴۔ پرفشانی... پرواز، اڑنا۔ کیا قدرت... مجھ میں قدرت نہیں طاقت اڑ گئی... زائل ہو گئی۔ شہپر... وہ پر جس کی مدد سے پرندے اڑنے میں مجھ میں اتنی قدرت نہیں۔ کہ میں ذوقِ پرواز کے ظلم وستم بیان کردں۔ بس یہ سمجھ لو۔ کہ اڑنے سے پہلے میرے پر پرواز کی طاقت زائل ہو گئی۔ اور پرفشانی کا شوق دل ہی دل میں رہ گیا۔ اب یہی ذوقِ پرفشانی مجھے ناقابلِ برداشت تکلیف پہنچا رہا ہے۔

۵۔ یارب میں خیمۂ یار کے پیچھے کہاں تک روتے جاؤں۔ کیا میری قسمت میں پتھر کی دیوار بھی نہ تھی۔ کہ میں اس سے اپنا سر پھوڑ کر ہی قصہ تمام کرلیتا اور اس رونے کی تکلیف سے نجات پاتا۔

۱۵۲

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے ۱ جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے ۲ اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے ۳ یاں تک مٹے کہ آپ ہم اپنی قسم ہوئے

سختی کشانِ عشق کی پوچھے ہے کیا خبر ۴ وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا الم ہوئے

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں ۵ تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں ۶ ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اللہ رے تیری تندیٔ خو جس کے بیم سے ۷ اجزائے نالہ دل میں مرے رزقِ ہم ہوئے

اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق ۸ جو پاؤں اٹھ گئے وہی ان کے علم ہوئے

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے ۹ جو واں نہ کھنچ سکے سو وہ یاں آ کے دم ہوئے

چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی ۱۰ سائل ہوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہوئے

۱۔ سُبک ۔۔۔۔ خفیف، ذلیل ۔ اپنی بے اعتدالیوں کی بدولت ہم سب کی نگاہوں میں ذلیل ہو گئے ۔ یوں سمجھ لیجئے ۔ کہ ہم جس قدر زیادہ (اپنی حد سے) بڑھے ۔ اتنے ہی لوگوں کی نظروں میں گھٹ گئے ۔

۲۔ سخت قریب ۔۔۔۔ بہت ہی قریب صیاد نے ہمارے آشیانے کے بالکل قریب جال پھیلایا تھا ۔ اور ہم کو اس کی خبر نہ تھی ۔ اس لئے اپنے گھونسلے سے ابھی اڑنے بھی نہ پائے تھے ۔ کہ گرفتار ہو گئے ۔ بقول حالی ۔ اس شعر کا مطلب یہ ہے ۔ کہ ہم کو ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی مصائب و شدائد نے گھیر لیا ۔ واقعہ یہ ہے ۔ کہ مرزا صاحب کی زندگی شروع سے لے کر آخر تک وقفِ آلام رہی ۔ اس لئے یہ شعر آپ بیتی ہے ۔

۳۔ کسی چیز کے نہ ہونے کو محاورے میں اس طرح کہتے ہیں ۔ کہ فلاں چیز ہمارے پاس قسم کھانے کو بھی یا نام کو بھی نہیں ہے گویا وہ برائے نام بھی ہوتی تو ثبوت کے لئے قسم کھانے کو کافی تھی ۔ اس شعر میں کہنا یہ چاہتے ہیں ۔ کہ ہماری ہستی فنا ہے ۔ اور اس کا وجود برائے نام صرف قسم کھانے کے لئے ہے یعنی ہم اس حد تک مٹ چکے ہیں ۔ کہ بس قسم کھانے کو رہ گئے ہیں ۔ اس لئے ہماری ہستی ہماری فنا کی دلیل ہے ۔

۴۔ عشق کی سختیاں اٹھانے والے لوگوں کی حالت تم کیا پوچھتے ہو ۔ وہ لوگ رنج و غم سے گھلتے گھلتے از سرتا پا الم بن گئے یعنی غم نے گھلا گھلا کر ان کو اپنی طرح غیر مرئی بنا دیا ۔

۵۔ تیری وفا سے بھلا ظلموں کی کیا تلافی ہو سکتی ہے ۔ بیشک تو وفا کر کے اپنے ظلموں کی تلافی کر سکتا ہے لیکن ان ظلموں کی تلافی کیونکر ہو سکتی ہے ۔ جو تیرے علاوہ اور لوگوں نے ہم پر کئے ہیں ۔

طباطبائی لکھتے ہیں۔ کہ معشوق کو تلافیٔ ستم کرنے پر آمادہ پایا جاتا ہے۔ چاہتا ہے کہ اسے اور زیادہ ترس آئے۔

۶۔ قلم ہوئے۔ یعنی کٹ گئے لکھنے رہے کی رعایت سے قلم ہوئے لائے ہیں یعنی باوجودیکہ ہمارے ہاتھ بھی کاٹ ڈالے گئے لیکن پھر بھی ہم جنونِ عشق کی داستان خونچکاں لکھنے سے ہرگز باز نہ آئے۔ یا یہ کہ ہاتھ کٹوانے منظور کئے لیکن جنون کی داستان خونچکاں کا لکھنا نہ چھوڑا۔

۷۔ بیم۔۔۔۔ خوف، ڈر۔ رزق ہم ہوئے۔۔۔۔ ایک دوسرے کا رزق ہو گئے یعنی ایک کو دوسرا کھا گیا۔ اللہ رے تیری تندخوئی۔ کہ جس کے خوف سے میرے نالے کے اجزاء ایک دوسرے کا رزق بن گئے یعنی ایک دوسرے کو کھا گئے یا منہ سے باہر نہ نکلے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ نالے تیرے خوف سے منہ سے باہر نہ نکلے اور دل کے دل ہی میں ہی فنا ہو گئے۔

۸۔ نبردِ عشق۔۔۔۔ میدانِ عشق، جنگِ عشق۔ پاؤں کے اٹھنے کو علمِ فتح قرار دیا ہے۔ اور اس سے مراد پاؤں کا اکھڑ جانا ہوتا ہے۔ میدانِ عشق کو چھوڑ کر بھاگ جانا اہل ہوس کی فتح ہے۔ کیونکہ میدان سے بھاگتے ہیں جو قدم ان کے اٹھے۔ وہ گویا ان کی فتح کے علم بلند ہو گئے۔ بقول بیخود۔ جان بچی سو لاکھوں پائے۔

۹۔ دم۔۔۔۔ سانس۔ جب ہم عدم میں تھے۔ تو ہمارے سپرد چند نالے کئے گئے۔ ان نالوں میں سے کچھ نالے تو ہم نے عدم میں کھینچے جو باقی رہے وہ ہمارے ساتھ اس دنیا میں آ گئے۔ اور وہ ہمارا سانس بن گئے۔ مطلب ہے کہ یہ جو ہم سانس لیتے ہیں یہ سانس نہیں ہے۔ بلکہ یہ نالے ہیں۔ جو ہم عدم میں نہ کھینچ سکے تھے۔ بقول حسرتؔ، اپنے سراپا درد ہونے کو اس پہلو سے بیان کیا

۱۵۱

ہے۔ کہ میرا نفس گویا نالہ ہے۔

۱۔ عشق و عاشقی کے اس قدر دلدادہ ہیں۔ کہ فقیر ہو گئے۔ لیکن عاشقی نہ چھوڑی پہلے عشق حسینوں سے تھا۔ اب اہل کرم کے عاشق ہیں۔ اور ان کی تلاش میں در بدر بیابان کے پیچھے مارے مارے پھرتے ہیں۔

۱۵۳

جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی ۱ تو فسردگی نہاں ہے بکمیں بے زبانی

مجھے اس سے کیا توقع بہ زمانۂ جوانی ۲ کبھی کودکی میں جس نے نہ سنی مری کہانی

یونہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ کہتا ۳ کہ مرے عدو کو یارب ملے میری زندگانی

۱۔ نقدِ داغِ دل ۔۔۔۔ داغ کی صورت اشرفی کی سی سُرخ ہوتی ہے اس لئے اس کو نقدِ دل کہا ہے۔ شعلہ کو زبان سے تشبیہہ دی جاتی ہے شعلہ کا پاسبانی نہ کرنا بیزبانی ہے۔ اور اس بیزبانی کا انجام افسردگی یعنی بجھ جانا ہے۔ کمین ۔۔۔۔ گھات ۔۔۔۔ کہتے ہیں۔ اگر شعلہ عشق میرے دل کی نقدی کی پاسبانی نہ کرے۔ تو افسردگی جو کہ بے زبانی کی اوٹ میں چھپی بیٹھی ہے۔ وہ داغِ دل افسردہ ہو جائے۔

۲۔ بچپن میں بچوں کو کہانیاں سننے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس نے کبھی بچپن کے زمانے میں تو میری کہانی سنی نہیں۔ اب جوانی کے زمانے میں مجھے اس سے کب توقع ہو سکتی ہے۔ کہ وہ میری داستانِ غم سنے گا۔

۳۔ یونہی ۔۔۔۔ بے وجہ ۔۔۔ بے وجہ کسی کو دکھ دینا اچھا نہیں۔ ورنہ میں یہ دعا مانگتا۔ کہ یارب میری زندگی میرے دشمن کو دے دے۔ مطلب یہ ہے کہ میری زندگی بہت زیادہ دکھوں بھری ہے۔ ویسے تو دشمن کو میری زندگی کا یقین نہیں آتا۔ اور وہ مجھ پر آوازے کستا ہے۔ اگر اس کی مجھ جیسی حالت ہوتی تو

پھر اُسے حقیقت معلوم ہوتی۔ لیکن شرافت ذاتی مجھے اس دعا کی اجازت نہیں دیتی۔

۱۵۴

ظلمتکدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے ۱ اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے
نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال ۲ مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے
مے نے کیا ہے حسنِ خود آرا کو بے حجاب ۳ اے شوق یاں اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے
گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا ۴ کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے
دیدار بادہ حوصلہ ساقی نگاہِ مست ۵ بزمِ خیال میکدۂ بے خروش ہے
اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل ۶ قطعہ زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو ۷ میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی ۸ مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط ۹ دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ ۱۰ یہ جنتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبحدم جو دیکھیے آکر تو بزم میں ۱۱ نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی ۱۲ اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

۱۳ آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

۱۔ میرزا نے اس مطلع کی شرح ایک خط میں خود لکھی ہے فرماتے ہیں۔ ع

اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے"

یہ خبر ہے پہلے مصرعہ "ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے —"
یہ مبتدا ہے۔ شبِ غم کا جوش یعنی اندھیرا ہی اندھیرا، ظلمتِ غلیظ۔ سحر ناپید،

گویا خلق ہی نہیں ہوئی، ہاں ایک "دلیلِ صبح کی بود پر ہے یعنی بجھی ہوئی شمع
اس راہ سے کہ شمع و چراغ صبح کو بجھ جایا کرتے ہیں۔ لطف اس مضمون کا یہ ہے
کہ جس شے کو دلیلِ صبح ٹھہرایا ہے۔ وہ خود ایک سبب ہے۔ منجملہ اسباب
تاریکی کے۔ پس دیکھنا چاہیئے۔ جس گھر میں علامتِ صبح سوید ظلمت ہوگی، وہ
گھر کتنا تاریک ہوگا۔

۲۔ آشتی ... صلح — مدت ہوگئی۔ نہ تو کانوں نے مژدۂ وصلِ یار سنا
ہے۔ اور نہ آنکھوں نے جمالِ یار کا نظارہ کیا ہے۔ اس لئے کانوں اور آنکھوں
میں باہم صلح و آشتی ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ پہلے چشم و گوش میں جنگ رہتی تھی
اور اس کا سبب یہ تھا۔ کہ اگر پہلے کان مژدہ وصل سن پاتے تھے۔ تو وہ خوش ہوتے
تھے۔ اور آنکھیں بوجہ رشک ان سے لڑتی اور جلتی تھیں کہ یہ اچھے رہے انہوں
نے ہم سے پہلے مژدہ وصل یار کا لطف اٹھا لیا اور ہم نظارۂ جمال سے محروم
رہے۔ اور اسی طرح جب آنکھیں نظارۂ جمال سے لطف اندوز ہو جاتیں
اور کان مژدۂ وصل سے محروم رہتے۔ تو وہ ان سے خائف ہو جاتے۔ غرض اسی
طرح آپس میں رشک و حسد سے لڑائیاں جاری رہتیں۔ لیکن اب مدت سے
نہ کانوں نے مژدہ وصل سنا اور نہ آنکھوں نے جمالِ یار دیکھا ہے اس لئے اسبابِ
نزاع دور ہو جانے سے دونوں میں صلح و صفائی ہے۔

۳۔ اجازتِ تسلیم ... ہوش ان کے حوالے کر دینے کی اجازت —
شراب کے نشہ نے اس حسنِ خود آراء کو بے حجاب کر دیا ہے۔ اے شوق ایسی
حالت میں تجھے اجازت ہے۔ کہ تو اپنے ہوش و حواس اور ضبط و قرار کو ان کے
حوالے کر دے۔ مطلب یہ ہے کہ تو بھی ان کی طرح بے حجاب ہو جا اور اپنے
دل کی آرزو نکال۔

۴۔عقد… لڑی۔ اوج… بلندی ۔۔۔ ذرا دیکھنا گوہر فروش کا ستارہ کس بلندی پر ہے۔ یعنی وہ کس قدر خوش قسمت ہے کہ اس کا موتیوں کا ہار معشوقوں کی گردن میں پڑا ہوا ہے۔ گوہر فروش پر رشک ظاہر کیا ہے۔

۵۔ میکدہ میں عام طور پر شور ہوا کرتا ہے۔ لیکن میکدۂ بزم خیال ایسا میکدہ ہے۔ جہاں شور و شر بالکل نہیں۔ یہاں دیدارِ معشوق شراب ہے، کہ وہ کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔ اور حوصلہ ساقی ہے۔ کہ ہر شخص کو اس کے ظرف کے اندازہ سے شراب پلاتا ہے۔ اور نگاہ ایسی مے خوار ہے۔ جو کسی طرح سیر نہیں ہوتی۔ شراب دیدار پیئے جاتی ہے۔ لیکن پھر بھی بدمست ہو کر شور و شر نہیں کرتی۔

۶۔ (قطعہ) اس قطعہ میں اِن لوگوں سے خطاب ہے جو بزمِ عشق میں نووارد ہیں۔ کہتے ہیں۔ اے وہ لوگو جو فرشِ آرزوئے دل پر ابھی ابھی آکر بیٹھے ہو یعنی بزمِ عشق میں پہلی مرتبہ آئے ہو۔ خبردار اگر تمہیں نغمۂ نے کو سننے اور شراب پینے کی خواہش ہے تو۔

۷۔ بزمِ عشق میں قدم رکھنے سے پہلے اگر تم دیدۂ عبرت نہیں رکھتے ہو۔ تو میری حالت کو دیکھو کہ میرا اس شوق کی بدولت کیا عبرتناک حشر ہوا ہے اور اگر تم گوشِ نصیحت نیوش رکھتے ہو۔ تو میری بات سنو۔

۸۔ جب ساقی جلوہ افروز ہوتا ہے۔ تو وہ اپنے دلفریب حسن سے ایمان اور عقل کو غارت کر دیتا ہے۔ اور جب مطرب گاتا ہے۔ تو وہ اپنی خوش نوائی سے تمکین و ہوش کو، لوٹ لیتا ہے۔

۹۔ رات کے وقت تو ہم نے یہ عالم دیکھی کہ محفلِ عیش و طرب کے فرش کا

ہر گوشہ پھولوں کی کثرت سے دامن باغبان اور کفِ گلفروش بنا ہوا تھا۔ یعنی ہر طرف پھولوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے، اور

۱۰۔ ساقی کی خوش خرامی کا لطف نگاہوں کو جنت کا سماں دکھلاتا تھا۔ اور چنگ کی میٹھی میٹھی سریلی آواز کانوں کو بہشت کا مزہ دے رہی تھی گویا لطف خرام ساقی سے آنکھیں اور نے کی نغمہ سرائی سے کان ایسا لطف اٹھا رہے تھے جو جنت میں حاصل ہو سکتا ہے یا۔

۱۱۔ صبح کے وقت بزم میں آکر کیا دیکھتے ہیں کہ ہر طرف اداسی چھائی ہے، نہ وہ سرود و ساز ہے، اور نہ وہ جوش و خروش۔

۱۲۔ بلکہ اس سامانِ عیش و نشاط کے بدلے صرف ایک شمع باقی ہے جو صحبت شب کے فراق میں داغ داغ اور خاموش ہے۔

۱۳۔ یہ قطعہ نہایت پُر درد اور بلیغ ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ اردو شاعری میں اپنا نظیر نہیں رکھتا۔ یہ مقطع اس کا ثبوت ہے۔

نوا ۔۔۔۔ آواز ۔ سریر خامہ ۔۔۔۔۔ قلم کی آواز جو لکھتے وقت پیدا ہوتی ہے۔ نوائے سروش ۔۔۔۔ فرشتۂ غیب کی آواز۔ غالب میرے خیال میں یہ مضامین بلند و بلیغ غیب سے آتے ہیں۔ گویا میرے قلم کی آواز فرشتۂ غیب کی آواز ہے۔ جو یہ اچھوتے مضامین عرش سے لاتی ہے

۱۵۵

طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے	۱	آکہ مری جان کو قرار نہیں ہے
نشہ باندازۂ خمار نہیں ہے	۲	دیتے ہیں جنت حیاتِ دہر کے بدلے
ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے	۳	گریہ نکالے ہے تری بزم سے مجھ کو
خاک میں عشاق کی غبار نہیں ہے	۴	ہم سے عبث ہے گمانِ رنجشِ خاطر

دل سے اٹھا لطفِ جلوہ ہائے معانی ۵ غیرِ گل آئینہ بہار نہیں ہے
قتل کا میرے کیا ہے عہد تو بارے ۶ وائے اگر عہد استوار نہیں ہے
تو نے قسم میکشی کی کھائی ہے غالبؔ
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

۱۔ تو جلدی آ۔ کیونکہ میری جان سخت بیقرار ہے۔ اور اب یہ اذیتِ انتظار برداشت کرنے کی طاقت نہیں رہی۔

۲۔ اللہ میاں اگر ہم کو حیاتِ دہر کی تکلیفوں کے بدلے میں جنت دیتے ہیں۔ تو یہ کچھ فیاضی نہیں ہے۔ کیونکہ یہ نشہ (یعنی آرامِ جنت) خمار (تکالیفِ دنیا) کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ اس کا اندازہ وہی رند کر سکتا ہے جس نے خمار کی بہت زیادہ تکلیفیں اٹھائی ہوں اور اس کے خمار کی تکالیف کی تلافی کرنے کے لئے اس کو بہت کم مقدار میں شراب دی جائے۔ مطلب یہ ہے کہ تکلیفیں جو انسان کو دنیا میں جھیلنی پڑتی ہیں۔ ان کی تلافی کے لئے جنت کے عیش و آرام بہت کم ہیں۔

دوسرا مفہوم یہ بھی ہے۔ کہ ہم جنت کی کوئی پرواہ نہیں کرتے۔ لہٰذا حیاتِ دہر کے عیش و آرام کے بدلے جنت سے دست بردار ہوتے ہیں۔ کیونکہ جس قدر ہم کو خمار کی تکلیف ہے اس کے مقابلے میں ہمارے پاس بہت ہی کم ہے اس لئے جو شراب ہمیں جنت میں ملے گی۔ بہتر ہے کہ یہیں مل جائے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ شاعر دنیا کی تکلیفوں سے تنگ ہے۔ اور نسیہ کے مقابلے میں نقد کو ترجیح دیتا ہے۔

۳۔ گریہ و اشکباری تیری بزم سے مجھ کو نکالتے ہیں۔ افسوس کہ مجھ کو رونے پر اختیار نہیں۔ اگر میں چپ رہتا تو اس کی بزم سے نہ نکلتا۔ بزم سے نکالنے

کے کئی پہلو ہیں۔ یہ کہ اس سے محبوب کی رسوائی ہوتی ہے۔ یا یہ کہ بزمِ نشاط میں اشکباری سے سب متاثر ہوتے ہیں۔ اس لئے مجھ کو باہر نکال دیتے ہیں۔ کہ رنگ میں کھنڈت نہ پڑے۔

۴۔ آپ کی یہ بدگمانی فضول ہے۔ کہ ہمارے دل میں آپکی طرف سے کوئی رنجش یا غبار ہے۔ کیونکہ عاشقوں کی تو خاک میں بھی غبار نہیں ہوتا۔ یا چونکہ ہم عاشق ہیں۔ اس لئے ہمارے دل میں غبار ہونا چہ معنی؟

طبا طبائی۔ عشاق مر کر خاک ہو گئے ہیں۔ لیکن ان کی خاک میں بھی غبار نہیں ہے۔ یہ محض ادعائے شاعرانہ ہے جس کے لئے تعلیل کی ضرورت ہے مطلب مصنف کا ہے۔ کہ عشاق کی طینت میں غبار نہیں ہے لیکن طینت کی جگہ خاک کہنا محاورہ سے گرا ہوا ہے بیخود پہلے معنی اور سعید دوسرے معنی لکھتے ہیں۔ آسی نے دونوں مفہوم لکھے ہیں۔

۵۔ جس طرح گل وہ آئینہ ہے۔ جس میں معانی کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح دل بھی ایک آئینہ ہے جس میں معانی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اس لئے اگر تجھے جلوہ ہائے معانی کا لطف اٹھانا ہے۔ تو وہ آئینۂ دل سے اٹھا۔

حسرت نے دوسرا مفہوم یہ لکھا ہے "بہار کی نمود اسی وقت تک ہے جب تک گل قائم ہے۔ لیکن چونکہ قیام شگفتگی گل ناپائیدار ہے اس لئے بہار بھی ناپائیدار ہے بس اس سے بہتر ہے۔ کہ دل سے جلوۂ معانی کا لطف اٹھایا جائے۔

۶۔ خدا کا شکر ہے۔ کہ اس نے مجھ کو قتل کرنے کا عہد تو کیا۔ لیکن اگر یہ عہد مضبوط نہیں ہے۔ تو بہت ہی افسوس ہے۔

۷۔ غالب تم نے میکشی کی قسم کھائی ہے یعنی یہ عہد کیا ہے کہ اب ہم شراب نہ پئیں گے۔ مگر تیری قسم کا ہم کو اعتبار نہیں ہے کیونکہ تجھ سے میکشی نہیں چھوٹ سکتی۔ کسی چیز کی قسم کھانا محاورہ ہے۔ اور اس سے اس کے ترک کی قسم کھانا مراد ہے۔

صرف بیخود کو ان معنوں سے اختلاف ہے۔ لکھتے ہیں۔ اے غالب تو نے میکشی کی قسم کھائی ہے۔ تیری قسم سے یہ بات ثابت نہیں ہے کہ ترکِ میکشی کی قسم کھائی ہے یا میکشی کرنے کی۔ اور جب تیری قسم سے یہ دونوں پہلو جھلک رہے ہیں۔ تو ہمیں تیری قسم کا ہرگز اعتبار نہیں ہے۔

۱۵۶

۱ ہجوم غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے
کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے

۲ رفوئے زخم سے مطلب ہے لذت زخم سوزن کی
سمجھیو مت کہ پاس درد سے دیوانہ غافل ہے

۳ وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالبؔ
چٹکنا غنچۂ گل کا صدائے خندۂ دل ہے

۱۔ کثرتِ غم کے بوجھ سے میرا سر اس قدر جھکا ہے کہ تارِ دامن اور تارِ نظر میں امتیاز کرنا دشوار ہو گیا ہے۔ مطلب یہ ہے تارِ دامن سے تارِ نظر اس طرح متصل ہو گیا ہے کہ دونوں بالکل ایک معلوم ہوتے ہیں۔

۲۔ رفوئے زخم سے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ زخم سل کر مندمل ہو جائے اس سے زخم سوزن کی لذت مطلوب ہے۔

تم رفوئے زخم سے کہیں یہ نتیجہ نہ نکالنا کہ دردِ عشق کے دیوانے کو اب درد کا خیال نہیں رہا۔ اس لئے وہ زخم کو رفو کرا رہا ہے۔ اس خیال کو اس طرح بھی ادا کیا ہے

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

ہو۔ غنچۂ گل کے چٹکنے کو خندۂ دل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کیونکہ گلاب کی کلی بلحاظ رنگ و صورت دل سے مشابہت تامہ رکھتی ہے کہتے ہیں وہ گل معشوق جس گلستان میں جلوہ فرما ہو۔ وہاں غنچوں کا چٹکنا خندۂ دل کا ہم معنی ہے مطلب یہ ہے۔ کہ کلیاں اس کو جلوہ افروز دیکھ کر کھلکھلا کر ہنستی ہیں بلوجہ مشابہت کلیوں کے چٹکنے کی آواز کو خندۂ دل کہا ہے۔

۱۵۷

پا بدامن ہو رہا ہوں بسکہ میں صحرا نورد ۱ خارِ پا ہیں جوہر آئینۂ زانو مجھے
دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے وقت ۲ ہے نگاہِ آشنا تیرا سرِ ہر مو مجھے
ہوں سراپا سازِ آہنگ شکایت کچھ نہ پوچھ
ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

۱۔ زانو کو آئینہ سے تشبیہہ دی جاتی ہے۔ کیونکہ آئینہ کو زانو پر رکھ کر دیکھتے ہیں۔ اور آئینہ فولادی کے جوہر کانٹوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ کہتے ہیں میں صحرا نورد تھا لیکن پاؤں میں کانٹے چبھ جانے سے میں صحرا نوردی سے معذور ہو گیا اور اب پا بدامن بیٹھا ہوں۔ وہ کانٹے جو صحرا نوردی میں میرے پاؤں میں چبھے تھے آئینہ زانو کا جوہر معلوم ہوتے ہیں۔ بقول آسی۔ لطیف بات اس میں یہ ہے کہ جو کانٹے پاؤں میں چبھے ہیں ان کا اثر زانو تک محسوس ہو رہا ہے۔ میرے نزدیک یہ صحیح نہیں۔ بلکہ تلوؤں میں سے کانٹے نکالنے کے لئے جس طریقے سے بیٹھا جاتا ہے۔ مصنف نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔ یا جب پاؤں میں کانٹا چبھ جائے۔ تو تلوا زمین پر نہیں ٹکا جاتا۔ بلکہ آلتی پالتی مار کے بیٹھے ہیں۔ اسی طرح بیٹھنے سے کانٹے سامنے آجاتے ہیں اور انکو نکالنے میں آسانی ہوتی ہے

۲۔ میرے دل کی حالت محبوب سے ہم آغوشی کے وقت دیکھنے سے

تعلق رکھتی ہے۔ اس کا بال بال میرے لئے ایک نگاہ آشنا ہے جو میرے دل کی حقیقت سے پوری طرح واقف ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ ہم آغوشی کے وقت کسی قسم کی غیریت کا احساس نہیں۔ کیونکہ محبوب کا رونگٹا رونگٹا مجھ سے واقف ہے۔ بیخود۔ آسی۔ کیونکہ دل تیری زلفیں میں تو اسیر رہ چکا ہے اس وجہ سے ہر ایک سر مو ہم آغوشی کے وقت نگاہ آشنا کا کام دیگا۔ بےجید کیونکہ میں ہمیشہ اپنے تصور میں آنکی ہم آغوشی کا خیال باندھتا رہا ہوں اس وجہ سے اس کا ہر سر مو میرے قلب سے آشنا ہو گیا ہے۔

طباطبائی (۱) ہمخیال آسی و بیخود (۲) اور سر مو کو عام لیں تو بھی معنی درست ہیں یعنی ہنگام ہم آغوشی تیرا ہر سر مو میرے دل کی حالت دیکھنے کے لئے نگاہ آشنا ہو جائے گا

۳۔ میں سراپا شکایتوں کے راگ کا ساز ہوں بہتر یہی ہے کہ تو لوگوں کے سامنے مجھے نہ چھیڑے۔ ورنہ بیساختہ منہ سے شکائتیں نکلنے لگیں گی اسی مضمون کو یوں بھی لکھا ہے ؎

پُر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجہ　　اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھیئے کیا ہوتا ہے

۱۵۸

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے ۱ جاں کالبد صورت دیوار میں آوے

سایہ کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر ۲ تو اس قد دلکش سے جو گلزار میں آوے

تب ناز گراں مایگی اشک بجا ہے ۳ جب لخت جگر دیدۂ خونبار میں آوے

دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر ۴ کچھ تجھ کو مزہ بھی مرے آزار میں آوے

اُس چشم فسوں گر کا اگر پائے اشارہ ۵ طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب ۶ اک آبلہ پا وادیٔ پُرخار میں آوے

مر جاؤں کیوں رشک سے جب وہ تنِ نازک ۷ آغوشِ خمِ حلقۂ زنار میں آوے

غارت گرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر ۸ کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے

تب چاکِ گریباں کا مزا ہے دلِ نالاں ۹ جب اک نفس الجھا ہوا ہر تار میں آوے

آتشکدہ ہے سینہ مرا رازِ نہاں سے ۱۰ اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے

جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

۱۔ کالبد۔۔۔ قالب، مراد جسم۔ صورتِ دیوار۔۔۔ وہ تصویر جو دیوار پر بنائی جائے۔ جس بزم میں تو ناز و ادا سے گفتگو کرے۔ اگر تیری جان بخش باتوں سے اِن تصویروں کے جسموں میں جان پڑ جائے۔ جو دیوار پر آرائش کے لئے بنادی جاتی ہیں۔ تو کوئی تعجب نہیں۔ کیونکہ تیرے لب و دہن میں مسیحائی کی صفت ہے۔

۲۔ اگر تو اپنے اس قدِ دلکش کے ساتھ گلزار میں آئے تو سرو و صنوبر تجھ پر عاشق ہو جائیں۔ اور سایہ کی طرح تیرے ساتھ پھریں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے قد کی دلکشی کو بھول جائیں۔ اور تیرے قد پر عاشق ہو جائیں۔ بیخود اس شعر کو بیت الغزل قرار دیتے ہیں۔

۳۔ نشتر کو اس وقت اپنی گرانمایگی پر ناز کرنا بجا ہے جب دیدۂ خونبار میں جگر کے ٹکڑے بھی کٹ کٹ کر آئیں۔

۴۔ کہتے ہیں بے وجہ ستانے میں کوئی لطف نہیں۔ تم مجھے ذرا شکایت کرنے کی اجازت دے دو۔ کیونکہ جب میں تم سے تمہاری شکایتیں کروں گا۔ تو تمہیں غصہ آئیگا۔ جب غصہ آئیگا۔ تو تم مجھ پر ظلم کرو گے۔ پھر جیسی پُر زور شکایت کروں گا۔ ویسا ہی سخت تم مجھ پر ظلم کرو گے۔ ہر طرح سے

تمہیں بھی ظلم کرنے اور آزار دینے کا لطف آئے گا۔ اور ادھر میں بھی لطف اندوز ہوں گا۔ خاموشی سے ظلم اٹھانے ہیں مجھے بھی کوئی لطف نہیں آتا طبا طبائی اور بیخود اس شعر کو حاصل زمین قرار دیتے ہیں۔

۵۔ فسوں گر۔۔۔۔ جادوگر۔ آئینہ اور طوطی میں مناسبت ہے۔ کیونکہ آئینہ سامنے رکھ کر طوطی کو بولنا سکھایا جاتا ہے۔ دوسرے اس تمثیل میں لطف یہ ہے۔ کہ جب محبوب آئینہ کے سامنے اشارہ کریگا۔ تو وہی آئینہ میں بھی دکھائی دیگا۔ گویا اس طرح سے آئینہ میں گفتار پیدا ہو جائے گی۔ اور یہی چشم فسوں کا جادو ہے۔ کہ بے جان آئینہ اس کے جادو سے گویا ہو گیا۔

۶۔ وادیٔ پُر خار میں پیاس کے مارے کانٹوں کی زبان سُوکھ گئی۔ خدا کرے کوئی آبلہ پا (عاشق) اس وادیٔ پُر خار میں آنکلے۔ کہ اس کے آبلوں کے پانی سے اِن کانٹوں کی زبان تر ہو جائے آسی لکھتے ہیں۔ کہ در پردہ اپنی رہائی کی دعا کی ہے۔

۷۔ معشوق کے گلے میں زنار پڑی ہوئی دیکھ کر رشک سے مرے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ رشک سے کیوں نہ مر جاؤں۔ کہ میرے سامنے اس کے تنِ نازک کو حلقۂ زنار نے اپنی آغوش میں لے لیا ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ ہم آغوشی میرا حق تھا۔ نہ کہ کمبخت زنار کا۔

۸۔ اگر ہوسِ زر غارت گر ناموس نہ ہو۔ تو شاہد گل (پھول) بازار میں ہرگز فروخت نہ ہوں۔ مطلب یہ ہے۔ کہ پھول جیسی خوبصورت چیز کو محض تھیلی زر کے لئے بازار میں فروخت کر دیا جاتا ہے۔ پھول کو شاہدِ گل کہہ کر اس کو بازار میں لانے سے گل کی سخت توہین مقصود ہے یعنی ہوسِ زر شاہد فروشی کو بھی جائز قرار دیتی ہے۔ جو کہ ادنےٰ قسم کا انسان بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ (آسی۔ حسرت)

طبا طبائی۔ گلاب میں جو زیرہ ہوتا ہے۔ اُسے زرِ گل کہتے ہیں شعر کا مطلب یوں سمجھو کہ گلاب کا کھلنا اور زرِ گل کا کھلنا کیا ہے۔ گویا زر کی ہوس میں ہاتھ پھیلاتا ہے جس کا انجام یہ ہوا کہ سرِ بازار آنا پڑا نہیں تو بربادیٔ ناموس کا کیوں سامنا ہوتا غنچہ کی طرح بندھی مٹھی چلا گیا ہوتا۔ جب ہاتھ پھیلا کر زر لیا۔ تو شاہد بازاری ہو گیا۔ اور ناموس و عزت برباد ہو گئی (بیخود)

۹۔ اے دِل نالاں، گریباں چاک کرنے کا لطف تو اس وقت ہے۔ جب ہر تار گریبان کے ساتھ ایک نفس بھی اُلجھا ہؤا ساتھ آئے۔ مطلب یہ ہے کہ چاک گریبان کے ساتھ دامن زندگی بھی تار تار ہونا چاہیئے۔ عشق میں موت کی آرزو کا اظہار کیا ہے۔

۱۰۔ رازِ نہاں کی گرمی سے میرا سینہ آتشکدہ بن چکا ہے اگر خدا نخواستہ کہیں وہ ظاہر ہو جائے تو خدا جانے کیا آفت برپا ہو۔ دنیا جل جائے پتہ نہیں اس سے کہاں کہاں آگ لگے۔

۱۱۔ گنجینہ۔۔۔۔ خزانہ۔ اے غالبؔ جو لفظ کہ میرے اشعار میں آئے اس کو گنجینۂ معانی کا طلسم سمجھیئے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے ایک ایک لفظ میں بیشمار معانی اور مفہوم ہوتے ہیں۔ اور جوں جوں وہ نظروں کے سامنے آتے ہیں۔ انسان حیران ہوتا چلا جاتا ہے۔

۱۵۹

اس سے میرا مہ خورشید جمال اچھا ہے	۱	حسن مہ گرچہ بہنگامِ کمال اچھا ہے
جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے	۲	بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے	۳	اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے	۴	بے طلب دیں تو مزہ اس میں سوا ملتا ہے

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق ۵ وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض ۶ اک برہمن نے کہا ہے یہ سال اچھا ہے

ہم سخن تیشہ نے فرہاد کو شیریں سے کیا ۷ جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے ۸ کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

خضر سلطاں کو رکھے خالق اکبر سرسبز ۹ شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

۱۔ چاند کا حُسن جس وقت کہ وہ تکمیل کو پہنچ چکا ہو۔ یعنی بدر بن گیا ہو اچھا ہے لیکن اس سے میرا خورشید جمال معشوق یقیناً اسی طرح بہتر ہے جس طرح کہ خورشید ماہ سے بہتر ہے۔ بقول حالی۔ دوسرے مصرعہ میں دعوی متضمن دلیل ہے۔ کہ معشوق کو مہِ خورشید جمال اس لئے کہا ہے تاکہ اس کو ماہ کامل پر ترجیح دینے کی وجہ پیدا ہو جائے۔ آسی یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ ازہر پر تو بود ماہ را

۲۔ کہتے ہیں۔ دل کی قیمت بوسہ ہے۔ وہ تو دیتے نہیں۔ اور دل اڑا لینے کی فکر میں ہیں۔ ہر وقت اس کی تاک میں ہیں۔ اور جی میں کہتے ہیں۔ کہ اگر یہ مال مفت میں یعنی بغیر قیمت (بوسہ) دیئے ہاتھ آ جائے۔ تو اچھا مال ہے (تمام متفق) بیخود لکھتے ہیں کہ وہ اس خیال سے دل کو مفت اڑا لینے کی فکر میں ہیں کہ یہ مال اگر مفت مل جائے تو خوب ہے پھر کسی موقعہ پر بوسہ کو جان کی قیمت میں لگائیں گے۔

۳۔ جام سفال۔۔۔ مٹی کا پیالہ۔ حالی۔ شاعر کے ذہن میں پہلے سے اپنی اپنی جگہ پر یہ باتیں ترتیب وار موجود تھیں۔ کہ مٹی کا کوزہ ایک نہایت کم قیمت اور ارزاں چیز ہے۔ جو بازار میں ہر وقت مل سکتی ہے اور جام جمشید ایک بے انتہا

تھی جس کا بدل دنیا میں موجود نہ تھا۔ اس کو یہ بھی معلوم تھا۔ کہ تمام عالم کے نزدیک جامِ سفال میں کوئی خوبی ایسی نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ جامِ جم جیسی چیز سے فایق اور افضل سمجھا جائے۔ نیز یہ بھی معلوم تھا۔ کہ جامِ جم میں شراب پی جاتی تھی۔ اور مٹی کے کوزے میں شراب پی جا سکتی ہے۔ اب قوتِ متخیلہ نے اس تمام معلومات کو ایک نئے ڈھنگ سے ترتیب دیکر ایسی صورت میں جلوہ گر کر دیا۔ کہ جامِ سفال کے آگے جامِ جم کی کچھ حقیقت نہ رہی۔ اور پھر اس صورت میں موجودہ فی الذہن کو بیان کا ایک دلفریب پیرایہ دیکر اس قابل کر دیا۔ کہ زبان اس کو پڑھ کر متلذذ اور کان اس کو سنکر محظوظ اور دل اُس کو سمجھ کر متاثر ہو سکے۔ اس مثال میں وہ قوت جس نے شاعر کی معلومات سابقہ کو دوبارہ ترتیب دے کر ایک نئی صورت بخشی ہے۔ وہ تخیل یا امیجنیشن ہے۔ اور اس نئی صورت موجودہ فی الذہن نے جب الفاظ کا لباس پہن کر عالم محسوسات میں قدم رکھا ہے اس کا نام شعر ہے۔ نیز اس مثال میں امیجی نیشن کا عمل خیالات اور الفاظ دونوں کے لحاظ سے بمرتبہ غایت اعلےٰ درجہ میں واقع ہوا ہے۔ کہ باوجود کمال سادگی اور بے ساختگی کے نہایت بلند اور نہایت تعجب انگیز ہے۔

۴۔ اگر اہلِ کرم بھکاری کو بغیر مانگے بھیک دیں۔ تو اسے بہت زیادہ خوشی ہوتی ہے۔ کیونکہ سوال کرنے سے اس کے جذبۂ خودداری کو ٹھیس لگتی ہے اور بقول بیخود سوال کی تلخی عطا کی شیرینی کو بدمزہ کر دیتی ہے۔ اس لیئے وہ گدا جس کو سوال کرنے کی عادت نہ ہو۔ اچھا اس لیئے ہے کہ اس کے جذبۂ خودداری کو گزند نہیں پہنچتا۔

بیخود۔ اس شعر میں ردیف کی نشست ایسی زبردست واقع ہوئی ہے۔

کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ طبا طبائی۔ سوال کرنے کی مذمت کیا اچھی طرح سے کی ہے۔

۵۔ حالی۔ شاعر کو پہلے سے یہ بات معلوم تھی۔ کہ دوست کے ملنے سے خوشی ہوتی ہے۔ اور بگڑی ہوئی طبیعت بحال ہوجاتی ہے۔ نیز یہ بھی معلوم تھا۔ کہ دوست کو جب تک عاشق اپنی حالتِ زار اور اس کی جدائی کا صدمہ نہ جتائے۔ دوست عاشق کی محبت اور عشق کا پورا پورا یقین نہیں کرسکتا۔ یہ بھی معلوم تھا کہ بعض وقت خوشی سے دفعتہً ایسی بشاشت ہوسکتی ہے کہ رنج و غم اور تکلیف کا مطلق اثر چہرہ پر باقی نہ رہے۔ اور امیجنیشن نے ان تمام معلومات میں اپنا تصرف کرکے ایک نئی ترتیب پیدا کردی۔ یعنی یہ کہ عاشق کسی طرح سے اپنی جدائی کے زمانے کی تکلیفیں معشوق پر ظاہر نہیں کرسکتا۔ کیونکہ جب تکلیف کا وقت ہوتا ہے۔ اس وقت معشوق نہیں ہوتا۔ اور جب معشوق ہوتا ہے اس وقت تکلیف نہیں رہتی۔ اس مثال میں امیجنیشن کا عمل معنًا اور لفظًا دونوں طرح بدرجہ غایت لطیف اور حیرت انگیز واقع ہوا ہے جیسا کہ ہر صاحبِ ذوقِ سلیم پر ظاہر ہے۔

۶۔ حالی۔ گویا معشوق کی تمنا میں ایسا مستغرق ہے کہ دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہیں۔ یہاں تک کہ پنڈت نے جو سال اچھا بتایا ہے۔ تو اس کے اچھا ہونے کے یہی معنے سمجھتا ہے۔ کہ شاید اس سال معشوق عاشقوں پر مہربان ہوجائیں۔ نہ یہ کہ اس سال قحط نہیں پڑے گا۔ وبائیں نہ آئیں گی۔ لڑائیاں نہیں ہونگی۔ وغیرہ وغیرہ۔

۷۔ انسان میں جس طرح کا کمال بھی ہو۔ وہ بہت اچھا ہے۔ کیونکہ کمال انسان کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ فرہاد ایک معمولی

مزدور پیشہ شخص تھا۔ اس لئے شیریں تک اس کا پہنچنا محال تھا۔ کیونکہ یہ مزدور تھا اور وہ شہزادی۔ مگر اسے کوہ کنی اور تیشہ زنی میں کمال حاصل تھا اس لئے وہ شیریں تک پہنچا۔ اور اس کو اپنی محبوبہ سے ہمکلامی کا شرف حاصل ہوا۔

طبا طبائی پہلے مصرعہ میں گنجلک ہے دوسرے میں تنافر اور دونوں میں ربط بھی خوب نہیں اور مضمون بھی کچھ نہیں۔ آسی اس اعتراض کی تردید کرتے ہیں۔ کہ یہ بالکل غلط ہے۔ بہرحال یہ ضرور ماننا پڑیگا۔ کہ اوپر کے شعروں کے مقابلہ میں یہ شعر بہت کمزور اور پھسپھسا ہے۔

۸۔ اس میں مصنف نے قطرہ و دریا کی تمثیل کو نظم کیا ہے۔ یہ مضمون وہ پہلے بھی کئی شعروں میں ادا کر چکے ہیں مثلاً سے۔

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا
دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر — ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

صوفیائے کرام کا عقیدہ ہے۔ کہ فنا فرع کو اصل سے ملاتی ہے اس لئے ہر چیز اپنے مبداء سے اتصال کے لئے کوشاں ہے۔ چنانچہ قطرہ جب اپنے آپ کو دریا میں فنا کر دیتا ہے۔ تو وہ قطرہ نہیں رہتا۔ بلکہ دریا ہو جاتا ہے اور چونکہ اس کا یہ کام یعنے دریا میں فنا ہو جانا اچھا ہے۔ اس لئے اس کا انجام بھی اچھا ہے۔

آسی۔ اس میں مصنف نے ایک اخلاقی سبق دیا ہے۔ طبا طبائی یہ مضمون کثرتِ استعمال سے متبذل ہو گیا ہے۔ جو شخص اسے نظم کرتا ہے شعر ہی بدمزہ ہو جاتا ہے۔ "سازِ انا البحر" والے شعر کی تعریف کرتے ہیں۔ کہ محاورہ کی چاشنی نے پھیکے مضمون کو چٹ پٹا بنا دیا ہے۔

۹۔ یہ شعر شہزادہ خضر سلطان فرزند بہادر شاہ بادشاہ متخلص بہ ظفر کی مدح

میں لکھا ہے کہتے ہیں۔ خداوند کریم خضر سلطان کو ہمیشہ سرسبز اور شادکام رکھے۔ کیونکہ گلستانِ شاہی میں یہ نونہال بہت اچھا ہے۔ اس شعر میں الفاظ نہایت متناسب ہیں۔ مثلاً خضر، سرسبز باغ، تازہ نہال۔ خاندانِ شاہی کو باغ اور فرزند شاہ کو تازہ نہال سے تشبیہ دیکر شعر میں جان ڈال دی ہے۔

۱۰۔ کہتے ہیں ہمیں جنت کی حقیقت معلوم ہے یعنی وہ کچھ بھی نہیں محض نافہموں کو ایک سبز باغ دکھایا ہے"۔ بہر حال دل کو خوش رکھنے کے لئے یہ خیال بہت خوب ہے۔

۱۶۰

۱ امتحان اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی	نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی
۲ شوقِ گل چینِ گلستانِ تسلی نہ سہی	خار خارِ الم حسرتِ دیدار تو ہے
۳ ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی	مے پرستاں خم مے منہ سے لگائے ہی بنے
۴ گر نہیں شمع سیہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی	نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغ صحرا
۵ نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی	ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق
۶ گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی	نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ

۷ عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی غالبؔ اگر عمرِ طبعی نہ سہی

۱۔ معشوق کو عاشق کے عشقِ صادق کا یقین نہیں آیا۔ اور یہاں عاشق امتحانِ محبت میں جان تک دے چکا ہے۔ عاشق اس حالت کو دیکھ کر کہتا ہے کہ اگر میرے مرجانے سے تیری تسلی نہ ہوئی۔ تو کچھ مضائقہ نہیں تو اور امتحان لینا چاہتا ہے۔ تو وہ بھی خوشی سے لے لے میں بعد از مرگ بھی طبیب خاطر مزید امتحان کے لئے تیار ہوں۔

سعید لکھتے ہیں "اگر یہ بات ہے۔ تو امتحان کی خاطر میں نہیں مروں گا"۔

طبا طبائی۔ اس شعر پر اگر غالب خدائے سخن ہونے کا دعوے کریں۔ تو خدا گواہ ہے۔ کہ زیبا ہے پھر دیکھیئے تو نہ فنِ معانی کی کوئی خوبی ہے۔ نہ فن بیان کا کچھ حسن ہے۔ نہ فن بدیع کے تکلفات ہیں۔ ۱ھ تی بے مثل شعر کہا ہے۔ بیخود طبا طبائی کے ہمخیال ہیں اور لکھتے ہیں۔ کہ یہ مطلع بھی ویسا ہی بے مثل ہے جیسا مرزا صاحب کا اکثر کلام ہے۔

۲۔ اگر شوق گلستانِ تسلی کا گلچین نہیں بنا تو نہ سہی۔ اس کے لئے حسرتِ دیدار کا رنج وغم ہی کافی ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ اگر شوق کو تسلی حاصل نہیں ہوئی تو کیا ہوا۔ یہ کیا کچھ کم ہے۔ کہ وہ حسرتِ دیدار کے رنج میں مصروف ہے

۳۔ اے مے پرستو! اگر ایک دن بزم میں ساقی نہیں کہ وہ جام بھر بھر کر پلائے تو نہ سہی۔ خم منہ سے لگا کر پی جاؤ۔ مطلب تو جی بھر کر پینے سے ہے۔ طبا طبائی کو مے پرستوں کی جگہ "مے پرستاں" اور "لگائے ہی بنے" لانے پر اعتراض ہے۔

۴۔ لطف اس شعر میں یہ ہے کہ لیلیٰ کا رنگ کالا تھا۔ اور وہ کالے خیمہ میں رہا کرتی تھی۔ اس لئے اس گھر کو سیہ خانہ کہا ہے۔ بیخود و طبا طبائی لکھتے ہیں کہ مجنوں کو خیمۂ لیلےٰ میں بار نہ ملی۔ اس لئے اظہار نفرت کی خاطر اس کو سیہ خانہ کہا ہے۔

نفسِ قیس جو اپنی شعلہ باری کے لحاظ سے چشم و چراغِ صحرا بنا ہوا ہے۔ اگر وہ لیلےٰ کے سیہ خانہ کی شمع نہ بنا۔ تو نہ سہی۔ یہ کیا کم ہے۔ کہ صحرا اس سے روشن ہے۔ آسی۔ سیہ خانہ لیلیٰ سے لیلیٰ کا تاریک دل مراد لے کر معنی بیان کرتے ہیں۔ بقولِ حسرت غالب نے اس شعر میں عشق کے استغنا کا اظہار کیا ہے۔

۵۔ گھر کی رونق ایک ہنگامہ پر موقوف ہے۔ اگر نغمۂ شادی نہیں ہے۔ تو نہ سہی۔ نوحۂ غم ہی سہی۔ کیونکہ ہنگامہ کے لحاظ سے غم اور شادی دونوں برابر ہیں۔ اس شعر میں کمالِ مجبوری اور انتہائے محرومی کا اظہار کیا ہے۔ بقولِ سعید ایسے شخص کی جو نوحۂ غم اور نغمۂ شادی میں تمیز نہیں کر سکتا عیش و راحت کی محرومی کا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔ یا بقولِ طبا طبائی عارف کی نظر میں شادی و غم دونوں کی ایک صورت ہے۔

۶۔ مرزا کے کلام پر عام طور پر اعتراض کیا جاتا تھا۔ کہ وہ مہمل اور مشکل ہوتا ہے۔ کہتے ہیں۔ نہ مجھے کسی سے داد لینے کی تمنّا ہے۔ اور نہ صلے کی پروا ہے یعنی جو کوئی کچھ دینا ہو وہ شوق سے نہ دے۔ اگر میرے کلام میں معنی نہیں اور وہ مہمل ہے۔ تو ہوا کرے۔ کسی کو کیا؟۔

۷۔ خیال یہ ہے۔ کہ عشق کے صدمات اور شدائد عاشق کو عمرِ طبعی تک نہیں پہنچنے دیتے۔ اور گھلا گھلا کر پہلے ہی ختم کر دیتے ہیں۔ کہتے ہیں غالب اگر نہیں صدماتِ عشق نے گھلا گھلا کر عمرِ طبعی کو پہنچنے سے پہلے مار ڈالا۔ تو کچھ مضائقہ نہیں۔ یہ کیا کم ہے۔ کہ تمہاری جتنی عمر گذری وہ حسینوں کی صحبت میں گزری۔ گویا عشرتِ صحبتِ خوباں کو عمرِ طبعی پر ترجیح دیتے ہیں۔

۱۶۱

عجیب نشاط سے جلّاد کے چلے ہیں ہم آگے ۱ کہ اپنے سایہ سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

قضا نے تھا مجھے چاہا خراب بادۂ الفت ۲ فقط خراب لکھا بس نہ چل سکا قلم آگے

غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی ۳ وگرنہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذّتِ الم آگے

خدا کیواسطے داد اس جنونِ شوق کی دینا ۴ کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے ۵ تمہارے آئیو اے طرہ ہائے خم بخم آگے

دل و جگر میں پر افشاں جو ایک موجۂ خوں ہے ۴ ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اُس کو دم آگے

۷ قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالبؔ
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

۱۔ ہم قتل ہونے کی خوشی میں جلّاد کے آگے آگے جا رہے ہیں۔ اور ہماری خوشی کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے۔ کہ شوقِ شہادت میں ہمارا سر پاؤں سے بھی دو قدم آگے ہے۔ جب آفتاب چلنے والے کی پشت پر ہو۔ تو اس کے سر کا سایہ ہمیشہ پاؤں سے آگے پڑتا ہے۔ مرزا نے اسی مشاہدہ سے یہ مضمون پیدا کیا ہے۔

۲۔ روزِ ازل کاتبِ تقدیر نے مجھے خراب بادۂ الفت لکھنا چاہا تھا۔ لیکن اس نے فقط خراب لکھا تھا۔ کہ اس کا قلم آگے نہ چل سکا۔ گویا میں محض خراب و برباد ہی رہ گیا۔ خراب بادۂ الفت نہ ہو سکا۔

بقول طباطبائی۔ یہاں مضمون کے ناتمام رہ جانے نے بڑا لطف دیا اور ہر ایک حالت کی ناتمامی کا بیان ہمیشہ لطف دیتا ہے۔ اور قلم کے نہ چل سکنے کی وجہ مستی اور بے ہوشی ہے۔ جو لفظ خراب لکھنے سے پیدا ہوئی ہے

۳۔ غمِ زمانہ نے ہماری نشاطِ عشق کی مستی کو جھاڑ دیا۔ یعنی غمِ دنیا نے عشق کو بھلا دیا۔ ورنہ کبھی ہم بھی غمِ عشق کی لذت سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔

۴۔ خدا کے لئے ہمارے اس جنونِ شوق کی داد دینا کہ اِدھر ہم یار کے نام خط لکھ کر نامہ بر کے حوالے کرتے ہیں۔ اور اِدھر جواب کے شوق میں یار کے دروازے پر نامہ بر سے پہلے پہنچ جاتے ہیں۔ یہی جنونِ شوق ہے کہ خط پہنچا نہیں اور اس کے جواب کے طالب پہلے سے کھڑے ہیں۔

۵۔ "تمہارے آگے آئے" بد دعا ہے۔ مثلاً کہتے ہیں۔ جو کچھ ہم نے کیا ہے

ہمارے آگے آئے اور جو کچھ تم نے کیا ہے۔ تمہارے آگے آئے۔ فرماتے ہیں اے گیسوئے خمدار بار تمہاری بدولت جو ہم نے پریشانیاں اٹھائی ہیں خدا کرے وہ تمہارے آگے آئیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم بھی ہمیشہ میری طرح پریشان رہو۔ شاعر نے یہاں بددعا میں دعا کا پہلو نکالا ہے چونکہ پریشان ہونا زلف کی صفت ہے۔ اس لئے عاشق کی بددعا دعا بن گئی۔ اور دعا یہ ہے کہ خدا کرے تمہاری زلف میں یہی دلکشی رہے۔

۶۔ پرافشاں۔۔۔ جوش زن۔ موجۂ خون۔۔۔ خون کی موج۔ زعم۔۔ گمان۔ دم۔۔۔ سانس۔

ہمارے دل و جگر میں جو ایک موج خون جوش زن ہے۔ اس کو پہلے ہم سانس خیال کرتے تھے۔ اب جبکہ عشق نے اس کو لہو بنا کر بہایا۔ تو ہمیں معلوم ہوا۔ کہ یہ سانس نہیں ہے۔ بلکہ موجِ خون ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عشق نے یہ حالت بنادی ہے۔ کہ سانس کے ساتھ سینے سے لہو کٹ کٹ کر آرہا ہے اور عاشق یہ خیال کرتا ہے۔ کہ سانس ہی حقیقتاً لہو ہے۔ کیا معصومانہ استنباط ہے۔ اسی کو شاعری اور آرٹ کہتے ہیں۔

۷۔ قسم کھانا۔۔۔ انکار کرنا۔ آگے۔۔۔ پہلے۔ پانوان کی یہ حالت تھی کہ وہ میری جان کی قسم کھایا کرتے تھے۔ اور جان کی قسم اسی کی کھایا کرتے ہیں جس سے محبت ہوا کرتی ہے۔ لیکن اب یہ حال ہے کہ اُن کو میرے جنازے پر بھی آنے سے انکار ہے۔

۱۶۲

شکوہ کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے ۱ یہ بھی مت کہہ کہ جو کہیئے تو گلا ہوتا ہے

پُر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجہ ۲ اک ذرا چھیڑیئے پھر دیکھیئے کیا ہوتا ہے

تو سمجھتا نہیں پر حسنِ تلافی دیکھو ۳ شکوۂ جور سے سرگرمِ جفا ہوتا ہے

عشق کی راہ میں ہے چرخِ مکوکب کی وہ چال ۴ سست رو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد کہ ہم ۵ آپ اٹھا لاتے ہیں، گر تیر خطا ہوتا ہے

خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ ۶ کہ بھلا چاہتے ہیں، اور برا ہوتا ہے

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب ۷ لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

خامہ میرا کہ وہ ہے باربدِ بزمِ سخن ۸ شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے

اے شہنشاہِ کواکب سپہ و مہرِ علم ۹ تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے

سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے ۱۰ تو وہ لشکر کا ترے نعل بہا ہوتا ہے

ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال ۱۱ آستاں پر ترے مہ ناصیہ سا ہوتا ہے

میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزل خوانی میں ۱۲ یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے

۱۳ رکھیو غالبؔ مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

۱۔ اگر میں شکوہ کا نام بھی لیتا ہوں۔ تو وہ بے مہر خفا ہوتا ہے۔ اس کی خفگی کا یہ عالم ہے۔ کہ اگر میں یہ کہتا ہوں۔ کہ وہ "شکوے کے نام سے خفا ہوتا ہے" تو یہ بھی وہ گلہ خیال کرتا ہے۔ اور خفا ہوتا ہے۔

طباطبائی۔ یہ بات بھی یعنی (جو کہیے تو گلہ ہوتا ہے) منہ سے نہ نکالو۔ گلہ نہیں تو گلہ کا نام تو زبان پر آ گیا (سعید د آسی)

۲۔ میں شکایتوں سے اس طرح بھرا ہوا ہوں جس طرح راگوں سے باجہ بھرا ہوا ہوتا ہے۔ بس مجھے چھیڑنے کی دیر ہے۔ پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے اس مضمون کو اس طرح بھی لکھا ہے ؎

ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت کچھ نہ پوچھ ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

۳۔ وہ اپنی کم سنی یا سادگی کی وجہ سے میرے شکووں کا مطلب نہیں سمجھتا۔ لیکن اُس کی حُسنِ تلافی قابلِ داد ہے۔ کہ شکوۂ جور کرنے سے وہ اور زیادہ جفائیں کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ محبوب کو یہ خبر نہیں کہ ہم شکوۂ جور سے مزید جفاؤں ہی کا طلبگار ہوں پہلے کہہ چکے ہیں۔ ع

نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

۴۔ چرخ مکوکب ...... ستارہ دار آسمان، ستاروں کو آبلوں سے اور چرخ مکوکب کو آبلہ پا سے تشبیہہ دی ہے عشق کی راہ میں ستارہ دار آسمان اس طرح سنبھل سنبھل کر اور رک رک کر چلتا ہے۔ جیسے کوئی آبلہ پا شخص چلتا ہے۔

۵۔ ہدف ... نشانہ۔ ناوک ... تیر معشوق کے ناوکِ بیداد کا نشانہ بننے کے ہم اس قدر آرزو مند ہیں۔ کہ اگر اس کا کوئی تیر خطا ہو جاتا ہے تو دوڑ کر ہم اُسے خود اُٹھا لاتے ہیں۔ اور اس کو دیتے ہیں کہ لو دوبارہ ہم پر چلاؤ ایسی حالت میں بھلا ہم اس کے ناوکِ بیداد کے ہدف کیوں نہ ٹھہریں مطلب یہ ہے۔ کہ اُنہیں تیر کھانے کا مجھ جیسا شوقین اور کوئی کہاں مل سکتا ہے۔

۶۔ تجربے سے ثابت ہوا ہے۔ کہ اگر ہم اپنا بھلا چاہتے ہیں۔ تو ہمیشہ بُرا ہوتا ہے۔ اگر یہ بات ہمیں پہلے معلوم ہو جاتی ہے تو ہم اپنے بدخواہ بن جاتے۔ اور اپنی بدخواہی کرتے اور اس بدخواہی کا یہ نتیجہ نکلتا۔ کہ ہماری بھلائی کی صورت پیدا ہو جاتی۔ کیونکہ جو کچھ وقوع میں آتا ہے۔ وہ ہمیشہ ہماری خواہش کے برخلاف ہوتا ہے۔

۷۔ پہلے میرے نالوں میں اس قدر زور تھا۔ کہ وہ عرشِ معلےٰ سے بھی آگے نکل جاتے تھے۔ لیکن اب کمزوری کا یہ عالم ہے کہ اگر کوئی نالہ بہت ہی رسا

ہوتا ہے۔ تو وہ شکل سے لب تک آتا ہے۔ ورنہ بیشتر نالے تو سینے میں رہ جاتے ہیں۔

۸۔ یہاں سے قطعہ شروع ہوجاتا ہے۔ باربد.... ایک مشہور ایرانی گویّے کا نام ہے۔ جو بادشاہ ایران کا درباری گویّا تھا۔ یہاں مراد مطرب ہے۔ میرا قلم جو کہ بزم سخن کا باربد (مطرب) ہے۔ بادشاہ کی مدح میں اس طرح سے نغمہ سرا ہوتا ہے۔

۹۔ کواکب سپہ.... جمع کوکب، بمعنی ستارہ یعنی وہ جس کی فوج آسمان کے ستارے ہوں۔ مراد لاتعداد فوج۔ مہر علم.... جس کا علم آفتاب ہو۔ اے شہنشاہ ستارے تیرا لشکر اور آفتاب تیرا علم ہے۔ تو اس قدر بڑا بادشاہ ہے۔ کہ کوئی شخص تیرے انعام واکرام کا حق ادا نہیں کرسکتا۔

۱۰۔ سات اقلیم.... سات سلطنتیں مراد ساری دنیا کا حاصل محصول نعل بہا.... وہ روپیہ جو چھوٹی حکومتیں بڑی حکومت کو ادا کرتی ہیں تاکہ وہ ان کی سرپرستی اور حفاظت کرے۔ اگر سات سلطنتوں کا محصول فراہم کریں۔ تو وہ تیرے لشکر کا نعل بہا ہوتا ہے۔

۱۱۔ ہر مہینے جو چاند بدر سے گھٹ کر ہلال ہوجاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تیرے آستانے پر اس قدر ناصیہ فرسائی کرتا ہے کہ گھستے گھستے بدر سے ہلال بن جاتا ہے۔

۱۲۔ میں جو آئین غزلخوانی میں گستاخی کرتا ہوں یہ تیرے ہی کرم کا اثر ہے۔ کہ وہ میری آتش اشتیاق کو مشتعل کرتا ہے (سعید)

بیخود۔ میں جو آئین غزلخوانی کو توڑ کر تیرا مدح سرا ہوجاتا ہوں تیرے کرم

کی وجہ سے یعنی تیرا کرم ذوقِ مدح سرائی بڑھاتا رہتا ہے۔ آسی۔ میں
جو گستاخانہ اور بے تکلفانہ اچھی اچھی غزلیں پڑھتا ہوں۔ اس کی کوئی
اور وجہ نہیں بلکہ کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ۔

۱۳۔ اے غالب! میری تلخ نوائی سے درگذر کرنا۔ اس کی وجہ یہ ہے
کہ آج میرے دل کا درد کچھ بڑھ گیا ہے۔ اور ضبط کی تاب نہیں رہی اس
لیئے زبان سے تلخ الفاظ نکل رہے ہیں۔ بیخود۔ تلخ نوائی سے اشعار پُر درد
مراد لیتے ہیں۔ سعید تلخ گوئی سے سخت سُست کہنا سمجھے ہیں۔

۱۶۳

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے ۱ تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے
نہ شعلہ میں یہ کرشمہ، نہ برق میں یہ ادا ۲ کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تند خو کیا ہے
یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے ۳ وگرنہ خوفِ بد آموزیِ عدو کیا ہے
چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن ۴ ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے
جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا ۵ کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے
رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل ۶ جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے
وہ چیز جس کے لیئے ہم کو ہو بہشت عزیز ۷ سوائے بادۂ گلفامِ مشک بو کیا ہے
پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار ۸ یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے
رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی ۹ تو کس امید پہ کہیئے کہ آرزو کیا ہے

۱۰ ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

۱۔ تم میری ہر ایک بات پر کہتے ہو کہ تیری حقیقت ہی کیا ہے تو اپنے آپ کو
سمجھتا کیا ہے۔ یا تو ہے کیا چیز۔ خدا کے لیئے تمہیں بتاؤ کہ یہ طرزِ گفتگو کس قسم

کا ہے۔ یعنی تم نے یہ کس قدر توہین آمیز طرز گفتگو اختیار کی ہے۔

۲- اگر میں اس کی تند خوئی کے سبب سے اس کو شعلہ کہوں تو شعلہ میں وہ کرشمہ نہیں جو اس میں ہے۔ اور اگر میں اس کی شوخی کی وجہ سے اس کو برق قرار دوں۔ تو برق میں وہ ناز اور انداز نہیں جو اس میں ہے۔ پھر خدارا کوئی مجھے یہ بتا دے کہ آخر میں اس شوخ تند خو کو کیا کہوں۔

۳- مجھے اس بات کا خوف نہیں کہ دشمن نہیں میری طرف سے بدگمان کرتا اور تمہارے کان بھرتا ہے۔ مجھے تو رشک یہ ہے کہ وہ تم سے ہمکلام ہوتا ہے۔

۴- ہمارے گریبان کو اب رفو کی ضرورت نہیں رہی۔ کیونکہ لہو سے بدن پر پیراہن چپک گیا ہے۔ اسی مضمون کو فارسی میں اس طرح ادا کیا ہے

ے بتن چسپیدہ بازم از نم خونابہ پیراہن
خراش سینہ سطرِ بخیہ شد چاک گریبانم

طبا طبائی۔ اس شعر میں سستی یہ ہے کہ کوئی وجہ نہیں بیان کی کہ لڑکوں نے پتھر مار کر خون بہایا ہے۔ یا خود سر پھوڑ ڈالا ہے۔ یا خون کے آنسو بہے ہیں۔ یا چھاتی کو پیٹتے پیٹتے زخمی کر دیا ہے۔ یا گریبان پھاڑنے میں ناخن سے نوچا ہے۔ یہ سب احتمال ہیں۔ مگر تعین نہ کرنے سے بے لطفی پیدا ہو گئی ہے بیخود لکھتے ہیں کہ احتمالات تعین نہ کرنے سے زیادہ لطف پیدا ہو گیا ہے

۵- عاشق سوز عشق سے جل چکا ہے اور معشوق اسکی راکھ کرید رہا ہے کہتے ہیں ارے نادان جسم کے ساتھ دل بھی جل گیا ہوگا۔ اب راکھ کرید کر دل کو کیا تلاش کرتا ہے۔

طبا طبائی لکھتے ہیں۔ کہ کریدنا بُرا ہے وقیقہ سنج لوگ ضرور کہیں گے کہ معشوق

مرغی تھا۔ آسی لکھتے ہیں کہ اعتراض آسان ہے حقیقتاً اس جگہ کوئی اور لفظ رکھا جائے تو حقیقت کھلے۔

۶۔ ہم اس لہو کو لہو نہیں مانتے۔ جو رگوں میں دوڑتا پھرے۔ ہم تو اسکو لہو مانتے ہیں۔ جو آنکھ سے ٹپکے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ لہو نہیں جو آنکھ سے آنسو بن کر نہ ٹپکے۔

۷۔ وہ چیز جس کی وجہ سے ہم کو بہشت عزیز ہو سکتی ہے۔ سوائے بادۂ گلفام مشک بو اور کیا چیز ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ ہمیں بہشت اسی وجہ سے عزیز ہے کہ وہاں نہایت عمدہ شراب ملے گی اور بمقدار کثیر ملے گی۔

۸۔ ہم اس قدر بلا نوش واقع ہوئے ہیں۔ کہ قدح و شیشہ و کوزہ و سبو کو کچھ چیز نہیں سمجھتے۔ ہاں اگر دو چار خم سامنے ہوں تو پھر شراب پیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے۔ کہ تھوڑی شراب پی کر طبیعت بے لطف نہیں کرنا چاہتے

۹۔ اول تو مجھ میں طاقتِ گفتار ہی باقی نہیں رہی۔ اور اگر ہو بھی تو کس امید پر کہوں کہ میری کیا آرزو ہے۔ کیونکہ اس سے آرزو پوری ہونے کی بالکل توقع نہیں رہی۔ اور یہ ہمہ نا امیدی کا نتیجہ ہے۔ اس کے گذشتہ سلوک کا کہ اس نے کبھی کوئی آرزو پوری نہیں کی۔

۱۰۔ ذرا غالب کو دیکھنا بادشاہ کے مصاحب بن کر اتراتے پھرتے ہیں ورنہ جو کچھ شہر میں ان کی آبرو ہے۔ وہ معلوم ہی ہے۔ یعنی کچھ نہیں۔

کہتے ہیں ایک دن استاد ذوق کہیں پالکی میں بیٹھے جا رہے تھے کہ غالب کی نظر پڑی۔ چونکہ اُن سے معاصرانہ چشمک تھی۔ مصرعۂ اولیٰ فی البدیہہ کہہ کر پڑھا۔ استاد ذوق نے سن لیا۔ اور بادشاہ سے شکایت کی بادشاہ نے غالب کو بلوایا اور پوچھا کہ آپ نے کونسی غزل کہی ہے۔ انہوں نے پوری غزل

سُنائی اور مقطع میں یہ مصرعہ بھی شامل کر دیا۔

۱۶۴

میں انہیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں ۱ چل نکلتے جو مے پیئے ہوتے
قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو ۲ کاش کے تم مرے لئے ہوتے
میری قسمت میں غم گر اتنا تھا ۳ دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے
۴ آ ہی جاتا وہ راہ پر غالب
کوئی دن اور بھی جیئے ہوتے

۱۔ میں انہیں چھیڑوں اور وہ کچھ نہ کہیں۔ بڑے تعجب کی بات ہے اگر کہیں اس وقت وہ شراب کی ترنگ میں ہوتے تو میرے چھیڑنے پر آفت برپا کر دیتے۔

۲۔ تم قہر ہو یا بلا ہو، خواہ کچھ ہی ہو۔ لیکن کاش کے تم میرے لئے مخصوص ہوتے۔ مطلب یہ ہے کہ میں کسی حالت میں بھی یہ گوارا نہیں کرتا۔ کہ تم دوسروں کے لئے ہو۔ بقول طباطبائی۔ قہر و بلا اپنے لئے گوارا کر لینا نادر مضمون ہے۔ اس کے علاوہ معشوق کی شوخ مزاجی اور عربدہ جوئی اور شوق و حسرت وغیرہ کی تصویر کھینچ دی ہے۔

۳۔ یارب اگر میری قسمت میں اتنا زیادہ غم لکھا تھا۔ تو اس کو برداشت کرنے کے لئے دل بھی کئی دیئے ہوتے۔ مطلب یہ ہے کہ جس قدر غم مجھے دیا گیا ہے۔ وہ ایک دل کی برداشت سے بہت زیادہ ہے۔ میر

کاشکے دل دو تو ہوتے عشق میں ایک رکھتے ایک کھوتے عشق میں

۴۔ راہ پر آنا ۔۔۔ کہا مان لینا۔ غالب دن عنقریب راہ پر آ جاتا اور تمہاری دلجوئی کرتا۔ تم بہت جلد مایوس ہو کر چل بسے۔ کوئی دن اور جیئے ہوتے

کہ لطفِ صحبتِ محبوب اٹھاتے۔

۱۶۵

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے ۔ ۱ ۔ ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے
خستگی کا تم سے کیا شکوہ کہ یہ ۔ ۲ ۔ ہتھکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے
خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو ۔ ۳ ۔ ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے
رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم ۔ ۴ ۔ دھوئے دھبے جامۂ احرام کے
دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا مگر ۔ ۵ ۔ یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے
شاہ کی ہے غسلِ صحت کی خبر ۔ ۶ ۔ دیکھیے کب دن پھریں حمام کے

عشق نے غالبؔ نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

۱۔محفل سے مراد محفلِ معشوق ہے اور پیغام سے مراد پیغام طلب تشنہ جام کی رعایت سے لائے ہیں۔ اپنی حرماں نصیبی کا نقشہ کھینچا ہے کہتے ہیں افسوس کہ غیر تو محفلِ یار میں جام کے بوسے لیں یعنی بے تکلف شراب پییں اور ہم پیغام طلب سے بھی محروم رہیں یا ہماری کوئی بات بھی نہ پوچھے۔ اور ہم یونہی پڑے ترسا کریں۔

۲۔اپنی بربادی اور خستگی کا تم سے گلہ نہیں، یہ سب فلک کج رفتار کے ہتھکنڈے ہیں مطلب یہ ہے۔ کہ تم سے گلہ نہیں۔ اپنی تقدیر سے شکوہ ہے۔

طباطبائی لکھتے ہیں۔ کہ نیلی فام بھرتی کا لفظ ہے۔ اس کو معانی میں دخل نہیں بنا بریں کہہ سکتے ہیں۔ کہ نیلا رنگ منحوس اور غم کی نشانی ہے۔

۳۔چاہے خط لکھنے کی ضرورت ہو یا نہ۔ ہم تمہیں برابر خط لکھے جائیں گے کیونکہ

ہم تمہارے نام کے عاشق ہیں۔ اس لیے ہمیں تو تمہارے نام خط لکھنے سے مطلب ہے۔ اگر کوئی مطلب نہیں ہے تو نہ سہی۔ یا یہ کہ خط میں تمہارا نام آئے گا۔

۴۔ زمزم .... مکہ معظمہ میں ایک کنواں ہے جس کے پانی کو خانہ کعبہ کے قرب کی وجہ سے متبرک خیال کیا جاتا ہے۔ رات کو ہم نے چاہ زمزم پر بیٹھ کر شراب پی اور صبح کے وقت اسی کے پانی سے جامۂ احرام کے دھبے دھو ڈالے۔ یعنی پاک صاف ہو گئے۔ اس شعر میں مرزا صاحب نے رندانہ شوخی دکھائی ہے کہ ہم حج کے موقعہ پر بھی شراب نوشی سے باز نہیں آئے۔ بلکہ چاہ زمزم پر بیٹھ کر شراب پیتے رہے۔

۵۔ نگر یعنی شاید۔ میرے دل کو میری آنکھوں نے تمہارے عشق کے جال میں پھنسایا ہے۔ شاید یہ میری آنکھیں تمہارے دام کے حلقے ہیں چونکہ آنکھوں کی بدولت انسان عشق میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس لئے اپنی آنکھوں کو معشوق کا حلقہ دام کہا۔ حلقۂ چشم اور حلقۂ دام میں مناسبت ہے۔

۶۔ افواہ ہے کہ بادشاہ غسلِ صحت کرنے والے ہیں۔ دیکھئے حمام کی تقدیر کب پھرتی ہے یعنی وہ کب حمام میں غسل صحت فرما کر اس کو شرفِ قدوم میمنت لزوم بخشتے ہیں۔

۷۔ غالب ہمیں عشق نے کسی کام کا نہ رکھا۔ ورنہ ہم بڑے کام کے آدمی تھے۔

۱۶۶

پھر اس انداز سے بہار آئی ۱ کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک ۲ اس کو کہتے ہیں عالمِ آرائی

۳ رو کشِ سطحِ چرخِ مینائی | کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر
۴ بن گیا روئے آب پر کائی | سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
۵ چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی | سبزہ و گل کے دیکھنے کے لیئے
۶ بادہ نوشی ہے باد پیمائی | ہے ہوا میں شراب کی تاثیر

۷ کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالبؔ
شاہِ دیندار نے شفا پائی۔

۱۔ پھر اس انداز سے بہار آئی ہے۔ کہ مہر و ماہ اس کو بڑے شوق کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

۲۔ اے زمین کے رہنے والو دیکھو، اس کو عالم آرائی کہتے ہیں۔

۳۔ رو کش ۔۔۔۔ بمقابل۔ چرخ مینائی ۔۔۔۔ سبز آسمان۔ زمین کثرت سبزہ و گل کی بدولت سبز آسمان کی بمقابل بن گئی ہے یعنی آسمان بھی سبز ہے اور زمین بھی سبز ہے۔ یا یہ کہ زمین آسمان سے بڑھ گئی ہے۔

۴۔ کثرتِ سبزہ و گل کی وجہ سے سبزہ کو جب روئے زمین پر جگہ نہ ملی تو وہ آخر کار سطح آب پر کائی بن کر ظاہر ہو گیا۔ کائی بھی سبز ہوتی ہے۔

۵۔ خداوند تعالےٰ نے سبزہ و گل کے نظارہ سے لطف اندوز ہونے کے لیے چشمِ نرگس کو بینائی دی ہے۔ یاد رہے چشمِ نرگس کو عام شعرا نابینا خیال کرتے ہیں لیکن غالب نے اس خیال کو ترک کر کے نیا مضمون پیدا کیا ہے۔

۶۔ حالی۔ یہ شعر بہار کی تعریف میں ہے۔ اس میں باد پیمائی کے لفظ نے دو معنی پیدا کر دیئے ہیں۔ باد پیمائی عبث کام کرنے کو کہتے ہیں پس ایک معنی تو اس کے یہ ہیں۔ کہ فصلِ بہار کی ہوا ایسی نشاط انگیز ہے کہ گویا اس میں شراب کی تاثیر پیدا ہو گئی ہے۔ اور جبکہ یہ حال ہے تو بادہ نوشی محض باد پیمائی یعنی

وفضول کام ہے۔ اس صورت میں بادہ نوشی مبتدا ہوگا۔ اور باد پیمائی خبر۔ دوسرے معنی یہ ہیں۔ کہ باد پیمائی کو مبتدا اور بادہ نوشی کو خبر قرار دیا جائے۔ اور جس طرح بادہ پیمائی کے معنی بادہ خواری کے ہیں۔ اسی طرح باد پیمائی کے معنی ہوا کھانے کے لیئے جائیں۔ اس صورت میں مطلب یہ نکلے گا۔ کہ آج کل ہوا کھانی بھی شراب پینی ہے۔ (سعید۔ بیخود) آسی اور طبا طبائی نے محض پہلے معنی لکھے ہیں۔

۷۔ موسم بہار کو دنیا کی خوشی قرار دے کر کہتے ہیں۔ کہ بھلا ساری دنیا خوش کیوں نہ ہو۔ بادشاہ سلامت نے شفا پائی ہے۔ چونکہ مصرعۂ اولیٰ میں دنیا کا لفظ آیا تھا۔ اس لئے اس کی مناسبت سے دوسرے مصرعہ میں دین کا لفظ لائے ہیں اس تناسب کو مد نظر رکھے بغیر و بیندار اچھا معلوم نہیں ہوتا۔

۱۶۷

تغافل دوست ہوں میرا دماغ عجز عالی ہے	۱ اگر پہلو تہی کیجے تو جا میری بھی خالی ہے
رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے	۲ بھرے ہیں جسقدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

۱۔ تغافل دوست ہوں ... یعنی میں تغافل کو پسند کرتا ہوں۔ دماغ عجز ... عجز کا دماغ مراد مرتبہ عجز۔ پہلو تہی ... تغافل۔ جگہ خالی کرنا ... جگہ اس شخص کے لئے خالی کی جاتی ہے جس کا احترام مقصود ہو۔ میں تغافل پسند انسان ہوں۔ میرا دماغ عجز اس درجہ بلند ہے۔ کہ اگر آپ مجھ سے پہلو تہی کریں تو میں اس پہلو تہی کرنے سے یہ سمجھوں گا۔ کہ آپ نے میرے لئے جگہ خالی کر کے مجھ پر خاص کرم فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ میں تغافل پسند ہونے کی وجہ سے تغافل کو پسند کرتا ہوں۔ کیونکہ تغافل میں نکتہ یہ ہے۔ کہ آپ مجھے عاشق سمجھتے ہوئے جان بوجھ کر مجھ سے گریز کرتے ہیں۔ ایک جگہ پہلے لکھ چکے ہیں ۔ جان کر کیجے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو۔

۲۔ حالی۔ یہ خیال شاید کسی اور کے دل میں بھی گذرا ہو، مگر تمثیل نے اس کو بالکل ایک اچھوتا مضمون بنا دیا ہے۔ اور شعر کو نہایت بلند کر دیا ہے۔ کہتے ہیں۔ کہ دنیا میں اگر اہل ہمت کا وجود ہوتا جو دنیا کو محض ناچیز سمجھ کر اس کی طرف التفات نہ کرتے۔ تو دنیا ویران ہو جاتی۔ پس یہ جاننا چاہیئے۔ کہ عالم اسی سبب سے آباد نظر آتا ہے۔ کہ اہل ہمت مفقود ہیں۔ یعنی جس طرح مے خانہ میں جام و سبو کا شراب سے بھرا رہنا اس بات کی دلیل ہے۔ کہ مے خانہ میں کوئی میخوار نہیں ہے اسی طرح عالم کا آباد و معمور ہونا دلالت کرتا ہے۔ کہ اس میں اہل ہمت معدوم ہیں (تمام متفق)

آسی (۱) اگرچہ دنیا آباد ہے۔ مگر اہل ہمت اس میں نہیں ہیں۔ گویا یہ ایک مے خانہ ہے جس میں شراب ندارد ہے۔ جام و سبو بھرے پڑے ہیں۔

۲۔ حالی کے ہم خیال (۳) اہل ہمت نہ ہونے سے دنیا آباد ہے کہ جام و سبو جس قدر بھر بھر کر دیں گے میخانہ خالی ہو جائے گا۔ یعنی یہ لوگ اگر میخانہ دنیا میں ہوتے۔ تو دنیا کو لٹا دیتے۔ اور ان کا جود و کرم ویرانہ کو آباد نہ رہنے دیتا۔

۱۶۸

کب وہ سنتا ہے کہانی میری ۱ اور پھر وہ بھی زبانی میری
خلش غمزہ خوں ریز نہ پوچھ ۲ دیکھ خونابہ فشانی میری
کیا بیاں کرکے مرا روئیں گے یار ۳ مگر آشفتہ بیانی میری
ہوں زخود رفتہ بیدائے خیال ۴ بھول جانا ہے نشانی میری
متقابل ہے مقابل میرا ۵ رک گیا دیکھ روانی میری

قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں ۶ سخت ارزاں ہے گرانی میری
گرد بادِ رہِ بے تابی ہوں ۔ ۷ صرصرِ شوق ہے بانی میری
دہن اُس کا جو نہ معلوم ہُوا ۸ کھُل گئی ہیچمدانی میری
۹ کر دیا ضعف نے عاجز غالبؔ
ننگِ پیری ہے جوانی میری

۱۔ کہانی میری ۔۔۔۔ یعنی میرا افسانۂ عشق ۔ شارحین اس شعر کو تعریف سے مستغنی قرار دیتے ہیں ۔ واقعی نہایت بے تکلّف شعر واقع ہُوا ہے ۔ کہتے ہیں ۔ وہ اوّل تو میری کہانی کب سُنتا ہے ۔ اور اگر سُنے بھی تو میری زبانی ناممکن ہے ۔

۲۔ غمزۂ خونریز کی خلش کی کیفیت مجھ سے نہ پوچھ بلکہ میری خونابہ (خالص خوں) فشانی دیکھ لے ۔ اس کو دیکھ کر تجھے غمزۂ خونریز کی خلش کی کیفیت معلوم ہو جائے گی ۔ کہ اس نے میرے سینے میں زخم ڈال دیئے ہیں ۔ جو خالص خون کے آنسو جاری ہیں ۔

۳۔ جب کوئی عزیز مر جاتا ہے ۔ تو اقربا مرنے والے کی صفات بیان کر کے روتے ہیں ۔ کہتے ہیں میرے عزیز اور دوست مرنے کے بعد میری کیا صفات یاد کر کے روئیں گے ؟ اس سوال کا خود ہی جواب دیتے ہیں ۔ کہ شاید وہ میری "آشفتہ بیانی" بیان کر کے روئیں گے ۔ اس شعر میں شاعر اپنی آشفتہ بیانی کو بھی مابہ الامتیاز صفت قرار دیتا ہے جسے یاد کر کے اعزا کو رونا آئیگا ۔ خوب شعر ہے ۔

۴۔ بیدا ۔۔۔ صحرا نشانی ۔۔ پہچان ۔ حسرت ۔ میں صحرائے خیال کا از خود رفتہ ہوں ۔ اور از خود رفتگی ہی میری نشانی یا پہچان ہے ۔ (سعید)
طباطبائی ۔ خیال سے احباب مراد ہے ۔ اور اسے میدان فرض کیا ہے ۔ اور

اپنے تئیں اس میدان کا ازخود رفتہ کہا ہے یعنی خیالِ احباب سے جیں نکل جاتا ہوں اور احباب کا مجھے بھول جانا ہی میری نشانی ہے (طباطبائی بیخود۔ آسی)

آسی: میں خیالِ یار کے دشتِ ناپیدا رکنار میں ازخود رفتہ ہو گیا ہوں اور میری گمگشتگی اور ازخود رفتگی کا نشان یہ ہے۔ کہ وہ مجھے بھول گیا ہے۔

۵۔ ایک خط میں غالبؔ نے اس شعر کی شرح خود لکھی ہے۔ تقابل و تضاد کو کون نہ جانے گا۔ نور و ظلمت، شادی و غم، راحت و رنج، موجود و عدم؛ لفظ مقابل اس مصرعہ میں بمعنی مرجع ہے۔ جیسے کہ حریف کہ بمعنی دوست کے بھی مستعمل ہے مفہوم شعر یہ ہے۔ کہ ہم اور دوست از روئے خوئے و عادات ضد یکدگر ہیں وہ میری طبع کی روانی دیکھ کر رُک گیا (عود ہندی)

حسرتؔ: مقابل یعنی بہ تصنع مقابل ہے مطلب یہ ہے کہ حریف میری روانی (روانی طبع) کو دیکھ کر درحقیقت قائل ہو گیا لیکن ظاہر میں محض اس بات کی پیچ کے لئے بہ تصنع مقابلہ کئے جاتا ہے۔

۶۔ حالیؔ۔ گرانی کے معنی بھاری پن کے ہیں اور بیش قیمت ہونے کے بھی کہتا ہے۔ کہ میری قدر اس پتھر کی سی ہے جو راہ کے سرے پر پڑا ہو اور ہر شخص آتے جاتے اس پر پاؤں رکھ کر گذرے یعنی ہوں تو گراں مگر اس پتھر کی طرح بیقدر رہوں لیس میری گرانی کس قدر ارزاں ہے (سعید۔ بیخود)

۷۔ گردباد۔۔۔ بگولا۔ صرصر۔۔۔ آندھی ہوائے تند۔۔۔ بانی۔۔۔۔ بانی مبانی ـــ میں راہ بیتابی کا بگولا ہوں یعنی بگولے کی طرح بیقرار رہوں اور اس بیقراری کی بانی مبانی صرصر شوق ہے۔ یعنی میں وہ بگولا ہوں جو شوق کی آندھی سے پیدا ہوتا ہے۔

۸۔ معشوق کا ذہن ایچ ہے۔ جو شخص ایچ نہ جانے وہ ہیچمدان ہے کہتے ہیں۔

جب اس کا دہن باوجود کوشش کے مجھے معلوم نہ ہوا۔ تو میری ہیچمدانی ظاہر ہو گئی

۹۔ ننگ... عار، شرم۔ اگرچہ میں جوان ہوں لیکن ضعف و نقاہت نے مجھے عاجز کر دیا ہے۔ مجھے ایسا ضعف ہے کہ اگر بڑھاپے میں بھی کسی کو ہوتا تو ننگِ پیری کہلاتا۔ مطلب یہ ہے۔ کہ میری جوانی بڑھاپے کے لئے باعثِ ننگ و عار ہے۔

۱۶۹

نقشِ نازِ بُتِ طنّاز بآغوشِ رقیب ۱ پائے طاؤس پے خامۂ مانی مانگے

تو وہ بدخو کہ تحیّر کو تماشا جانے ۲ غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے

وہ تپِ عشقِ تمنّا ہے کہ پھر صورتِ شمع ۳ شعلہ تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے

۱۔ پے بمعنی بجائے ــــ مور کا تمام جسم خوبصورت مگر اس کے پاؤں بدصورت ہوتے ہیں۔ اسی طرح معشوق خوبصورت اور رقیب جس کی گود میں وہ بیٹھا ہوا ہے بدصورت ہے۔ اس لئے جب اس معشوق سراپا نازکی اس حالت کی تصویر ناز مصور تیار کرے تو مناسب ہے کہ وہ خامہ مانی کی بجائے پائے طاؤس مانگے۔ تاکہ رقیب کی تصویر مور کے پاؤں کی طرح خراب بنے۔ یہ طرز بیدل کا شعر ہے بقول آسی۔ خوبی اس شعر میں یہ ہے۔ کہ یہاں خود مصنف نے یہ نہیں کہا کہ میں ایسا چاہتا ہوں بلکہ یہ کہا ہے کہ اس قسم کی تصویر کا یہ تقاضا ہے۔

۲۔ عالمِ حیرت میں خاموشی کا ہونا ضروری ہے لیکن تو ایسا بدخو واقع ہوا ہے کہ میری حیرت اور خاموشی کو تماشا اور سامانِ تفریح خیال کرتا ہے۔ حالانکہ حیرت کی وجہ یہ ہے کہ ہم افسانۂ غم بیان نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ افسانہ ہے۔ جو آشفتہ بیانی چاہتا ہے۔ اور آشفتہ بیانی کو تو پسند نہیں کرتا۔ اس لئے ہم سخت کشمکش میں ہیں۔ مطلب یہ ہے مبتلائے حیرت خاموشی بھی نہیں رہا جاتا۔

اور افسانۂ غم بھی بیان نہیں کر سکتے۔

آسی (۱) تو مجھ کو محوِ تماشہ سمجھتا ہے۔ اور میرے غم کا افسانہ ایسا ہے جو چاہتا ہے۔ کہ آشفتہ بیانی بھی اس کے ساتھ ہو۔ (۲) میری حیرت تیرے لئے ایک تماشہ ہے۔ اور اگر اس سے آشفتہ ہوں اور میرا غم مجھے مجبور کر دے تو تو آشفتہ بیانی سمجھتا ہے۔ غرض دو گونہ عذاب ہے۔ چپ رہوں تو مصیبت کچھ کہوں تو آفت (باقی شارحین میرے ہم خیال ہیں)

۳۔ نبض سے مراد، رگ۔ ریشہ دوانی مانگے... یعنی سرایت کرے مجھ کو ایسے تپ عشق کی تمنا ہے۔ کہ جس کا شعلہ شمع کی طرح رگِ جگر تک سرایت کرے گویا تمام جسم کو جلا ڈالے۔ شمع سے مثال اس لئے دی ہے کہ جب اسکی بتی کو آگ لگتی ہے۔ تو شعلہ اس کے جگر تک بتی کے ذریعہ سے سرایت کرتا ہے ریشہ دوانی بھی اسی رعایت سے لائے ہیں۔

۱۷۰

گلشن کو تری صحبت از بسکہ خوش آئی ہے	۱	ہر غنچہ کا گل ہونا آغوش کشائی ہے
واں کنگرِ استغنا ہر دم ہے بلندی پر	۲	یاں نالہ کو اور الٹا دعویٰ رسائی ہے
از بسکہ سکھاتا ہے غم ضبط کے انداز ے	۳	جو داغ نظر آیا اک چشم نمائی ہے

۱۔ چونکہ گلستان کو تیری ہم نشینی اور تیرا یارانہ بہت ہی زیادہ مرغوب ہے اس لئے باغ میں کلیاں کھلتی نہیں بلکہ جوشِ محبت میں تجھ سے بغلگیر ہونے کے لئے اپنی آغوش وا کرتی ہیں۔

۲۔ کنگرہ استغنا... بام استغنا (بے پروائی) کا کنگورہ۔ ادھر یار کے بامِ استغنا کا کنگورہ ہر دم بلند ہوتا جاتا ہے۔ اور ادھر ہمارے نالہ کو الٹا رسائی کا دعویٰ ہے یعنی یار تو ہر دم ہم سے بے پروا ہوئے جاتا ہے مگر

ہمارے نالے کو دعویٰ رسائی ہے ع (بہ بیں تفاوتِ راہ از کجاست تا بہ کجا)

۳- داغ صورت میں آنکھ سے مشابہ ہے کہتے ہیں۔ غم میرا استاد بنا ہے اور وہ مجھ کو ضبطِ غم کی تعلیم دے رہا ہے۔ اس صورت میں مجھے جو داغ نظر آرہا ہے۔ وہ استاد کی چشم نمائی کا حکم رکھتا ہے گویا زبانِ حال سے کہتا ہے۔ کہ دیکھیو۔ نالہ و فریاد نہ کیجئیو۔

۱۷۱

لکھ دیجئیو یارب اُسے قسمت میں عدو کی	۱ جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی	۲ اچھا ہے سر انگشتِ حنائی کا تصور
یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی	۳ کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے
جنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی	۴ دشنہ نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو

۵ صد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالب
حسرت میں رہے ایک بتِ عربدہ جو کی۔

۱- جس زخم میں ٹانکے لگ سکتے ہوں۔ وہ مجھے درکار نہیں اے خدا! الٹا زخم دشمن کی قسمت میں لکھ دیجئیو۔ میں تو ایسا زخم چاہتا ہوں جس کا کوئی علاج ہی نہ ہو سکے بقولِ حسرت اپنی ایذا دوستی کا اظہار کیا ہے۔

۲- حالی۔ لفظ "تو" نے جو دوسرے مصرعہ میں ہے۔ یہ معنی پیدا کر دیئے ہیں کہ آنکھ سے لہو رونے روتے دل میں خون کا ایک قطرہ باقی نہ رہا۔ اس لیئے دوست ...... کے سر انگشت حنائی کے تصور کو غنیمت سمجھتا ہے کہ اس کی وجہ سے دل میں لہو کی ایک بوند تو نظر آتی ہے۔

۳ حالی۔ بے حوصلگی۔ یعنی کم ظرفی۔ یہاں سے مراد دنیا معشوق سے کہتا ہے۔ کہ اس بات سے کیوں ڈرتا ہے کہ ہم عاشق لوگ تیرے ظلم و جور سے

تنگ آکر عالم سے یا خدا سے تیری فریاد کریں گے کس لئے کہ اگر ہم ایسا کریں بھی تو کوئی کسی کی فریاد ہی نہیں سنتا۔

۴۔ دشنہ اور خنجر سے مراد ناز و انداز اور ظلم و بیداد معشوق۔ دشنہ کا جگر کو منہ نہ لگانا ہے جگر کو ٹکڑے نہ کرنا اور خنجر کا گلو کی بات نہ پوچھنا ہے اس کو نہ کاٹنا مراد ہے۔ اس ظالم معشوق کے دشنہ نے جس عاشق ناکام کے جگر کو منہ تک نہ لگایا ہو اور اس کے خنجر نے کبھی اس مظلوم کے گلو کی بات تک نہ پوچھی ہو۔ اس کی حسرت دیکھنا چاہیئے۔ اسی اور طباطبائی نے اس شعر کو مقطع سے پہلے لکھا ہے۔ اس ترتیب سے شعر کا مفہوم بالکل صاف ہو جاتا ہے۔

۵۔ بت عربدہ جو... معشوق جنگجو۔ غالب افسوس صد افسوس اس ناکام تمنا کی حالت پر جو ایک عمر یعنی عرصہ دراز تک ایک بت جنگجو کی حسرت میں رہے۔ اور اس کی تمنا پوری نہ ہو۔

۱۷۲

سیماب پشت گرمیٔ آئینہ دے ہے ہم ۱ حیراں کیے ہوئے ہیں دل بیقرار کے
آغوش گل کشودہ برائے وداع ہے ۲ اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے

۱۔ سیماب... پارہ۔ پشت گرمی... پشت بانی یعنی اعانت و امداد پہلا مصرعہ مثالیہ ہے اور "ہم" دوسرے مصرعہ کے ساتھ ہے دل بیقرار کو سیماب سے اور اپنی حیرانی کو آئینہ سے تشبیہ دی ہے۔ کہتے ہیں جس طرح شیشے پر پارہ چڑھانے سے شیشہ آئینہ بن جاتا ہے۔ اور حیران کہلاتا ہے۔ اسی طرح ہم دل بیقرار کے حیران کیے ہوئے ہیں۔ یعنی بیقراری کا سیماب ہمارے دل کے شیشے پر چڑھا ہے۔ پھر اس میں حیرانی کی صفت

پیدا ہوئی ہے (تمام متفق)

آسی نے دوسرا مفہوم یہ لکھا ہے سیماب کا کام یہ ہے کہ وہ آئینہ کی مدد کرتا ہے۔ اور اس کو چمکاتا ہے۔ برعکس اس کے ہمارے دل بیقرار نے ہم کو حیران بنا دیا، اور پریشان کر دیا یعنی ہم بیکار ہو گئے۔ اور گویا یہ اس سیماب کی نئی تاثیر ہے۔

۲۔ پھول کھلنے کو آغوشِ گل کشودہ سے تعبیر کیا ہے۔ لطف یہ ہے۔ کہ پھول کا کھلنا اس کی فنا کی دلیل ہے۔ کہتے ہیں پھولوں نے رخصت ہونے کے لئے اپنی آغوش وا کر دی ہے۔ اے عندلیب اس لئے گلے مل کر رخصت ہو۔ کہ بہار کے دن ختم ہو گئے۔

۱۷۳

۱ معشوق شوخ و عاشق دیوانہ چاہیئے | ہے وصل ہجر عالم تمکین و ضبط میں
۲ شوقِ فضول و جرأت رندانہ چاہیئے | اس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو ہاں

۱۔ تمکین۔۔۔۔ خودداری۔ اگر وصل کی رات معشوق کے دل میں تمکنت اور عاشق کے دل پر ضبط و قرار کا عالم طاری ہو تو پھر وصل ہجر بن جاتا ہے در اصل وصل میں معشوق کو شوخ و شنگ اور عاشق کو دیوانہ و گستاخ ہونا چاہیئے۔ تاکہ کسی قسم کا تکلف بے لطفی پیدا نہ کرے۔

۲۔ اس کے لب کا بوسہ کبھی نہ کبھی مل ہی جائے گا۔ ہاں اس کیلئے شوق فضول اور جرأت رندانہ چاہیئے۔ بیخود۔۔ شوق فضول کے معنی حد سے بڑھا ہوا شوق لکھتے ہیں۔ اور آسی کہتے ہیں۔ کہ بوسہ کے شوق کو شوق فضول اس لیئے کہا ہے۔ کہ مصنف اس کو بوالہوسی سمجھتا ہے نہ کہ عاشقی۔

۱ یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیئے | چاہیئے اچھوں کو جتنا چاہیئے
۲ چاہئے مے اپنے کو کھینچا چاہیئے | صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر
۳ بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیئے | چاہیئے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل
۴ کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہیئے | چاک مت کر جیب بے ایامِ گل
۵ منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیئے | دوستی کا پردہ ہے بیگانگی
۶ کس قدر دشمن ہے، دیکھا چاہیئے | دشمنی نے میری کھو یا غیر کو
۷ یاں رہی منگامۂ آرا چاہیئے | اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی
۸ ناامیدی اس کی دیکھا چاہیئے | منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید
۹ چاہنے والا بھی اچھا چاہیئے | غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے

۱۰ چاہتے ہیں خوب رویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیئے

۱- اچھوں... حسینوں۔ انسان دنیا میں جس قدر بھی محبت کرے وہ حسینوں سے کرے۔ اور اگر خوش قسمتی سے اس کے جواب میں وہ اسے چاہنے لگیں، تو پھر کسی اور نعمت کی ضرورت نہیں۔

۲- شراب کشیدن... شراب کھینچنا۔ اپنے کو کھینچنا۔ پرہیز کرنا۔... .... کہتے ہیں میخواروں کی صحبت سے پرہیز کرنا واجب ہے بجائے شراب کھینچنے (شراب پینے) کے اپنے آپ کو اس سے کھینچنا چاہیئے یعنی پرہیز کرنا چاہیئے۔

۳- تیرے چاہنے کو دل بالکل آسان بات سمجھتا ہے۔ اب اس سے ذرا پوچھنا چاہیئے۔ کہ تو نے عشق کو کیا سمجھا تھا مطلب یہ ہے کہ عشق بہت مشکل تھا

لیکن دل نے اس کو آسان سمجھ لیا تھا (سعید)

بیخود، طباطبائی، وآسی۔ دوسرے مصرعہ میں سمجھا با زپرس کرنے کے معنی پر ہے یعنی معشوق کو صلاح دیتے ہیں۔ کہ ذرا اس کا مزاج بھی پوچھو کہ کیا سمجھ کر عشق کیا تھا۔

۴۔ حالی۔ پھول کے کھلنے کو چاکِ گریبان سے عموماً تشبیہ دی جاتی ہے کہتا ہے۔ کہ ہر ایک کام نیچر کی ہدایت سے کرنا چاہیئے پس جب تک پھول اپنا گریبان چاک نہ کرے تو بھی اپنا گریبان چاک مت کر اس میں لطف یہ ہے مجنوں کو ہمیشہ بہار میں جوش جنوں زیادہ ہوتا ہے۔

طباطبائی یہاں چاک گریبان کے منع کرنے نے بہت لطف دیا کہ یہ بندش کا نیا انداز ہے۔ آسی۔ جدت یہ ہے کہ فصلِ بہار میں گریبان چاک کرنا بہار کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ مقتضائے ایمائے قدرت ہے۔

۵۔ محبوب عاشق کے سامنے خاص طور پر اپنا منہ چھپاتا ہے کہتے ہیں۔ تم ہم سے منہ چھپانا چھوڑ دو جس طرح تم اوروں سے بے حجابانہ اور بے تکلفانہ ملتے ہو اسی طرح ہم سے ملو کیونکہ اپنی طرف سے تو تم اپنا منہ چھپا کر بیگانگی و ناواقفیت کا اظہار کرتے ہو لیکن در اصل اس طرح کی بیگانگی میں لگاوٹ پائی جاتی ہے۔ اس لئے دیکھنے والے فوراً اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ معاملہ دگرگوں ہے۔ برعکس اس کے اگر تم ہم سے منہ چھپانا چھوڑ دو گے۔ اور بے حجابانہ ملو گے۔ تو دیکھنے والوں کو تمہارے اور ہمارے دلی معاملات معلوم نہ ہونے پائیں گے! اور اس طرح سے بیگانگی دوستی کا پردہ ہو جائے گی۔ اس مضمون کو اس طرح بھی لکھا ہے۔

در پردہ انہیں غیر سے ہے ربطِ نہانی — ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردہ نہیں کرتے

۶۔ غالبؔ ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دُور نہیں

اس مضمون کو اب۔ اس طرح ادا کرتے ہیں۔ کہ میری دشمنی کی بدولت رقیب نے سخت نقصان اُٹھایا۔ ذرا غور کیجیے۔ محبوب میرا کس قدر دشمن ہے۔ کہ میری دشمنی کو بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ محض اس لیئے کہ رقیب میرا دشمن ہے وہ رقیب کا بھی دشمن ہو گیا۔ (سُہا) غیر میری دشمنی میں سب کچھ بھول گیا ہے یہاں تک کہ اس کو معشوق کی بھی خبر نہیں، دیکھئے وہ ہمارا کس قدر دشمن ہے

۷۔ اگر ہم اپنے تئیں رسوا اور بدنام کرنے کی کوشش بھی کریں۔ تو کامیاب نہیں ہو سکتے۔ ہاں اگر یار ہنگامہ آرا ہو۔ تو رسوائی ہو سکتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ چاہے۔ تو ہمیں جلوہ دکھا کر رسوا کر سکتا ہے۔ جلوہ دکھانے میں رسوائی کی یہ صورت ہے۔ کہ اس کی جلوہ آرائی سے بیتابی پیدا ہو گی۔ اور بیتابی رسوائی کا باعث ہو گی۔

۸۔ جس شخص کی اُمید مرنے پر منحصر ہو۔ اس کی نا امیدی دیکھنے کے قابل ہے، مطلب یہ ہے۔ کہ وہ حد درجہ نا امید ہو چکا ہے۔ طباطبائی لکھتے ہیں۔ کہ مرنے پر اُمید حاصل ہوئی تو کیا۔ ع۔ امید نیست کہ عمر گذشتہ باز آید۔

۹۔ اے غافل ان مہوشوں کو چاہنے والا بھی حسین و خوبرو ہونا چاہیئے

۱۰۔ دیکھنا اسدؔ صاحب حسینوں کو چاہتے ہیں۔ ذرا آپ کی صورت تو ملاحظہ کیجئے۔ یہ منہ اور منصور کی دال

۱۷۵

ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے	۱ میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے
درسِ عنوانِ تماشا بتغافل خوشتر	۲ ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے

وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں ۳ صورتِ دود رہا سایہ گریزاں مجھ سے
غمِ عشاق نہ ہو سادگی آموزِ بتاں ۴ کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے
اثرِ آبلہ سے جادۂ صحرائے جنوں ۵ صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے
بیخودی بستۂ تمہیدِ فراغت ہو جو ۶ پُر ہے سایہ کی طرح میرا شبستاں مجھ سے
شوقِ دیدار میں گر تو مجھے گردن مارے ۷ ہو نگہ مثلِ گلِ شمع پریشاں مجھ سے
بیکسی ہائے شبِ ہجر کی وحشت ہے ہے ۸ سایہ خورشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے
گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے ۹ آئینہ داریٔ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

نگہِ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسدؔ
ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

۱۔ میں بھاگ رہا ہوں۔ تاکہ جلدی منزلِ مقصود پر پہنچ جاؤں۔ لیکن ہر قدم پر دوریٔ منزل بڑھتی جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ جس رفتار سے میں بھاگ رہا ہوں۔ اسی چال سے بیابان بھی آگے بھاگ رہا ہے۔ گویا جس قدر میں آگے بڑھتا ہوں۔ اسی نسبت سے منزلِ مقصود بھی دور ہوتی جاتی ہے سعید اس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ کہ بیابان میری رفتارِ مجنونانہ سے ڈر کر مجھ سے بھاگتا ہے (ظاہر ہے یہاں یہ مفہوم نہیں)

۲۔ حسرت۔ ظاہر ہے۔ کہ رشتۂ شیرازۂ مژگان غیر محسوس ہوتا ہے بس مطلب یہ ٹھہرا۔ کتابِ یار کے دیدار کا درس یاد (بحذفِ استعارات) محبوب کے دیدار کا لطف اسی حالت میں ہے۔ کہ ہم اسے دیکھیں اور اسے ہمارے اس دیکھنے کی خبر نہ ہو۔ (سعید ہم خیال ہیں یہی شرح سب سے بہتر ہے)

طباطبائی۔ میری نگاہ شیرازۂ مژگاں کا رشتہ بن گئی ہے۔ حاصل یہ کہ غافل

پسند ہونے کے سبب سے آنکھ سے باہر نہیں نکلتی اور تماشائے دنیا سے درس لینا بھی تغافل سے اچھا ہے۔ اور عنوان کا لفظ مبالغہ پیدا کرنے کے لئے لاتے ہیں یعنی سارا تماشا تو ایک طومار ہے۔ اسے دیکھنے کا کسے دماغ ہے۔ یہاں عنوانِ تماشا کے بھی دیکھنے سے تغافل ہے۔

آسی:۔ عنوانِ تماشائے دوست کا درس حالتِ تغافلِ یار میں چھپائے تاکہ اس پر یہ ظاہر نہ ہو۔ کہ اس کے سوائے دوسروں پر بھی یہ راز نہ کھلے۔ کہ نگاہ نے عنوانِ تماشا کا درس لیا۔ یعنی کسی کو دیکھا۔ اس وجہ سے نگاہ مجھ سے رشتۂ شیرازۂ مژگاں بنی ہوئی ہے یعنی مجھ سے چھپی ہوئی ہے۔ اور اس کا یہ فعل اس لئے ہے۔ کہ اس کا راز معشوق پر تو کیا، مجھ پر بھی نہ ظاہر ہو۔

بیخود۔ دُنیا کے تماشے سے عبرت کا سبق حاصل کرنا بھی تغافل کے ساتھ بہتر ہے یعنی اچٹتی ہوئی نگاہ سے آغازِ تماشہ کو دیکھ لینا نتیجہ نکال لینے کیلئے کافی ہے۔ اس لئے میری نگاہ شیرازۂ مژگاں کا رشتہ بن گئی ہے۔ مطلب یہ ہے میں ایسا تغافل پسند ہوں۔ کہ میری نظر بھی آنکھ کے پردے سے باہر نہیں نکلتی اور دنیا کی نیرنگیوں سے سبق حاصل نہیں کرتی۔

۳۔ شبِ فراق میں میرا سایہ میری آتشِ دل کی وحشت سے ڈر کر مجھ سے اس طرح بھاگتا ہے جس طرح آگ سے دھواں بھاگتا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ شبِ فراق میں میرا سایہ جو ہمیشہ میرے ساتھ رہتا ہے میرا ساتھ نہیں دیتا۔ یہی مضمون اس طرح بھی ادا کیا ہے ؎

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دود بھاگے ہے اسدؔ پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

۴۔ کہیں ایسا نہ ہو۔ کہ غمِ عشاق حسینوں کو سادگی سکھا دے اور یہ لوگ عشاق کے غم میں ترکِ آرائش کر دیں۔ محض ایک میرے مرجانے سے خانۂ آئینہ

ویران ہوگیا ہے۔ کیونکہ اس نے میرے سوگ میں آئینہ دیکھنا چھوڑ دیا ہے
اگر غمِ عشاق میں تمام محبوب آرائش ترک کر کے سادگی اختیار کر لیں گے تو خانۂ
آئینہ کا پوری طرح ویران ہوجانا یقینی ہے۔

آسی نے دوسرا مفہوم غمِ عشاق کو منادی قرار دے کر لکھا ہے یعنی اے
غمِ عشاق تو معشوق کی سادگی کو نہ سکھا۔ دیکھ تو سہی۔ تیرے اس فعل سے آئینہ
خانہ کیسا ویران معلوم ہوتا ہے۔ یعنی میرے غم میں محبوب نے آرائش
ترک کر دی ہے۔

۵۔ آبلے کو گوہرِ روشن اور جادۂ صحرا کو رشتۂ گوہر سے تشبیہہ دی ہے کہتے
ہیں میرے پاؤں کے چھالوں کے اثر سے صحرائے جنوں کا جادۂ رشتۂ گوہر کی
طرح چمک رہا ہے۔ اور وہ رشتۂ گوہر چراغاں کا سماں پیش کرتا ہے مطلب یہ
ہے۔ کہ میرے آبلوں میں سے جادۂ صحرا پر برابر خون کے قطرے ٹپکتے چلے
گئے ہیں۔ اور وہ چراغوں کی طرح روشن ہیں۔

آسی نے دوسرا مفہوم یہ لکھا ہے میرے آبلے ایسے پُر سوز ہیں کہ جن کے
نقشِ پا تک جل کر چراغاں کا منظر دکھا رہے ہیں۔

۶۔ تمہید کے لغوی معنی بچھانے کے ہیں۔ اور بچھانا بستر کے مناسبات
میں سے ہے۔ تمہید کے اصطلاحی معنی ہیں" کسی کام سے پہلے ایسی باتیں
کہنا جن پر کام موقوف ہو" اور یہی مصنف کا مقصود ہے۔ یعنی بیخودی حصولِ
فراغت کی تمہید یا دیباچہ ہے۔ فراغت کے لغوی معنی خالی ہونے کے ہیں
اور یہ بھی معنے کے مناسبات میں ہے۔ اصطلاح میں راحت کے معنی "پر" ہیں
اور یہی معنی یہاں مراد ہیں "ہوجو" ہوجیو کا مخفف ہے۔ کہتے ہیں خدا کرے میری
بے خودی کو بسترِ تمہید فراغت نبنا نصیب ہو۔ کیونکہ اس کی بدولت

میرا شبستان (خواب گاہ) مجھ سے اس طرح بھرا ہوا ہے جس طرح سایہ کا شبستان سائے سے پُر ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ میری بے خودی کا بھلا ہو کیونکہ اس کے سبب سے میں اپنی خوابگاہ میں سایہ کی طرح بے حس و حرکت آرام سے پڑا ہوں۔ اور میری خواب گاہ اس سایہ سے بھری بھری یعنی آباد معلوم ہوتی ہے۔ اگر بے خودی نہ ہوتی۔ تو میں خدا جانے کہاں کہاں آوارہ اور ویران پھرتا۔ اور ادھر میری خواب گاہ میرے نہ ہونے سے بالکل ویران ہو جاتی

۷۔ گردن مارنا.... سر کاٹنا۔ گلِ شمع .... شمع کا گل۔ اگر شمع کا گل کاٹ دیا جائے۔ تو اس کے اجزاء بکھر جاتے ہیں۔ اور گل کاٹنے سے شمع کا شعلہ زیادہ روشن ہو جاتا ہے۔ گلِ شمع شعلۂ شمع کو بھی کہتے ہیں۔ اگر شوقِ دیدار میں تو میرا سر قلم کر دے تو گردن کٹ جانے سے میرا شوقِ دیدار کم نہ ہوگا۔ بلکہ میری نگاہ گلِ شمع کی طرح اور زیادہ روشن ہو جائے گی۔ اگر بکھر جانے کے معنی لیں تو مطلب یہ ہوگا کہ میری نگاہ شوقِ دیدار میں گلِ شمع کی مانند پریشان ہو جائے گی گویا ایک نگاہ کی کئی نگاہیں بن جائیں گی۔

۸۔ شبِ ہجر کے عالمِ بے کسی کی وحشت اس قدر زیادہ ہے۔ کہ میرا سایہ مجھ سے ڈر کر بھاگا ہے۔ اور آفتابِ قیامت کے سایہ میں جا کر چھپ گیا ہے امرِ واقعہ یہ ہے۔ کہ سایہ آفتاب سے بھاگتا ہے لیکن یہاں شاعر نے سورج کی روشنی سے سایہ غائب ہو جانے کو سایہ کا چھپ جانا قرار دیا ہے۔

آسی لکھتے ہیں۔ کہ ہائے شبِ ہجر میں مجھے وحشت ہوتی تھی۔ تو سایہ کیا کیا مجھے ڈرایا کرتا تھا۔ اس کی شرم اور ندامت کی وجہ سے قیامت کے دن خورشیدِ قیامت میں سایہ مجھ سے پوشیدہ ہو رہا ہے۔ اور چھپا چھپا پھرتا ہے۔ یہ معنی قرینِ قیاس نہیں۔

۹۔ صد جلوۂ رنگین.... یعنی جلوۂ حسن۔ دیدۂ حیران.... حیرتِ عشق
جلوۂ حسن کے ساغر کی گردش تیری بدولت ہے اور دیدۂ حیران کی آئینہ داری
میرے سبب سے بقولِ حسرت مطلب یہ ہے کہ جلوۂ حسن کا تعلق تجھ سے
ہے۔ اور حیرتِ عشق کا مجھ سے (سعید و حسرت)

طبا طبائی۔ تیرا جلوۂ رنگین اس محفل میں گردشِ ساغر کا کام کر رہا ہے
اور میرا دیدۂ حیران آئینہ کا، جلوہ کو ساغر اس وجہ سے کہا ہے۔ کہ وہ بھی
مثل ساغر ہوش ربا ہے (آسی، بیخود)

۱۰۔ اے اسد میری نگاہِ گرم سے آگ برستی ہے۔ اور اس آگ سے خس و
خاشاکِ گلستان میں آگ لگی ہوئی ہے۔ یا چراغاں ہو رہا ہے۔ گویا گلستان
میں یہ چراغاں میری نگہ گرم کی بدولت ہے۔

۱۷۶

۱ کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے — نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے
۲ اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے — میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
۳ کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے — کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے
۴ کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے — غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ اگر
۵ ہاتھ آویں تو انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے — اس نزاکت کا برا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا
۶ پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے — کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
۷ تم کو چاہوں کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے — موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رہے
۸ کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے — بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے

۹ عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

۱۔ میں اپنا غمِ دل اس کو سُنا نہیں سکتا۔ کیونکہ وہ ہر بات میں مین میخ نکالنے کا عادی ہے۔ بھلا میری تدبیر وہاں کیا کارگر ہو سکتی ہے جہاں میں کوئی بات نہیں بنا سکتا، بات کا بننا اور بن پڑنا۔ تدبیر نکالنا۔ بات کا بنانا جھوٹی بات بنانا اپنا مطلب حاصل کرنے کے لئے۔

آسی نے دوسرا مفہوم غمِ دل کو نکتہ چین قرار دے کر لکھا ہے یعنی غمِ دل اس لئے نکتہ چینی کرتا ہے کہ تو اس پر مجھے اظہار نہیں کرنا۔ اور ہم سے اس کو اپنا حال رعبِ حسن یا موقعہ نہ ملنے کی وجہ سے سُنایا نہیں جاتا۔ کہتے ہیں غمِ دل تو اپنا مطلب حاصل کرنے کیلئے نکتہ چینی میں مصروف ہے۔ مگر وہاں کی ذِگت کو یہ نہیں جانتا۔ کہ وہاں کوئی بات بنائے تو بن نہیں سکتی۔ پھر بھلا کامیابی کیسے ہو سکتی ہے۔

۲۔ میں اس کو بُلاتا تو ہوں۔ لیکن امید نہیں کہ وہ آئے اجذبۂ دل مدد کا وقت ہے۔ تو اپنے اثر سے اس کو اتنا مجبور کر دے۔ کہ وہ آئے بغیر نہ رہے۔

۳۔ وہ ستانے کو ایک کھیل سمجھتا ہے۔ اس لئے مجھے خوف ہے کہ کہیں وہ ستانا چھوڑ نہ دے۔ اور بھول نہ جائے۔ کاش ایسا ہو۔ کہ اس کو ستائے بغیر چین ہی نہ آئے۔ گویا اس کو ستانے کی عادت ہو جائے۔

۴۔ تو نے رقیب کو خط لکھا ہے اور دوسرے خط کو اس طرح کھلے بندوں لئے پھرتا ہے۔ کہ اگر کوئی اس سے پوچھے۔ کہ یہ کیا ہے۔ تو وہ اس کو چھپا نہیں سکتا بلکہ اس کو مجبوراً بتانا ہی پڑے گا۔ کہ یہ فلاں کا خط ہے گویا تم رقیب کو خط لکھنے سے ایک نہ ایک دن ضرور بدنام ہو جاؤ گے۔ کیونکہ اس کو تمہاری رسوائی کا مطلق خیال نہیں۔

۵۔اس شعر میں نزاکت کی مذمت اور تعریف کی ہے کہتے ہیں۔ وہ بھلے ہیں تو کیا ہوا۔ مگر اس نزاکت کا بُرا ہو کہ ہماری مطلب براری ان سے نہیں ہوسکتی کیونکہ اگر وہ حسنِ اتفاق سے ہاتھ آجائیں۔ تو ہم ان کی نزاکت کی وجہ سے انہیں چھو بھی نہیں سکتے۔

۶۔کون کہہ سکتا ہے۔ کہ یہ کس کی جلوہ گری ہے۔ کیونکہ اس نے عالمِ امکان پر اسباب کا ایسا پردہ ڈالا ہے۔ جس کو کوئی نہیں اٹھا سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ رنگا رنگی اور کثرت کے پردے کو اٹھا کر کوئی کنہ حقیقت دریافت نہیں کر سکتا۔

۷۔حسرت۔ موت کی راہ دیکھنے سے کیا فائدہ۔ کہ وہ تو خواہ نخواہ آئے ہی گی۔ تمہاری خواہش کرنا چاہتے ہیں۔ کہ اگر تم نہ آؤ۔ تو مجھے بلاتے بھی نہ بن پڑے۔

طباطبائی۔ موت کی راہ کیوں نہ دیکھوں۔ کہ وہ آئے بغیر نہ رہے گی۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا کہ تم سے کہوں۔ تم نہ آؤ کہ پھر مجھے بلاتے بھی نہ بن پڑے یعنی اب میں آنے کو منع کروں۔ تو کس منہ سے بلاؤں۔ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ تمہارے نہ آنے سے موت کا آنا بہتر ہے۔

بیخود۔ موت کی میں کیوں راہ دیکھوں۔ اس کا آنا لازمی بات ہے۔ وہ بغیر انتظار کے بھی اپنے وقت معیّن پر آکر رہے گی۔ تم کو چاہوں کہ اگر تم نہ آؤ تو تمہارا بلانا بھی ممکن نہیں۔ مطلب یہ ہے تمہارا بلانا موت کے آنے سے دشوار نظر آتی۔ چار مفہوم لکھتے ہیں۔ اور اس مفہوم کو سب سے بہتر قرار دیا ہے۔ یہ جو شب درد میں موت کا انتظار کرتا ہوں یہ فضولی ہے۔ اس کو چھوڑ دینا چاہیے۔ اور اس کی راہ مجھے نہ دیکھنی چاہیئے۔ کیونکہ وہ تو خواہ نخواہ آئے گی۔ اور اس کے

یقینی ہونے کا اور ضروری آنے کا سبب اور اس کے بلانے کی تدبیر یہ ہے کہ میں یہ چاہوں یعنی اس بات کی خواہش کروں کہ تم نہ آؤ۔ تو اس خواہش کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا۔ کہ تم مجھ سے ناراض ہو جاؤ گے۔ اور پھر میرا منہ نہ پڑیگا۔ کہ میں تم کو بلاؤں اور پھر اس صدمہ سے لازمی مجھے موت آجائے گی۔

سپیدہ۔ یعنی میرے اوپر شب انتظار میں جو کلفت ہے۔ وہ صرف دو صورت سے رفع ہو سکتی ہے۔ یا تم آؤ یا موت۔ لیکن تمہاری کیفیت یہ ہے کہ اگر نہ آؤ۔ تو میں بلا بھی نہیں سکتا۔ اس لئے تمہاری آمد کو کیوں چاہوں اور موت ہی کا راستہ کیوں نہ دیکھوں۔ کہ وہ اس تکلیف میں یقیناً آ کر رہے گی۔

۸۔ میرے سر پر سے وہ بوجھ گرا ہے کہ میں اٹھا نہیں سکتا گویا ایسی مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ کہ کچھ کرتے دھرتے بن نہیں پڑتا مطلب یہ ہے۔ کہ میں ایسی سخت کشمکش میں مبتلا ہوں۔ کہ کچھ بن نہیں پڑتا۔

۹۔ غالب عشق پہ کسی کا زور نہیں۔ یہ وہ آگ ہے۔ کہ نہ لگائے لگ سکتی ہے۔ اور نہ بجھائے بجھ سکتی ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ عشق نہ اپنی خواہش سے پیدا ہوتا ہے۔ اور نہ اپنی خواہش سے ترک کیا جا سکتا ہے۔

۱۷۷

چاک کی خواہش اگر وحشت بہ عریانی کرے ۱ صبح کے مانند زخمِ دل گریبانی کرے
جلوہ کا تیرے وہ عالم ہے گر گر کیجئے خیال ۲ دیدۂ دل کو زیارت گاہِ حیرانی کرے
ہے شکستن سے بھی دل نومید یارب کب تلک ۳ آبگینہ کوہ پر عرضِ گراں جانی کرے
میکدہ گر چشمِ مست ناز سے پائے شکست ۴ موئے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے
خطِ عارض سے لکھا ہے زلف کو الفت نے عہد ۵ یک قلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے

۱۔ اگر عریانی کی حالت میں میری وحشت گریبان چاک کرنے کی خواہش کرے تو صبح کی طرح میرا زخمِ دل گریبان بن کر چاک چاک ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ جب گریبان نہ رہے۔ اور جنون کو گریبان چاک کرنے کی خواہش ہو۔ تو پھر میرے زخمِ دل کا گریبان اس طرح چاک ہو جیسے گریبانِ صبح چاک ہوتا ہے۔

۲۔ تیرے جلوے کا وہ عالم ہے۔ کہ اگر اس کا خیال کریں تو دیدۂ دل حیرت کی زیارت گاہ بن جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ محض تیرے جلوہ کے خیال سے دل کو سخت حیرانی ہوتی ہے۔

۳۔ اب تو شکستگی سے بھی ہمارا دل نا امید ہو گیا۔ حالانکہ معشوق سخت سنگدل ہے۔ لیکن پھر بھی شکستگیٔ دل کی امید اس سے پوری نہیں ہوتی۔ یارب پہاڑ کے سامنے شیشہ کب تک اپنی گراں جانی کا اظہار کرے گا۔ اور کب تک پہاڑ اس کی مشکل کو حل نہ کرے گا۔ معشوق کو کوہ اور دل کو آبگینہ سے تشبیہہ دی ہے۔

۴۔ موئے شیشہ۔۔۔ شیشہ چٹخنے سے اس میں بال پڑ جاتے ہیں۔ مژگانی کرے۔۔۔ پلکیں بن جائے۔ اگر میکدہ معشوق کی مستِ ناز آنکھوں سے شکست پائے۔ تو اس شکست میں ساغر میں جو بال پڑیں گے۔ وہ دیدۂ ساغر کے لیے پلکیں بن جائیں گے۔ اور دیدۂ ساغر چشمِ مستِ یار کو دیکھ کر حیران رہ جائے گا یا شرمندہ ہوگا۔

۵۔ یک قلم منظور ہے یعنی سب منظور ہے۔ قلم کے لفظ میں دوہری رعایت ہے۔ ایک تو رخساروں پر قلمیں ہوتی ہیں۔ دوسرے خط بھی قلم سے لکھا جاتا ہے۔ یار کے رخساروں پر جو خط نمایاں ہوا ہے وہ خط نہیں ہے بلکہ ایک

عہد نامہ ہے جو اُلفت نے زلف کو لکھ کر دیا ہے۔ اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ میرے حق میں پریشانی کو جو کچھ کرنا ہو۔ وہ بخوشی کرے۔ مجھے سب منظور ہے۔

۱۶۸

۱ دے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے	وہ آکے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے
۲ تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے	کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
۳ نہ دے جو بوسہ تو منہ سے کہیں جواب تو دے	دکھا کے جنبشِ لب ہی تمام کر ہم کو
۴ پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے	پلادے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے

۵ اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

۱۔ یہ ممکن ہے۔ کہ وہ خواب میں آئے۔ اور مجھے اضطراب سے تسکین دے لیکن مشکل یہ ہے۔ کہ تپش دل (بیقراری دل) مجھے سونے ہی نہیں دیتی۔

۲۔ لگاوٹ یعنی محبت میں تیرا رو دینا مجھے قتل کیے ڈالتا ہے کیونکہ تیری آنکھوں میں آنسو جھلکنے سے ایسی چمک اور آب پیدا ہوتی ہے۔ کہ کوئی اور معشوق اس طرح اپنی تیغ نگہ کو آب نہیں دے سکتا یہی وجہ ہے کہ تیرا رونا مجھے قتل کیے ڈالتا ہے۔

۳۔ اگر بوسہ نہیں دینے تو نہ دو۔ اپنے منہ سے انکار ہی کر دو۔ ہم تمہاری جنبشِ لب ہی سے تمام ہو جائیں گے پہلے یوں لکھ چکے ہیں سے

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسےٰ نہ ہوا۔

۴۔ اے ساقی اگر تجھے ہم سے نفرت ہے۔ اور تو اپنے پیالے میں ہمیں شراب نہیں پلانا چاہتا۔ تو کچھ مضائقہ نہیں اوک ہی سے پلادے۔ ہمیں تو شراب

چاہیئے۔ پیالے سے غرض نہیں۔

۵۔ اس شعر میں اپنی خوش بختی اور محروم القسمتی دکھائی ہے کہ مجھے ان کے پاؤں دبانے کا موقعہ ملا تو خوشی سے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ گویا پھر بھی حظ وصل سے محروم رہا۔

۱۷۹

۱ مرا سر رنجِ بالیں ہے مراتن بارِ بستر ہے	تپش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے
۲ دلِ بیدست و پا افتادہ برخوردارِ بستر ہے	سرشکِ سر بصحرا دادہ نور العینِ دامن ہے
۳ فروغِ شمعِ بالیں طالعِ بیدارِ بستر ہے	خوشا اقبالِ رنجوری عیادت کو تم آئے ہو
۴ شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے	بطوفاں گاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی
۵ ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے	ابھی آتی ہے بو بالش سے اسکی زلفِ مشکیں کی

کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں غالبؔ
کہ بے تابی سے ہر اک تارِ بستر خارِ بستر ہے

۱۔ میری تپش سے بستر کا ہر ایک تار بے چین ہے۔ میرا سر تکیہ کے لئے باعثِ ایذا اور میرا جسم بستر کے لئے وبال ہے تپش یعنی تڑپ اور حرارت۔

۲۔ سرشک۔۔۔۔ آنسو۔ سر بصحرا دادہ۔۔۔۔ آوارۂ دشت۔ نور العین۔۔۔ آنکھ کا تارا۔ بیدست و پا افتادہ۔۔۔ بیدست و پا پڑا ہوا۔ برخوردار۔۔۔ عزیزِ انس گرفتہ۔ میرا آنسو جو کثرتِ گریہ سے دشت میں آوارہ ہے یعنی بہتے بہتے صحرا میں جا پہنچا ہے۔ وہ میرے دامن کی آنکھ کا تارا ہے گویا میرے دامن کیلئے باعثِ فخر و ناز ہے۔ اور میرا دل جو بستر پر بیدست و پا پڑا ہوا ہے وہ بستر سے غایت درجہ انس رکھتا ہے۔ بالفاظِ دیگر برخوردارِ بستر ہے نور العین اور برخوردار مقابلے کے الفاظ ہیں اور مطلب یہ ہے کہ میرے وہ اشک جو

نور العینِ دامن ہیں بہتے بہتے صحرا میں جا پہنچے ہیں۔ اور میرا دل جو برخوردارِ بستر ہے۔ ایسا بے دست و پا ہوا ہے۔ کہ وہ ہر وقت بستر پر پڑا رہتا ہے۔

آسیؔ۔ نور العین دامن سے صحرا کے دامن کا نور العین مراد لیتے ہیں۔

طباطبائی۔ آنسو دامن کی آنکھ کا تارا ہے۔ اور دل بستر مرض کا مراد دینے والا ہے یعنی آنسو دامن میں رہتا ہے۔ اور دلِ بیمار کو بستر پر پڑا رہنے سے اُنس ہو گیا ہے۔ (بیخود)

سعید۔ مجھ رفتۂ صحرا نوردی کا آنسو دامن کا نور العین ہے اور مجھ عاجز کا دل بستر کا برخوردار ہے یعنی بہ آرزوئے صحرا نوردی میرے ہمیشہ روتے رہنے سے دامن کو آنسوؤں سے اور میری بیچارگی اور عاجزی کی وجہ سے ہمیشہ پڑے رہنے سے بستر کو دل سے غایت النسبت ہو گئی ہے۔ اپنی کثرتِ یاس و محرومی کا اظہار کیا ہے۔

۳۔ رنجوری... بیماری۔ عیادت... بیمار پرسی۔ بالیں.... سرہانہ طالعِ بیدار.... جاگی ہوئی قسمت۔ میری بیماری کا نصیبہ کیسا اچھا ہے کہ تم عیادت کو آئے ہو۔ ورنہ تم کہاں اور ہم کہاں تمہاری تشریف آوری سے میرا طالع بیدار بستر مریض کے لئے شمع بن گیا ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ تمہارے آنے سے میری تقدیر اس شمع کی طرح روشن ہو گئی ہے۔ جو بیمار کے سرہانے جلائی جاتی ہے۔ (آسیؔ)

بیخودؔ۔ تمہارے قدم رنجہ کرنے سے شمع بالیں کی روشنی طالعِ بیدارِ بستر بن گئی ہے۔ سعیدؔ تمہارے آنے سے طالع بیدار بستر رنجوری فروغِ شمع بالیں ہے۔ حسرتؔ۔ تمہارے آنے کی وجہ سے طالعِ بیدارِ بستر فروغِ شمع بالیں ہے یعنی طالع بیدار کی درخشندگی شمعِ بالیں کی روشنی سے بھی بڑھ گئی ہے

۴۔شامِ فراق جوشِ اضطراب کی وجہ سے ایک طوفان گاہ بن گئی ہے اور اس طوفانِ اضطراب اور تاریکیٔ شب فراق کی وجہ سے ہر تارِ بستر شعاعِ آفتاب قیامت بنا ہوا ہے۔قیامت کے دن سورج سوا نیزے پر آجائیگا اور اس کی شعاعیں ناقابلِ برداشت ہوں گی۔

طبا طبائی لکھتے ہیں۔کہ پہلے مصرعہ میں پے در پے چار اضافتیں بے لطفی پیدا کرتی ہیں۔آسی لکھتے ہیں۔چونکہ یہ ثقالت پیدا نہیں کرتیں۔اس لئے ان پر اعتراض کرنا درست نہیں۔

۵۔بالش۔۔۔تکیہ۔عارِ بستر۔۔۔بستر کے لئے باعثِ ننگ و عار ابھی میرے تکیے میں سے معشوق کی زلفِ مشکیں کی خوشبو آرہی ہے گویا شبِ وصل کو گذرے ہوئے کچھ زیادہ زمانہ نہیں گزرا۔زلیخا کی طرح یوسف سے محض خواب میں ہمخوابہ ہونا ہماری دید اور بستر کے لئے باعثِ ننگ و عار ہے مطلب یہ ہے ہم عالمِ خواب میں وصل حاصل کرنا موجبِ عار خیال کرتے ہیں۔

۶۔غالب میں کیا بیان کروں۔کہ ہجر یار میں میرے دل کی کیا حالت ہے بس یہ سمجھ لو۔کہ میرے بستر کا ہر ایک تار کانٹا بنا ہوا ہے۔گویا میں بستر پر نہیں لیٹتا۔کانٹوں پر لوٹتا ہوں۔

بیخود۔آخری مصرعہ کی یہ توجیہ کرتے ہیں۔کہ تڑپتے تڑپتے میرے بستر میں اس قدر سلوٹیں پڑ گئی ہیں۔کہ ایک ایک تارِ بستر چبھ جانے کے لئے خارِ بستر بن گیا ہے۔

۱۸۰

خطر ہے رشتۂ الفت رگِ گردن نہ ہو جائے ۔ ۱ غرورِ دوستی آفت ہے تو دشمن نہ ہو جائے

۲ سمجھ اس فصل میں کوتاہیٔ نشو و نما غالب
اگر گل سرو کے قامت پہ پیراہن نہ ہو جائے

۱- رگِ گردن...... مراد غرور۔ رگِ گردن کبر و غرور کی حالت میں پھول جاتی ہے۔ کہتے ہیں مجھے خطرہ ہے کہ میرا رشتۂ الفت کہیں رگِ گردن نہ ہو جائے۔ گویا کہیں میں تیری دوستی پر غرور نہ کرنے لگوں اور تجھے اس غرور پر غصہ نہ آئے کہ میں یہ اور میری دوستی پر غرور کرتا ہے۔ غرض مجھے خوف ہے کہ مبادا اس بنا پر تو مجھ سے بگڑ بیٹھے اور میرا دشمن ہو جائے۔ (آسی)

باقی شارحین نے یہ شرح لکھی ہے۔ کہ "معشوق کو میری دوستی اور رشتۂ محبت پر غضب کا غرور ہوا ہے۔ اس سے مجھے یہ خطرہ ہو گیا ہے کہیں یہ دوستی دشمنی سے نہ بدل جائے۔ کیونکہ غرورِ دوستی آفت ہے"۔ اس شرح میں خرابی یہ ہے کہ معشوق کو عاشق کی دوستی پر کبھی غرور نہیں ہوتا۔

سعید نے دوسرا مفہوم یہ لکھا ہے۔ رشتۂ الفت رگِ گردن کی طرح کٹ نہ جائے۔ کیونکہ دوستی کا گھمنڈ بڑا فتنہ ہے جس سے اندیشہ ہے کہ تو دشمن ہو جائے گا۔ اور اس کے باعث رشتۂ الفت منقطع ہو جائیگا۔

۲- اگر اس فصلِ بہاری میں اس قدر زیادہ پھول نہ ہوں جو سرو کے قامت کو ڈھانک لیں۔ تو سمجھ لیں۔ کہ بہار کی قوت نشو و نما میں کمی ہے گویا اگر یہ کمی نہ ہوتی۔ تو اسقدر پھول ہوتے۔ کہ سرو کے قامت پر پھولوں کا پیراہن چڑھ جاتا۔

آسی: فصلِ بہار میں سبزہ کی نشو و نما کی یہ شان ہونا چاہیئے کہ سرو جس پر پھول نہیں آتے اس پر بھی پھول آجائیں۔ اور اس قدر آئیں۔ کہ پیراہنِ سرو ہو جائیں۔

۱۸۱

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے ۱ نالہ پابندِ نَے نہیں ہے

کیوں بوتے ہیں باغبان تونبے ۲ گر باغ گدائے مے نہیں ہے

ہر چند ہر ایک شے میں تو ہے ۳ پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

ہاں کھائیو مت فریب ہستی ۴ ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے
شادی سے گزر کہ غم نہ ہووے ۵ اُردی جو نہ ہو تو دے نہیں ہے
کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد ۶ مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے
۷ ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالبؔ
آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

۱۔ فریاد کرنے کے لئے کسی لے کی ضرورت نہیں ہے جس طرح کوئی چاہے فریاد کرے۔ دیکھو نالہ نے کا پابند نہیں یعنی اسے تصنع سے کچھ لگاؤ نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو بات دل سے نکلتی ہے۔ اُس میں اثر ہوتا ہے اور تصنع میں یہ بات نہیں۔

۲۔ تونبوں سے کشکول گدائی اور کدو سے شراب بنایا جاتا ہے کہتے ہیں۔ اگر باغ شراب کی گدائی نہیں کرتا۔ تو پھر باغبان باغوں میں تونبے کیوں بوتے ہیں مطلب یہ ہے۔ کہ ان تونبوں سے باغ ضرور شراب کی بھیک مانگتا ہے۔ ورنہ باغبان ہرگز تونبے نہ بوتے۔

۳۔ یہ شعر تصوف میں ہے کہتے ہیں۔ باوجود اس کے ہر شے میں تو جلوہ گر ہے۔ مگر تیرے مانند کوئی شے عالمِ جسمانی میں نہیں یعنی تیری ذات "باہمہ اور بے ہمہ" کے مصداق ہے۔

۴۔ دیکھنا۔ خبردار۔ تم ہستی کا فریب نہ کھانا۔ ہر چند سب کہیں کہ "ہے"۔ لیکن تم یہی سمجھنا کہ نہیں ہے۔
فریب ہستی میں پھنس کر انسان طلسم اوہام میں گرفتار اور جلوۂ حقیقت سے محروم رہ جاتا ہے۔

۵۔ اردی ... ماہ بہار۔ دے ... ماہ خزاں۔ اگر غم سے محفوظ رہنا

چاہتا ہے۔ تو خوشی کو ترک کر دے۔ پھر تجھے کبھی غم نہ ہوگا۔ کیونکہ تیرے لئے خوشی اور غم برابر ہو جائے گا۔ اس کی مثال یہ دیتے ہیں۔ کہ اگر بہار کا موسم نہ ہو تو خزاں بھی نہ ہو۔ گویا ایک سی حالت رہے۔

۶۔ حاصلِ مگس کی قے، یعنی شہد۔ زاہد جو شہد پینے کو ثواب جانتا ہے اور شراب سے نفرت کرتا ہے۔ شاعر اس کو شراب پینے کی ترغیب دیتا ہے اور یہ جتاتا ہے۔ کہ نفرت کی چیز شراب نہیں ہے۔ بلکہ وہ چیز ہے جو مگس کی قے کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔

۷۔ ردیف غزل میں "نہیں ہے، نہیں ہے"۔ بار بار آیا ہے۔ ردیف کو ایک نئے ڈھنگ سے صرف کرنے کے لئے غالب نے از راہ شوخی اپنا نام ہی "نہیں ہے" رکھ لیا ہے۔ چنانچہ دریافت کرتے ہیں۔ کہ جب ہستی کے متعلق تمہارا یہ خیال ہے۔ کہ "وہ نہیں ہے" اور عدم کے بارے میں تمہارا یہ قول ہے کہ "وہ نہیں ہے" تو اے "نہیں ہے"۔ یہ تو بتلایئے کہ آپ ہیں کیا؟

۱۸۲

نہ پوچھ نسخہ مرہم جراحتِ دل کا ۱ کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے
۲ بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

۱۔ جراحت۔۔۔ زخم۔ مجھ سے زخم دل کے مرہم کا نسخہ نہ پوچھ۔ کیونکہ اس میں سب سے زیادہ جُز ریزہ الماس کا ہے۔ ریزہ الماس سے زخم اور بھی زیادہ بڑھتا ہے۔ کیونکہ وہ زخم کو بُری طرح سے کاٹتا ہے۔ بقول حسرتؔ، ریزۂ الماس کو زخمِ دل کا مرہم کہہ کر اپنی ایذا دوستی کا اظہار کیا ہے۔

۲۔ بہت دنوں میں تغافل نے تجھ میں یہ بات پیدا کی کہ کبھی کبھی تو ایک اچٹتی

ہوئی نگہ ہم پر ڈال لیتا ہے۔ یعنی پہلے تغافل نادانستہ تھا کیونکہ تو ہمیں جانتا نہ تھا لیکن اب تغافل دانستہ ہے جس کو درحقیقت التفات معشوقانہ کہنا چاہیئے۔ اگرچہ بظاہر ہم اس کو ایسا نہیں کہہ سکتے۔ اس میں لطیفہ یہ بھی ہے کہ "نگہ" "نگاہ" سے بقدر ایک الف کم ہے۔

۱۸۳

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے ۱ مرتے ہیں ولے ان کی تمنا نہیں کرتے

درپردہ انہیں غیر سے ہے ربطِ نہانی ۲ ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردا نہیں کرتے

۳ یہ باعثِ نومیدیٔ اربابِ ہوس ہے
غالبؔ کو بُرا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

۱۔ ہمارا رشک اس قدر بڑھا ہے۔ کہ ہم اپنے رشک کو بھی گوارا نہیں کرتے۔ حالانکہ مرے جاتے ہیں۔ مگر اس کی تمنا نہیں کرتے۔ کہ تمنا کریں گے۔ تو اپنے پر رشک آئیگا۔ جو ہمیں کسی طرح گوارا نہیں۔ اسی مضمون کو اسطرح بھی لکھا ہے

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے ہم اسے دیکھیں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

۲۔ درپردہ۔۔۔ پوشیدہ طور پر۔ ربطِ نہانی۔۔۔ پوشیدہ تعلق۔ شاعر بطور شکایت کہتا ہے کہ وہ جو غیر سے بے تکلفانہ ملتے ہیں۔ اس میں ایک بھید ہے اور وہ یہ ہے کہ لوگوں کو معلوم نہ ہو سکے۔ کہ ان کے رقیب کے ساتھ خاص الخاص تعلقات ہیں۔ گویا ان کا غیر سے پردہ کرنا ایک قسم کا پردہ ہے جس کی وجہ سے ان کے وہ تعلقات پوشیدہ رہتے ہیں جن کو شاعر ربطِ نہانی کے الفاظ سے تعبیر کرتا ہے۔ اس مضمون کو یوں بھی ادا کیا ہے ؎

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیئے

۳۔ غالبؔ تمہارا عاشق صادق ہے۔ اور تم اس کو بُرا کہتے ہو۔ یہ اچھا

نہیں کرتے۔ کیونکہ اس طرح سے ارباب ہوس (رقیب) نا امید ہو جائینگے یہ سوچ کر جب تم غالب جیسے عاشق صادق کو برا کہتے ہو۔ تو ان کا کیا حشر ہوگا جن کا عشق محض ہوس پر مبنی ہے۔

۱۸۴

۱ کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ — خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچیں ہے

۲ کبھی تو اس دلِ شوریدہ کی بھی داد ملے — کہ ایک عمر سے حسرت پرستِ بالیں ہے

۳ بجا ہے گر نہ سنے نالہ ہائے بلبلِ زار — کہ گوشِ گل نمِ شبنم سے پنبہ آگیں ہے

۴ اسد ہے نزع میں چل بیوفا برائے خدا — مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکیں ہے

۱۔ کسب ...... حاصل کرنا خطِ پیالہ کو نگاہِ گل چیں سے مشابہ کیا ہے شراب تیرے سرخ سرخ ہونٹوں سے رنگ فروغ حاصل کرتی ہے۔ اور جام پر جو خط پڑے ہوئے ہیں۔ وہ سراسر نگاہ گل چیں ہیں جو تیرے پھول جیسے ہونٹوں کی گلچینی کر رہے ہیں۔ یا کسب رنگ سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

۲۔ دیوانے کو نیند نہیں آتی۔ تمام رات بے قراری اور وحشت میں بیٹھے بیٹھے گزر جاتی ہے کہتے ہیں کبھی تو اس دل شوریدہ کی بھی داد ملے کیونکہ یہ ایک عرصہ دراز سے تکیہ پر سر رکھنے کی حسرت میں مبتلا ہے بقول بیخود۔ مطلب یہ ہے کہ دل میں سودائے عشق میں کمی ہو کر سر تکیہ سے آشنا ہو جائیگا اور نیند بھی آجائے گی۔

آسی کبھی تو میرے دل شوریدہ پر رحم کر۔ ایک مدت سے کم طاقتی کی وجہ سے بالیں پر پڑا رہتا ہے۔ اور اپنی حسرت شوریدگی یعنی دیوانگی اور بیابان

گردی کو دبا دبا کر رکھتا ہے۔ تو کم از کم کبھی تو ایسا کر کہ اس میں یہ طاقت آ جائے کہ اپنی حسرتوں کو پورا کر سکے۔ اور اپنی صفتِ شوریدگی سے متصف ہو۔

طباطبائی۔ ایک عمر سے حسرت پرست بالیں ہونا دو معنی رکھتا ہے ایک تو یہ کہ مدت سے بالیں پر سر رکھنے کی حسرت ہے۔ دوسرے یہ کہ ایسی ناتوانی ہے۔ کہ بالیں سے سر نہیں اٹھ سکتا۔ اور اس صورت میں عجب نہیں۔ کہ دِل کا لفظ غلط کتابت ہو۔ اور مصنّف نے سر شوریدہ کہا ہو۔ مگر معنی شعر ہر طرح سے ظاہر ہیں۔

۳۔ نم شبنم کو اس کی سفیدی کی وجہ سے پنبہ کہا ہے کہتے ہیں۔ اگر گوش گل نالہ ہائے بلبل زار نہ سُنے تو بجا ہے۔ کیونکہ اس کے کان میں شبنم کا پنبہ ہے۔

۴۔ اسے بے وفا اس وقت اسد حالتِ نزع میں ہے خدا کیلئے چل یہ ایسا وقت ہے۔ کہ تجھے اس وقت تمکین و خودداری اور حجاب و شرم کو ترک کر دینا چاہیئے۔

۱۸۵

کیوں نہ ہو چشم بتاں محوِ تغافل کیوں نہ ہو ۱ یعنی اس بیمار کو نظارے سے پرہیز ہے

مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی ۲ وائے ناکامی کہ اس کافر کا خنجر تیز ہے

۳ عارضِ گل دیکھ روئے یار یاد آیا اسدؔ

جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے

۱۔ معشوقوں کی آنکھ کو شعرا چشمِ بیمار باندھا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں معشوقوں کی آنکھ محوِ تغافل کیوں نہ ہو یعنی اُسے ضرور محوِ تغافل ہونا چاہیئے کیونکہ وہ ایک بیمار ہے۔ اور اس بیمار کو نظارے سے پرہیز بتایا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ تغافل

شعاری اس نے اپنا وطیرہ بنالیا ہے۔ تاکہ یہ پرہیز نہ ٹوٹنے پائے۔

۲- امید تھی۔ کہ جب وہ قتل کریگا۔ تو ہم جی بھر کے اس کو دیکھ لیں گے لیکن ولئے ناکامی کہ اس کافر کا خنجر تیز ہے۔ وہ ہمیں فوراً ہی قتل کر دے گا۔ اور مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی۔ اگر اس کا خنجر کند ہوتا تو گلا کٹتے ہی کٹتے ہم اپنی حسرتِ دیدار نکال لیتے (۳) عارضِ گل اور روئے یار میں بدرجۂ اتم مشابہت ہے کہتے ہیں۔ عارضِ گل کو دیکھ کر مجھے روئے یار یاد آیا۔ اس سے معلوم ہوا۔ کہ فصلِ بہاری کی جوشش دل میں جوشِ اشتیاق برانگیختہ کرتی ہے۔ جوشِ اشتیاق سے مراد جذبۂ عشق و محبت ہے۔

۱۸۶

ہوا رقیب تو ہو نامہ بر ہے کیا کہئے	۱	دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہئے
قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہئے	۲	یہ ضد کہ آج نہ آئے اور آئے بن نہ رہے
اگر نہ کہئے کہ دشمن کا گھر ہے کیا کہئے	۳	رہے ہے یوں گہ و بیگہ کہ کوئے دوست کو اب
کہ بن کہے ہی انہیں سب خبر ہے کیا کہئے	۴	زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب
کہ یہ کہے کہ سرِ رہگذر ہے کیا کہئے	۵	سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال
ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے مگر ہے کیا کہئے	۶	تمہیں نہیں ہے سرِ رشتۂ وفا کا خیال
ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے کیا کہئے	۷	انہیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے کیوں لڑیئے
ستم بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کہئے	۸	حسد سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجئے

۹ کہا ہے کس نے کہ غالب برا نہیں لیکن
سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے کیا کہئے

۱- اگر نامہ بر نے اس کو دل دیا۔ اور وہ اس پر عاشق ہو کر میرا رقیب بن گیا تو میں اسے کیا کہوں وہ بھی میری طرح کا انسان ہے فرشتہ نہیں مطلب یہ ہے کہ

اس کا حسن اس قدر دلفریب ہے۔ کہ ہم نامہ بر کو قصور وار نہیں ٹھہرا سکتے دوسرے وہ ہمارا نامہ بر ہے اور ہمارے اوپر اس کی خدمات نامہ بری کا احسان ہے۔ اس لئے بھی اسے ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ نیز یہ کہ وہ انسان ہے اور انسان سے غلطی ہؤا ہی کرتی ہے۔

۲۔ آج ہمیں موت کی سخت ضرورت ہے تاکہ آلام عشق جو ناقابل برداشت صورت اختیار کر چکے ہیں ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں۔ اور ہماری خلاصی ہو ہمیں معلوم ہے۔ کہ قضا آئے بغیر نہیں رہے گی۔ ایک نہ ایک دن ضرور آئیگی۔ لیکن ضد کی وجہ سے آج نہیں آئے گی۔ قضا کی اس ضد کی وجہ سے ہمیں اس سے جس قدر شکوہ ہے۔ وہ ہم بیان نہیں کر سکتے۔

۳۔ گہ و بیگہ ۔۔۔ وقت بیوقت یعنی ہر وقت ــــ رقیب کوئے دوست میں ہر وقت موجود رہتا ہے۔ وقت بیوقت جس وقت دیکھو وہیں موجود ہے ایسی صورت میں اسے ہم کوئے یار کو دشمن کا گھر نہ کہیں تو کیا کہیں۔

۴۔ کرشمہ ۔۔۔ ناز معشوقانہ ــــ اس کی کرشمہ سازی تعریف سے مستغنی ہے جس کے ذریعہ سے اس نے ہمیں یہ دم دے رکھا ہے۔ کہ ہمیں تیرا حال کہے بغیر ہی معلوم ہے۔ اس فریب میں آکر میں اس سے اپنا حال بھی نہیں کہہ سکتا گویا یہ سمجھتا ہوں۔ کہ جب اسے معلوم ہی ہے تو پھر میں کیا کہوں۔

۵۔ وہ ایسا عیار ہے۔ کہ جان بوجھ کر سر بازار مجھ سے میرا حال پوچھتا ہے تاکہ میں کچھ نہ کہہ سکوں اور یہ سمجھ کر خاموش ہو جاؤں کہ سر راہ گذر ہے کیا کہئے یا بقول سعید ان سے یہ کہہ دوں کہ سر رہ گذر ہے۔ راستہ چل رہا ہے یہاں کیا بیان کروں۔ آسی لکھتے ہیں۔ کہ اس شعر سے مرزا کی وضعداری کے ساتھ ساتھ گذشتہ تہذیب کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ کہ پہلے شرفا بازار میں باتیں کرنا بھی

عیب سمجھتے تھے۔

۶۔ عاشق معشوق سے کہتا ہے۔ کہ تم بیگانہ وفا ہو۔ اور تمہیں سر رشتۂ وفا کا مطلق خیال نہیں، پھر اپنی مٹھی بند کر لیتا ہے۔ اور پوچھتا ہے کہ اچھا اگر یہی بات ہے تو بتاؤ۔ میرے ہاتھ میں کیا ہے۔ حالانکہ پہلے مصرعہ میں اس نے سر رشتۂ وفا کا نام ظاہر کر دیا ہے۔ لیکن معشوق پھر بھی نہیں بتا سکتا مطلب یہ ہے کہ محبوب وفا سے اس درجہ بیگانہ ہے۔ کہ وہ باوجود بتا دینے کے یہ نہیں جانتا کہ ہمارے ہاتھ میں سر رشتۂ وفا ہے (تمام متفق)

آسی۔ اِن معنوں کے متعلق لکھتے ہیں۔ کہ یہ تاویل ہے۔ جو طبع سلیم پر گراں گذرتی ہے۔ صاف صاف معنی یہ ہیں کہ تم وہ تغافل شعار جفاکار ہو کہ تمہیں سر رشتۂ وفا کا ذرا بھی خیال نہیں اور تم اس کو چھوڑ چکے البتہ یہ سر رشتہ ہمارے ہاتھ میں ابھی کچھ باقی ہے۔ اگرچہ کچھ کچھ ہے مگر ہے ضرور۔ اب ہم تم سے کیا کہیں۔

۷۔ زعم ... گمان۔ انہیں ہمارے سوال پر جنون کا گمان گزرتا ہے جب وہ ہمیں دیوانہ سمجھتے ہیں۔ تو ہم اُن سے کیا لڑیں۔ لہذا ہم نے ان سے جواب کی امید بھی منقطع کر لی ہے (تمام متفق)

آسی نے دوسرا مفہوم یہ لکھا ہے۔ انہیں ہمارے سوال پر ہمارے جنون کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ کہ ہم دیوانہ وار کہتے ہیں اور ہم کو جواب دینے کی ضرورت نہیں۔

۸۔ کیا کیجے اور کیا کہیے۔ عاجز ہو کے مقام پر بولے جاتے ہیں کہتے ہیں جس شخص میں کمال سخن ہوتا ہے۔ زمانہ اس کے ساتھ حسد کرنے لگتا ہے گویا کمال سخن کی سزا حسد ہے۔ اور جس شخص میں کوئی ہنر ہوتا ہے تو ہنر کے

ملتے ہیں اس پر ستم توڑے جاتے ہیں۔ گویا متاعِ ہنر کی قیمت ستم ٹھہری۔ اس شعر میں شاعر نے زمانے کی ناقدردانی کا اظہار کرتے ہوئے یہ ظاہر کیا ہے کہ زمانہ کا یہ برتاؤ ہمارے ہی ساتھ نہیں بلکہ ہر ہنرمند اور کامل سخن زمانے کے ہاتھوں مصیبتوں میں مبتلا ہے۔

۹۔ یہ کس نے کہا ہے۔ کہ غالبؔ بُرا نہیں۔ دن ضرور بُرا ہے۔ لیکن صرف اتنا ہی کہ وہ دیوانہ ہے۔ اور جو دیوانہ ہو۔ اس کا کہنا ہی کیا۔ یعنی دیوانے کو کچھ کہنا سننا بیکار ہے۔

۱۸۷

دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے ۱ کر گئی وابستۂ تن میری عریانی مجھے
بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں ۲ مرحبا میں، کیا مبارک ہے گرانجانی مجھے
کیوں نہ ہو بے التفاتی اسکی خاطر جمع ہے ۳ جانتا ہے محوِ پرسش ہائے پنہانی مجھے
میرے غمخوانے کی قسمت جب نقش ہونے لگی ۴ لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے
بدگماں ہوتا ہے وہ کافر نہ ہوتا کاش کے ۵ اس قدر ذوقِ نوائے مرغِ بستانی مجھے
وائے واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا ۶ لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے
وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے ۷ تمنے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے
ہاں نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری واہ واہ ۸ پھر ہُوا ہے تازہ سودائے غزلخوانی مجھے

دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی
میرزا یوسف ہے غالبؔ یوسفِ ثانی مجھے

۱۔ دامن افشانی ۔۔۔ ترکِ لباس۔ مراد ترکِ تعلق دنیا۔ جب میری عریانی نے یہ دیکھا۔ کہ میں در پردہ ترکِ لباس کر کے عریاں یعنی آزاد ہونا چاہتا ہوں تو اس نے مجھے وابستہ تن کر دیا۔ جب میں وابستہ تن ہوا۔ تو مجبور ہو گیا

اب میں جسم کی قید کو کسی طرح دور نہیں کر سکتا تھا۔ مطلب یہ ہے ترکِ تعلقاتِ دنیا کو کسی طرح ممکن نہیں۔ میں سمجھتا تھا۔ کہ ترکِ لباس کر کے میں تعلقِ لباس سے آزاد ہو جاؤں گا۔ لیکن ترکِ لباس کرنے کے باوجود جسم کی پابندی باقی رہی۔ اور حقیقی آزادی جس کا میں خواہشمند تھا پھر بھی حاصل نہ ہو سکی۔

۲۔ سنگِ فساں ...... وہ پتھر جس پر تلوار کی سان رکھی جاتی ہے گرانجانی ... سخت جانی۔ میں اپنی سخت جانی کی بدولت تیغ نگاہِ یار کا سنگِ فساں بن گیا۔ اب ہر وقت وہ مجھ پر تیغ نظر کو تیز کرتا ہے۔ آفریں ہے تجھ پر اے گرانجانی تو میرے لئے کس قدر مبارک ثابت ہوئی ہے۔

طباطبائی لکھتے ہیں کہ دوسرا مصرعہ بطور طعن کہا ہے۔ ممکن ہے شاعر نے اس واقعہ پر اظہارِ مسرت کیا ہو۔ کیونکہ عاشقوں کو تکلیف مرغوب ہوتی ہے۔

۳۔ پرسشہائے پنہانی ...... بقول سعید وہ پرسش جو در پردہ کی جائے باقی شارحین متفق ہیں کہ اس سے مراد وہ پرسش ہے۔ جو خواب و خیال میں کی جاتی ہے۔ کہتے ہیں۔ اس طرف سے بے التفاتی کیوں نہ ہو۔ اسکی خاطر جمع ہے۔ کہ میں پرسشہائے پنہانی میں محو ہوں۔ اس لئے اسکی بے اعتنائی مجھ کو ناگوار معلوم نہ ہوگی۔

۴۔ جب کاتب تقدیر نے میرے غم خانہ کی قسمت لکھی تو منجملہ اسبابِ ویرانی کے میری ذات کو بھی اپنے گھر کی ویرانی کا ایک سبب قرار دیا۔ مطلب یہ ہوا کہ میں خود ہی خانہ ویرانی کا سبب ہوں۔ یا بقول حسرت اسباب کے بجائے مجھ کو اسبابِ ویرانی ملا۔

۵۔ مجھے نوائے مرغِ بستانی سننے کا بہت شوق ہے۔ کیونکہ مرغِ بستاں

میرا اہم پیشہ ہے۔ لیکن معشوق میرے اس شوق کو دیکھ کر مجھ سے بدگمان ہوتا ہے۔ کہتے ہیں۔ کاش کے مجھے یہ شوق نہ ہوتا۔ پھر معشوق بھی مجھ سے بدگمان نہ ہوتا۔

۶۔ میرا خیال تھا۔ کہ قبر میں میرے جسم و جان کو آرام ملے گا۔ اس لیے میں نے گور میں جانا یعنی مرنا پسند کیا تھا۔ لیکن افسوس کہ شورِ محشر نے مجھے وہاں بھی آرام کا سانس نہ لینے دیا۔

۷۔ آپ نے وعدہ کیا تھا۔ کہ میں تیرے گھر آؤں گا۔ میں جب سے آپ کے انتظار میں دروازہ پر کھڑا ہوں۔ نہ کہیں آ سکتا ہوں نہ جا سکتا ہوں۔ یہ کیا انداز ہے۔ کہ آپ نے مجھے میرے ہی گھر کا دربان مقرر کر دیا ہے۔ مہربانی فرما کر وعدہ وفا کیجیے۔ اور مجھے اس تکلیف انتظار اور فرض دربانی سے نجات دیجیے۔ بقول حالی وفائے وعدہ کے انتظار میں گھر سے کہیں نہ جانے کو اس طرح بیان کرنا۔ کہ تم نے میرے گھر کی دربانی مجھے سونپ دی ہے۔ بالکل نیا پیرایہ بیان ہے۔

۸۔ ہاں اے آمدِ فصلِ بہاری کی مسرت سبحان اللہ۔ میں بالکل مردہ ہو گیا تھا اور سودائے غزلخوانی کو بالکل بھول بیٹھا تھا۔ لیکن تیری آمد آمد سے پھر سودائے غزلخوانی میرے دل میں تازہ ہو گیا ہے۔

۹۔ میرزا یوسف علی خاں غالب کے بھائی تھے۔ وہ تیس برس تک دیوانے رہے۔ غالب کو ان سے بہت محبت تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ صحت یاب ہوئے ہیں۔ از راہ محبت بہ مسرت اس شعر میں ظاہر ہو گئی ہے۔ کہتے ہیں خداوند تعالے نے میرے بھائی یوسف علی خاں کو از سر نو زندگی عنایت فرمائی۔ میرزا یوسف میرے لئے دوسرے یوسف ہیں۔ کیونکہ خدا نے ان کی جان بچائی ہے یا یہ کہ میری نظر میں ایسے ہی ہیں۔ جیسے حضرت یوسف تھے۔

یاد ہے شادی میں بھی ہنگامہ یارب مجھے ۱ سبحۂ زاہد ہوا ہے خندہ زیر لب مجھے

ہے کشادِ خاطرِ وابستہ دررہن سخن ۲ تھا طلسم قفل ابجد خانہ مکتب مجھے

یارب اس آشفتگی کی داد کس سے چاہیئے ۳ رشک آسائش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

طبع ہے مشتاقِ لذتہائے حسرت کیا کروں ۴ آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

۵ دل لگا کر آپ بھی غالبؔ مجھی سے ہو گئے
عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

ا۔ آسی۔ عالم خوشی میں بھی بار بار یارب پکار اٹھتا ہوں گویا میرا ہنسنا میرے لئے تسبیح زاہد کا کام دے رہا ہے کہ ہنستا ہوں اور یارب کہتا ہوں قاعدہ ہے کہ شادی ہو یا غم ہو بحالت دل کے اندر ایک کیفیت سی پیدا ہوتی ہے اور آدمی کی زبان سے بے ساختہ یا اللہ یارب وغیرہ ایسے الفاظ نکل جاتے ہیں۔ اور اسی سے مصنف کی یہاں مراد ہے۔ خندہ زیر لب سے مراد وہ خندہ ہے۔ کہ از دیاد غم میں انسان مسکراتا ہے۔ اور ساتھ ہی ایسے الفاظ کہہ اٹھتا ہے ارے میرے اللہ مارے میرے مالک اسی کو مصنف مراد لیتا ہے۔ کہ لبظاہر خوشی کی صورت ہے لیکن یہ ہنسی تسبیح زاہد ہے جس سے مجھ کو بس خدا ہی یاد آ رہا ہے۔ فارسی میں اسی خیال کی دوسرے الفاظ پر بنا رکھی ہے۔

مبادا ہیچ مارسبحہ از ہم بگسلد غالبؔ نفس ہا ایں ضعیفی بر نتابد شور یاربہا

طبا طبائی۔ یارب کے معنی فارسی محاورہ میں خدا کی دہائی ہے اور سبحۂ زاہد سے وہ ذکر خفی مراد ہے جو چپکے چپکے ہونٹوں میں کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ شادی میں مجھے شور یارب نہیں بھولا ہے۔ میرا خندۂ زیر لب گویا زاہد کا ذکر خفی ہے دیکھو د۔ سعیدا

حسرت۔ جس طرح دانہ ہائے تسبیح سے صورت خنداں نمایاں ہوتی ہے

لیکن اِن پر ذکر یارب ہوتا ہے۔ اسی طرح مجھے شادی میں بھی ہنگامۂ زیادیا
رہتا ہے یارب کے لفظ میں ابہام ہے (سعید)

۲۔ قفلِ ابجد۔۔۔۔ یہ ایک قسم کا قفل ہے، اس میں بہت سی پھرکیاں ہوتی ہیں
جن پر مختلف حروف کندہ ہوتے ہیں۔ قفل کو کھولنے کے لئے صناع ایک لفظ
مقرر کر دیتا ہے۔ اِن حروف کو جوڑ کر اس لفظ کو بناتے ہیں۔ بس جونہی یہ لفظ ترتیب
پاتا ہے قفل کھل جاتا ہے کہتے ہیں طلسم قفل ابجد میرے لئے ایک مکتب خانہ
تھا میں نے اس مکتب میں یہ سبق پڑھا ہے۔ کہ جس طرح سے قفل ابجد کا کھلنا
لفظ مقررہ کے مرتب ہونے پر مبنی ہے۔ (یعنی رہین سخن ہے) اسی طرح سے
میری خاطر دالبستہ کا کھلنا رہین سخن ہے گویا میری گرفتہ خاطری اور
انقباضِ طبع کا علاج شغلِ شعر و سخن ہے (تمام متفق) آسی نے مکتب کے
لغوی معنی مراد لئے ہیں یعنی وہ مقام جس جگہ بیٹھ کر لکھیں۔ کہتے ہیں میری
خوشیٔ دل فکرِ شعر پر منحصر ہے۔ خانہ مکتب یعنی جہاں بیٹھ کر میں لکھتا ہوں
طلسم قفلِ ابجد کا حکم رکھتا ہے۔ کہ جیسے ادہر اس کے حروفِ معینہ کو ملا کیا
اور ادھر وہ کھلا۔ ایسے ہی ادھر میں اپنے لکھنے کی جگہ پر بیٹھا۔ اِدھر میری
طبیعت کو کشادگی حاصل ہوئی۔ اور شعر کہنے شروع کئے۔ ظاہر ہے یہ معنی
تاویلی ہیں۔ اصلی مطلب وہی ہے۔ جو میں نے لکھا ہے۔

۳۔ زندانی۔۔۔۔ قیدی۔ یارب میں اس جنون کی داد کس سے طلب کروں
کہ جب میں زنداں میں تھا۔ تو صحرا نوردی کو اچھا جانتا تھا۔ اور اب جبکہ صحرا
میں ہوں۔ تو اہلِ زنداں کی آسائش و آرام پر مجھے رشک آتا ہے

۴۔ میں کیا کروں۔ میری طبیعت حسرتوں کی لذات کی مشتاق ہے۔ اسی
لئے ہر آرزو سے میرا مطلب شکستِ آرزو ہوتا ہے۔ کیونکہ شکستِ آرزو میں

ہے لذت حاصل ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں ہر آرزو اسی نیت سے کرتا ہوں کہ وہ ٹوٹ جائے۔ اور مجھ کو حسرتِ لذت اُٹھانے کا موقع ملے۔

۵۔ بطورِ طعن کہتے ہیں۔ کہ آپ تو ہمیں عشق کرنے سے منع کیا کرتے تھے اب دل لگا کر آپ کی بھی میرے جیسی حالت ہو گئی۔

۱۸۹

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے ۱ چمن میں خوش نوایانِ چمن کی آزمائش ہے

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے ۲ جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

کریں گے کوہکن کے حوصلے کا امتحاں آخر ۳ ہنوز اُس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے

نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی ۴ اُسے یوسف کی بوئے پیرہن کی آزمائش ہے

وہ آیا بزم میں دیکھو نہ کہیو پھر کہ غافل تھے ۵ شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمائش ہے

رہے دل ہی میں تیر اچھا جگر کے پار ہو بہتر ۶ غرض شستِ بتِ ناوک فگن کی آزمائش ہے

نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی ۷ وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

پڑا رہ اے دلِ وابستہ بیتابی سے کیا حاصل ۸ مگر پھر تابِ زلفِ پُر شکن کی آزمائش ہے

رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم تب دیکھیے کیا ہو ۹ ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے

۱۰ وہ آئیں گے مرے گھر وعدہ کیسا دیکھنا غالب
نئے فتنوں میں اب چرخِ کہن کی آزمائش ہے

۱۔ اس طرح پر قلعہ میں ایک مشاعرہ ہوا تھا۔ کہتے ہیں آج بادشاہ کے دربار میں شعرا کی آزمائش ہے گویا بادشاہ کا دربار ایک چمن ہے اور اس چمن میں خوش نوایانِ چمن (شعرا) کا امتحان ہے۔ کہ دیکھیں وہ کس کس انداز سے اپنے اپنے نغمے سناتے ہیں۔

۲۔ قیس ... مجنوں۔ کوہکن ... فرہاد۔ قیس اور فرہاد کی آزمائش تو قد و

گیسو سے لی جاتی ہے لیکن جس مقام عشق پر ہم ہیں وہاں عشاق کی آزمائش دار و رسن سے ہوتی ہے ظاہر ہے کہ ہمارا امتحانِ عشق قیس و فرہاد کے امتحانِ عشق سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔

۳۔ ابھی تو کوہکن کی محض طاقتِ جسمانی کا امتحان ہو رہا ہے کہ اس سے پہاڑ کھود کر نہر نکالنے کو کہا گیا ہے۔ جب طاقتِ جسم کی آزمائش ہو جائیگی تو پھر اس کے حوصلہ کا امتحان لیا جائے گا۔ یعنی ایک بڑھیا کو یہ پیغام دے کر بھیجا جائیگا کہ شیریں مر گئی۔ اس آزمائش میں وہ رہ جائے گا۔ اور سر پر تیشہ مار کر اپنا خاتمہ کرلے گا۔

۴۔ پیر کنعان۔۔۔ حضرت یوسف کے والد حضرت یعقوب۔ نسیم مصر جو حضرت یوسف کے پیراہن کی خوشبو اڑا کر لائی ہے۔ اس کو اس فعل سے حضرت یعقوب کی خیر خواہی مقصود نہیں۔ بلکہ وہ حضرت یوسف کے پیراہن کی خوشبو کا امتحان لینا چاہتی ہے۔ کہ آیا حضرت یعقوب پر اس کا کچھ اثر ہوتا ہے یا نہیں، یا یہ کہ بوئے پیراہن میں کس قدر تاثیر ہے۔

۵۔ دیکھو وہ غارتگرِ صبر و شکیب بزم میں آرہا ہے پھر نہ کہنا کہ میں غافل تھا اور غفلت کی حالت میں وہ متاعِ صبر و شکیب کو لوٹ کر لے گیا ہم یہ پہلے سے بتائے دیتے ہیں کہ وہ اہلِ بزم کے صبر و شکیب کی آزمائش کرنے آرہا ہے۔

۶۔ نشست۔۔۔ نشانہ۔ ناوک فگن۔۔۔ تیر انداز۔ اگر تیر دل میں رہ جائے تو اچھا ہے۔ اور اگر جگر کے پار ہو جائے تو اور بھی زیادہ اچھا ہے۔ غرض ان دونوں صورتوں میں کوئی نہ کوئی صورت ضرور ہونی چاہیئے پھر ہم اس کے نشانہ کے قائل ہو سکتے ہیں۔

۷۔ گیرائی۔۔۔ گرفت۔ تسبیحِ شیخ اور زنار برہمن میں کوئی گیرائی نہیں جس نے ان کو گرفتار کر رکھا ہو۔ بلکہ ان سے شیخ و برہمن کی وفاداری کی آزمائش

مقصود ہے۔ یعنی دیکھنا یہ ہے کہ وہ کب تک اپنی وضع کو نباہتے اور وفادار رہتے ہیں۔

۸۔ اے دلِ وابستہ (قیدی) تو پہلے زلفِ پُر شکن کا امتحان کئی مرتبہ کر چکا ہے۔ اور آزاد نہیں ہو سکا۔ اب تجھے تڑپنے سے کیا حاصل ہو گا۔ اس لئے مناسب یہ ہے کہ تو اسی طرح پڑا رہے گیا تو پھر زلفِ پُر شکن کی طاقت کو آزمانا چاہتا ہے۔

۹۔ جب زہرِ غم ہر رگ و پے میں اُترے گا۔ تو پتہ نہیں کیا ہو گا۔ ابھی تو زہرِ غم میرے کام و دہن تک ہی پہنچا ہے۔ مطلب یہ ہے۔ آغازِ عشق ایسا سخت ہے۔ تو خدا جانے انجام کیسا ہو گا۔

۱۰۔ وہ میرے گھر ہرگز نہیں آئیں گے۔ وعدہ کیسا، اب دیکھنا یہ ہے۔ کہ چرخ کہن ان کے نہ آنے سے ہمیں کس کس نئی مصیبت میں مبتلا کرتا ہے۔ نیا فتنہ سے مراد ان کے آنے کا فتنہ ہے۔ آسی لکھتے ہیں کہ نیا فتنہ اس وجہ سے کہا ہے۔ کہ اول تو وہ وعدہ ہی نہ کرتے تھے۔ اب وعدہ کیا تو وعدہ خلافی کا صدمہ میرے لئے نیا صدمہ ہے۔ دیکھئے کیا ہو گا؟۔

۱۹۰

کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے ۱ جفائیں کرکے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

خدایا جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے ۲ کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

وہ بدخو اور میری داستانِ عشق طولانی ۳ عبارت مختصر قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے

اُدھر وہ بدگمانی ہے اِدھر یہ ناتوانی ہے ۴ نہ پوچھا جائے ہے اس سے نہ بولا جائے ہے مجھ سے

سنبھلنے دے مجھے اے نا اُمیدی کیا قیامت ہے ۵ کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی لیکن ۶ وہ دیکھا جائے کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی ، نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

۸ قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالبؔ
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

۱- اگر کبھی میرے ساتھ نیکی کرنے کا خیال اس کے جی میں آجاتا ہے تو اس بنا پر کہ تمام عمر تو اس پر ظلم کئے ہیں - اب تھوڑی سی نیکی کرنے سے ان کی کیا تلافی ہو سکتی ہے - وہ نیکی نہیں کرتا -

۲- خدایا شاید میرے جذبۂ دل کی تاثیر اُلٹی ہے کہ اس کو میں جس قدر اپنی طرف کھینچتا ہوں - وہ اُلٹا مجھ سے کھچتا ہے یعنی جتنا میں اس کو اپنے قریب لانا چاہتا ہوں - اتنا ہی وہ دُور ہوتا جاتا ہے کھچتا جائے ہے یعنی آزردہ اور کشیدہ خاطر ہوتا جاتا ہے -

۳- وہ سے مراد معشوق - عبارت مختصر یعنی قصہ مختصر - معشوق بدخو اور بدمزاج ہے - اور میرا افسانۂ عشق بہت طولانی ہے - مختصر بات یہ ہے کہ میرا قاصد بھی اُسے سن کر گھبرا جاتا ہے - کہ میں اتنا لمبا افسانہ اس بدخو سے کیسے کہوں گا - اگر کہوں گا تو مفت میں میری شامت آجائے گی -

۴- اُدھر یہ بدگمانی ہے کہ میرے دعوائے محبت کو وہ جھوٹ سمجھتا ہے اور اس بدگمانی کے سبب سے وہ کچھ نہیں پوچھتا - اور اِدھر اس قدر ناتوانی ہے کہ کمزوری کے سبب سے میں بول بھی نہیں سکتا - کہ ان کی بدگمانی کو دُور کردوں - لہٰذا عجیب مصیبت میں مبتلا ہوں کہ یہ غلط فہمی کیسے دُور ہو - بقول طباطبائی شعر میں ترکیب کے تشابہ اور تقابل سے عجب لطف پیدا ہو گیا ہے -

۵- خیالِ یار کا دامن ہاتھ میں تھا لیکن نا امیدی نے ایسا گرایا ہے کہ اب دامانِ خیالِ یار بھی ہاتھ سے چھوٹا جاتا ہے - مطلب یہ ہے کہ اس قدر نا امید

ہوگئے ہیں۔ کہ خیالِ یار بھی دل سے نکلا جاتا ہے۔ اس لئے ناامیدی کو مدد کے لئے پکارتے ہیں۔

۶۔ بیشک اس کو دیکھنے والوں میں میں بھی شامل ہوں لیکن یہ ظلم مجھ سے ہرگز دیکھا نہیں جاتا۔ کہ وہ دیکھا جائے۔ یعنی کوئی اُسے دیکھے۔ مطلب یہ ہے کہ رشک کی وجہ سے نہ اپنا دیکھنا گوارا کرتا ہوں نہ اغیار کا۔ ؎

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے

میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

۷۔ حالی۔ اس میں وجدانی کیفیات کی تمثیل محسوسات کے ساتھ دی گئی ہے مطلب یہ ہے۔ کہ قویٰ جن سے عشق کے ترک کرنے بلا اس کے شدائد پر تحمل کرنیکی قدرت تھی۔ ابتدائے عشق میں انہی کو صدمہ پہنچا بس اب نہ عشق ترک ہو سکتا ہے۔ اور نہ اس پر صبر و تحمل کیا جا سکتا ہے۔

۸۔ مدعی۔۔۔۔ رقیب جس کو بدگمانی کی وجہ سے ہم خدا کے حوالے بھی نہیں کر سکتے۔ یعنی بوقتِ رخصت یہ بھی نہیں کہہ سکتے۔ کہ جاؤ سدھارو تمہیں سپردِ خدا کیا۔ قیامت ہے۔ کہ وہ میرے رقیب کا ہمسفر ہو۔ گویا میں اس کو رقیب کے حوالے کردوں۔

۱۹۱

زبسکہ مشقِ تماشا جنوں علامت ہے ۱ کشاد و بستِ مژہ سیلیِ ندامت ہے

نہ جانوں کیونکہ مٹے داغِ طعنِ بدعہدی ۲ تجھے کہ آئینہ بھی ورطۂ ملامت ہے

بہ پیچ و تابِ ہوس سلکِ عافیت مت توڑ ۳ نگاہِ عجز سرِ رشتۂ سلامت ہے

۴ وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد

جنونِ ساختہ و فصلِ گل قیامت ہے

۱۔ کشاد و بست مژہ... پلکوں کا بار بار کھلنا اور بند ہونا۔ سیلی... طمانچہ تھپڑ۔ تماشا سے مراد تماشائے دنیا یا تماشائے حُسن ــ کہتے ہیں۔ چونکہ تماشائے حُسن کی بہت زیادہ مشق کرنا جنوں کی علامت ہے۔ اس لئے تماشائے حُسن کے وقت پلکوں کا بار بار بند ہونا اور کھلنا طمانچہ ہائے ندامت کا پڑنا ہے۔ جو آنکھوں پر لگائے جا رہے ہیں۔

۲۔ خدا جانے طعنِ بد عہدی کا دھبہ کیونکر مٹے گا۔ تو لاکھ آرائش کرے مگر اس داغِ بد عہدی کی موجودگی میں جب تو آرائش کے لئے آئینہ دیکھتا ہے تو آئینہ تیرے لئے ورطۂ ملامت بن جاتا ہے۔ کیونکہ آرائش غیروں کو دکھلانے کے لئے ہوتی ہے۔ جو عین بد عہدی ہے۔ اس لئے آئینہ کو دیکھ کر تو گردابِ ندامت میں غرق ہو جاتا ہے۔ آئینہ کو ورطہ سے تشبیہہ دی ہے۔

۳۔ ہوس کے پیچ دے دے کر عافیت اور سلامتی کی سلک (لڑی) کو نہ توڑ۔ کیونکہ نگاہِ عجز یعنی ترکِ ہوس سر رشتۂ سلامتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سلامتی اور عافیت عاجزی اور کم ہوسی میں ہے گویا ہوس کے ساتھ سلامتی اور عافیت ممکن نہیں

۴۔ حسرت۔ محبوب اور رقیب کے معاملہ کا ذکر بطور طعن کرتا ہے "بڑا ستم ہے۔ کہ محبوب تو آمادۂ وفا ہو۔ اور دعویٔ عشق جھوٹا ہو۔ یہ تو اسی قسم کی بات ہے۔ کہ بہار تو واقعی آئی ہو۔ لیکن جنون میں بناوٹ ہو"

۱۹۲

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے	۱ میرا ذمہ دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے
کیا تعجب ہے کہ اسکو دیکھ کر آجائے رحم	۲ واں تلک کوئی کسی حیلہ سے پہنچا دے مجھے
منہ نہ دکھلاوے نہ دکھلا پر بہ اندازِ عتاب	۳ کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے
یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں	۴ زلف گر بن جاؤں تو شانے میں الجھا دے مجھے

۱۔ میں عشق میں گھل گھل کر اس قدر لاغر ہو گیا ہوں کہ اگر تو اپنی بزم میں مجھے جگہ دے تو میں اس بات کا ذمہ لیتا ہوں۔ کہ کوئی مجھے دیکھ کر بتلا نہ سکے گا۔ کہ یہ فلاں شخص ہے یا یہ کہ کوئی مجھے دیکھ ہی نہ سکے گا۔ پھر خوف کا ہے کا ہے۔ مجھے اپنی بزم میں جگہ دیجیے۔

۱۹۳

۱ بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے | ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

۲ اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک | اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

۳ جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور | جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے

۴ ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے | گھستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

۵ مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے | تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے

۶ سچ کہتے ہو خود بین و خود آرا ہوں نہ کیوں ہوں | بیٹھا ہے بتِ آئینہ سیما مرے آگے

۷ پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیٔ گفتار | رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

۸ نفرت کا گماں گزرے ہے میں رشک سے گزرا | کیونکر کہوں لو نام نہ ان کا مرے آگے

۹ ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر | کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

۱۰ عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام | مجنوں کو برا کہتی ہے لیلا مرے آگے

۱۱ خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے | آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے

۱۲ ہے موجزن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو | آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

۱۳ گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے | رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

۱۴ ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا
غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

۱۔ بازیچۂ اطفال۔۔۔ بچوں کا کھیل — میری نظروں میں دنیا ایک بچوں کا

کھیل ہے میں یہ سمجھتا ہوں کہ میرے سامنے شب و روز ایک تماشا ہو رہا ہے مطلب یہ ہے۔ کہ میں حادثاتِ دنیا کو بچوں کا کھیل سمجھتا ہوں۔ اور اس کو دیکھ کر خوش ہوتا ہوں۔

۲۔ اورنگ... تخت۔ تختِ سلیمان آسمان پر اڑا کرتا تھا۔ اعجاز مسیح یہ تھا۔ کہ وہ قم کہہ کر مُردوں کو زندہ کر دیتے تھے۔ میں تختِ سلیماں کو ایک کھیل سمجھتا ہوں۔ اور اعجاز مسیحا میرے نزدیک ایک معمولی سی بات ہے بقول طباطبائی۔ دوسرے مصرعہ میں "ایک بات" نے دوہرا لطف پیدا کر دیا ہے مطلب یہ ہے۔ دنیا اور اہل دنیا کا اقبال و کمال میری نظر میں ہیچ ہے۔

۳۔ صورتِ عالم کو محض نام ہی خیال کرتا ہوں۔ یا اس کے آگے کچھ نہیں ہستا اور ہستی اشیاء کو ایک وہم سمجھتا ہوں۔ اور وہم اس کو کہتے ہیں جس کا کوئی وجود نہ ہو حاصل شعر یہ ہے۔ کہ ذات خداوند تعالےٰ کے سوا میں کسی چیز کو موجود نہیں سمجھتا

۴۔ میں صحرانوردی میں اس قدر خاک اڑاتا ہوں۔ کہ صحرا گرد میں چھپ جاتا ہے۔ اور مجھ سے پناہ مانگتا ہے میں آنکھوں سے اس قدر اشک بہاتا ہوں کہ دریا ان کے مقابلے میں اپنے آپ کو ہیچ سمجھتا ہے۔ اور میرے سامنے اظہار عجز کے لئے اپنا ماتھا زمین پر رگڑتا ہے۔

بیخود۔ میں آنکھوں سے اس قدر اشک بہاتا ہوں۔ کہ دریا میرے آگے بہ نکلتا ہے۔ پانی کے زور کو جبیں رگڑنے سے تعبیر کیا ہے طباطبائی نے بھی "دوسرا مفہوم یہی لکھا ہے۔

۵۔ مجھ سے مت پوچھ کہ تیرے پیچھے کیا حال ہے۔ بس یہ سمجھ لے۔ کہ جس طرح تو میرے سامنے حیا اور شوخی سے دل تنگ اور شرمایا ہوا سا بیٹھا رہتا ہے اسی طرح میں تیری جدائی میں بیقرار اور مضطرب رہتا ہوں۔

طباطبائی و آسی کے دوسرا مفہوم یہ نکلا ہے۔ تو اپنی بے اعتنائی یا حُسن کو میری آنکھ سے دیکھ اور اسی پر قیاس کرلے۔ کہ تیری مفارقت میں میرا کیا حال ہوتا ہوگا۔

۶۔ یہ سچ کہتے ہو۔ کہ میں خود بین و خود آرا ہوں۔ بھلا جب تم جیسا آئینہ سیما معشوق میرے سامنے بیٹھا ہو۔ تو پھر میں کیوں نہ خود بین و خود آرا ہوں مطلب یہ ہے کہ تمہارے حُسن نے مجھے مغرور و متکبر بنا دیا ہے۔

کوئی میرے سامنے ساغر اور شیشہ رکھ دے، پھر دیکھے میرے منہ سے کیسے پھول جھڑتے ہیں۔ بقولِ بیخود۔ سُنا گیا ہے۔ کہ میرزا صاحب شام کے وقت شراب پیتے اور رشب کو سرخوشی کے عالم میں عجب پُرلطف باتیں کیا کرتے تھے۔

۸۔ اگر کوئی شخص معشوق کا نام میرے سامنے لیتا ہے تو رشک کی وجہ سے مجھ پر سخت ناگوار گذرتا ہے۔ مشکل یہ آپڑی ہے کہ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اس کا نام میرے سامنے نہ لو کیونکہ ایسا کہنے سے سننے والوں کو یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ مجھے معشوق کے نام سے نفرت ہے۔ لہٰذا میں ایسے رشک سے باز آیا جس سے نفرت کا گمان گذرے۔

۹۔ کلیسا۔۔۔ گرجا۔ میں عجب کشمکش میں مبتلا ہوں۔ ادھر کعبہ ہے اُدھر کلیسا ہے۔ اگر کفر مجھے اپنی طرف کھینچتا ہے۔ تو ایمان مجھے اُدھر جانے سے روکتا ہے۔ بقول طباطبائی۔ کعبہ پیچھے پڑا روکتا ہے۔ کہ اُدھر نہ جا اور سامنے کلیسا کھینچ رہا ہے کہ ادھر چل، بقولِ آسی بے مثل شعر کہا ہے خصوصاً مصرعۂ ثانی، اگر دیوان کے دیوان اس پر سے صدقے کر دیے جائیں تو بجا ہے۔

۱۰۔ عاشق ہونے کی حیثیت سے مجھے معشوقوں کے فریب میں آجانا چاہیئے

تھا۔ لیکن میں ایسا عاشق ہوں جو معشوقوں کے فریب میں نہیں آسکتا ۔ بلکہ الٹا انہی کو فریب دیتا ہوں۔ چنانچہ یہ میری معشوق فریبی کا نتیجہ ہے ۔ کہ لیلی مجنوں کو میرے سامنے بُرا کہتی ہے ۔ گویا مجھے اس سے اچھا جانتی ہے۔

۱۱۔ کہتے ہیں ۔ شب وصل میں سبھی خوش ہوا کرتے ہیں۔ لیکن میری طرح شادی مرگ نہیں ہو جاتے ۔ معلوم ہوتا ہے ۔ کہ شب ہجر میں جو میں اکثر مرجانے کی دعائیں مانگا کرتا تھا۔ وہ شب وصل میں میرے آگے آئیں ۔ (نظم طباطبائی)

آسی کہتے ہیں ۔ کہ شب ہجر میں میں یہ دعائیں مانگا کرتا تھا ۔ یا اللہ اگر مروں تو شب وصل میں مروں ہجر میں ناکام مرنا تو بُرا ہے ۔ لہذا آج شب وصل وہ مراد پوری ہو گئی ۔

طباطبائی ۔ وصل کی خوشی میں مرجانا اور لوگ بھی باندھا کرتے ہیں۔ مگر یہ بات ہی اور ہے ۔ ساری کرامات محاورہ اور زبان کی ہے جس نے مرنے کے مضمون کو زندہ کر دیا ہے ۔ فکر غالب کے کارناموں میں یہ شعر بھی شمار کرنا چاہیئے ۔

۱۲۔ میرے دل میں ایک دریائے خوں موجزن ہے ۔ کاش اسی پر اکتفا ہو گویا دریائے خوں آنکھوں سے بہ کر میری مصیبتوں کا خاتمہ ہو جائے ۔ لیکن ایسا کہاں ہوتا ہے ۔ دیکھئے ابھی میرے آگے کیا کیا آتا ہے اور یہ عشق کیا کیا دکھاتا ہے۔

۱۳۔ آخری وقت آ لگا ہے ۔ ضعف اس قدر ہے کہ ہاتھوں میں بالکل طاقت نہیں رہی وہ حرکت بھی نہیں کر سکتے ۔ کہتے ہیں ۔ اگر ہاتھوں میں قوت نہیں تو کیا ہوا ۔ آنکھوں میں تو دم موجود ہے ۔ شراب و ساغر کو میرے سامنے سے کیوں اٹھاتے ہو اسے میرے سامنے ہی پڑا رہنے دو ۔ تاکہ میں اسے دیکھ کر ہی اپنے دل کو تسکین دوں۔

طباطبائی - یہ شعر بھی مصنف کے چیدہ اشعار میں مشہور ہے۔ مگر تمنا والے شعر کو نہیں پہنچتا حقیقتاً خوب شعر کہا ہے۔ سعید لکھتے ہیں شراب کی مدح کی ہے یعنی شراب ایسی بُری چیز ہے۔ کہ اگر اس کی عادت پڑ جائے۔ تو آخر وقت تک نہیں چھوٹ سکتی۔ یا اپنی کثرتِ شراب نوشی کا اظہار کیا ہے۔

۱۲ - چونکہ غالب میرا ہم پیشہ، ہم مشرب اور ہمراز ہے۔ اس لیے آپ میرے سامنے اس کو بُرا کیوں کہیں۔ ع

غالب کو بُرا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

آسی - آپ اُس کو بُرا کہتے ہیں۔ تو گویا مجھے بُرا کہتے ہیں۔ اسی طرح آپ مجھے بھی بُرا سمجھتے ہوں گے۔

طباطبائی - معلوم ہوتا ہے معشوق کی طرف خطاب کیا ہے اور وہ یہ نہیں جانتا کہ غالب یہی ہے (بیخود)

۱۹۴

کہوں جو حال تو کہتے ہو مدعا کہیے	۱	تمہیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے
نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ ہم ستمگر ہیں	۲	مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیے
وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اُتر جائے	۳	نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے
نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں	۴	وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہیے
جو مدعی بنے اُس کے نہ مدعی بنیے	۵	جو نا سزا کہے اُس کو نہ نا سزا کہیے
کہیں حقیقتِ جانکاہیِ مرض لکھیے	۶	کہیں مصیبتِ ناسازیِ دوا کہیے
کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجے	۷	کبھی حکایتِ صبرِ گریز پا کہیے
رہے نہ جان تو قاتل کو خونبہا دیجے	۸	کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہیے

نہیں نگار کو اُلفت نہ ہو نگار تو ہے ۹ روانیِ روشِ وستیِ ادا کہئے
نہیں بہار کو فرصت نہ ہو بہار تو ہے ۱۰ طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہئے
۱۱ سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالبؔ
خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہئے

۱- جب میں تم سے اپنا حال کہتا ہوں، تو تم ہمیشہ یہی کہتے ہو کہ آخر تمہارا مطلب کیا ہے - اپنا مطلب بیان کرو۔ تم ہی بتاؤ اگر تم ہی اس طرح سے کہو تو پھر بھلا میں کچھ کہنے کی کیسے جرأت کرسکتا ہوں بمطلب یہ ہے کہ تم میرے حال سے اچھی طرح واقف ہو۔ مگر جان جان کر پوچھتے ہو کہ تمہارا مطلب کیا ہے - ایسی صورت میں کیا کہہ سکتا ہوں۔

۲- مجھے آپ کی ہر بات پر "بجا و درست" کہنے کی عادت ہوگئی ہے اس لئے مہربانی کرکے پھر دوبارہ طعن سے یہ نہ کہنا کہ ہم ستمگر ہیں۔ میری زبان سے حسبِ عادت بجا و درست نکل جائے گا۔ میں کہہ بیٹھوں گا کہ ہاں واقعی آپ ستمگر ہیں۔ اور یہ بات آپ کو ناگوار گزریگی۔ کیا عجب ہے کہ یہ سن کر مزاج نازبرہم ہو جائے - اور میری مفت میں شامت آجائے (آسی)

باقی شارحین کا خیال ہے کہ معشوق نے طعن سے کہا تھا کہ ہم ستمگر ہیں اور ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ کہ "بجا و درست" اس پر معشوق کو غصہ آگیا۔ اب یہ اپنی صفائی پیش کرکے کہتے ہیں۔ کہ دیکھنا اب یہ بات طعن سے نہ پوچھنا۔

۳- ہم تسلیم کرتے ہیں۔ کہ نگاہِ یار نشتر ہے اور نشتر کسی کا ہمدرد اور آشنا نہیں ہوتا لیکن جب وہ دل میں اُتر جائے۔ اور دل اس کو قبول کرلے تو پھر نگاہِ ناز کو آشنا اور دوست کہنے میں کیا ہرج ہے۔

۴۔جراحت ..... زخم ۔پیکان کے زخم سے میرے دل کو تسلی اور تسکین نہیں ۔وہ زخم تیغ ہے جو میری دلکشائی اور تسلی خاطر کا باعث ہے لفظ دلکشا میں ایہام ہے۔ زخم تیر دل میں محض ایک رخنہ ڈال دیتا ہے۔ اور زخم تلوار بہت کشادہ ہوتا ہے۔ اس لئے زخم تیغ کو دلکشا کہا ہے۔

۵۔مدعی..... دشمن ۔جو شخص کہ دشمن بن جائے۔ اور دشمنی کرے تو اس کے ساتھ دشمنی نہ کرنی چاہیئے۔ اسی طرح جو شخص بُرا کہے اس کے جواب میں اُس کو بُرا نہیں کہنا چاہیئے۔ اپنی نیکی اپنے ساتھ ہے۔

۶۔ہمارا تو یہ حال ہے۔ کہ کہیں اپنے مرض کی حقیقت جانکاہی لکھتے ہیں۔ کہ مرض نے جان کو گھلا ڈالا ہے۔ اور کہیں دوا کی ناسازی اور ناموافقت کا رونا روتے ہیں۔ کہ کوئی دوا طبیعت کے موافق نہیں آتی۔

۷۔صبر گریز پا..... وہ صبر جو بہت جلد جاتا رہتا ہے کبھی شدائدِ آلام و مصائب کی شکایت کرتے ہیں۔ اور کبھی پیمانۂ صبر کے بار بار چھلک جانے کا دکھڑا روتے ہیں۔

۸۔خوں بہا..... فدیہ، وہ قیمت جو خون کے بدلے ادا کی جاتی ہے اگر جان پاس نہ ہو اور وہ جاتی رہے تو پھر قاتل کو اس کا خوں بہا ادا کیجیے کہ جان نہیں دے سکتے تو یہ حاضر ہے۔ اور اگر زبان کٹ جائے۔ تو خنجر کو مرحبا اور آفرین کہئے (آسی)

باقی شارحین پہلے مصرعہ کی یہ شرح بیان کرتے ہیں۔ اگر جان جاتی رہے۔ تو قاتل کو بخش دیجیے۔"

۹۔نگار..... محبوب۔ اگر محبوب کو محبت نہیں تو کیا ہوا۔ اس سے اس کی شانِ محبوبی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ایسی صورت میں مناسب یہ ہے۔ کہ اس کی اس کوتاہی کو صرفِ نظر کر کے اس کی خوش خرامی اور مستی ادا کی تعریف کریں۔

۱۰۔ اگر بہار کو فرصتِ قیام نہیں تو کیا ہوا۔ آخر وہ بہار تو ہے بس اس صورت میں شادابیٔ چمن اور خوبیٔ ہوا کی تعریف کرنی لازم ہے۔

۱۱۔ سفینہ ...... کشتی۔ اے غالب جبکہ کشتی کنارے ہی پر آ لگی تو اب خدا سے ناخدا کے ظلم و ستم کیا کہوں، وقت گذر گیا غنیمت ہے۔ گذشتہ مصائب کو یاد کر کے مصیبتوں کو تازہ کرنا بیکار ہے۔

بقول طباطبائی لقمان نے چار باتوں پر حکمت و اخلاق کو منحصر کر دیا ہے موت اور خدا کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے۔ اور اگر کسی پر کچھ احسان کیا ہو یا کسی نے کچھ برائی کی ہو تو اسے بھول جانا چاہیئے۔

۱۹۵

۱ رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے — دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے

۲ صرف بہائے مے ہوئے آلاتِ میکشی — تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے

۳ رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم — بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

۴ کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر — پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

۵ پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا — آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

۶ کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ — کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

۷ اس رنگ سے اٹھائی کل اس نے اسدؔ کی نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

۱۔ حالی۔ دھویا جانا ...... بے شرم و بیباک ہونا، پاک ...... آزاد یا شہدا مطلب یہ ہے کہ جب تک آنکھوں سے آنسو نہ نکلے تھے تو اس بات کا پاس اور لحاظ تھا کہ عشق کا راز کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے مگر جب رونا ضبط نہ ہو سکا اور ہر وقت آنسو جاری رہنے لگے تو اخفائے رازِ عشق کا خیال جاتا رہا اور ہم ایسے

بے شرم و بے حجاب ہو گئے۔ کہ آزادوں اور شہدوں کی طرح کھل کھیلے۔ اس مطلب کو ان الفاظ میں ادا کرنا کہ رونے سے ایسے دھوئے گئے کہ بالکل پاک ہو گئے۔ بلاغت اور حسنِ بیان کی انتہا ہے۔

۲۔ ہمارے دو حساب تھے۔ اوّل یہ کہ شراب کی قیمت کہاں سے آئے جو ادا کر کے شراب مہیا کی جائے۔ دوسرے آلاتِ مے کشی کے حساب و شمار کا جھگڑا کہ ان کو کہاں کہاں باندھے پھریں۔ اور کب تک ان کی دیکھ بھال اور جانچ پڑتال کریں۔ سو ان دونوں حسابوں کا جھگڑا اس طرح پاک ہوا کہ ہم آلاتِ میکشی بیچ کر شراب پی گئے۔ بقول طبا طبائی۔ رندوں کا حسن سلیقہ اس سے بڑھ کر ادا کیا ہو سکتا ہے۔ کہ جھگڑوں سے بھی چھوٹے اور شراب بھی مل گئی۔

۳۔ اگرچہ تم آوارگی سے سارے زمانے میں بدنام ہو گئے۔ لیکن اس سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوا۔ کہ تم طبیعت کے چالاک ہو گئے۔ گویا اب تم کسی کے دھوکے میں نہ آؤ گے۔ کیونکہ کافی ٹھوکریں کھا چکے ہو۔

۴۔ نالۂ بلبل کو کون بے اثر کہتا ہے۔ اس کے اثر سے لاکھوں گلوں کے جگر چاک ہو گئے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ پھول کھلتے نہیں بلکہ نالۂ بلبل کے اثر سے ان کے جگر چاک ہوتے ہیں۔

۵۔ اہلِ شوق۔۔۔ اہلِ عشق۔ اہلِ شوق کا وجود و عدم تو کیا پوچھتا ہے وہ تو اپنی آگ (آتش شوق) میں خس و خاشاک کی طرح جل بجھے ہیں۔ اور اب نہ ان کا وجود ہے۔ اور نہ عدم ہے گویا وہ فنا فی الشوق ہو چکے ہیں۔

۶۔ معانی۔ شاہدِ حقیقی کا جو معاملہ غیر عشاق کے ساتھ ہے اس کو تغافل کے ساتھ عشاق کے معاملے کو نگاہ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے جیسا کہ سحابی کہتا ہے ؎

اے زاہد عاشق از تو در نالہ و آہ دور تو و نزدیک ترا حال تباہ

کس نیست کہ جاں از تو سلامت ببرد — ما را بہ تغافل کشتی ایں را بہ نگاہ

پس شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اس تغافل سے تنگ آ کر شکایت کی تھی اور اس کی توجہ کے خواستگار ہوئے تھے۔ جب اس نے توجہ کی تو ایک ہی نگاہ میں ہم کو فنا کر دیا۔

۲۔ کل اس نے اسد کی لاش کچھ ایسے رنگ سے اٹھائی کہ دشمنوں کے دل بھی رشک کی وجہ سے غمناک ہو گئے۔ دوسرا مفہوم تحقیر کا ہے کہ اس نے اس ذلت و تحقیر کے ساتھ اسد کی لاش اٹھائی کہ اسے دیکھ کر دشمنوں کو بھی رنج ہوا۔

۱۹۶

۱ شیشہ مے سرو سبز جوئبار نغمہ ہے — نشہ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مست طرب

۲ واں تو میرے نالے کو بھی اعتبار نغمہ ہے — ہم نشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزم عیش دوست

۱۔ رنگ سے مراد رنگ محفل۔ نغمہ کو باعتبار روانی جوئبار سے تشبیہہ دی ہے، اور شیشۂ مے کو باعتبار سبزی جوئبار نغمہ کا سرو سبز کہا ہے۔ رنگ محفل سے نشہ شاداب و مسرور ہے۔ ساز ہوسیقی نشۂ طرب سے مست ہے اور شیشۂ مے رنگینیٔ شراب سے نغمہ جوئبار کا سرو سبز معلوم ہوتا ہے۔ مصنف نے بہار اور نغمہ اور شراب کی کیفیت دکھائی ہے۔

۲۔ اے ہمنشین مجھے یہ مت کہو کہ نالہ کشی اور آہ و فریاد سے دوست کی محفل عیش کو تو پریشان نہ کر۔ کیونکہ اس کی محفل عیش و نشاط میں جا کر میرا نالہ بھی نغمہ بن جاتا ہے جب میرا نالہ نغمہ بن گیا تو اس سے محفل عیش میں کیسے خلل پڑ سکتا ہے۔ نالہ کے نغمے بننے سے دوسرا مفہوم یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ وہ میرے نالے سن کر مسرور ہوتا ہے پہلے مفہوم کو اس طرح بھی ادا کیا ہے ؎

دُور چشمِ بد تری بزمِ طرب سے واہ وا نغمہ بن جاتا ہے گر نالہ بھی میرا جائے ہے

۱۹۷

عرضِ نازِ شوخیٔ دنداں برائے خندہ ہے ۱ دعویٔ جمعیتِ احباب جائے خندہ ہے

ہے عدم میں غنچہ محوِ حیرتِ انجامِ گل ۲ یک جہاں زانو تامل در قفائے خندہ ہے

کلفتِ افسردگی کو عیشِ بیتابی حرام ۳ ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے

۴ سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

۱- دانتوں کی شوخیٔ ناز کا اظہار ہنسی کے لئے ہُوا کرتا ہے یعنی وہ ہنسی کے وقت اپنی شوخی اور چمک دکھاتے ہیں۔ اور چونکہ دانت ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کو جمعیتِ احباب سے تشبیہہ دی جاتی ہے کہتے ہیں بالکل اسی طرح سے احباب کا دعوے جمعیت جائے خندہ ہے۔ کیونکہ یہ جمعیت بالکل عارضی ہے۔

بیخودؔ لکھتے ہیں کہ جس طرح بڑھاپے میں دانت ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح دوستوں میں بھی جدائی پیدا ہو جایا کرتی ہے۔

۲- عدم میں اس لئے کہ کھلنے کے بعد غنچہ معدوم اور گل پیدا ہو گیا یکجہاں بمعنی فکر و تامل کے وقت انسان سر بزانو ہو جاتا ہے اس ترکیب سے مطلب فکر و تامل بیحد ہوا۔ در قفائے خندہ ... کھل جانے کے بعد۔ غنچہ جب کھل گیا۔ تو معدوم ہو گیا۔ اور گل آموجود ہُوا۔ اب عدم میں غنچہ محوِ حیرت ہے۔ کہ میرا انجام بھی وہی ہو گا۔ جو اور پھولوں کا ہُوا ہے اس لئے وہ کھل جانے کے بعد بہت زیادہ فکر و تردد میں ہے (نظم متفق)

بیخودؔ نے یکجہاں زانو تامل کی شرح میں اختلاف کیا ہے۔ لکھتے ہیں

جس فکر و تامل میں غنچہ مبتلا ہے اس کی مقدار مہلت زانو بدلنے تک کی مدت ہے یعنی فکر اور سوچ کے وقت انسان سر بزانو ہو جاتا ہے۔ اور تھوڑی دیر میں تھک جانے کے بعد زانو بدلتا ہے۔ اور سر کو زانو پر سے اٹھا لیتا ہے گویا اتنی سی دیر میں پھول کو اپنا انجام نظر آ جاتا ہے۔ اور وہ کھل جاتا ہے یا جھڑ جاتا ہے آسی:۔ یعنی ہنوز عدم سے ہستی میں نہیں ظاہر ہوا مگر انجام گل کی ہستی پر مجبور رہا ہے اور وہ غنچہ سوچتا ہے کہ خندہ کے پیچھے بہت سا فکر پوشیدہ ہے۔

۲۔ میرے ہم خیال۔

۳۔ کلفت افسردگی۔۔۔۔ افسردگی کی تکلیف، یالوس الحالی عیش بے تابی۔۔۔۔ بیتابی کی راحت، وہ آرام جو بیتابی میں حاصل ہوتا ہے۔ دندان در دل فشردن۔ دل میں دانت گڑو دینا بیتاب ہو کر دل کو چبا ڈالنا۔ گویا تکلیف برداشت کرنا کلفت افسردگی کی حالت میں عیش بیتابی حرام ہے۔ اس لئے عالم افسردگی میں ہم بیتابی کے لطف حاصل نہیں کرتے ورنہ ہم دل کو چبا ڈالیں اور اس ترکیب سے عیش بیتابی کے مزے اڑائیں مطلب یہ ہوا کہ دل کو دانتوں سے زخمی کرنے سے زخم پیدا ہو جائیگا زخم کے لئے خندہ لازم ہے۔ اور خندہ لوازمات عیش میں سے ہے (طباطبائی، بیخود، آسی) آسی نے دوسرا مفہوم یہ لکھا ہے ہم افسردگی سے مجبور ہیں جس کے مذہب میں عیش بیتابی حرام ہے۔ ورنہ اپنے دل کو زخمی کرنا اور خون پینا یہ تو عین خوشی کی جگہ ہے۔ اور اس پر فخر کرنا چاہیئے۔ (حسرت، سعید)

۴۔ احباب سوزش باطن کے قائل نہیں ہیں۔ ورنہ میری حالت یہ ہے۔ کہ دل پر گریہ طاری ہے۔ اور ہونٹوں پر مسکراہٹ اور ہنسی ہے یعنی بظاہر میں خوش نظر آتا ہوں لیکن میرا دل مبتلائے رنج ہے آشنا کا لفظ محیط کے مناسبات میں سے ہے۔ آشنا پیراک کو کہتے ہیں۔

۱۹۷

حسنِ بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے ۱ آئینہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے
تا کجا اے آگہی رنگِ تماشا باختن ۲ چشمِ وا گردیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

۱- اگرچہ حسن بے پروا اور بے نیاز ہے لیکن پھر بھی وہ متاعِ جلوہ کا خریدار ہے۔ اور اس کی خواہش رکھتا ہے۔ چنانچہ اس خواہش کی وجہ سے آئینہ اس کا زانوئے فکر بن گیا ہے یعنی وہ ہر وقت آئینہ دیکھتا رہتا ہے تاکہ اس کو دیکھ دیکھ کر کوئی نئی ایجاد جلوہ میں کرے۔

۲- آگہی ... ہوشیاری۔ رنگ باختن ... رنگ بدلنا۔ چشمِ وا گردیدہ ... کھلی ہوئی آنکھ آغوش سے مشابہ ہے۔ تماشا ... جلوہ بظاہر۔ اے آگاہی تو کب تک جلوۂ ظاہر کے تماشے میں مصروف و محو رہے گی کھلی ہوئی آنکھ یعنی چشمِ تماشا جو جلوۂ ظاہر کو دیکھنے کے لئے حیرت سے کھلی ہوئی ہے وہ جلوے کے لئے آغوشِ وداع ہے جو اس کو رخصت کرنے کیلئے وا ہوئی ہے غرض مطلب یہ ہے کہ جلوۂ عالم اس قدر بے ثبات و ناپائدار ہے کہ اس کی چشمِ کشادہ ہی آغوشِ وداع ہے۔

۱۹۸

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی ۱ مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی
عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سربسر ۲ کب تک خیالِ طرۂ لیلیٰ کرے کوئی
افسردگی نہیں طرب انشائے التفات ۳ ہاں درد بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی
رونے سے اے ندیم ملامت نہ کر مجھے ۴ آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی
چاکِ جگر سے جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی ۵ کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی
لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل ۶ تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی

ناکامیٔ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز ۷ تو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی
ہر سنگ و خشت ہے صدفِ گوہرِ شکست ۸ نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی
سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر ۹ فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی
ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد یاس خیز ۱۰ یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی
بیکاریٔ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل ۱۱ جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

۱۲ حسنِ فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

۱۔ حالی۔ صوفیا کی اصطلاح میں محادثت اور مسامرت (یعنی عبد و معبود کے درمیان گفتگو ہونی) کے دو مرتبے ہیں جو کاملین اور عرفا کو حاصل ہوتے ہیں کہتا ہے کہ شاہدِ حقیقی کے ساتھ اس معمولی لبِ دہن کے ساتھ بات چیت نہیں ہوسکتی۔ بلکہ اس کے لئے دہانِ زخم پیدا کرنا چاہیے یعنی جب تک دل تیغِ عشق سے مجروح نہ ہو۔ یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوتا۔

۲۔ تمام عالم وحشتِ مجنوں کا غبار ہے۔ کب تک اسے کوئی طرۂ لیلا سمجھتا رہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمام عالم ایک دھوکا ہے اس لئے کوئی کب تک اس کو طرۂ لیلیٰ کی طرح دلکش خیال کرے گا۔ طرہ زینت و آرائش کی چیز ہے اور عاشقوں کو مرغوب ہے۔ وحشتِ مجنوں اور طرۂ لیلیٰ میں تناسب ہے۔

آسی نے اس کے علاوہ دو معنی اور لکھے ہیں لیکن زبردستی کے ہیں۔ ملاحظہ ہوں۔ (۱) دنیا میں غبار وحشتِ مجنوں اڑ رہا ہے۔ آخر اسے کوئی کب تک دیکھے اور لیلیٰ اسے کوئی کہاں تک خیال کرے یعنی بمقابلہ حسنِ لیلیٰ کے عشقِ مجنوں زیادہ قابلِ دید ہے۔

(۲) مجنوں کی اس درجہ پریشانی اور وحشت پر نگاہ نہ ڈالنا اور اس کے غبار سے

آلودگیٔ طرۂ لیلیٰ کا لحاظ کرنا ظلم ہے۔

۳۔ طرب افشائے التفات.... التفات معشوق کی خوشی کو پیدا کرنے والی افسردگی.... غمزدگی۔ افسردگی سے التفاتِ معشوق کی خوشی حاصل نہیں ہو سکتی۔ ہاں اگر کوئی سراپا دردبن جائے۔ تو ممکن ہے کہ معشوق کے دل میں جگہ پیدا ہو سکے (حسرت۔ سعید۔ بیخود)

طباطبائی (۱) میری تنگ دلی ایسی نہیں۔ کہ کوئی التفات کر کے خوش ہو یعنی کسی کے التفات کرنے سے میری گرفتگی خاطر رفع نہیں ہوتی۔ ہاں درد بن کر دل میں کوئی جگہ پیدا کرے تو کرے۔ غرضیکہ تنگیٔ دل کی یہ حالت ہے کہ درد کے سوا کسی کی گنجائش نہیں ہے (۲) میرے ہمخیال)

آسی نے تیسری شرح یہ بھی لکھی ہے۔ افسردگی سے التفاتِ معشوق کو خوشی نہیں ہو سکتی۔ البتہ کوئی سراپا درد بن جائے تو اس کے التفات کو خوش کر سکتا ہے۔ طباطبائی اور آسی کا خیال ہے کہ مصنف نے یقیناً "طرب افشائی" کہا ہے کیونکہ طرب اور افشا دونوں لفظ عربی ہیں اور یہ ترکیب فارسی ہے۔ غالب سے یہ غلطی ممکن نہیں۔

۴۔ اے ندیم (ہمنشین) دنیا میں مجھے ملامت نہ کر کیونکہ آخر کب تک کوئی اپنے دل کی بھڑاس نہ نکالے۔ اور منقبض خاطر بیٹھا رہے۔

۵۔ ہم نے اس خیال سے اپنا جگر چاک کیا کہ وہ ہمارے حال کی پرسش کریں گے مگر جب چاکِ جگر سے یہ بات حاصل نہ ہوئی۔ تو اب گریبان کو چاک کرنے سے کیا فائدہ ہے سوائے اس کے کہ ہم گریبان چاک کر کے رسوائی کے سامان کے موجب بنیں گویا یہ کہلوائیں کہ گریبان چاک ہونے کا بھی کوئی اثر نہ ہوا (سعید)

۵۔ آسی، بیخود اور طباطبائی نے یہ مفہوم لیا ہے۔ کہ گریبان پھاڑ کر اپنے آپ کو رسوا اور بدنام کرنے سے کیا فائدہ۔

۶۔ میرے جگر کے ٹکڑے صحرا کے ہر خار میں چھدے پڑے ہیں۔ ان کی رنگینی سے ہر خار شاخ گل بن گیا ہے۔ اور ہر خار صحرا چمن کا منظر پیش کرتا ہے۔ ظاہر ہے لخت جگر عاشق کے بکثرت خون رونے اور صحرا نوردی کرنے سے ہر خار پر چبھے ہیں۔ اس لئے کہتا ہے۔ کہ کب تک کوئی صحرا کی باغبانی کرے یاد رہے۔ باغبان کے فرائض میں آبیاری کرنا اور پھول لگانا شامل ہے۔

(سعید۔ آسی۔ حسرت)

طباطبائی اور بیخود لکھتے ہیں اب صحرا کی بہار میں کیا بات باقی رہی ہے جو کوئی باغبانی کرے

۷۔ تو وہ ذات ہے جس کو کوئی دیکھ نہیں سکتا کیونکہ نگاہ کی ناکامی برق نظارہ سوز ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ اگر کوئی تیرا جلوہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہے تو ناکامی نگاہ برق بن کر گرتی ہے۔ اور قوت دید کو سلب کر دیتی ہے اس مضمون کو مصنف نے مختلف پیرایوں سے باندھا ہے ؎

نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا	مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی
جب وہ جمالِ دلفروز صورت مہر نیم روز	آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

۸۔ سنگ و خشت۔۔۔ اینٹ پتھر۔ صدف۔۔ سیپی۔ شکست سے مراد ضرب سنگ۔ اگر کوئی شخص جنون سے سودا کرے۔ تو اس معاملہ میں اسے کچھ نقصان نہیں کیونکہ ہر سنگ و خشت جو لڑکے دیوانے کو مارتے ہیں۔ وہ ایک صدف ہے جس میں سے گوہر شکست حاصل ہوتا ہے۔ ظاہر ہے۔ وہ سودا جس میں موتی حاصل ہوں فائدے سے خالی نہیں۔

۹۔ تیرا وعدہ بڑا صبر آزما ہے۔ میری ساری عمر ایفائے عہد کی امید میں بسر

ہو گئی۔ مگر پھر بھی تیرا وعدہ پورا نہ ہوا۔ گویا ہم انتظار میں ہی مر گئے اور تیری تمنا کرنے کا وقت ہی نہ آنے پایا پھر تیری تمنا کس وقت کی جاتی۔

۱۰۔ طبا طبائی۔ معنی آفرینی اور اخلاقی مضامین و ایجاد و اختراع لطائف ایسا وحشی فن ہے جس سے یاس پیدا ہوتی ہے پھر بھی سب اس مرض میں مبتلا ہیں۔ ایجاد کے مناسبات سے "پیدا کرنا" اور درد کو پیدا کرنا جس کے لئے پیدائی نہیں لطف سے خالی نہیں (بیخود)

حسرت۔ ایجاد کی طبیعت میں جو وحشت ہے۔ وہ یاس خیز ہے یعنی ہم وحشی لوگ یاس کو ایجاد کیا کرتے ہیں۔ اور اس طرح گویا مایوس ہونے پر مجبور ہیں۔

سعید۔ درد عشق۔ وہ درد نہیں جس کو کوئی پیدا کر سکے۔ اس میں کسی کوشش اور اختراع و ایجاد کا نتیجہ ہمیشہ مایوس کن ہوتا ہے۔ مرزا پہلے لکھ چکے ہیں۔

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

آسی۔ ایجاد سے مراد غالباً عالم ایجاد ہے۔ اس صورت میں یہ معنی پیدا ہوتے ہیں۔ کہ عالم ایجاد کی طبیعت ہی میں وحشت ہے۔ اور یہ وحشت یاس خیز اور مایوس کن، بلکہ یہ یاس ایک درد ہے۔ جو ہر ساکن عالم ایجاد کے دل میں پیدا ہونا ضروری ہے۔

سہا۔ اس عالم ایجاد کی طبیعت میں یا ممکنات کے خاصہ میں وحشت و بیگانگی ہے اور اس سے توقع رکھنی عبث ہے۔ اور یہ وحشت و بیگانگی ایسا درد نہیں جو کوئی پیدا کرے۔

۱۱۔ مجنوں کا کام یہ ہے کہ اپنے لباس کو پھاڑے۔ جب جسم پر لباس نہ رہا تو

دیوانہ بیکار ہو گیا۔ کہتے ہیں لباس پھاڑنے کے بعد بیکاری جنوں کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے سر کو پیٹے لیکن سوال یہ ہے کہ جب سر کو پیٹتے پیٹتے ہاتھ ٹوٹ جائیں۔ تو پھر دیوانہ کیا کرے۔ کیونکہ جنون میں بیکار تو بیٹھا نہیں جاتا۔

۲۔ فروغِ شمعِ سخن بہت مشکل ہے۔ یہ خصوصیت پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے۔ پہلے دل گداختہ پیدا کرے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ بغیر دلِ دردمند کے فروغِ سخن ممکن نہیں۔

۱۹۸

ابن مریم ہوا کرے کوئی ۱ میرے دکھ کی دوا کرے کوئی
شرع و آئین پر مدار سہی ۲ ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی
چال جیسے کڑی کمان کا تیر ۳ دل میں ایسے کے جا کرے کوئی
بات پر واں زبان کٹتی ہے ۴ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی
بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ ۵ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
نہ سنو گر برا کہے کوئی ۶ نہ کہو گر برا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی ۷ بخش دو گر خطا کرے کوئی
کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند ۸ کس کی حاجت روا کرے کوئی
کیا کیا خضر نے سکندر سے ۹ اب کسے رہنما کرے کوئی

۱۰ جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی۔

۱۔ ابن مریم۔۔۔ حضرت عیسٰے جن کا معجزہ مریضوں کو زندہ اور بیماروں کے دکھوں کو دور کرنا تھا۔ اگر کوئی عیسٰے ہے۔ تو ہوا کرے ہیں تو جب جانوں۔ کہ کوئی میرے دکھ کو دور کرے۔ شاید بیماری عشق کو حضرت عیسٰی بھی اچھا نہ کر سکتے

ہے) کیونکہ یہ کوئی مرض نہیں بلکہ ایک قسم کا وہم ہے۔

۱۔ شرع و آئین ..... قانون دین و دنیا ــــ میں نے مانا کہ دنیا کا مدار قانون پر ہے۔ اور قاتل کو قتل کی سزا دی جاتی ہے۔ لیکن ایسے قاتل کو کوئی کیا سزا دے سکتا ہے جو بغیر تلوار کے قتل کر ڈالتا ہے۔

حسرت نے دوسرا مفہوم یہ لکھا ہے۔ کہ جس پر بہ سبب ناز اکثر حسن کوئی حدِ شرعی کا جاری کرنا گوارا نہ کرتا ہو۔ الخ

۲۔ کڑی کمان ..... سخت کمان۔ جس قدر کمان سخت ہوتی ہے اسی قدر تیر میں بھی زیادہ زور ہوتا ہے کہتے ہیں۔ اس کی چال ایسی ہے جیسے کڑی کمان کا تیر ہوتا ہے یعنی بے محابا اس کی خوش خرامی تیر کی طرح سینے کے پار ہوتی ہے ایسے کے دل میں کوئی جگہ پیدا کرے۔ تو بات ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ ایسے کے دل میں جگہ پیدا کرنی بہت مشکل ہے۔

۴۔ اگر ان کے سامنے ذرا بھی بات کی جائے تو وہ زبان کاٹ ڈالتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ جو کچھ ان کے دل میں آئے۔ وہ کہے جائیں اور بس خاموش بیٹھے سنا کیجئے۔

۵۔ خدا جانے جوشِ وحشت میں میں کیا کیا بک رہا ہوں خدا کرے کوئی میری باتوں کو نہ سمجھے۔

۶۔ اگر تمہیں کوئی برا کہے تو سُنی ان سُنی کردو۔ اگر کوئی برا کرے تو چشم پوشی کرو۔ یعنی عیب چینی نہ کرو۔ اور قوت برداشت پیدا کرو۔

۷۔ اگر کوئی غلط راستے پر چلے تو اس کو روک لو۔ اور اگر کوئی خطا کرے تو اس کو فراخدلی سے معاف کردو۔

۸۔ دنیا میں کون شخص ہے جو حاجتمند نہیں ہے۔ کوئی کس کس کی حاجت

روا کرے۔ اگر کوئی تمہاری حاجت روا نہ کرے تو شکایت زبان پر نہ لاؤ کیونکہ ہر شخص کی اپنی اپنی ضرورتیں ہیں۔

۹۔ خضر رہنمائی کرتے ہوئے سکندر کو چشمۂ آبحیات پر لے گئے تھے لیکن سکندر نے یہ دیکھ کر چشمۂ آبحیات کے گرد بہت سے لوگ ہڈیاں ہوئے بسک رہے ہیں آبِ حیات نہ پیا اور یونہی واپس آگیا۔ کہتے ہیں۔ دیکھو تو سکندر کے ساتھ خضر نے کیا کیا۔ رہنما بنا اور پھر بھی آبِ حیات نصیب نہ ہوا۔ حضرت خضر سے بڑھ کر اور رہنما کون ہو سکتا ہے۔ ایسی حالت میں اب کوئی کس کو رہنما بنائے۔

۱۰۔ جب کوئی توقع ہی نہیں رہی تو پھر کس بیرنے پر کوئی کسی کا گلہ شکوہ کرے۔ گلہ کرنے کا اس وقت فائدہ ہو سکتا ہے۔ جب مطلب براری کی امید ہو۔ ظاہر ہے۔ جب توقعات منقطع ہو جائیں۔ تو گلہ کرنے سے نفرت اور دشمنی بڑھتی ہے۔

۱۹۹

بہت سہی غمِ گیتی شراب کم کیا ہے ۱ غلامِ ساقیٔ کوثر ہوں مجھ کو غم کیا ہے

تمہاری طرز و روش جانتے ہیں ہم کیا ہے ۲ رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے

۳ سخن میں خامۂ غالبؔ کی آتش افشانی
یقین ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

ا۔ غمِ گیتی ... غمِ دنیا۔ ساقیٔ کوثر ... حضرت علی رضی اللہ عنہٗ۔ میں نے مانا کہ غمِ دنیا بہت زیادہ ہے لیکن کیا ہوا۔ غم دور کرنے کے لئے میرے پاس شراب بھی بہت ہے۔ شراب بہت اس لئے ہے کہ میں ساقیٔ کوثر کا غلام ہوں وہ کبھی مجھ کو تشنہ نہ رہنے دیں گے۔

سعید نے مصرعہ ثانی کا یہ پہلو نکالا ہے۔ کہتے ہیں۔ ہمیں اب اس شراب پینے کے گناہ کی سزا سو اس کی بھی ہم کو فکر نہیں کیونکہ میں ساقیٔ کوثر کا غلام ہوں وہ اپنے غلام کی شفاعت خود کریں گے۔

۲۔ ہم تمہاری طرزِ روش کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ کہ وہ کیا ہے کہنے کو تو مجھ پر ظلم و ستم نہیں کرتے لیکن رقیب پر جو تمہارا لطف و کرم ہے۔ یہی بڑے ستم ہے اور ستم کس کو کہتے ہیں۔ (حسرت۔ طباطبائی۔ بیخود)

آسی۔ تم کسی پر مہربان بھی ہوتے ہو۔ تو ظلم کرنے کے لئے ہوتے ہو۔ لہذا اگر رقیب پر مہربان ہو تو کیا ستم ہے۔ وہی اس پر ظلم کرتے ہوگے۔

سعید۔ تمہارا جو ہمارے ساتھ برتاؤ ہے۔ ہم اس کو خوب جانتے ہیں یعنی بُرا ہے۔ پس جب تم رقیب پر مہربانی کرتے ہو تو ہماری شکایت عبث ہے۔

۳۔ ہم شاعری میں قلمِ غالب کی آتش فشانی کا یقین رکھتے تھے لیکن اب اس میں دم ہی کہاں باقی رہا ہے۔ مطلب یہ ہے۔ حرفِ کہولت نے اس کو ٹھنڈا کر دیا ہے۔

۳۰۰

۱ باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے — سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

۲ جوہرِ تیغ بہ سرچشمۂ دیگر معلوم — ہوں میں وہ سبزہ کہ زہرآب اگاتا ہے مجھے

۳ مدعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے — آئینہ خانے میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے

۴ نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کفِ خاک — آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

۵ زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے — دیکھوں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے

۱۔ خفقان میں ڈر بہت لگا کرتا ہے۔ اور خفقانی ہر وقت توہمات سے مغلوب رہتا ہے کہتے ہیں باغ نے مجھ کو خفقانی سمجھ لیا ہے۔ اس لئے وہ مجھ کو ہر وقت

ڈراتا رہتا ہے۔ اس کی ہر شاخ گل کا سایہ خفقانی ہونے کی وجہ سے مجھے افعی معلوم دیتا ہے۔ اور میں سہما جاتا ہوں۔

۲- جوہر تیغ سبزی مائل ہوتا ہے۔ اور وہ تلوار کو زہر آب میں بجھانے سے نمودار ہوتا ہے کہتے ہیں جس طرح سبزہ جوہر تیغ سوائے تو ہر آب کے کسی دوسرے سرچشمہ پر نہیں اگتا۔ اسی طرح میں وہ سبزہ ہوں۔ کہ مجھے بھی زہر آب (غم) ہی اگاتا ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ میری سرشت غم و غصہ سے ہے۔

۳- مدعا حاصل نہ ہونے سے میرا دل ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ چونکہ میرا دل آئینہ تھا۔ اس لئے ٹوٹ جانے سے بہت سے آئینوں کے ٹکڑے ہو گئے۔ اب ان آئینوں میں مدعا شکست دل کا تماشا دیکھنے میں محو ہے چونکہ ان ٹکڑوں میں ہر طرف شکست دل کا تماشا نظر آ رہا ہے اس لئے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسطرح کوئی مجھے آئینہ خانہ میں لئے جاتا ہے (نظام متفق) آسی نے ایک مفہوم یہ بھی تراشا ہے۔ کوئی مجھ کو آئینہ خانہ میں لیے جاتا ہے اور اس کا اس لے جانے سے مطلب یہ ہے۔ کہ وہاں میرا دل ٹوٹے اور میں اپنے ٹوٹے ہوئے دل کے تماشے میں محو ہو جاؤں۔ اور میرا دل ٹوٹنا اس پر منحصر ہے کہ میں حیران ہوں گا۔ اور اس سے میرا دل ٹوٹے گا۔

۴- میں نالہ کو سرمایۂ دنیا اور دنیا کو ایک مٹھی بھر خاک سمجھتا ہوں اور میری نظروں میں آسمان ایک بیضۂ قمری ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میری نظروں میں ہیچ ہے کیونکہ اس کا حاصل سوائے رنج و محن کے اور کچھ نہیں آسمان بیضۂ قمری کی پھبتی کہی ہے۔ کہ جس میں کف خاک کے سوا کچھ نہیں ور اس مٹھی بھر خاک کی قسمت میں عمر بھر کی نالہ کشی لکھی ہے۔ اور بیضۂ قمری اسی لئے

کہا۔ کہ قمری نالہ کشی کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ چونکہ قمری کا رنگ خاکی ہوتا ہے۔ اس لئے آسمان کو بیضۂ قمری قرار دینا خالی از لطف نہیں۔

۵۔ حالی۔ کون اٹھاتا ہے مجھے۔ اس کے دو معنی ہیں۔ ایک تو یہ زندگی میں تو مجھے محفل سے اٹھا دیتے تھے۔ اب مرنے کے بعد دیکھوں مجھے یہاں سے کون اٹھاتا ہے۔ اور دوسرے معنی یہ ہیں۔ کہ محفل سے تو اٹھا دیتے تھے۔ دیکھوں اب میرا جنازہ کون اٹھاتا ہے۔

۲۰۰

روندی ہوئی ہے کوکبۂ شہریار کی ۱ اترائے کیوں نہ خاک سرِ رہگذار کی
جب اس کے دیکھنے کیلئے آئیں بادشاہ ۲ لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو لالہ زار کی
بھوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے ہم ولے ۳ کیونکر نہ کھائیے کہ ہوا ہے بہار کی

۱۔ کوکبۂ شہریار۔۔۔ وہ سوار جو بادشاہ کی اردلی میں رہیں۔ کہتے ہیں راستے کی خاک بھلا کیوں نہ اترائے۔ اس کا اترانا بجا ہے۔ کیونکہ بادشاہ کے سپاہی اس کو روندتے ہوئے گذرے ہیں۔ بقول آسی جب بادشاہ کے اردلیوں کے روندنے سے خاک کو یہ فخر ہے۔ تو زہے نصیب اس کے جس پر بادشاہ مہربان ہو۔

۲۔ نمود۔۔۔ شہرت جس لالہ زار کو دیکھنے کے لئے بادشاہ خود تشریف لائیں تو بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ اس لالہ زار کی لوگوں میں شہرت اور مقبولیت نہ ہو۔

۳۔ ہم سیرِ گلستان کے بھوکے نہیں ہیں۔ مگر ہوائے بہار میں ایسی کشش ہے کہ وہ خود بخود ہمارے دل کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اس لئے ہم اس سے کیوں نہ حظ حاصل کریں۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے ۱ بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہیگا اسکی گردن پر ۲ وہ خوں جو چشم تر سے عمر بھر یوں دمبدم نکلے

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن ۳ بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچہ سے ہم نکلے

بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا ۴ اگر اس طرۂ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

مگر لکھوائے کوئی اسکو خط تو ہم سے لکھوائے ۵ ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی ۶ پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جام جم نکلے

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی ۷ وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغ ستم نکلے

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا ۸ اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

کہاں میخانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ ۹ پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

۱۔ حالی۔ "خواہش پر دم نکلنا" اس کے پورے ہونے کے لیے جلدی کرنا چنانچہ کہتے ہیں۔ کیوں دم نکلا جاتا ہے۔ یا کیوں مرے جاتے ہو۔ یعنی کیوں جلدی کرتے ہو۔ پہلے مصرعہ میں بمقتضائے مقام یہ الفاظ کہ "دل میں باقی ہیں" بقدر ملائے جائیں" یعنی ہمارے دل میں ہزاروں ایسی خواہشیں باقی ہیں۔ کہ جن میں سے ہر خواہش کے لئے ہم مرے جاتے ہیں۔ ہمارے ارمان بہت نکل چکے ہیں لیکن پھر بھی باقی ہیں۔

۲۔ میرا قاتل اس بات سے ڈرتا ہے۔ کہ اگر میں اس کو قتل کردوں گا۔ تو اس کا خون میری گردن پر رہے گا۔ اس کا اس بات سے ڈرنا بیکار ہے۔ کیونکہ جو خون چشم تر سے عمر بھر بہتا رہا۔ اور کبھی نہ تھما۔ تو وہ اس کی گردن پر کیا ٹھہرے گا۔ یعنی جسم میں ہی نہیں رہتا تو گردن پر کیا رہے گا۔

۳۔ کوچہ یار کو کس خوبی سے بہشت کہتے ہیں ہمیشہ سے سنتے آئے

ہیں۔ کہ حضرت آدم بہشت سے نکالے گئے تھے لیکن جس بے آبروئی کے ساتھ ہم تیرے کوچے سے نکلے ہیں وہ اس طرح سے نہ نکلے ہوں گے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم ان سے زیادہ بے آبرو اور بے عزت کئے گئے ہیں۔

۴۔ بھرم ۔۔۔ حقیقت، اصلیت۔ تیرے قامت کی درازی کی لوگ بہت تعریفیں کرتے ہیں لیکن یہ تعریفیں اسی وقت تک ہیں۔ جب تک تیری زلفیں لپٹی ہوئی ہیں جس وقت ان کے پیچ و خم نکلے تو قامت کی درازی کی حقیقت کھل جائیگی۔ کیونکہ تیری زلفیں تیرے قد سے بھی زیادہ دراز ہیں۔

۵۔ عاشق کو شبہ یہ ہے کہ تمام شہر والوں کی معشوق سے خط و کتابت ہے اس لئے یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کون اس سے خط و کتابت کرتا ہے اور اسے کیا کیا لکھواتا ہے۔ خط نویسی کا پیشہ اختیار کیا ہے۔ صبح ہوتے ہی کان پر قلم لگا کر گھر سے نکل جاتے ہیں۔ اور گلی کوچوں میں پھرتے ہیں کہ لوگ منشی جی سمجھ کر انہیں بلائیں۔ اور ان سے خط لکھوائیں۔ اور اس طریقے سے ان کو اپنا مدعائے دلی حاصل ہو جائے۔ آسی لکھتے ہیں کہ ہم ان کا نام لکھنے کے عاشق ہیں اس لئے ہم نے یہ ترکیب نکالی ہے لیکن یہ معنی کچھ لطف نہیں دیتے۔

۶۔ بادہ آشامی ۔۔۔ شراب نوشی جمشید سے مشہور تھی۔ گویا پھر وہ زمانہ آگیا ہے کہ جام جم نکلے اور اس کو میرے نام سے شہرت ہو۔ کیونکہ جمشید تو رہا نہیں۔ اب میں جام جمشید کا حریف ہوں۔ جام جم کے متعلق مشہور ہے کہ اس کو جمشید نے ایجاد کیا تھا۔ اس میں تمام عالم کی سیر ہوتی تھی۔ اور وہ اس میں شراب بھر کر پیا کرتا تھا نیز شراب کو بھی جمشید کی ایجاد کہا جاتا ہے۔

۷۔ جن لوگوں سے ہمیں امید تھی۔ کہ وہ ہماری خستگی اور دردمندی کی داد

دیں گے۔ جب ہم نے اپنا درد ان کے سامنے بیان کیا تو انہوں نے اپنی درد بھری داستان سنا دی جس سے معلوم ہوا کہ وہ ہم سے بھی زیادہ فلک زدہ اور ستم رسیدہ ہیں۔ ع خفتہ را خفتہ کے کند بیدار

آسی نے دوسرا مفہوم یہ لکھا ہے۔ اور آپ کو ہمارے مفہوم پر ترجیح دی ہے کہتے ہیں ہم نے جس سے خستگی کی داد ملنے کی توقع کی جس کے سامنے اس بات کا اظہار فخریہ کرنا چاہا کہ ہم نے اتنے ستم سہے ہیں۔ وہ لوگ ہم سے بھی زیادہ تیغ ستم یار کے دل خستہ تھے۔

۸۔ محبت میں مرنے اور جینے کا امتیاز اٹھ گیا کیونکہ جس کو دیکھ کر جیتے ہیں۔ اُسی کافر پہ مرتے ہیں بقول بیخود۔ حاصل زمین یہی شعر ہے۔

۹۔ شراب ایسی چیز ہے کہ اسے واعظ بھی چھپ چھپ کر پیتے ہیں کہتے ہیں کہاں میخانہ کا دروازہ اور کہاں حضرت واعظ، کل کی بات ہے، ہم میخانہ سے شراب پی کر نکل رہے تھے کہ حضرت واعظ داخل ہوتے اور ہم نے انہیں میخانے میں جاتے ہوئے دیکھ لیا۔

۲۰۲

کوہ کے ہوں بارِ خاطر گر صدا ہو جایئے ۱ بے تکلف اے شرارِ جستہ کیا ہو جایئے

بیضہ آسا ننگِ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس ۲ از سرِ نو زندگی ہو گر رہا ہو جایئے

۱۔ شرار سے پوچھتے ہیں کہ اگر ہم صدا بن جائیں تو پہاڑ کے لئے بارِ خاطر ہوں۔ کیونکہ جو آواز پہاڑوں سے ٹکراتی ہے۔ وہ گونج کر واپس آجاتی ہے اور اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ وہ پہاڑ پر بارِ خاطر تھی۔ اس لئے پہاڑ نے اسے واپس لوٹا دیا کہتے ہیں۔ اے شرارِ جستہ پھر آخر ہم کو کیا ہونا چاہیئے۔ بقول حسرت اسی اندازِ سوال سے یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ کہ میں بھی شرار کی مانند بے تکلف دم بھر

میں حل کر فنا ہو جانا چاہتا ہوں (سعید و حسرت)

طباطبائی۔ شرار کی از خود رفتگی اور بے تکلفی کو دیکھ کر کہتے ہیں۔ کہ تیری طرح بھلا ہم کیا بے تکلف ہو جائیں۔ اور کیونکر ضبط کو ہاتھ سے دیں یہاں تو حال یہ ہے کہ اگر صدا کی طرح سبک و لطیف بن کر تڑپیں۔ تو بھی کوہ ایسے سنگین پر تمکین جسم کے بار خاطر ہو جائیں۔ غرض یہ کہ جہاں تک ہو سکے ضبط کرنا اور پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیئے۔ وجہ مناسبت اس شعر میں یہ ہے۔ کہ شرار پتھر سے نکلتا ہے۔ اور صدا پہاڑ سے ٹکرا کر پلٹ آتی ہے یعنی اس کی بار خاطر ہوتی ہے۔ اور اسی سبب سے وہ اسے رد کرتا ہے (آسی۔ بیخود)

۲۔ میرا کنج قفس بیضہ کی طرح ہے جو بال و پر کے لئے باعث تنگی و عار ہے۔ اگر میں اس کنج قفس سے آزاد ہو جاؤں تو سمجھوں گا کہ مجھے از سر نو زندگی حاصل ہوئی۔ مطلب یہ ہے۔ کہ جس طرح انڈے سے بچہ نکلنے کے بعد نئی زندگی شروع کرتا ہے اسی طرح قفس سے آزاد ہونے کے بعد نئی زندگی شروع ہو گی۔ بقول طباطبائی اگر فلک سے بیضۂ فلک مراد لیں تو عالم ارواح میں نئی زندگی شروع ہو گی۔

۲۰۳

مستی بذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے ۱ موجِ شراب یک مژۂ خوابناک ہے
جز زخمِ تیغ ناز نہیں دل میں آرزو ۲ جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے
جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسدؔ ۳ صحرا ہماری آنکھ میں یک مشتِ خاک ہے

۱۔ ساقی کی ادائے غفلت پہ مستیٔ شراب تلک ہلاک ہے یہاں تک کہ شراب اس کی غفلت کے ذوق میں ایسی بیخود ہوتی ہے۔ کہ موج شراب چشم ساغر کی مژہ خواب آلود معلوم ہوتی ہے۔

بقول حسرت موج شراب کو چشم ساغر کی مژہ قرار دیا - اور اس کی خوابناکی کا سبب یہ بتایا - کہ مستی شراب کو بھی ساقی کی ادائے تغافل نے مست و بیخود بنا رکھا ہے -

۲ - میرے دل میں سوائے زخم تیغ ناز کے اور کوئی آرزو نہیں یہی وجہ ہے - کہ جیب خیال بھی تیرے ہاتھوں سے چاک ہے "جبھی" سے یہ پتہ چلتا ہے گریبان تو پہلے سے چاک ہے -

طباطبائی جیب خیال سے دل مراد ہے - اور جب دل میں زخم تیغ ناز ہوا - تو جیب خیال چاک ہوئی پھر اس میں آرزو کیونکر رہ سکے -

۳ - جوش جنوں نے وسعت نظر کو بڑھا دیا ہے یہی وجہ ہے کہ ہمیں ہر چیز بے حقیقت معلوم ہوتی ہے - یہاں تک کہ صحرا باوجود اپنی پہنائی کے ہماری نظروں میں ایک مشت خاک سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا (آسی - سعید)

طباطبائی - بیخود - صحرا کو دیکھ کر ایسا جوش جنوں پیدا ہوا ہے کہ اب سوجھتا نہیں - گویا صحرا میری آنکھوں کے لئے مٹھی بھر خاک تھی اور جس آنکھ میں خاک جھونک دی جائے اُسے کیا سوجھے گا -

۲۰۳

لب عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی ا قیامت کشتۂ لعل بتاں کا خواب سنگیں ہے

لب عیسیٰ میں یہ تاثیر تھی کہ وہ مُردوں کو زندہ کر دیتے تھے - کہتے ہیں کشتہ لب لعل بتاں پر عیسےٰ کا یہ جادو نہیں چلتا - بلکہ لب عیسیٰ کی جنبش ان کشتگان کے حق میں لوری کا کام دیتی ہے جس طرح کوئی بچے کو سلانے کے لئے پنگھوڑے کو جنبش دیتا ہے - اور اس جنبش سے نیند اور زیادہ گہری ہو جاتی ہے یہاں بھی

حال جنبش لب عیسےٰ کا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ کشتگان لب لعلیں کی نیند
قیامت کی گہری نیند نہیں ہے بلکہ لب عیسیٰ کی جنبش سے وہ اور بھی زیادہ
گہری ہو جاتی ہے۔

۲۰۴

آمد سیلاب طوفان صدائے آب ہے ۱ نقش پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے
بزم مے وحشت کدہ ہے کس کی چشم مست کا ۲ شیشہ میں نبض پری پنہاں ہے موج بادہ سے

۱۔ نقش پا کی صورت کان سے اور جادہ کی انگلی سے مشابہت ہے کہتے ہیں۔ طوفان آب کی آواز آرہی ہے اس کو سنکر نقش پا نے اپنے کان میں جادہ کی انگلی رکھ لی ہے تاکہ طوفان آب کی آواز سے وہ خوفزدہ نہ ہو۔ خوف پیدا ہونے کا سبب یہ ہے کہ طوفان آئیگا تو نقش مٹ جائیگا۔

طباطبائی نے اس شعر کو بے معنی لکھا ہے۔

۲۔ بادہ کو نبض پری سے مشابہت دی ہے پھر اس کی وحشت کو ظاہر کیا ہے۔ کہتے ہیں کس کی چشم مست نے بزم مے کو وحشت کدہ بنادیا ہے کہ وحشت کے مارے شیشے میں بصورت موج بادہ گویا نبض پری پنہاں ہے (موج بادہ سے یعنی بصورت موج بادہ)

ہوں میں بھی تماشائی نیرنگ تمنا مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آئے

تمنا کرنے سے یہ مقصد ہرگز نہیں کہ تمنا پوری ہی ہو بلکہ میں تمنا کی طلسم کاری کا تماشائی ہوں گویا یہ دیکھتا ہوں کہ تمنا کیسے کیسے رنگ اور تماشے دکھاتی ہے۔

سیاہی جیسے گر جاوے دم تحریر کاغذ پر میری قسمت میں یوں تصویر ہے شبہائے ہجراں کی

قسمت سے قسمت نامہ مراد ہے اور فرض یہ کیا ہے کہ خط تقدیر کے سب حروف تصویروں کی شکل میں لکھے گئے ہیں۔ زمانہ قدیم میں جب فن تحریر ایجاد نہ ہوا

تھا تو اظہار مطلب تصویریں کھینچ کر کیا جاتا تھا۔ میرے قسمت نامہ میں شب ہائے فراق کی تصویر اس طرح کھینچی گئی ہے۔ کہ جیسے لکھتے وقت کاغذ پر سیاہی گر جائے اور وہ کاغذ بالکل سیاہ ہو جائے۔

۲۰۵

خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے ۱ ہجوم نالہ حیرت عاجز عرض یک افغاں ہے

نگاہ بے حجاب ناز تیغ تیز عریاں ہے ۲ تکلف بر طرف ہے جانستاں تر لطف بد خویاں

کہ صبح عید مجھ کو بدتر از چاک گریباں ہے ۳ ہوئی یہ کثرت غم سے تلف کیفیت شادی

کہ اس بازار میں ساغر متاع دست گرداں ہے ۴ دل و دیں نقد لا ساقی سے گر سودا کیا چاہے

چراغ روشن اپنا قلزم صرصر کا مرجاں ہے ۵ غم آغوش بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو

۱۔ حسرت: حیرت عاجز یعنی عاجز حیرت۔ ہجوم نالہ اس بات سے عاجز ہے کہ حیرت کی وجہ سے آہ و فغاں ناممکن ہے۔ چنانچہ خموشی جو لازم حیرت ہے اس عجز کا اظہار کر رہی ہے جس بدنداں ہونے سے اظہار عجز مراد ہے۔ اور ریشۂ نیستاں اس لحاظ سے آیا ہے۔ کہ نیستان کی بھی بعینہٖ یہی حالت ہوتی ہے۔ کہ باوجودیکہ اس سے ہزاروں بانسلیاں بن سکتی ہیں۔ اور اس لئے ان کو لاکھوں نالہائے ناگفتہ کا مجمع کہہ سکتے ہیں۔ اور خموشی نیستاں خس بدنداں نظر آتی ہے (سعید)

شرح حسرت کے سوا باقی نسخوں میں پہلا مصرعہ اس طرح لکھا ہے "ہجوم نالہ حیرت عاجز عرض یک افغاں ہے۔"

طباطبائی: میدان جنگ میں جب کوئی گروہ مغلوب ہو جاتا ہے تو اظہار عجز کرنے کے لئے گھانس پھونس وغیرہ منہ میں دبا کر دکھاتے ہیں کہ لڑائی موقوف کرو۔ یہاں ہجوم نالہ نے لشکر کشی کی ہے۔ اور حیرت ایک نالہ کرنے میں بھی عاجز ہے اور اسی عجز کا اظہار کرنے کے لئے ع۔ خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے

لیکن خس بدنداں ہونے کے لئے ریشۂ نیستاں کی کیا تخصیص ہے یہ کہ وہ نالہ و فریاد کی جڑ ہے۔ یہ کہ ریشے سے نے پیدا ہوتی ہے اور نے سے نالہ اور حالت ضبط میں نالے چھپے ہوتے ہیں جس طرح ریشہ نیستاں میں پنہاں ہوں ہے ہیں حرف ندا محذوف ہے یعنی اے ہجوم نالہ مراد ہے۔ فقط ہجوم نالہ کو مخاطب کر کے مصنف نے ریشۂ صد نیستان کہنے کا باعث بنا دیا۔ آسی۔ بیخود

مولوی ابو الکمال امیدؔ۔ اے ہجوم نالہ میں حیرت کی وجہ سے نالہ کشی سے مجبور ہوں۔ میری خموشی سے خفا نہ ہو۔ بلکہ اس کو ریشۂ نیستاں سمجھ کہ اس سے میرے عجز کا اظہار ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ثبوت ملتا ہے۔ کہ میں سراسر نالہ ہوں ایک جگہ ریشۂ نے کو اسی طرح اور بھی کہہ چکے ہیں ؎

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

بیخود۔ باوجود ہجوم نالہ کے حیرت نے عرض فغاں سے عاجز کر دیا ہے گویا خاموشی نے نیستاں کو جس میں سینکڑوں بانسریاں موجود ہیں خس بدنداں کر رکھا ہے مطلب یہ ہے۔ کہ باوجود قوت گویائی کے رازداری کے لحاظ سے لب سی دیئے ہیں۔

۲۔ بدخویاں، جمع بدخو کی یعنی معشوق۔ جانستاں تر۔۔۔۔ زیادہ قاتل۔ تکلف برطرف بدخو معشوقوں کا لطف و کرم اور بھی زیادہ قاتل اور ہلاک کن ہے کیونکہ نگاہِ ناز تیغ ہے۔ اس لئے نگاہِ ناز بے حجاب کو جانستاں تر کہا ہے۔

۳۔ کثرت غم سے خوشی کی کیفیت اس قدر خراب ہو گئی ہے کہ صبح عید جو ہر کس و ناکس کے لئے بے انتہا خوشی کا باعث ہوتی ہے۔ مجھ کو چاک گریبان سے بھی بدتر معلوم ہوتی ہے گریبان کا چاک ہونا انتہائی رنج و غم کی علامت ہے۔

۴۔ متاعِ دست گرداں ۔۔۔۔ وہ چیز جو نقد قیمت پر بکے ۔ اس شعر کے متعلق طباطبائی لکھتے ہیں ۔ کہ ساغر کو متاعِ دست گرداں کہنا ایسا لطف رکھتا ہے کہ دل و دین نیازِ مصنف کرنا چاہیئے ۔

اگر تو ساقی سے سودا کرنا چاہتا ہے ۔ اور شراب خریدنے کا آرزومند ہے تو نقد دل و دین اس کے حوالے کر ۔ اور شراب خرید لے ۔ یہاں اُدھار سے کام نہیں چلتا ۔ یاد رہے ۔ متاعِ ساغر وہ جنس ہے جو ہمیشہ نقد قیمت پر بکتی ہے ، بقول سعید ۔ اپنے دین و ملت کو خیر باد کہہ ۔ ماسوا سے دِل ہٹا ۔ پھر اس کی خواہش کر ۔

۵ ۔ آغوشِ بلا ۔۔۔ مصیبتوں کی گود ۔ قلزم ۔۔۔ سمندر ۔ صرصر ۔ ہوائے تند و تیز ۔ مرجان ۔۔۔ مونگا ۔ مرجان سمندر میں پرورش پاتا ہے اور اس کا رنگ سُرخ ہوتا ہے ۔ اس لیے چراغ کو مرجان سے مشابہ کیا ہے ۔ غمِ عشق عاشق کو آغوشِ بلا میں پالتا ہے ۔ گویا اس کی تمام زندگی مصائب و آلام میں بسر ہوتی ہے ۔ اپنے آپ کو عاشق سمجھ کر کہتا ہے کہ ہمارا چراغ طوفانِ صرصر میں اسی طرح روشن رہتا ہے جیسے مرجان کا چراغ طوفانِ سمندر میں ۔ مطلب یہ ہے ۔ کہ ہوائے تیز و تند میں چراغ بجھ جاتا ہے لیکن عاشق چونکہ مصائب کا عادی ہوتا ہے ۔ اس لیئے اس کا چراغ باوجود طوفانِ باد کے روشن رہتا ہے ۔ اس کی مثال یہ دی ہے ۔ کہ مرجان سمندر کے طوفان کا عادی ہے ۔ اس لیے باوجود طوفانوں کے پرورش پاتا ہے ۔

۲۰۶

خموشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے ، نگاہ دل سے ترے سُرمہ سا نکلتی ہے

فشارِ تنگیٔ خلوت سے بنتی ہے شبنم ۲ صبا جو غنچے کے پردے میں جا نکلتی ہے

نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آب تیغ نگاہ ۳ کہ زخم روزن در سے ہوا نکلتی ہے

۱۔ تماشا ادا۔۔ تماشا دکھانے والی :۔ تماشا ادا نگاہ کی صفت ہے۔ سرمہ کھانے

سے آواز بیٹھ جاتی ہے۔ اسی سے فائدہ اٹھا کر مصنف نے سرمہ اور خاموشی کو ایک

چیز بتلایا ہے کہتے ہیں خاموشی کی وجہ سے تیری نگاہ جو انداز تماشا دکھانے

والی ہے تیرے دل سے سرمہ آلود ہو کر نکلتی ہے۔ (حسرت بسعید)

طبا طبائی۔ خاموشی میں تیری نگاہ تیرے دل ہی سے سرمہ آلود ہو کر نکلتی ہے

یعنی تیری خاموشی ہی نگاہ کو سرمہ آلود کر دیتی ہے یعنی بسبب ملائمت کے خاموشی

اور سرمہ ایک ہی چیز ہے آسی نگاہِ تماشا ادائے معشوق میں اور کوئی سرمہ نہیں

لگاتا۔ بلکہ وہ اس کے دل ہی سے سرمہ سا ہو کر نکلتی ہے اور خموشی ہی اس کو زینت

دیتی ہے۔ یعنی اس میں سرمہ لگاتی ہے۔ حاصل یہ ہے۔ کہ جب تو خاموشی کی حالت

میں تماشائے بزم کرتا ہے۔ تو تیری نگاہ پیاری اور سرمہ سا معلوم ہوتی ہے

بیخود۔ سرمہ کھانے سے آواز بیٹھ جاتی ہے۔ فرماتے ہیں۔ تیری خاموشیوں میں

بھی ایک ادائے اظہار پائی جاتی ہے۔ گویا تیرے دل کے ارادے سے جو

نگاہ نکلتی ہے۔ وہ سرمہ سا نکلتی ہے یعنی آواز بے صوت ہوتی ہے۔

۲۔ فشار۔۔۔ بھینچنا۔ جب کبھی صبا غنچہ کے پردے میں جا نکلتی ہے

تو غنچہ اس کو اکیلا پا کر اپنی آغوش میں خوب بھینچتا ہے۔ صبا شرم سے پانی

پانی ہو جاتی ہے۔ یہی عرق شرم شبنم ہے۔ گویا شبنم اس طرح سے بنتی ہے

(آسی۔ طبا طبائی۔ بیخود)

سعید و حسرت لکھتے ہیں۔ کہ غنچے کو تنگیٔ خلوت کے فشار سے جو پسینہ

آ جاتا ہے۔ وہی شبنم ہے۔

۳۔ معشوق کی تیغ نگاہ کی آبداری اور تیزی کی کیفیت سینۂ عاشق سے نہ پوچھ

کرتا کیسی ہے بلکہ روزنِ در کے زخم کو دیکھو۔ وہ اتنے بڑے ہیں کہ ان میں سے ہوا نکلتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ نظر جس نے دروازے کے کواڑوں میں اتنے بڑے بڑے سوراخ ڈال دیئے کہ ان میں سے ہوا نکلتی ہے۔ اگر سینۂ عاشق پر دار کر گئی تو ظاہر ہے۔ اس کی کیا کیفیت ہو گی جس زخم سے ہوا نکلے وہ مہلک ہوتا ہے۔ اس لیے سینۂ عاشق کے زخم جو ان کی نگاہ نے ڈالے ہیں سخت مہلک ہیں۔ اور زخم روزن در سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ کہ معشوق دروازہ میں سے جھانکتا ہے۔ اور اس کے دروازے میں جو سوراخ ہیں وہ اس کی تیغ نگاہ کے زخم ہیں۔

۲۰۷

جس جا نسیم شانہ کش زلفِ یار ہے	۱	نافہ دماغ آہوئے دشتِ تتار ہے
کس کا سراغِ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا	۲	آئینہ فرشِ شش جہتِ انتظار ہے
ہے ذرہ ذرہ تنگیٔ جائے غبارِ شوق	۳	گر دام یہ ہے وسعتِ صحرا شکار ہے
دل مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ	۴	نظارہ کا مقدمہ پھر روبکار ہے
چھڑکے ہے شبنم آئینہ برگِ گل پر آب	۵	اے عندلیب وقت وداعِ بہار ہے
پچ آپڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے	۶	وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے
بے پردہ سوئے وادیٔ مجنوں گذر نہ کر	۷	ہر ذرے کے نقاب میں دل بیقرار ہے
اے عندلیب یک کفِ خس بہرِ آشیاں	۸	طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے
دل مت گنوا خبر نہ سہی سیر ہی سہی	۹	اے بے دماغ آئینہ تمثال دار ہے

۱۰ غفلت کفیل عمر و اسد ضامن نشاط
اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

۱۔ شانہ۔۔۔ کنگھی جس جگہ نسیم زلفِ یار میں شانہ کرتی ہے یعنی زلفِ کو بناتی سنوارتی ہے۔ وہاں زلفِ یار کی خوشبو اس قدر پھیلتی ہے کہ تمام فضا کو

معطر کر دیتی ہے ۔ اور یہ خوشبو آہوئے دشتِ تتار کے دماغ میں اس قدر بس جاتی ہے ۔ کہ اس کا دماغ بھی نافہ بن جاتا ہے ۔ گویا نافہ میں تو خوشبو ہوتی ہی ہے آہوئے تتار کے دماغ میں بھی اس قدر خوشبوئے زلفِ مشکیں بس جاتی ہے کہ وہ بھی نافہ کی طرح خوشبو دینے لگتا ہے ۔

۲ حیرت کو آئینہ سے تشبیہہ دی جاتی ہے ۔ کہتے ہیں ۔ اے خدا حیرت کس کے جلوے کا سراغ لگانا چاہتی ہے ۔ کہ اس کے انتظار میں حیرت نے ہر طرف آئینہ کا فرش بچھا دیا ہے یعنی ہر طرف آئینے ہی آئینے لگا دیئے ہیں ۔ اس میں نکتہ یہ ہے ۔ سراغرساں لوگ گم شدہ چیز کا عکس دیکھنے کے لئے ہر طرف بڑے بڑے آئینے لگا دیتے ہیں ۔ تاکہ مدعا جہاں کہیں ہو نظر آجائے ۔

۳ ۔ تنگیٔ جا کی وجہ سے میرا شوق پس گیا ، پس کر ذرہ ذرہ ہوا ۔ ذرہ ذرہ ہو کر غبار بن گیا ۔ غبار بن کر فضا میں پھیل گیا ۔ اور اس نے دام کی صورت اختیار کر لی ۔ کہتے ہیں ۔ اگر میرا یہی دام ہے ۔ تو سمجھ لو ۔ کہ تمام وسعتِ صحرا کو یہ دام شکار کر لے گا ۔ مطلب یہ ہے ۔ کہ میرا غبارِ شوق تمام صحرا پر چھا جائیگا

۴ ۔ روبکار ۔۔۔۔ پیشی ۔ تاریخ ۔ دل مدعی بنا ہے اور اس نے آنکھ پر دعوے کیا ہے ۔ گویا آنکھ مدعا علیہ ہے ۔ دعویٰ یہ ہے کہ آنکھ نے نظارہ کیا اور دل کا خون ہو گیا ۔ اس لیے دل کے نقصان کی تلافی کی جائے ۔ آج اس نظارہ کے مقدمہ کی پھر پیشی ہے ۔ سہ

دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا　　آج پھر اس کی روبکاری ہے

۵ ۔ آب چھڑکنا ۔۔۔۔ ایران میں ایک رسم ہے جب کوئی سفر کو جاتا ہے تو آئینہ پر پانی چھڑکتے ہیں ۔ تاکہ مسافر بخیریت واپس آئے ۔ اور راستے میں اسے کوئی تکلیف نہ ہو ۔ بلبل کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ۔ کہ شبنم آئینہ برگِ گل پر پانی چھڑک رہی ہے گویا

وہ بہار کو رخصت کر رہی ہے۔ کہ وہ خیریت سے جائے اور ساتھ خیریت کے واپس آئے۔

طباطبائی نے محض اس قدر لکھا ہے۔ ایران میں رسم ہے۔ کہ آب بر آئینہ ریزند قفائے سفری، بیخود نے اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے۔ ایران کی رسم ہے۔ جب کوئی سفر کرتا ہے۔ تو مسافر کی پشت پر آئینہ رکھ کر اس آئینہ پر پانی چھڑکتے ہیں۔ باقی شارحین نے قفا کے معنی مسافر کے رخصت ہونے کے بعد کے لئے ہیں۔ اور یہی درست ہے۔

سعید نے ایک اور بات پیدا کی ہے لکھتے ہیں۔ جغرافیہ طبعی کا یہ اصول ہے۔ کہ اوس ہمیشہ اس روز پڑتی ہے جس روز ابر نہ ہو۔ اس لئے اوس کا پڑنا یعنی مطلع کا صاف رہنا رخصت برسات (موسم بہار) کی علامت ہوئی دیگر مقدمات سے مطلب شعر وہی ہے،

۶۔ ہم کو اس بات کی پیچ آپڑی ہے یعنی ہم کو اس بات کا نباہنا ضرور ہے معشوق نے آنے کا وعدہ کیا ہے۔ مجھے اس کے وعدہ کی پیچ آپڑی ہے تاکہ لوگ یہ نہ کہیں کہ معشوق کے وعدہ کا انتظار نہ کیا۔ اس لئے وہ آئے یا نہ آئے میں اس کا انتظار ضرور کروں گا۔ بقول بیخود یہ شعر بیت الغزل ہے۔

۷۔ دھوپ کی چمک سے ذرّے چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں یہی چمکنا ذرہ کا تڑپنا ہے اور دل بیقرار سے مشابہ کرنے کا موجب۔ لیلی کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ وادیٔ مجنوں میں سے بے پردہ مت گذر۔ کیونکہ وہاں کا ہر ذرہ ذرہ نہیں بلکہ وہ دل بیقرار ہے جو ذرہ کے پردے میں بیتابی مجنوں کا آئینہ دار ہے وادیٔ مجنوں میں جانے سے روکنے کی وجہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ مجنوں کے دل کی بے تابی لیلے کے دل پر اثر انداز نہ ہو۔

۸۔ یک کفِ خس ۔۔۔۔ مٹھی بھر تنکے ۔ اے عندلیب اپنے آشیانہ کے لئے چار تنکے جو بھی جمع کرنے ہیں کر لے فصلِ بہار کی آمد آمد کا غلغلہ مچ رہا ہے جب طوفان بہار آ گیا تو پھر تجھے ایک تنکا بھی نہ مل سکیگا کیونکہ اثر بہار سے خشک تنکے سبز ہو جائیں گے۔

۹۔ اے بے دماغ تو اپنے دل کو اس لئے ضائع نہ کر۔ کہ وہ جلوۂ معرفت نہیں دکھاتا۔ اگر وہ آئینہ معرفت نہیں نہ سہی آئینہ تصویر تو ہے، جب وہ آئینہ تصویر ہوا۔ تو یقیناً اس میں تصاویر نظر آئیں گی اور سیر ہوگی۔ آئینہ تمثال دار سے مطلب یہ ہے۔ کہ اس میں معشوق کا عکس نظر آتا ہے اور معشوق کا عکس نظر آنا معرفت کے خلاف ہے جس میں دل کعبہ ہے اس میں سے بتوں کو نکالنا چاہیئے یہی وجہ ہے کہ بے دماغ اپنے دل کو ضائع اور برباد کرنا چاہتا ہے لیکن شاعر اسکو روکتا ہے۔ کہ اگر دل کعبہ نہ بن سکا۔ تو بت خانہ سہی۔ کیونکہ اس میں بھی ایک قسم کی کیفیت ہے۔

۱۰۔ کفیل ۔۔۔۔ ضامن۔ شاعر کا عقیدہ ہے۔ کہ جو شخص غفلت اور بیخبری میں عمر بسر کرے اور موت کو بھولا رہے۔ اس کو ناگہانی موت آجاتی ہے کہتے ہیں۔ ہماری حالت یہ ہے کہ غفلت نے ہماری عمر کا ٹھیکہ لیا ہے اور ہم نشاط و مسرت کے ضامن بن گئے ہیں یعنی ہمیشہ غافل ہیں اور یہ سمجھتے ہیں۔ کہ سدا عیش و آرام سے گذریگی۔ اس لئے اے مرگِ ناگہاں جب تیرے آنے کے اسباب موجود ہیں۔ تو پھر تجھے کس بات کا انتظار ہے آجا۔ بقول آسی حاصل اس شعر کا نہایت اچھا ہے یعنی انسان اسی فکر میں رہتا ہے۔ کہ ہمیشہ عیش و عشرت سے بسر ہوگی۔ اور اسی میں اس کی غفلت بڑھ جاتی ہے یہاں تک کہ موت آجاتی ہے۔

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشہ کہیں جسے ۱ ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

حسرت نے لا رکھا تری بزمِ خیال میں ۲ گلدستۂ نگاہ سویدا کہیں جسے

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا ۳ افسونِ انتظار، تمنا کہیں جسے

سر پر ہجوم دردِ غریبی سے ڈالئے ۴ وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

ہے چشم تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں ۵ شوقِ عناں گسیختہ دریا کہیں جسے

درکار ہے شگفتنِ گلہائے عیش کو ۶ صبحِ بہار پنبۂ مینا کہیں جسے

۷ غالب بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

۱- میں ایسا حسین کہاں سے لاؤں۔ جسے لوگ تجھ سا کہیں اور تو بھی قائل ہو جائے۔ کہ واقعی یہ مجھ جیسا ہے مناسب یہ ہے کہ میں تیرے سامنے آئینہ پیش کر دوں۔ کہ تجھ جیسا حسین مہیا ہو جائے اور تو اس کو دیکھ کر حیران رہ جائے اور تیرا حیران ہونا لوگوں کو تماشہ ہو جائے۔ بجز اس طریق کے غیر ممکن ہے کہ تجھ جیسا معشوق میں تجھ کو دکھا کر تجھے قائل کر سکوں۔

۲- تیری بزمِ خیال سے مراد میرا دل ہے۔ سویدا ... وہ سیاہ داغ جو دل میں ہوتا ہے۔ حسرت نے تیری بزمِ خیال یعنی میرے دل میں تیری رنگین نگاہوں کا ایک گلدستہ لا رکھا ہے جسکو سب لوگ سویدا کے نام سے پکارتے ہیں ظاہر ہے کہ گلدستہ بزم کے لئے باعث زینت ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے دل میں جو خال سویدا ہے۔ وہ تیری حسرت بھری نگاہوں کا گلدستہ ہے اپنے دل کو معشوق کی بزمِ خیال اس لئے کہا ہے کہ اس میں معشوق کا خیال جلوہ گر رہتا ہے۔

۳۔ اے خدا گوش محبت میں افسونِ انتظار جسے لوگ تمنا کہتے ہیں کس نے پھونکا ہے۔ تمنائے معشوق کو افسونِ انتظار کہا۔ مطلب یہ ہے کہ محبت پیدا ہوتے ہی تمنائے معشوق کیسے پیدا ہو گئی۔ یا یہ کہ محبت کو تمنا کرنی کون سکھا دیتا ہے۔

۴۔ غریبی ... بے وطنی۔ غم بے وطنی نے میرا ایسا حال بنا دیا ہے کہ جی چاہتا ہے۔ اپنے سر پر ایک مٹھی بھر خاک ڈالوں لیکن وہ مشتِ خاک ایسی ہو کہ لوگ یہ کہیں۔ اس نے ایک صحرا کی خاک اپنے سر پر ڈالی ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ غربت میں جی بھر کے خاک اڑانی چاہیئے تو آسی۔ بیخود)

سعید لکھتے ہیں۔ کہ کثرتِ درد غریبی سے تنگ آکر بس صحرا نوردی اختیار کیجیے۔ غریبی میں ایہام ہے۔

طبا طبائی۔ اشارہ یہ ہے کہ یہ شخص آوارۂ دشت و صحرا ہونے کا ارادہ کر رہا ہے۔ اور درد بے وطنی دبے ہے۔ اور خاک اڑانے پر نہایت آمادہ ہے کہ صحرا کو ایک مشتِ خاک سمجھتا ہے۔

۵۔ عنان گسیختہ ... جس کی باگ ٹوٹ گئی ہو یعنی شوق بے اختیار۔ حسرتِ دیدار کی وجہ سے میری چشم تر میں وہ جوش اشک پوشیدہ ہے کہ جس کو دریا کہہ سکتے ہیں۔

آسی۔ میری چشم تر میں حسرتِ دیدار نے شوق کو نہاں کر دیا ہے اور وہ شوق نکلنے کے لئے بیتاب ہے۔ اور بصورتِ دریا آنکھ سے نکل رہا ہے یعنی حسرتِ دیدار کے شوق میں رو رہا ہے۔

۶۔ پنبہ ... روئی۔ سفیدیٔ پنبہ کو سپیدیٔ صبح سے تشبیہ دی ہے۔ صبح بہار سے باغوں میں پھول کھلتے ہیں لیکن عیش و نشاط کے پھول صبح بہا

ے نہیں کھلتے ۔ گلہائے عیش کے کھلنے کے لئے وہ صبح بہار درکار ہے جسکو صبح بہار پنبۂ مینا کہا جاتا ہے ۔ مطلب یہ ہے ۔ کہ پنبۂ مینا کا شیشۂ شراب میں سے نکلنا صبح عیش پیدا کرتا ہے جس سے بادہ خوروں کے بستہ دل شگفتہ ہو جاتے ہیں ۔ اس شعر میں پنبۂ مینا کی سفیدی کو وجہ شبہ قرار دیا ہے ۔

۷ ۔ غالب اگر تجھے واعظ بُرا کہتا ہے ۔ تو تو بُرا نہ مان ۔ بھلا دنیا میں ایسا بھی کوئی ہے جسے سبھی اچھا کہیں ۔ مطلب یہ ہے اگر ایک واعظ تجھے بُرا کہتا ہے تو کیا ہُوا ۔ سب رند تو تجھے اچھا جانتے ہیں ۔

۲۰۹

داغِ دل بے درد نظر گاہِ حیا ہے ۱ شبنم بہ گلِ لالہ نہ خالی ز ادا ہے
آئینہ بدستِ بتِ بدمست حنا ہے ۲ دل خوں شدۂ کشمکشِ حسرتِ دیدار
جی کس قدر افسردگیٔ دل پہ جلا ہے ۳ شعلے سے نہ ہوتی ہوسِ شعلہ نے جو کی
آئینہ بانداز گل آغوش کشا ہے ۴ تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے ۵ قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
معشوقی و بے حوصلگی طرفہ بلا ہے ۶ خو نے تیری افسردہ کیا وحشتِ دل کو
دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے ۷ مجبوری و دعوائے گرفتاریٔ الفت
تیغِ ستم آئینہ تصویر نما ہے ۸ معلوم ہُوا حالِ شہیدانِ گذشتہ
سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے ۹ اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے ۱۰ ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد

۱۱ بیگانگیٔ خلق سے بیدل نہ ہو غالب
کوئی نہ ہو تیرا تو مری جان خدا ہے

۱۔ نہ خالی زادا ... ادا سے خالی نہیں، یعنی کچھ مطلب رکھتی ہیں۔ گل لالہ پر جو شبنم کے قطرات پڑے ہیں۔ وہ مطلب سے خالی نہیں۔ ان کا مطلب یہ ہے۔ کہ جس دِل میں درد نہ ہو مگر داغ ہو۔ وہ باعثِ ننگ و عار ہے ظاہر ہے کہ لالہ کے دل میں داغ تو ہے۔ مگر دردِ عشق نہیں، چونکہ یہ بات اس کے لئے باعثِ شرم ہے۔ اس لئے اس شرم سے اس کو عرق شرم آگیا۔ اور عرق شرم یہی قطرات شبنم ہیں۔ بقول حسرت مذہب عشق میں داغِ بیدرد کا موجب شرم ہونا مسلم ہے۔

۲۔ سعید۔ (۱) ہمارا دل کشمکش حسرتِ دیدار سے خون ہو کر اس بتِ بدمست حنا کے ہاتھ کا شیشہ بن گیا ہے (۲) معشوق کے ہاتھ میں آئینہ حنا بندھا ہوا ہے۔ کہ کسی وقت چھوٹتا ہی نہیں۔ اور ادھر حسرتِ دیدار کی کشمکش سے ہمارا دل خون ہو رہا ہے۔ اس لئے کہ اس کے چہرے کو دیکھیں تو کس طرح دیکھیں یہ آئینہ بیچ میں حائل ہے۔

طباطبائی۔ آئینہ دل مہندی بن گیا ہے یعنی حسرتِ دیدار نے اسے پیس ڈالا اور اس کے جگر کو لہو کر دیا۔ دل کو آئینہ بنا کر پھر اسے حنا بنا دیا بہت ہی تصنع ہے۔

حسرت (۱) دل اور آئینہ کی رسائی قسمت کا مقابلہ کرتا ہے ایک ہمارا دل ہے جو خون شدہ کشمکش حسرتِ دیدار ہے اور ایک آئینہ ہے جو اس بتِ بدمست حنا کے ہاتھ میں ہے (۲) وہی جو سعید نے لکھے ہیں۔

آسی۔ میرا دل حیران جو آئینہ اس لئے بنا تھا کہ معشوق اسے دیکھے اور اس صورت سے وہ معشوق کا نظارہ کرے وہ حسرتِ دیدار میں خون ہو گیا مگر اس تک نہ پہنچا۔ اور کم بخت حنا اس کے ہاتھ کی آئینہ بنی ہوئی ہے (۲) میرا دل

جو حسرتِ دیدار میں خون ہو گیا تھا وہ صورتِ آئینہ حنا بن کر اس کے دستِ نازک میں پہنچا ہے۔

۳۔ شعلۂ عشق، مجھے اس قدر نہ جلاتا جسقدر شعلہ نے جلایا ہے۔ گویا افسردگی دل پر جی اس قدر جلا ہے۔ کہ اتنا شعلہ سے نہ جلتا۔ جی جلنا سے مراد دل کڑھنا ہے۔ ظاہر ہے۔ دل اس بات سے جلا ہے۔ کہ دل میں شعلہ پیدا نہ ہوا اور شعلہ کا نہ پیدا ہونا ناکامیٔ عشق کی نشانی ہے گویا دل ناکامیٔ عشق سے اتنا جلا ہے جتنا شعلہ عشق سے نہ جلتا۔

۴۔ تمثال ۔۔۔ تصویر، عکس۔ تیرے عکس میں وہ شوخی ہے کہ آئینہ نے کمالِ شوق سے پھول کی طرح اپنی گود کھول دی ہے تاکہ تیرے عکس کو اپنی آغوش میں لے لے۔

بیخود۔ تیری تصویر میں بھی ایسی شوخی کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہے کہ اس پر جو آئینہ لگا یا گیا ہے۔ وہ پھول کی طرح شوق ہم آغوشی میں آغوش کشا ہو گیا ہے

۵۔ بقول مولانا حالیؔ۔ اگر "اے" کے بدلے "جز" پڑھا جائے۔ تو شعر کا مطلب صاف ہو جاتا ہے۔ یہ معنی ان کو مرزا صاحب نے خود بتائے تھے۔ کہتے ہیں سوائے نالے کے جگر سوختنہ (عشق) کا کوئی نشان نہیں۔ چنانچہ قمری اور بلبل کے عاشق ہونے کا نشان بھی صرف انکی نالہ کشی سے ملتا ہے ورنہ قمری ایک کفِ خاکستر ہے۔ اپنے خاکی رنگ کی وجہ سے اور قفس رنگ ہے اپنے رنگین پروں کی بدولت گویا ان کی ہستی کفِ خاکستر اور قفس رنگ سے زیادہ نہیں (وتمام متفق)

آسی۔ نالہ کو مخاطب کر کے پوچھتا ہے۔ کہ قمری سرو کی عاشق ہے اور وہ غمِ الفت میں جل کر خاک کی صورت ہو گئی ہے اور اس صورت میں اس کا پتہ

ملتا ہے۔ بلبل عشق گل میں مقید ہو کر ایسی فنا ہوئی ہے۔ کہ بس قفسِ رنگ ہی رہ گئی ہے۔ یعنی صرف رنگ ہے۔ باقی اس میں دل وجان نہیں ہے اور یہ رنگ بھی اس اثر سے ہے۔ کہ وہ گل کی عاشق ہے۔ اور اس کا رنگ اس کے رگ وپے میں سرایت کر چکا ہے۔ بلبل کا اس سے نشان ملتا ہے۔ مگر اے نالہ میرے جگر سوختہ کا کیا نشان ہے میں اگر اس کو ڈھونڈوں تو کس صورت سے ڈھونڈوں اور کیونکر پاؤں۔ مطلب یہ ہے۔ کہ وہ ایسا جلا ہے۔ کہ اس کا کسی صورت اور کسی رنگ سے سراغ نہیں ملتا۔

۶۔ تو معشوق ہے لیکن بے حوصلہ معشوقیت کا اقتضا یہ تھا۔ کہ تو وحشتِ دل کو پسند کرتا۔ تیری اس بے حوصلگی کی عادت نے میری وحشتِ دل کو ٹھنڈا کر دیا۔ اگر تو باحوصلہ ہوتا۔ تو پھر عشق کا مزہ آتا۔ معشوق ہو کر بے حوصلہ ہونا اور عشق کی وحشت کی تاب نہ لانا۔ یعنی نازو انداز اور جور و جفا نہ کرنا میرے واسطے سخت مصیبت ہے۔ کیونکہ آتشِ عشق اس سے ٹھنڈی ہوئی جاتی ہے۔

۷۔ مجبوری کی حالت میں محبت کا دعویٰ ایسا ہی ہے جیسے کسی کا ہاتھ بھاری پتھر کے نیچے دب گیا ہو اور نکل نہ سکتا ہو لیکن وکھانے کے لئے وہ شخص لوگوں سے یہ کہے کہ ہم پیمانِ محبت نباہ رہے ہیں۔ خوبی شعر میں یہ ہے۔ کہ عہد کرتے وقت ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہیں۔ یہاں ہاتھ پر پتھر ہے۔

۸۔ تیری تیغ ستم کو دیکھ کر شہیدانِ گذشتہ کا حال معلوم ہوتا ہے گویا تیری تیغ تیغ نہیں ہے۔ بلکہ ایک آئینہ تصویر نما ہے جس میں تیری تیغ کے گذشتہ جور و ستم کی تصویر نظر آتی ہے بجو د۔ طباطبائی۔ تیرے ستم کا اندازہ دیکھ کر ستم رسیدوں پر جو گذری ہوگی۔ اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے

سعید جو ظلم وہ آج کر رہی ہے۔ وہی شہیدانِ سابق کو جھیلنے پڑے ہوں گے

۹۔ حالی۔ یہ خطاب ہے آفتاب حقیقت کی طرف کہتا ہے۔ کہ جیسے سایہ متہم بلوجود ہے۔ اور فی الواقع اس کی کچھ ہستی نہیں ہے۔ اسی طرح ہم بھی اس کے دھوکے میں پڑے ہیں۔ اگر آفتاب حقیقت کی کوئی تجلی ہم پر مگن ہو جائے۔ تو یہ دھوکا جاتا رہے۔ اور ہم فنا فی الشمس ہو جائیں۔ کیونکہ جہاں آفتاب چمکا اور سایہ کا نور ہٹا۔

طباطبائی و آسی یعنی ادھر بھی گرم کر اور وقت پڑنے کا محاورہ جس محل پر مصنف نے صرف کیا ہے۔ اس کی خوبی بیان نہیں ہو سکتی۔

۱۰۔ حالی۔ یعنی گناہ جو ہم نے کیے ہیں۔ اگر ان کی سزا ملنی ضرور ہے تو جو گناہ بسبب عدم قدرت کے ہم نہیں کر سکے۔ اور ان کی حسرت دل میں رہ گئی ان کی بھی داد ملنی چاہیئے۔ شعر کی خوبی بیان سے باہر ہے۔ بقول طباطبائی میر تقی کو بھی حسرت ہوتی ہو گی کہ یہ مضمون مرزا نوشہ کے لیئے بچ رہا۔

۱۱۔ اے غالب خلق کی بیگانگی سے بیدل نہ ہو۔ میری جان اگر تیرا کوئی ہمدرد و مددگار نہیں ہے۔ تو نہ سہی، خدا تو ہے۔

۲۱۰

۱ قسمت کھلی ترے قد و رخ سے ظہور کی	منظور تھی یہ شکلِ تجلّے کو نور کی
۲ پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی	اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
۳ کیا بات ہے تمہاری شراب طہور کی	واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
۴ اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیور کی	آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج
۵ گویا ابھی سنی نہیں آواز صور کی	اڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا
۶ کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی	گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب ۷ آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی
گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اسقدر ۸ کی جس سے بات اُس نے شکایت ضرور کی

غالبؔ گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

۱۔ تجلی .... جلوہ۔ نور ... نور خدا۔ تجلی کو اپنا نور دکھانے کے لئے تیرے قد و رخ کا انتظار تھا۔ کہ ایسی پیاری شکل ملے تو میں اس میں ظہور کروں۔ چنانچہ تیرے قد و رخ کی بدولت ظہور کی قسمت کھلی کہ اب وہ ظاہر ہو گئی آسی نے قسمت کھلی تیرے قد و رخ کے ظہور کی لکھا ہے اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ تجلی کو اپنا اظہار مقصود تھا چنانچہ وہ تیرے قد و رُخ میں ظاہر ہوئی۔ اور اس طرح سے تیری قسمت جاگی۔ گویا یہ شعر نوٹ میں ہے۔

۲۔ خونچکاں لباس کو دیکھ کر ہر شخص متوحش ہوتا ہے لیکن تیرے شہیدوں کے خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں۔ اور وہ ایسے بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ کہ حوریں بھی انہیں حسرت بھری نظروں سے دیکھتی اور دل سے پسند کرتی ہیں۔ بقول حالی یہ شعر حقیقت اور مجاز دونوں پہلو رکھتا ہے مگر بہ نسبت مجاز کے حقیقت پر زیادہ چسپاں ہے طبا طبائی لکھتے ہیں یہ شعر بھی ایسا کہا ہے کہ کروڑوں میں ایک آدھ ایسا نکلتا ہے۔

۳۔ شراب طہور ... پاک شراب جو بہشت میں ملیگی۔ واعظ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔ کہ تمہاری شراب طہور کی کیا بات ہے۔ نہ تم خود اسکو پی سکتے ہو نہ کسی اور کو پلا سکتے ہو۔ مگر اس کی تعریفیں اسقدر کرتے ہو۔ معلوم ہوتا ہے یہ تمہاری شراب طہور محض خیالی شراب ہے۔ جسکی تعریفوں سے تم اپنا اور دوسروں

کا دل خوش کر لیا کرتے ہو جنت کے خیالی ہونے کے متعلق لکھ چکے ہیں کہ

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ خیال اچھا ہے

۴۔ عقیدہ یہ ہے۔ کہ قیامت کے دن جب صور پھونکا جائیگا۔ تو تمام مردے زندہ ہو جائیں گے کہتے ہیں میرا قاتل اس قدر غافل اور بے خبر ہے۔ کہ صورِ قیامت پھونک دیا گیا۔ گویا مردوں کو اٹھنے کا حکم ہو گیا۔ لیکن اسے مطلق خبر نہیں۔ صور کی آواز سے میں جو اٹھا ہوں۔ تو وہ مجھ سے لڑتا ہے کہ تو کیوں اٹھا۔ اس شعر میں معشوق کی غفلت شعاری کے علاوہ دوسرا پہلو یہ ہے۔ کہ وہ مجھ سے اس بات پر لڑتا ہے۔ کہ تو میرا کشتہ ہے۔ تجھ کو میرے حکم سے اٹھنا چاہیئے تھا۔ تو آوازِ صور سن کر کیوں اٹھا۔

۵۔ طیور.... جمع طائر، پرندے۔ بلبل نغمہ سنج ہے۔ اس کی نغمہ سنجی سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ بہار آنے والی ہے چونکہ یہ خبر طیور کی زبانی ہے اور ہم نے اڑتے اڑتے سنی ہے۔ اس لئے خدا جانے یہ سچ ہے یا جھوٹ گویا نغمۂ بلبل بہار کی اڑتی ہوئی خبر ہے۔ بقول طبا طبائی یہ تشبیہ نہایت بدیع ہے۔ اور انصاف یہ ہے کہ نئی ہے۔

۶۔ واں سے مراد خانہ کعبہ ہے۔ زمانہ قدیم میں خانہ کعبہ بت خانہ تھا رسول مقبول ؐ نے بتوں کو توڑ کر اس کو خانۂ خدا بنایا۔ کہتے ہیں اے شخص تو میری بت پرستی پر غضبناک نہ ہو۔ تجھ کو اسی بات پر طیش اور غصہ آتا ہے تا کہ تو خانہ کعبہ کا احترام کرتا ہے۔ اور میں بتوں کو پوجتا ہوں۔ یاد رہے میرے مسلک اور تیرے مذہب میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ کیونکہ زمانہ قدیم میں خانہ کعبہ بت خانہ تھا۔ اور اس میں بت موجود تھے۔ اگر یہ اب وہاں سے نکال لیئے گئے تو کیا ہو گیا آخر ان کو خانہ کعبہ سے دور کی نسبت تو ہے۔

۷۔ یہ کیا ضروری ہے۔ کہ جس طرح حضرت موسیٰ کو کوہِ طور پر صاف جواب مِلا تھا۔ کہ تو ہم کو نہیں دیکھ سکتا۔ اسی طرح ہر ایک کو کورا جواب ملے ممکن ہے۔ کہ ہماری درخواست منظور ہو جائے اور خداوند تعالےٰ ہمیں اپنا جلوہ دکھا دے۔ اس لئے آؤ ہم بھی کوہِ طور کی سیر کریں اور اپنی قسمت آزمائیں مایوسی گناہ ہے۔

۸۔ کہتے ہیں۔ کلام میں گرمی اتنی زیادہ نہیں ہونی چاہیئے۔ کہ جس سے بات کی جائے۔ وہ گرمیٔ کلام کی شکایت زبان پر لائے یعنی بات سنتے ہی چیخ اُٹھے مطلب یہ ہے۔ کہ گرمیٔ کلام میں اعتدال چاہیئے۔

۹۔ حالی۔ اس شعر سے مرزا کی کمال شوخیِ طبع ظاہر ہوتی ہے یہ غزل اس زمانے میں لکھی تھی۔ جبکہ بہادر شاہ مرحوم کا ارادہ حج کو جانے کا تھا کمال اشتیاق ظاہر کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے لئے منت مانتے ہیں۔ کہ حج کا ثواب حضور کی نذر کر دوں گا۔ ادھر سفرِ حج کا وہ اشتیاق ادھر حج کے ثواب کی یہ بے قدری۔

۲۱۱

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے ۱ یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام بہت ہے
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ ۲ ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے
نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں ۳ گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے
کیا زاہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی ۴ پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے
ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں ۵ پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے
زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے کیا طوفِ حرم سے ۶ آلودہ بمے جامۂ احرام بہت ہے
ہے قہر گر اب بھی نہ بنے بات کہ ان کو ۷ انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ ۸ رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

۹ ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالبؔ کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

۱۔ بودا ... کمزور۔ میرا ناکام دل غم کھانے میں بہت کمزور ہے۔ اس لئے اس کو ذرا سے رنج کی بھی تاب نہیں۔ مثلاً آج ہمارے پاس مئے گلرنگ تھوڑی سی ہے۔ بس یہی غم اس کے لئے بہت زیادہ ہے۔ حالانکہ کوئی بات نہیں زیادہ نہ سہی۔ تھوڑی تو ہے لیکن اپنے بودے پن کی وجہ سے اس کو بھی زیادہ غم سمجھتا ہے (بیخود)

آسیؔ۔ میرا دل غم کھانے میں بہت ہی کمزور ہے۔ اگر بہت سی شراب ہوتی۔ تو اس کو پی کر غم کے دن گزار دیتا۔ کیونکہ وہ اندوہ رُبا ہے مگر چونکہ غم زیادہ ہے۔ شراب کم ہے۔ یہ میرے واسطے اور بھی افزونیٔ غم کا سبب ہے۔

۲۔ حالیؔ یعنی قناعت کا تو یہ حال ہے کہ شراب کی تلچھٹ میرے لئے کافی ہے۔ مگر یہی خیال ہے کہ ساقی مجھے ذلیل اور کم ہمت اور قانع بہ ہیچ نہ سمجھے۔ اس پر یہ بات ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ (بیخود۔ سعید)

آسیؔ لکھتے ہیں۔ کہ ساقی کے پاس ادب سے یہ نہیں کہہ سکتا۔ الخ۔

بقول طباطبائیؔ۔ شراب کی حرص کے بیان میں شعرا نے خم خالی کئے ہیں مگر ہمیشہ یہ مضمون بے کیفیت رہا۔ اس شعر کو دیکھیے اس کا مضمون کیسا ہوشربا ہے۔ کہ اس سے بڑھ کر حرص مے کا بیان نہیں ہو سکتا۔

۳۔ بقول حالیؔ۔ کہنا یہ مقصود ہے کہ جو شخص گمنامی اور کس مپرسی کی حالت میں ہوتا ہے۔ اس کا کوئی دشمن اور بدخواہ نہیں ہوتا۔ ساری خرابیاں

شہرت اور افتدار اور نمود کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اس مضمون کو ایک قیدی پرندے کی زبانی اس طرح ادا کیا ہے۔ کہ جب میں آزاد تھا۔ اور اپنے آشیانے میں رہتا تھا۔ تو ہر وقت صیاد کمان میں تیر لگائے گھات میں رہتا تھا کہ کب میں زد پر آؤں اور وہ کب مجھے نشانہ بنا دے۔ کبھی مجھے گرفتار کرنے کے لئے جال بچھاتا تھا وغیرہ وغیرہ۔ غرض ہر وقت بے چینی اور بیقراری دل کو پژمردہ اور متفکر رکھتی تھی۔ گرفتار ہو کر قفس میں آنے کے بعد یہ سب تفکرات دُور ہو گئے اور میں آرام سے ہو گیا۔ تسکین خاطر کا خوب پہلو نکالا ہے۔

۴۔ میں ایسے زُہد کو بھی نہیں مانتا جس میں ریا بالکل نہ ہو۔ کیونکہ اس میں بھی جزا کا خیال بہت زیادہ ہوتا ہے۔ یعنی جو شخص سچے دل سے ریاضت کرتا ہے۔ اس کو یہی خیال ہوتا ہے۔ کہ اس زہد و تقویٰ کے بدلے اگلے جہان میں اسے عیش و آرام ملیگا۔ یہی جزا کا خیال ہے۔ جو زُہد کو میری نظروں میں بے وقعت بنا دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے۔ زہد و تقویٰ بغیر جزا کے خیال کے ہونا چاہیئے۔

۵۔ اہل خرد اپنی کسی روش خاص پر ناز کرتے ہیں۔ بس یہی نا کہ وہ عامیانہ رسموں کے بہت زیادہ پابند ہیں۔ کیا اسی کا نام روش خاص ہے جس پر وہ نازاں ہیں۔ ان کو ناز کرنا اس وقت زیبا تھا۔ جب وہ عامیانہ رسموں کے پابند نہ ہوتے اور کوئی روش خاص رکھتے۔

آسی نے دوسرا مفہوم یہ نکالا ہے۔ کہ اہل خرد بھی دنیا میں بہت ہیں لہذا انکی روش خاص روش خاص نہیں رسم عام ہو گئی۔ اور یہ کچھ قابل فخر نہیں ہے مزا جب تھا۔ کہ جب کوئی روش خاص ہوتی۔ اور وہ اس پر ناز کرتے۔

بقول طباطبائی۔ جس روش کا یہ شعر ہے۔ اس روش پر مصنف کو ناز ہو تو زیبا ہے۔

۶۔ مجھے چاہِ زمزم ہی پر رہنے دو۔ مجھے طوافِ حرم اقدس سے کیا کام ہے۔ میرا جامۂ احرام تو شراب سے آلودہ ہے۔ اگر میں زمزم پر رہوں گا۔ تو اپنا جامۂ احرام پاک کر لوں گا۔ مطلب یہ ہے۔ کہ حج کرنے سے پہلے طہارت جسمانی لازم ہے۔ اور مصنف کی شوخی یہ ہے۔ کہ وہ طہارت بھی آبِ زمزم سے کرنا چاہتا ہے۔ اس مضمون کو اس طرح بھی لکھا ہے۔

رات پی زمزم پہ مے اور صبحدم ۔۔۔ دھوئے دھبّے جامۂ احرام کے

۷۔ ابرام ۔۔۔ اصرار، ضد۔ اگر اب بھی بات نہ بنے اور میرا مقصد حاصل نہ ہو تو نہایت افسوس ہے۔ کیونکہ ان کو انکار نہیں۔ اور میں بہت زیادہ مصر ہوں ۔۔

۸۔ موت سے شکایت کرتے ہیں کہ بہت جلد آ گئی، ابھی تو عشق میں جگر خون ہو کر آنکھ سے بھی ٹپکنے نہیں پایا۔ مجھے کچھ مدت اور اس دنیا میں رہنے دے۔ کیونکہ مجھے یہاں ابھی بہت سے کام کرنے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ابھی ابتدائے عشق ہے تکمیل عشق کی مہلت دے تاکہ منازل عشق کی تمام صعوبتیں اٹھاؤں۔ اور ان سے لطف اندوز ہوں۔

۹۔ کوئی شخص ایسا بھی ہے۔ جو غالب کو نہ جانے۔ یعنی غالب کو سب جانتے ہیں۔ کیونکہ وہ بہت زیادہ بدنام ہے لیکن ایمان کی بات یہ ہے۔ کہ وہ شاعر بھی اچھا ہے۔

۲۱۲

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے ۱ جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو ۲ عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

پھر وضعِ احتیاط سے رکنے لگا ہے دم ۳ برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے

پھر گرمِ نالہ ہائے شرربار ہے نفس ۴ مدت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق ۵ سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخونِ دل ۶ سازِ چمن طرازیٔ داماں کیے ہوئے

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب ۷ نظارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے ۸ پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب ۹ عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال ۱۰ صد گلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا ۱۱ جاں نذرِ دلفریبیٔ عنواں کیے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس ۱۲ زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو ۱۳ سرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ ۱۴ چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں ۱۵ سر زیر بارِ منتِ درباں کیے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن ۱۶ بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

۱۷ غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

۱- یار کو مہماں بلائے ہوئے مدت ہوگئی ہے۔ اور زمانہ گذر گیا ہے کہ شرابِ روشن کے ساغروں سے بزم کو روشن نہیں کیا۔ مطلب یہ کہ یار آئے تو پھر بزم کو جوشِ قدح سے چراغاں کروں۔ شرابِ آتشیں کو چراغ تصور کیا ہے۔

۲۔ عرصہ ہو گیا ہے۔ کہ مژگانِ یار کی دعوت نہیں کی۔ اس لئے جگر کے ٹکڑوں کو میں پھر جمع کر رہا ہوں۔ تاکہ دعوتِ مژگانِ یار کروں۔ ظاہر ہے کہ پہلے دعوتِ مژگانِ یار کر چکے ہیں۔ جس کی وجہ سے دِل ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہے اور اس کو اب جمع کر رہے ہیں۔

طباطبائی۔ جو کچھ غالب نے لکھا ہے۔ پتھر کی لکیر ہے۔ ریزش کا لفظ وہ لطف ہرگز پیدا نہیں کر سکتا۔ جو دعوت نے کیا ہے۔

۳۔ وضع احتیاط سے گریبان پھاڑنے میں احتیاط کرنا مراد ہے۔ برسوں ہو گئے ہیں۔ کہ میں نے گریبان چاک نہیں کیا اس وضع احتیاط کی وجہ سے میرا دل گھبرانے لگتا ہے۔ اور ایک قسم کی بے چینی پیدا ہو گئی ہے۔

۴۔ گرم.... مصروف۔ میرا نفس پھر نالہائے شرربار کھینچنے میں مصروف ہے۔ کیونکہ نالوں کی شرر باری سے جو کیفیت چراغاں کی پیدا ہوتی ہے اسکی سیر کئے ہوئے مدت ہوگئی ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ پھر ایسے نالے کھینچنے کو جی چاہتا ہے۔ جو شرر باری سے چراغاں کا منظر پیدا کر دیں۔

۵۔ جراحتِ دل.... زخمِ دل۔ طبیبِ عشق زخمِ دل کی پرسش اور عیادت کو چلا ہے۔ اور لطف یہ ہے۔ کہ اس کے ساتھ لاکھوں نمکدان ہیں بالفاظِ دیگر عشق پھر زخم دل پر نمک چھڑک کر آتشِ عشق کو مشتعل کرنے والا ہے۔

۶۔ میں خامۂ مژگان کو پھر خونِ دل میں ڈبو رہا ہوں تاکہ اپنے دامن پر گلکاریاں کرو۔ مطلب یہ ہے کہ مژگان کا مو قلم ہے اور خونِ دل کی روشنائی جس سے صفحۂ دامن پر گلکاریاں ہوں گی۔

۷۔ میرے دل اور آنکھوں میں رقابت پیدا ہو گئی ہے۔ کیونکہ دل نے

خیال یار اور آنکھوں نے اس کے نظارے کا پھر سامان فراہم کیا ہے۔

۸۔ طواف ۔۔۔ چکر کاٹنا۔ پندار یعنی غرور، خودداری ۔ میرا دل خودداری کا صنم کدہ ویران کر کے کوئے ملامت کو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خودداری کو ترک کر کے میرا دل کوچہ عشق میں طواف کو چلا ہے جہاں اسے طرح طرح کی ذلتیں اور ملامتیں اٹھانی پڑیں گی۔ گویا پہلے عشق کرنے سے خودداری مانع تھی۔ اب خودداری کا طلسم ٹوٹ گیا ہے۔ خودداری کا صنم کدہ کہنا لطف سے خالی نہیں۔

۹۔ شوق یعنی عشق کو پھر کسی خریدار کی طلب ہے۔ اس لئے اس نے متاع عقل و دل و جان کو سجایا ہے۔ تاکہ کوئی خریدار (معشوق) آئے اور ان چیزوں کی خریداری کرے۔ مطلب یہ ہے عشق کسی معشوق کا طلبگار رہے جو عقل و دل اور جان کو غارت کر دے۔

۱۰۔ طباطبائی۔ گل و لالہ کا حسینوں سے استعارہ ہے۔ اور صد گلستان نگاہ میں گلستاں کو پیمانۂ نگاہ فرض کیا ہے۔ اس سبب سے کہ گلستاں پر نگاہ رغبت اور شوق کی پڑتی ہے۔

سعید۔ صد گلستان نگاہ کئے ہوئے یعنی نہایت ذوق و شوق کیساتھ نگاہ کئے ہوئے۔ آسی۔ ہر گل و لالہ پر خیال دوڑ رہا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ اس صورت سے میری نگاہ کو رشک صد گلستاں بنائے یعنی فوق نظارہ گلستاں سے باثر نظارہ سے بیخود پھر خیال حسینوں کی طرف دوڑنے لگا ہے نگاہ میں سینکڑوں باغوں کا سامان فراہم کئے ہوئے۔

۱۱۔ عنوان ۔۔۔ سرخی۔ نامۂ دلدار کے دلفریب عنوان پر میں اس قدر مفتوں ہوں۔ کہ اس کا خط میں اس طرح کھولنا چاہتا ہوں۔ کہ اپنی جان کو

اس کے عنوان کی دلفریبی پر قربان کردوں یا بقول آسی یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے۔ کہ میرا شوق اس قدر بڑھا ہوا ہے۔ کہ الخ

۱۲۔ پھر میری ہوس نظارہ طلبگار ہے۔ کہ کوئی لب بام کھڑا ہو اور اس کی سیاہ زلفیں اس کے چاند جیسے چہرے کے اردگرد پریشان ہوں۔

۱۳۔ پھر میری آرزو چاہتی ہے۔ کہ کوئی میرے سامنے بیٹھا ہو اور اس نے اپنی مژگاں کے خنجروں کو سرمہ سے تیز کر رکھا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی سرمگیں چشم معشوق میرے سامنے بیٹھا ہو۔ اور وہ تیر نظر سے میرے دل کو زخمی کر رہا ہو۔

۱۴۔ پھر میری نگاہ ایک نوبہار ناز کو ڈھونڈتی پھرتی ہے جس نے اپنے چہرے کو فروغ مے سے گلستاں بنا رکھا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ شراب کے اثر سے اس کے چہرے پر سرخی اور رنگینی نمودار ہو۔ (مے اور ناک اور دیگر الفاظ میں مناسبت ہے)

۱۵۔ پھر جی میں سمائی ہے کہ ہم معشوق کے در پر پڑے رہیں اور ہمارا سر دربان کے بار احسان سے جھکا رہے۔ دربان کا احسان یہ ہے کہ معشوق کے دروازے پر پڑے رہنے کی اجازت دیدے۔

۱۶۔ پھر دل کو آرزو ہے کہ زمانہ گذشتہ کی طرح ہمیں ایسی فرصت مل جائے کہ رات دن تصور جاناں کئے ہوئے بیٹھے رہیں۔ بقول طباطبائی رات دن زلف و رخ کے تصور میں رہیں۔

۱۷۔ ہمیں نہ چھیڑو کیونکہ ہم جوش اشک سے طوفان برپا کرنے کا ارادہ کئے ہوئے بیٹھے ہیں۔ مطلب یہ ہے۔ کہ اگر کوئی چھیڑیگا تو اس قدر روئینگے کہ طوفان برپا کر دیں گے۔

۲۱۳

نویدِ امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لئے ۱ رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے ۲ رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کے لئے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر ۳ نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفتِ رشک ۴ بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لئے

فلک نہ دور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں ۵ دراز دستیِ قاتل کے امتحاں کے لئے

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر ۶ کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے ۷ اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل ۸ کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لئے

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے ۹ بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا ۱۰ کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

نصیرِ دولت و دیں اور معینِ ملت و ملک ۱۱ بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستاں کے لئے

زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آرائش ۱۲ بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے ۱۳ سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لئے

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

۱- نوید ... خوشخبری - بیداد دوست میری جان کے لئے امن اور چین کی خوشخبری ہے - کیونکہ دوست نے کوئی طرزِ ستم آسمان کے لئے باقی نہیں رکھی - سبھی قسم کے ظلم اس نے مجھ پر ختم کر دیئے ہیں - لہذا میری جان جورِ فلک سے بے خطر ہو گئی -

۲- اگر مژگانِ یار تشنۂ خوں ہیں - تو ہوا کریں - آخر میری مژگاں بھی تو خوں فشاں

ہیں۔ اس لئے مجھے چاہیئے۔ کہ کچھ خون میں اپنی مژگان کی خونفشانی کے لئے رکھ لوں، اور تمام کا تمام خون مژہ یار کی نذر نہ کر دوں۔ اگر میں سب خون اس کے حوالے کر دوں گا۔ تو میرے بیچاری اپنی مژگان کے لئے کیا رہیگا۔

۳۔ خضر عمر جاوداں کے مالک ہیں۔ کہتے ہیں۔ جناب خضر آپ کی عمر جاوداں کس کام کی ہے۔ نہ کسی سے ملتے جلتے ہو۔ نہ کسی کو دکھائی دیتے ہو۔ بلکہ عمر جاوداں کے لئے چور بن گئے ہو بھلا یہ کوئی زندگی ہے۔ زندہ ہم ہیں۔ کہ تمام دنیا سے روشناس ہیں اور ہر ایک سے کھلم کھلا ملتے ہیں۔

۴۔ میں مصیبت میں مبتلا ہوں۔ لیکن پھر بھی رشک نے مجھے نہیں چھوڑا یعنی مصیبت میں مصیبت یہ ہے۔ کہ میں مبتلائے آفت رشک ہوں اور یہ رشک اس بات کا ہے۔ کہ تیری ادا بلا ہی سہی لیکن وہ سارے جہاں کے لئے بلائے جاں کیوں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اگر بلا بھی تھی۔ تو صرف میرے لئے ہونی چاہیئے تھی۔

۵۔ اے فلک یہ درست ہے۔ کہ قاتل کی درازدستی کا امتحان اسی وقت ہو سکتا ہے۔ جبکہ شکار اس سے دور ہو۔ لیکن کیا صرف میں ہی اس امتحان کے لئے رہ گیا ہوں کہ تو نے مجھے قاتل سے دور رکھا ہے۔ اے فلک مجھے اس سے دور نہ رکھ۔ کیونکہ اور بھی بہت ہیں۔ جن کو دور رکھ کر قاتل کی درازدستی کا امتحان ہو سکتا ہے۔

۶۔ میری کوشش اور سعی کی مثال ایسی ہے۔ جیسے کوئی اسیر پرندہ قفس میں آشیانہ بنانے کے لئے تنکے جمع کرتا ہو۔ گویا میری کوشش بے سود بھی ہے۔ اور قابلِ رحم بھی۔ بقول حالیؔ۔ اس سے زیادہ سختی کسی پیرایہ میں بیان نہیں ہو سکتی۔

۷۔ حالی۔ غالب نے اتنے بڑے مضمون کو کہ میں جو معشوق کے مکان پر پہنچا۔ تو اول خاموش کھڑا رہا۔ پھر پاسبان کے قدموں پر گر پڑا اب اس نے جانا کہ اس کا مطلب کچھ اور ہے۔ اس لیئے میرے ساتھ وہ سلوک کیا کہ ناگفتہ بہ ہے۔ اس شعر میں ادا کیا ہے۔

جو واقعہ میرزا نے اس شعر میں بیان کیا ہے۔ اس میں دو باتوں کی تصریح کرنی ضرور تھی۔ ایک یہ کہ پاسبان نے سائل کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ دوسرے یہ کہ سائل پاسبان سے چاہتا کیا تھا۔ سو یہ دونوں باتیں بہ صراحت بیان نہیں کی گیئں۔ صرف کنایہ میں ادا کی گئی ہیں۔ مگر صراحت زیادہ وضوح کے ساتھ فوراً سمجھ میں آجاتی ہے پہلی بات پر لفظِ ندامت اور دوسری پر قدم لینا صرف دلالت کرتا ہے۔ اس کے سوا روزمرہ کی نشست اور الفاظ کی بندش اور ایک وسیع خیال کو دو مصرعوں میں ایسی خوبی سے ادا کرنا کہ نثر میں بھی اس طرح ادا کرنا مشکل ہے۔ یہ سب باتیں تعریف کے قابل ہیں۔

۸۔ غزل کا تنگ میدان میرے شوق کے مقابلے میں کم ہے۔ یعنی جن مضامین شوق کو میں بیان کرنا چاہتا ہوں وہ غزل میں نہیں لکھ سکتا میرے بیان کے لئے کچھ اور زیادہ وسعت چاہیئے۔ لہذا غزل سرائی چھوڑ کر مدح سرائی شروع کرتا ہوں۔

۹ تجمل حسین خاں فرخ آباد کے نواب تھے۔ انہوں نے کمالِ شوق سے غالب کو بلوایا تھا۔ کہتے ہیں کہ اصل میں خدا نے عیش و آرام محض تجمل حسین خاں کے لیئے بنایا ہے۔ لیکن دوسروں کو بھی مصلحت سے تھوڑا بہت عیش و آرام دے دیا ہے۔ کہ تجمل حسین کے عیش و آرام کو نظر نہ لگے۔

۱۰- یا اللہ میری زبان پر یہ کس کا نام آیا ہے۔ کہ میری زبان نے میرے منہ کو متعدد بار چوما۔ تجمل حسین خاں کہتے ہیں زبان کئی مرتبہ کام و دہن کو چھوتی ہے۔ اسی کو بوسہ سے تعبیر کیا ہے۔ یا یہ کہ خوشی کی وجہ سے زبان نے منہ کو چوما۔ یا جس کے اثر سے میرے نطق نے میری زبان کو چوم لیا، واقعہ یہ ہے۔ کہ سچ مچ چومنا مراد نہیں صرف اظہارِ محبت مقصود ہے۔

۱۱- نصیر.... مددگار- دولت.... حکومت بعین.... مددگار وہ دین و دولت کا مددگار اور ملک وملت کا حامی ہے۔ اور اس کا مرتبہ اس قدر بلند ہے۔ کہ چرخ بریں اس کے آستانے کیواسطے بنایا گیا ہے

۱۲- حالی- مرزا نے اپنے ممدوح کو ایک ایسے کمال کے ساتھ موصوف کیا ہے۔ جو تمام کمالات کی جڑ ہے یعنی وہ ہر چیز کو کامل تر اور افضل تر حالت میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اس لیے ہر شے اپنے تئیں کامل تر حالت میں اس کو دکھانا چاہتی ہے۔ اور اس سے یہ نتیجہ نکالا۔ کہ اگر یہی حال ہے تو شاید آسمان کی زیب و زینت کے لیے اور ستارے پیدا کیے جائیں اس پر سوائے اس کے کہ کوئی منطقی اعتراض کیا جائے۔ اور کسی طرح کی گرفت نہیں ہو سکتی۔

طباطبائی لکھتے ہیں۔ کہ "مولوی حالی صاحب نے جو معنی لکھے ہیں۔ اس پر کوئی قرینہ نہیں۔ مطلب یہ ہے۔ کہ ممدوح کا نام تجمل حسین ہے اسی سبب سے زمانہ اس کے عہد میں مصروف تجملہ آرائش ہے۔ کیا عجیب ہے کہ زہرہ و مشتری کی طرح آسمان کے لیے اور ستارے بھی بن جائیں۔"

۱۳- ممدوح کی تعریف: مدح لکھتے لکھتے ورق ختم ہو گیا اور اس کی تعریف ابھی اتنی باقی ہے۔ کہ معلوم ہوتا ہے۔ اس بحرِ بیکراں ناپیدا کنار (سمندر)

کے لئے ایک سفینہ (کشتی) درکار ہے یعنی اُس کی تعریف بہت ہے وہ چند کاغذوں پر نہیں لکھی جا سکتی۔ سفینہ کا لفظ بحر کی مناسبت سے لائے ہیں اور اس سے مقصود دفتر یا بہت بڑی بیاض ہے۔

۴۱۔ میں آج ادائے خاص سے نکتہ سرا ہوا ہوں یعنی میں نے غزل میں مدح لکھی ہے میں یارانِ نکتہ دان کو صلائے عام دیتا ہوں کہ وہ بھی غزل میں مدح کرنے کا یہ نیا ڈھنگ اختیار کریں۔

قصائد

ساز یک ذرہ نہیں فیضِ چمن سے بیکار ۱ سایۂ لالۂ بے داغ سویدائے بہار
مستیِ بادِ صبا سے ہے بعرضِ سبزہ ۲ ریزۂ شیشۂ مے جوہرِ تیغِ کہسار
سبز ہے جامِ زمرد کی طرح داغِ پلنگ ۳ تازہ ہے ریشۂ نارنج صفت روئے شرار
مستیِ ابر سے گلچینِ طرب ہے حسرت ۴ کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار
کوہ و صحرا ہمہ معموریِ شوقِ بلبل ۵ راہِ خوابیدہ ہوئی خندۂ گل سے بیدار
سونپے ہے فیضِ ہوا صورتِ مژگانِ یتیم ۶ سرنوشتِ دو جہاں ابر بہ یک سطرِ غبار
کاٹ کر پھینکیے ناخن تو بہ اندازِ ہلال ۷ قوتِ نامیہ اس کو بھی نہ چھوڑے بیکار
کفِ ہر خاک بگردوں شدہ قمری پرواز ۸ دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ طاؤس شکار
میکدے میں ہو اگر آرزوئے گل چینی ۹ بھول جا یک قدحِ بادہ بطاقِ گلزار
موجِ گل ڈھونڈھ بہ خلوتکدۂ غنچۂ باغ ۱۰ گم کرے گوشۂ میخانہ میں گر تو دستار
کھینچے گر مانیِ اندیشہ چمن کی تصویر ۱۱ سبز مثلِ خطِ نوخیز ہو خطِ پرکار
لعل سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ ۱۲ طوطیِ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار

۱۳ وہ شہنشاہ کہ جس کی پئے تعمیر سرا — چشمِ جبریل ہوئی قالبِ خشتِ دیوار

۱۴ فلک العرش ہجومِ خمِ دوشِ مزدور — رشتۂ فیضِ ازل سازِ طنابِ معمار

۱۵ سبزۂ نہ چمن و یک خطِ پشتِ لبِ بام — رفعتِ ہمتِ صد عارف و یک اوجِ حصار

۱۶ واں کی خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پرِ کاہ — وہ رہے مروحۂ بالِ پری سے بیزار

۱۷ خاکِ صحرائے نجف جوہرِ سیرِ عرفا — چشمِ نقشِ قدم آئینۂ بختِ بیدار

۱۸ ذرہ اس گرد کا خورشید کو آئینۂ ناز — گرد اس دشت کی امید کو احرامِ بہار

۱۹ آفرینش کو وہاں سے طلبِ مستئ ناز — عرضِ خمیازۂ ایجاد ہے ہر موجِ غبار

مطلعِ ثانی

۱ فیض سے تیرے ہے اے شمعِ شبستانِ بہار — دلِ پروانہ چراغاں، پرِ بلبل گلزار

۲ شکلِ طاؤس کرے آئینہ خانہ پرواز — ذوق میں جلوہ کے تیرے بہوائے دیدار

۳ تیری اولاد کے غم سے ہے بروئے گردوں — سلکِ اختر میں مہِ نو مژۂ گوہر بار

۴ ہم عبادت کو ترا نقشِ قدم مہرِ نماز — ہم ریاضت کو ترے حوصلے سے استظہار

۵ مدح میں تیری نہاں زمزمۂ نعتِ نبی — جام سے تیرے عیاں بادۂ جوشِ اسرار

۶ جوہرِ دستِ دعا آئینہ یعنی تاثیر — یک طرف نازشِ مژگاں و دگر سو غمِ خار

۷ مردمک سے ہو عزا خانۂ اقبالِ نگاہ — خاکِ در کی ترے جو چشم نہ ہو آئینہ دار

۸ دشمنِ آلِ نبی کو بہ طرب خانۂ دہر — عرضِ خمیازۂ سیلاب ہو طاقِ دیوار

۹ دیدہ تا دل اسد آئینۂ یک پرتوِ شوق — فیضِ معنی سے خطِ ساغرِ راقم سرشار

۱۔ ذرہ کو ایک ساز تصور کیا ہے فیضِ چمن ..... اثر بہار ۔ لالہ بیداغ ... اثر بہار مراد ہے ۔ مطلب ہے ۔ بہار کے اثر سے لالہ کا داغ دور ہو گیا

ہے۔ داغ سیاہ ہوتا ہے۔ بہار میں سیاہی کا کیا کام ہے۔ اس وقت تو
ہر طرف سبزہ ہی سبزہ ہونا چاہیئے۔

سویدا.... دل میں ایک سیاہ تل ہوتا ہے۔ کہتے ہیں فیض بہار سے
باغ کا کوئی ذرہ بیکار نہیں رہا۔ ہر ذرہ کا ساز متحرک ہے۔ یہاں تک
کہ لالہ کا داغ دور ہو گیا ہے۔ حسنِ تناسب کا یہ عالم ہے۔ کہ لالے کا سایہ
گویا بہار کے دل کا سویدا بن گیا ہے۔ سایہ ایک بیکار چیز تھی لیکن شاعر
نے ابرِ بہار دکھانے کے لیئے اسے بھی باکار بنا دیا ہے۔ طباطبائی لکھتے
ہیں۔ لالے کی صفت بے داغ سے دو باتیں پیدا ہوئیں ایک تو رنگِ بہار
کی خوبی لالے میں داغ نہیں رہا۔ دوسرے یہ کہ داغ اگر لالے میں ہوتا تو وہی سویدائے
بہار تھا۔ لیکن جب اس میں داغ نہیں ہے تو اس کے سایئے میں سویدائے
بہار کا حسن و تناسب پیدا ہو گیا۔

۲۔ عرض.... ظاہر کرنا۔ تیغ کہسار۔ قلۂ کوہ کو تیغ کہسار کہتے ہیں۔
یعنی پہاڑ کی چوٹی۔ جوہر.... یعنی سبزۂ کہسار۔ عرض و جوہر اور جوہرِ تیغ
لفظی رعایت رکھتے ہیں۔ پہلے کہسار کو ایک تیغ قرار دیا۔ پھر سبزۂ کہسار
کو جوہرِ تیغ جوہرِ تیغ کی تیزی ظاہر کرنے کے لیئے کہا ہے کہ بادِ صبا کی مستی کے اثر
سے وہ سبزہ جو تیغ کہسار کا جوہر تھا مینائے شراب کے ریزے بن
گیا ہے۔ ظاہر ہے سبزہ کو مینا کی کرچوں کے ساتھ رنگ میں مشابہت
ہے۔ بقول طباطبائی اس شعر میں عرض و جوہر کو جمع کیا ہے۔

۳۔ زمرد.... سبز رنگ کا قیمتی پتھر۔ داغِ پلنگ.... چیتے کی کھال پر
سیاہ دھبے ہوتے ہیں۔ ریشۂ نارنج صفت.... نارنج کے ریشوں کی طرح
اس شعر میں بھی تاثیرِ بہار دکھائی ہے کہتے ہیں بہار کے اثر

سے چیتے کے سیاہ داغ جام زمرد ین کی طرح سبز ہو گئے ہیں۔ اور شرارے نارنج کے ریشوں کی طرح تروتازہ ہو گئے ہیں۔ شرر کو ریشۂ نارنج سے سرخی کی وجہ سے مشابہت تامہ حاصل ہے۔ یہ دونوں تشبیہیں نہایت بدیع ہیں۔

۴۔ گلچین طرب... مسرت کے باغ سے گل چینی کرنے والی یعنی بہت زیادہ محظوظ۔ دو عالم کا فشار... دونوں عالم کے غم فراموش ہو جانا۔ لفظ فشار اور آغوش میں رعایت پیدا ہو گئی ہے۔ ہر طرف ابر چھایا ہے گویا اس نے دو عالم کو اپنی آغوش میں لے لیا ہے۔ یہ کیفیت دیکھ کر میرے دل میں حسرت پیدا ہوتی ہے۔ کہ دیکھو ابر نے دو عالم کو اپنی آغوش میں کھینچ رکھا ہے۔ حسرت اس وجہ سے ہے۔ کہ میری آغوش خالی ہے لیکن یہ حسرت تکلیف دہ نہیں طرب انگیز ہے۔ کیونکہ مستی ابر سے میں بھی مسرور ہوں۔ اور اس طرح سے دو عالم کے غموں کا فراموش ہو جانا ممکن ہے۔ خوشی کی ترنگ میں انسان اکثر غم بھول جاتا ہے۔

۵۔ معموری... آباد۔ راہ خوابیدہ... سونی راہیں جہاں کوئی نہ چلے پھرے۔ خندۂ گل... پھول کے چٹکنے کی آواز۔ بیدار... آباد، پر رونق۔ وہ رستے جو سونے پڑے تھے۔ موسم بہار کی آمد سے پر رونق ہو گئے ہیں۔ اور تمام کوہ و صحرا بلبلوں کے جمگھٹوں سے آباد ہیں۔ بلبلیں وہیں چہچہے کرتی ہیں جہاں پھول ہوتے ہیں۔ پھولوں کے چٹکنے کو خندۂ گل کہہ کر مسرت کا ایک سماں پیدا کر دیا ہے۔

آسی نے راہ خوابیدہ سے مراد وہ لوگ لئے ہیں جو راہ میں سو گئے تھے۔ گویا وہ خندۂ گل سے بیدار ہو گئے ہیں۔ دوسرے معنی وہی لکھے ہیں۔

طباطبائی لکھتے ہیں، کہ معموری کی جگہ معمورہ استعمال کرنا بہتر تھا۔

۶۔ فیضِ ہوا..... موسم بہار کی تاثیر۔ مژگانِ یتیم ... یتیم کی خاک آلود آنکھوں سے مدتوں اشک جاری رہتے ہیں۔ سرنوشت .... تقدیر، قسمت کا لکھا دوچھار ابر ... بہت زیادہ ابر۔ یک سطر غبار ... تھوڑا سا غبار ... اگر آسمان پر ذرا سا غبار آتا ہے تو باد بہاری اس کو مژگانِ یتیم کی خاصیت عطا فرماتی ہے۔ گویا مژگان یتیم کی طرح مدتوں اشک برساتا ہے۔ مطلب ہے۔ کہ فیض ہوا سے غبار میں بھی ابر کثیر کی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ مرزا صاحب نے اس شعر میں کمالِ نازک خیالی دکھائی ہے۔ الفاظ بھی نہایت مناسب ہیں۔

۷۔ باندازِ ہلال ... ہلال کی طرح۔ قوتِ نامیہ .... بڑھنے کی قوت، بالیدگی قوتِ نامیہ میں اسقدر زور پیدا ہو گیا ہے کہ اگر ناخن تراش کر پھینکتے ہیں تو وہ ہلال کی طرح خود بخود بڑھتے بڑھتے بدر بن جاتا ہے۔ تراشے ہوئے ناخن کی شکل ہلال جیسی ہوتی ہے۔

۸۔ کفِ ہر خاک ... خاک کی ہر مٹھی۔ قمری کا رنگ خاکستری ہوتا ہے اس لئے ہر کفِ خاک قمری بن گئی۔ بہ گردوں شدہ .... خاک کی صفت ہے خاک اڑ کر آسمان کی طرف جاتی ہے۔ کاغذِ آتش زدہ .... جلا ہوا کاغذ۔ کاغذ جل جانے کے بعد جال کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ کیونکہ اس میں جالی پڑ جاتی ہے تاثیر ہوا سے ہر چیز میں جان پڑ جاتی ہے۔ حد یہ ہے کہ خاک کی ہر مٹھی جب آسمان کی طرف چڑھی تو وہ قمری بن گئی۔ اور کاغذ جل جانے کے بعد دام بن گیا۔ جو طاؤس کو شکار کرتا ہے۔

۹۔ اگر تجھے بھی میکدے میں بیٹھ کر گل چینی کرنے کی آرزو ہے تو بہار کی تاثیر

تیری اس آرزو کو بھی پورا کر دیگی۔ اس آرزو کو پورا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ شراب کا ایک پیالہ بھر اور اسے طاقِ گلزار میں رکھ کر بھول جا۔ قوتِ نامیہ اس پیالے سے ہزار پیالے اور ہزار طاق پیدا کر دیگی گویا گلزار میں میکدہ پیدا ہو جائیگا۔ اور تو میکدے میں گل چینی کی آرزو پوری کر سکے گا۔

۱۰۔ اگر تو نشے کے عالم میں اپنی پگڑی میکدے کے کسی کونے کھدرے میں بھول جائے تو پھر تجھے اس پگڑی کو میخانے کے کونوں میں نہیں ڈھونڈنا چاہیئے۔ بلکہ اس کو غنچہ باغ کے خلوت خانے میں ڈھونڈنا چاہیئے۔ فیضِ بہار سے گوشۂ میخانہ غنچۂ باغ کا خلوت کدہ بن جائے گا اور تیری گم شدہ دستار موجِ گل ہو جائے گی۔

سبحان اللہ کیا نازک خیالی ہے۔ پگڑی جب تک بندھی رہتی ہے غنچہ کی مثل ہے ۔۱۱۔ مانیٔ اندیشہ۔۔۔ مانی بابل کا مشہور مصور ہے۔ اس نے اپنی مصوری کی وجہ سے پیغمبری کا دعویٰ کیا تھا۔ اور اپنی مصوری کو اپنا معجزہ قرار دیا تھا۔ مراد ہے اندیشہ یعنی قوتِ متخیلہ۔ خطِ نوخیز۔۔۔ سبزہ آغاز۔ اگر مانیٔ اندیشہ چمن کی تصویر کھینچے تو بادِ بہاری کی تاثیر سے اس کا خطِ پرکار خطِ نوخیز کی طرح سبز ہو جائے۔ طباطبائی لکھتے ہیں۔ کہ مانیٔ اندیشہ کو تصویر اتارنے میں پرکار کی کیا ضرورت ہے پھر خود ہی فرماتے ہیں کہ پرکار سے بھی پرکار کا اندیشہ مراد ہے

۱۲۔ منقار۔۔۔ چونچ۔ مدحت۔۔۔ مدح۔ طوطی۔۔۔ ایک سبز رنگ کا چھوٹا سا پرندہ جو مثل طوطے کے بولتا ہے۔ بادشاہ کی مدح سرائی کے لیئے سبزہ کہسار کے طوطی نے لعل سے زبان پیدا کر لی ہے۔ سبزہ کوہسار کو طوطی اور لعل کو منقار طوطی قرار دے کر یہ ظاہر کیا ہے کہ یہ سرخ منقار والا طوطی تیری مدح سرائی کے لیئے پیدا ہوا ہے۔ لطف یہ ہے کہ لعل اور سبزہ کوہساروں ہی میں ہوتا ہے۔

۱۳۔ قالب۔۔۔ سانچہ۔ خشت۔۔۔ اینٹ ــــ یہ طوطی اس بادشاہ کی تعریف

کریگا جسکے محل کی تعمیر کے لیے جبرئیل کی آنکھیں اینٹیں بنائی گئی ہیں

۱۴۔ فلک العرش.... آسمان ہفتم۔ ہجوم کثرت خمیدگی کو ظاہر کرنے کے لیے لائے ہیں۔ خم.... خمیدگی۔ رشتہ.... سلسلہ۔ سار.... سامان۔ طناب..... وہ سوت جس سے معمار دیوار کا سیدھا یا ٹیڑھا پن دیکھتے ہیں ــــ اس عالیشان محل کی تعمیر کے لئے ساتواں آسمان دوشِ مزدور کی طرح بہت ہی زیادہ خم ہو گیا ہے۔ اس محل کو بنانے والے معمار کا سوت فیض ازل کا رشتہ ہے یعنی اس محل کی تعمیر میں فیض ازل نگہدار ہے۔

حسرت آسی اور سعید خم کے معنی مٹکے کے لیتے ہیں گویا فلک العرش ایک بڑا سا خم ہے۔ کہ مزدور تعمیر کے لئے اس میں پانی بھر کر لاتے ہیں۔

۱۵۔ سبزہ نہ چمن.... نو آسمان کی سبزی، یعنی بہت ہی زیادہ سبزی ممدوح کے محل کی پشتِ لبِ بام کا ایک خط نو چمنوں یا آسمانوں کے سبزہ کے برابر ہے۔ اور اس کے محل کی بلندی نو عارفوں کی ہمت کے برابر بلند ہے اور دونوں مصرعوں میں مساوات کے معنی دے رہی ہیں۔

طباطبائی لکھتے ہیں۔ حرف عطف ان معنوں میں محض فارسی میں استعمال ہوتا ہے۔

۱۶۔ خاشاک.... تنکے وغیرہ۔ کاہ.... سوکھی ہوئی گھاس۔ مروحہ.... پنکھا، بال پری.... پری کے بازو ــــ اس محل کے کوڑے کرکٹ میں سے جس شخص کو ایک تنکا مل جائے وہ پری کے بازو کے پنکھے سے بھی بیزار ہو جائے۔

طباطبائی لکھتے ہیں۔ کہ یہ مبالغہ غیر عادی ہے۔ کیونکہ بیزاری کا کوئی سبب نہیں"۔ حالانکہ وجہ معقول موجود ہے۔

۱۷۔ نجف ..... جہاں حضرت علی کا روضہ ہے۔ عرفا ..... عارف کی جمع۔
جوہر وہ ہے جس سے دوسری شے قایم ہو۔ اور اس کی ذات بذاتِ خود قایم ہو۔ صرف صحرائے نجف کی خاک عارفوں کی سیر کا جوہر ہے۔ اور صحرائے نجف کی زمین پر جو نقشِ قدم بنتے ہیں۔ وہ گویا بختِ بیدار کا آئینہ ہوتے ہیں یعنی ان میں بختِ بیدار کی صورت نظر آتی ہے۔

۱۸۔ صحرائے نجف کا ہر ذرہ خورشید کے لئے آئینہ ناز ہے حالانکہ قاعدہ یہ ہے۔ کہ ذرہ خورشید پر ناز کرتا ہے۔ اور وحشت کی گرد محض نسبتِ نجف کی وجہ سے امید کے لئے فصلِ بہار کا جامۂ احرام ہے۔

۱۹۔ حسرت :۔ ایجاد کو اس خاک پاک کی آفرینش پر ناز ہے پس نجف کی ہر موجِ غبار گویا آفرینش و ایجاد کی انگڑائی ہے جس کے ذریعہ وہ بزبانِ حال یہ ظاہر کرتے ہیں۔ کہ ہم کو اس شراب فخر و ناز (یعنی ناز ایجاد نجف) کی پھر خواہش ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے۔ کہ اس سرزمین کو پیدا کر کے آفرینش کو بار بار ناز ہوتا ہے۔

مطلعِ ثانی

۱۔ اے شمع شبستانِ بہار تیرے فیض سے سب کی مرادیں حاصل ہو گئی ہیں۔ پروانے کا دل چراغاں بن گیا ہے۔ بلبل کے پر گلزار ہو گئے ہیں ظاہر ہے پروانہ کا معشوق چراغ ہے۔ اور بلبل کا محبوب پھول۔

۲۔ کیا تعجب ہے۔ کہ آئینہ خانہ تیرے جلوۂ شوق اور تیرے دیدار کے ذوق میں مثلِ طاؤس پرواز کرنے لگے۔ اس نادر تشبیہہ کی بھی تعریف کرتے ہیں۔

۳۔ غم سے مراد یہاں غم آلِ رسول، یعنی اولادِ حضرت علی ہے۔ کہتے ہیں۔ اے شاہِ نجف تیری اولاد کے غم میں یہ آسمان پر ستاروں کی لڑی میں مہ تو گوہر بار بن گیا ہے۔ مہ نو کو مژہ اور ستاروں کو سلک اشک قرار دیا ہے۔ اشارہ یہ ہے کہ غم حسین میں جو آنسو نکلتے ہیں۔ وہ موتی کا مرتبہ رکھتے ہیں۔

۴۔ بقول طباطبائی۔ ہم اس شعر میں بھلا معلوم نہیں ہوتا فارسی میں یہ استعمال قابلِ اعتراض نہیں۔ مہر نماز سے مراد سجدہ گاہ ہے جس پر اہلِ تشیع سجدہ کرتے ہیں۔ استظہار۔۔۔ پشت پناہ ۔۔۔ کہتے ہیں تیرا نقش قدم عبادت کے لئے سجدہ گاہ ہے۔ اور تیرا حوصلہ ریاضت کے لئے پشتِ پناہ یعنی تقویت کا باعث ہے۔

۵۔ تیری مدح میں نعت نبی کا زمزمہ پوشیدہ ہے یعنی تیری مدح در پردہ نبی کی مدح ہے۔ اور جس شخص نے تیری محبت کا جام پی لیا۔ سمجھ لو وہ بادۂ اسرار سے سرشار ہو گیا۔

۶۔ دستِ دعا کو آئینہ اور دعا کی تاثیر کو اس آئینہ کا جوہر تصور کیا ہے کہتے ہیں۔ ایک طرف دعا کی تاثیر مژگانِ اشک ریز کے لئے باعثِ ناز ہے کیونکہ صدقِ دل سے دعا کرتے وقت آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں اور دعا قبول ہو جاتی ہے۔ اور دوسری طرف خارِ حسرت کے لئے رنج و ملال کا موجب کیونکہ دعا قبول ہونے پر حسرت پامال ہو جاتی ہے۔

۷۔ مردمک۔۔۔ آنکھ کی پتلی۔ پتلی سیاہ ہوتی ہے اس لئے اس کو عزاخانہ سے تشبیہہ دی ہے۔ اقبال۔۔۔ بخت مندی و کامرانی۔ آئینہ دار۔۔۔۔ فرمانبردار، تابع ۔۔ جو آنکھ تیرے در کے خاک کی فرمانبردار اور تابعدار نہ ہو۔ اسکی نگاہ اقبال کا عزاخانہ بن جائے یعنی وہ ہمیشہ اقبال کے سوگ میں

سیاہ پوش رہے۔ اور اس کو اقبال مندی دیکھنی نصیب نہ ہو۔

۸۔ طاقِ محراب کی وجہ سے خمیازۂ سیلاب سے تشبیہہ دی ہے خمیازۂ سیلاب۔۔۔ موج سیلاب۔ خدا کرے آلِ نبی کے دشمن کے لئے اس دنیا کے عشرت کدہ کا ہر طاق دیوار موج سیلاب بن جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کو کبھی خوشی نصیب نہ ہو۔

۹۔ اسد اللہ آنکھ سے لے کر دل تک ہیں ایک آئینہ پرتو شوق بن گیا ہوں یعنی سرتاپا شوق بن گیا ہوں۔ اور معنیٔ شوق سے میرے ساغر کا خط سرشار ہے۔ طباطبائی لکھتے ہیں۔ کہ خط کا لفظ محض مناسبت کی وجہ سے لائے ہیں۔ ورنہ اس کی ضرورت نہ تھی۔ گویا شعر کا مفہوم محض اس قدر ہے۔ کہ معنی شوق سے سرشار ہے۔

قصیدہ نمبر ۲

دہر جز جلوۂ یکتائیٔ معشوق نہیں ۔۔۔ ۱ ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

بیدلیہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق ۔۔۔ ۲ بیکسیہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بم ہستی و عدم ۔۔۔ ۳ لغو ہے آئینۂ فرقِ جنون و تمکیں

نقشِ معنی ہمہ خمیازۂ عرضِ صورت ۔۔۔ ۴ سخنِ حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسیں

لاف دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم ۔۔۔ ۵ دردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

مثلِ مضمونِ وفا باد بدستِ تسلیم ۔۔۔ ۶ صورتِ نقشِ قدم خاک بفرقِ تمکیں

عشق بے ربطیٔ شیرازۂ اجزائے حواس ۔۔۔ ۷ وصل زنگارِ رخِ آئینۂ حسنِ یقیں

کوہکن گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب ۔۔۔ ۸ بے ستوں آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں

کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتش خیز ۔۔۔ ۹ کس نے پایا اثرِ نالۂ دلہائے حزیں

سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں لیکن ۱۰ نہ سر و برگِ ستائش نہ دماغِ نفرین

کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ ۱۱ یک قلم خارجِ آدابِ وقار و تمکین

نقشِ لاحول لکھ اے خامۂ ہذیان تحریر ۱۲ یا علی عرض کر اے فطرتِ وسواس قرین

مظہرِ فیضِ خدا جان و دلِ ختمِ رسل ۱۳ قبلۂ آلِ نبی کعبۂ ایجادِ یقین

ہو وہ سرمایۂ ایجاد جہاں گرمِ خرام ۱۴ ہر کفِ خاک ہے واں گردۂ تصویرِ زمین

جلوہ پرداز ہو نقشِ قدم اُس کا جس جا ۱۵ وہ کفِ خاک ہے ناموسِ دو عالم کی امین

نسبتِ نام سے اسکی ہے یہ رتبہ کہ رہے ۱۶ ابداً پشتِ فلک خم شدۂ طرزِ زمین

فیضِ خلق اسکا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا ۱۷ بوئے گل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگین

برشِ تیغ کا اُس کی ہے جہاں میں چرچا ۱۸ قطع ہو جائے نہ سر رشتۂ ایجاد کہیں

کفر سوز اُس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے ۱۹ رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بتخانۂ چین

جاں پناہا دل و جاں فیض رسانا شاہا ۲۰ وصیِ ختمِ رسل تو ہے بہ فتوائے یقین

جسمِ اطہر کو ترے دوشِ پیمبر منبر ۲۱ نامِ نامی کو ترے ناصیۂ عرش نگین۔

کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب ۲۲ شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئین

آستاں پر ہے ترے جوہرِ آئینۂ سنگ ۲۳ رقمِ بندگیٔ حضرتِ جبریلِ امین

تیرے در کے لئے اسبابِ نثار آمادہ ۲۴ خاکیوں کو جو خدا نے دیئے جان و دل و دین

تیری مدحت کیلئے ہیں دل و جاں کام و زباں ۲۵ تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جبین

کس سے ہو سکتی ہے مداحیِ ممدوحِ خدا ۲۶ کس سے ہو سکتی ہے آرائشِ فردوسِ برین

جنسِ بازارِ معاصی اسد اللہ اسدؔ ۲۷ کہ سوا تیرے کوئی اُس کا خریدار نہیں

شوخیٔ عرضِ مطالب میں ہے گستاخِ طلب ۲۸ ہے ترے حوصلۂ فضل پہ از بسکہ یقین

دے دعا کو مری وہ مرتبۂ حسنِ قبول ۲۹ کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آمین

غمِ شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز ۳۰ کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگین

طبع کو الفت دُلدل میں یہ سرگرمی شوق ۳۱ کہ جہاں تک چلے اُس سے قدم اور مجھ سے جبیں

دلِ الفت نسب و سینۂ توحید فضا ۳۲ نگہِ جلوہ پرست و نفسِ صدق گزیں

۳۳ صرفِ اعدا اثرِ شعلۂ دودِ دوزخ

وقفِ احباب گل و سنبلِ فردوس بریں

۱- صوفیائے کرام کا عقیدہ ہے۔ کہ جتنی جس شخص اور چیز میں قابلیت ہوتی ہے اتنا ہی اس کو نور پہنچتا ہے۔ فرماتے ہیں تمام دنیا ذات باری کی جلوہ گاہ ہے۔ اور اس کی تخلیق کا باعث اس معشوقِ حقیقی کی خود بینی ہے اگر اسے اپنا پر تو وجود دیکھنا مقصود نہ ہوتا تو کوئی چیز دنیا میں پیدا نہ ہوتی۔ یوں سمجھنا چاہیئے۔ کہ تمام مخلوقات ایک آئینہ ہے جس میں وہ اپنا جمال دیکھتا ہے۔ اور اس کی تخلیق کا سبب اس کی خود بینی ہے۔

۲- تماشہ یعنی نظارۂ عالم —— فرماتے ہیں ہم نے اس دنیائے فانی کا نظارہ ایسی بے دلی سے کیا۔ کہ اس سے نہ عبرت حاصل ہوئی نہ ذوق۔ اسی طرح ہماری تمنا بالکل بیکس ہے۔ کہ نہ وہ دنیا سے متعلق ہے نہ دین سے بقول بیخود طباطبائی اگر انسان دنیا کے تماشے سے عبرت حاصل کرے۔ تو دین کا فائدہ ہے اور اگر لطف اٹھائے تو دنیا کے مزے ہیں۔ مگر ہماری بے دلی تماشا بے کسی تمنا نے دونوں فائدوں سے ہمیں محروم رکھا۔

۳- ہرزہ ... لغو، بیہودہ۔ زیر و بم .... نیچی اور اونچی آواز ہستی کو بم اور زیر کو عدم سے مشابہ کیا ہے۔ تمکین .... ہوشیاری۔ ہستی اور نیستی کے نغمے بالکل بے معنی ہیں۔ دیوانگی اور فرزانگی میں فرق کرنا لغو ہے مطلب یہ ہے۔ کہ وجود باری تعالےٰ کے سوا اشیاء کے وجود و عدم یا دیوانگی و فرزانگی کے فرق کے متعلق بحث کرنا فضول ہے۔ اسی کی ذات کو ہمیشہ پیش نظر

رکھنا چاہیئے۔

۴۔ نقشِ معنی....ظاہرداری۔عرضِ صورت ۔ جو لوگ معنی شناسی کے دعویدار ہیں۔ وہ درحقیقت ظاہرداری کرتے ہیں۔ اور جو لوگ حق گوئی کا دعوے کرتے ہیں۔ ان کو اپنی تعریف و تحسین کی خواہش ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اہل زمانہ میں اصلیت اور حقیقت نہیں رہی معنی شناسی اور حق گوئی ظاہرداری اور تعریف و تحسین کی آلودگی سے پاک ہونی چاہیئے۔

۵۔ لاف.....شیخی۔ دنیا کے معاملات میں اپنی عقلمندی کی شیخی مارنا غلط ہے۔ اور امور دینی میں نفع عبادت کی امید فضول حقیقت امر یہ ہے کہ دنیا اور دین دونوں ایک ساغر غفلت کی تلچھٹ ہیں۔

۶۔ بادِ بدست....بے فائدہ۔ لاحاصل ۔فرق....سر۔ دنیا ایسی جگہ ہے۔ کہ یہاں تسلیم و رضا سے کچھ حاصل نہیں اور خودداری اور وقار سے نقش قدم کی طرح ذلت ہی حاصل ہوتی ہے۔ ظاہر ہے نقش قدم خاک بسر ہوتا ہے مطلب یہ ہے۔ دنیا میں ان صفات کی کچھ قدر نہیں بلکہ الٹی خواری ہے۔

۷۔ عشق کیا ہے؟ اجزائے حواس کے منتشر ہوجانے کا نام عشق ہے اور وصل کیا ہے؟ حسن لقین کے آئینے کا زنگار ۔ اگر آئینہ یقین مجلا ہوتا۔ تو جلوۂ معشوق اپنی صورت میں نظر آتا۔ گویا دائمی وصل حاصل ہوجاتا

۸۔ کوہ کن کون ہے؟ وہ ایک بھوکا مزدور ہے۔ اپنے رقیب کے عشرت کدہ کا اس لیے وہ شیریں کے عشق میں کامیابی حاصل نہیں کرسکا۔ اور کوہ بے ستون شیریں کے خوابِ غفلت کی تصویر ہے۔ جس پر فرہاد سر پھوڑ کر مرگیا اور شیریں کو خبر تک نہ ہوئی۔

۹۔ آج کل کے عاشقوں کے متعلق کہتا ہے کہ اہلِ وفا کی آہوں میں آتش خیزی اور دردمندوں کے نالوں میں اثر کس نے دیکھا ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ اہل وفا کی آہیں اور نالے بے اثر ہیں۔

۱۰۔ سامع...... سننے والا۔ زمزمہ..... نغمہ۔ یہاں طنزاً ہرزہ سرائی مراد ہے۔ سرد برگ..... طاقت۔ اہلِ جہاں کی ہرزہ سرائی کو میں مجبوراً سن ضرور لیتا ہوں۔ لیکن نہ تو مجھ میں اتنی طاقت ہے کہ اس کی تعریف کر سکوں اور نہ اتنا دماغ ہے۔ کہ اظہار نفرت کر سکوں۔

۱۱۔ ہرزہ سرا..... بیہودہ گو۔ عیاذاً باللہ..... پناہ بخدا، معاذ اللہ۔ میں بھی اس قدر بیہودہ گو واقع ہوا ہوں۔ کہ آداب وقار و تمکنت سے ایک دم خارج ہوں۔ مطلب یہ ہے۔ کہ وہ باتیں جو میں بیان کر چکا ہوں خلافِ آداب و تمکین ہیں۔ یہ شعر گریز کا ہے۔

۱۲۔ نقش..... تعویذ۔ لاحول..... نہیں ہے، قوت مگر خدا کو۔ خامۂ ہذیان تحریر..... وہ قلم جو ہمیشہ بیہودہ اور بے معنی باتیں لکھتا ہو۔۔۔ اے بیہودہ نویس قلم اب تو نقشِ لاحول لکھ تاکہ تیرا ہذیان دور ہو اور اے میری وسوسوں میں پھنسی ہوئی فطرت تو علی لکھ تاکہ تیرے وسوسے دور ہوں۔ اور تو راہِ راست پر آئے۔

۱۳۔ میرے ممدوح یعنی حضرت علی فیض خداوندی کا مظہر (ظاہر کرنے والے) ہیں۔ اور رسول مقبول خاتم النبیین کے جان و دِل ہیں۔ آل نبی کا قبلہ ہیں۔ اور یقین کے کعبے کے ایجاد کے موجد۔ مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک ان کی ذات بہت بزرگ ہے۔

۱۴۔ گرد تصویر زمین سے کرۂ زمین مراد ہے وہ سرمایۂ ایجاد

عالم جہاں کہیں سرگرم خرام ہو۔ وہاں کی ہر مشت خاک کرۂ زمین بن جاتی ہے۔ ایجاد کی رعایت سے کہا ہے۔ کہ اس کے پیروں تلے کی خاک سے بہت سے عالم پیدا ہوتے ہیں۔

۱۵۔ ممدوح کا نقش قدم جس جگہ جلوہ پرداز ہو۔ اس تھوڑی سی جگہ کی خاک دونوں عالم کے لئے باعث شرت ہوتی ہے۔

۱۶۔ حضرت علی کی کنیت ابوتراب ہے۔ اور تراب کے معنی خاک کے ہیں۔ ظاہر ہے۔ زمین کو خاک سے نسبت ہے۔ پس اسی نام کی نسبت کی وجہ سے زمین کو یہ رتبہ حاصل ہے۔ کہ ابد تک پشت فلک اس فخر و ناز کے باعث خم رہے گی۔

۱۷۔ اے اسد یہ آپ کے خلق عظیم کا فیض ہے۔ کہ گل کو پہنچا ہے گویا اس کے اثر سے گل میں خوشبو پیدا ہوئی ہے اور بوئے گل سے باد صبا معطر ہوئی ہے۔

۱۸۔ ممدوح کی ذوالفقار (تلوار) کی کاٹ کا سارے جہان میں چرچا ہے۔ مجھے ڈر ہے۔ کہ کہیں اس کی تیزی کے چرچوں سے سر رشتۂ ایجاد عالم ہی منقطع نہ ہو جائے۔

۱۹۔ ممدوح کا جلوہ ایسا کفر سوز واقع ہوا ہے۔ کہ اس سے عاشق کے رنگ کی طرح چین کے بت خانہ کی رونق اڑ جاتی ہے۔

رنگ کا ٹوٹنا اور رونق کا ٹوٹنا اردو محاورہ کے خلاف ہے مرزا صاحب نے فارسی محاورات کا ترجمہ کر ڈالا ہے۔ شاید بت خانے کی رعایت سے ایسا کیا ہے۔

۲۰۔ وصی ...... لفظی معنی جس کو وصیت کی گئی ہو یعنی جانشین

اے جان کو پناہ دینے والے اور دل وجان کو فیض پہنچانے والے بادشاہ بیشک خاتم النبیین کا تو ہی وصی ہے۔

۲۱۔ دوش۔۔۔ کاندھا۔ اطہر۔۔۔ نہایت پاک۔ ناصیہ۔۔ پیشانی تیرے نہایت پاک جسم کا منبر دوش پیمبر ہے۔ اور تیرے نام نامی کا نگینہ عرش کی پیشانی ہے۔ حضرت علی نے دوش پیمبر پر سوار ہو کر خانہ کعبہ کے بت توڑے تھے۔ دوسرے مصرعے سے مراد ہے کہ تیرا نام نامی عرش معلی پر لکھا ہوا ہے۔

۲۲۔ واجب۔۔۔ خدا تعالےٰ۔ باندھے آئین یعنی آئینہ بندی و آرائش۔ تیری مدح سوائے خدائے تعالےٰ کے کوئی نہیں کرسکتا۔ شمع کی آرائش اور آئینہ بندی شعلۂ شمع کے سوا اور کون کرسکتا ہے ظاہر ہے شمع کو شعلہ ہی سے آرائش حاصل ہوتی ہے۔ گویا ممدوح کی ذات گرامی کو فنا فی اللہ ہوجانے کی وجہ سے خدائے تعالےٰ سے وہی تعلق حاصل ہوگیا ہے۔ جو شمع کو شعلہ ہے۔

۲۳۔ ممدوح کے سنگ آستان کو آئینہ قرار دیا ہے اور اس پر حضرت جبرئیل امین کے سجدے کے نشانوں کو اس آئینہ کا جوہر فرماتے ہیں۔ تیرے سنگِ آستان کے آئینے میں جبرئیل امین کے سجدوں کے نشانات جوہر آئینہ کی طرح نظر آتے ہیں۔

۲۴۔ آمادہ۔۔۔ تیار۔ مہیا۔ خدائے تعالےٰ نے جو خاکیوں کو جان و دل ودین دیئے ہیں۔ وہ تیرے در پر سب نچھاور کرنے کو تیار ہیں

۲۵۔ دل وجان اور کام وزبان سب تیری مدح کے لئے ہیں۔ اور لوح قلم اور دست وجبیں تیری تسلیم بجا لانے کے لئے ہیں

ظاہر ہے۔ سلام ہاتھ سے کیا جاتا ہے۔

۲۶۔ جو شخص خدا کا ممدوح ہو۔ اس کی مدح کس سے ہو سکتی ہے اور فردوس بریں کی آرائش سوائے خدا کے اور کون کر سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو حضرت علی کی مدح کرتا ہے۔ اس کے لئے بہشت آراستہ کی جاتی ہے۔

۲۷۔ اسد اللہ نام اسد تخلص بازارِ معاصی کی ایک جنس ہے جس کا سوائے تیرے کوئی خریدار نہیں۔

سعید لکھتے ہیں اسد اللہ حضرت علی کا لقب ہے اس لئے ان سے خطاب کر کے کہا یعنی اے اسد اللہ علی۔۔۔۔ الخ

۲۸۔ چونکہ اس کو تیرے جذبۂ فضل و کرم پر بہت ہی زیادہ یقین ہے۔ اس لئے وہ اپنے عرض مطالب میں اس قدر گستاخ ہو گیا ہے۔

۲۹۔ اجابت۔۔۔۔ قبولیت۔ میری دعا کو ایسا حسنِ قبول کا مرتبہ دے کہ میرے ایک ایک حرف پر قبولیت سو بار آمین کہے

۳۰۔ غم حسین سے میرے دل کو اس قدر لبریز کر دے کہ خونِ جگر سے میری آنکھیں رنگین رہیں۔

۳۱۔ تیرے دلدل کی الفت میں میری طبیعت کو ایسا شوق اور عشق ہو جائے۔ کہ جہاں اس کا قدم ہو۔ وہیں میری جبیں ہو۔

۳۲۔ الفت نسب دل کی صفت ہے یعنی ایسا دل جسکو الفت سے نسبت ہو اور سینۂ توحید فضا سے مراد وہ سینہ جسکی فضا توحید ہو یعنی توحید سے معمور ہو۔ مطلب یہ ہے میرے دل کو ممدوح کی الفت سے نسبت ہو اور میرے سینے

کی فضا "توحید" سے معمور رہے - میری نگاہ اس کی جلوہ پرست ہو-
اور میرا نفس صدق گزیں۔

۴۳- دوزخ کے شعلے اور دھواں ممدوح کے دشمنوں پر صرف ہوں اور فردوس بریں کے گل وسنبل اس کے احباب کے لئے وقف ہوں

قصیدہ نمبر ۳

ہاں مہِ نو سنیں ہم اس کا نام ۱ جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام
دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح ۲ یہی انداز اور یہی اندام
بارے دو دن کہاں رہا غائب ۳ بندہ عاجز ہے گردشِ ایام
اڑ کے جاتا کہاں کہ تاروں کا ۴ آسمان نے بچھا رکھا تھا دام
مرحبا اے سرورِ خاص خواص ۵ حبذا اے نشاطِ عام عوام
عذر میں تین دن نہ آنے کے ۶ لے کے آیا ہے عید کا پیغام
اس کو بھولا نہ چاہیئے کہنا ۷ صبح جو جائے اور آئے شام
ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا ۸ تیرا آغاز اور ترا انجام
رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے ۹ مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمام
جانتا ہوں کہ آج دنیا میں ۱۰ ایک ہی ہے امید گاہِ انام
میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ بگوش ۱۱ غالب اس کا مگر نہیں ہے غلام
جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو ۱۲ تب کہا ہے بطرزِ استفہام
مہرِ تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ ۱۳ قرب ہر روزہ بر سبیلِ دوام
تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا ۱۴ جز بتقریبِ عید ماہ صیام

جانتا ہوں کہ اس کے فیض سے تو ۱۵ پھر بنا چاہتا ہے ماہ تمام
ماہ بن، ماہتاب بن، میں کون ۱۶ مجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام
میرا اپنا جدا معاملہ ہے ۱۷ اور کے لین دین سے کیا کام
ہے مجھے آرزوئے بخشش خاص ۱۸ گر تجھے ہے امید رحمت عام
جو کہ بخشے گا تجھ کو فرِ فروغ ۱۹ کیا نہ دے گا مجھے مے گلفام
جبکہ چودہ منازل فلکی ۲۰ کر چکی قطع تیری تیزی گام
تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر ۲۱ کوئے و مشکوئے و صحن و منظر و بام
دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز ۲۲ اپنی صورت کا اک بلوریں جام
پھر غزل کی روش پہ چل نکلا ۲۳ توسنِ طبع چاہتا تھا لگام

غزل

زہر غم کر چکا تھا میرا کام ۲۴ تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بدنام
مے ہی پھر کیوں نہ میں پئے جاؤں ۲۵ غم سے جب ہو گئی ہو زیست حرام
بوسہ کیسا یہی غنیمت ہے ۲۶ کہ نہ سمجھیں وہ لذتِ دشنام
کعبہ میں جا بجائیں گے ناقوس ۲۷ اب تو باندھا ہے دیر میں احرام
اس قدح کا ہے دور مجھ کو نقد ۲۸ چرخ نے لی ہے جس سے گردش وام
بوسہ دینے میں ان کو ہے انکار ۲۹ دل کے لینے میں جن کو تھا ابرام

چھیڑتا ہوں کہ ان کو غصہ آئے
کیوں رکھوں ورنہ اپنا غالبؔ نام ۳۰

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ ۳۱ اے پری چہرہ پیک تیز خرام

کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا ۳۲ ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام
تو نہیں جانتا تو مجھ سے سن ۳۳ نام شاہنشہ بلند مقام
قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ ۳۴ مظہر ذوالجلال والاکرام
شہسوار طریقۂ انصاف ۳۵ نوبہار حدیقۂ اسلام
جس کا ہر فعل صورت اعجاز ۳۶ جس کا ہر قول معنئ الہام
بزم میں میزبان قیصر و جم ۳۷ رزم میں اوستاد رستم و سام
اے ترا لطف زندگی افزا ۳۸ اے ترا عہد فرخی فرجام
چشم بد دور خسروانہ شکوہ ۳۹ لوحش اللہ عارفانہ کلام
جاں نثاروں میں تیرے قیصر روم ۴۰ جرعہ خواروں میں تیرے مرشد جام
وارث ملک جانتے ہیں تجھے ۴۱ ایرج و تور و خسرو و بہرام
زور بازو میں مانتے ہیں تجھے ۴۲ گیو و گودرز و بیژن و رہام
مرحبا موشگافئ ناوک ۴۳ آفریں آبداری صمصام
تیر کو تیرے تیر غیب ہدف ۴۴ تیغ کو تیری تیغ خصم نیام
رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند ۴۵ برق کو دے رہا ہے کیا الزام
تیرے فیل گراں جسد کی صدا ۴۶ تیرے رخش سبک عناں کا خرام
فن صورت گری میں تیرا گرز ۴۷ گر نہ رکھتا ہو دستگاہ تمام
اس کے مضروب کے سر و تن سے ۴۸ کیوں نمایاں ہو صورت ادغام
جب ازل میں رقم پذیر ہوئے ۴۹ صفحہ ہائے لیالی و ایام
اور ان اوراق میں بکلک قضا ۵۰ مجملاً مندرج ہوئے احکام
لکھ دیا شاہدوں کو عاشق کش ۵۱ لکھ دیا عاشقوں کو دشمن کام
آسماں کو کہا گیا کہ کہیں ۵۲ گنبد تیز گرد نیلی فام

حکم ناطق لکھ گیا کہ کہیں ۵۳ خال کو دانہ اور زلف کو دام
آتش و آب و باد و خاک نے لی ۵۴ وضع سوز و نم و رم و آرام
مہر رخشاں کا نام خسرو روز ۵۵ ماہ تاباں کا اسم شحنۂ شام
تیری توقیع سلطنت کو بھی ۵۶ دی بدستور صورتِ ارقام
کاتبِ حکم نے بموجب حکم ۵۷ اس رقم کو دیا طرازِ دوام
ہے ازل سے روائیٔ آغاز ۵۸ ہو ابد تک رسائیٔ انجام

۱۔ مہِ نو کی خمیدگی کو سلام کرنے سے تعبیر کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اے ہلال ذرا ہمیں اس کا نام بھی بتا دے جس کو تو اس طرح جھک کر سلام کر رہا ہے۔

۲۔ ہر مہینے میں چاند دو دن چھپا کرتا ہے۔ اور تیسرے روز پھر نکلتا ہے۔ مثلاً اگر ۲۸ تاریخ کو چھپتا ہے۔ تو ۲۹ کو نکلتا ہے۔ ان دنوں میں صبح کے وقت بہت کم دیر کے لئے دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بعد دو دن غائب رہتا ہے کہتے ہیں۔ دو دن تو صبحدم نظر آیا تو ایسا نازک اور پتلا تھا اور یہی تیرا انداز تھا۔ ان دنوں کا چاند بہت باریک ہوتا ہے۔

۳۔ پھر دو دن تو کہاں غائب رہا۔ ٹھیک ہے بندہ دنوں کی گردش سے عاجز ہے۔ گویا تیری کچھ خطا نہیں۔

۴۔ تو اڑ کے کہاں جاتا۔ کہیں جا ہی نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ آسمان نے تاروں کا جال بچھا رکھا تھا۔ اس لئے تو باہر نہ آ سکا۔ یہ معنے دور کے ہیں۔

۵۔ اے خاص و عام کو سرور بخشنے والے مرحبا اور عوام و عام کے سرور و نشاط کے باعث آفرین۔

۶۔ چاند تیسرے دن نکلا ہے۔ اس لئے کہتے ہیں کہ تین دن نہ آنے

کی خفت مٹانے کے لئے اب تو عید کا مسرت بخش پیغام لے کر آیا ہے
اب تجھ سے کون پوچھ سکتا ہے کہ تو کہاں رہا۔

۷۔ تو ۲۶ دیں کی صبح کو غائب ہوا تھا۔ اور ۲۹ ویں کی شام کو نکل آیا۔ گویا صبح کو گیا تھا اور شام کو واپس آگیا پس اس کو بھولا نہیں کہتے جو صبح کا گیا شام کو آ جائے۔ قابل تعریف شعر ہے۔ کس خوبی سے محاورہ نظم کیا ہے۔

۸۔ ایک لیں کیا سب نے تیرے آغاز اور انجام کو جان لیا۔ کہ تو پہلے بڑھتا ہے۔ پھر تنزل پذیر ہوتا ہے۔ اور پھر ترقی کے مدارج طے کرتا ہے۔

۹۔ نمتام.... چغل خور۔ اے ہلال تو مجھ سے اپنے دل کا راز کیوں چھپاتا ہے۔ کیا تو مجھے چغل خور سمجھتا ہے۔ کہ ہیں کسی سے کہہ دوں گا۔

۱۰۔ یہ بات میں خوب جانتا ہوں۔ آج ساری دنیا میں لوگوں کی صرف ایک امید گاہ ہے۔ جہاں سے وہ مرادیں پاتے ہیں۔

۱۱۔ یہ میں نے مان لیا۔ کہ تو اس کا حلقہ بگوش غلام ہے۔ لیکن میں تجھ سے یہ پوچھتا ہوں۔ کہ کیا غالب اس کا غلام نہیں ہے یعنی ہم دونوں اس کے غلام ہیں پھر یہ دو کس بات کا ہے۔

۱۲۔ میں جانتا ہوں۔ کہ تو بھی یہ بات خوب جانتا ہے۔ کہ میں بھی اس کا غلام ہوں یہی سبب ہے۔ کہ میں نے تجھ سے بطور استفہام یہ بات پوچھی ہے کہ غالب اس کا مگر نہیں ہے غلام؟

۱۳۔ اے ماہ! مہر تاباں کو اس کی بارگاہ میں قرب ہر روزہ ہمیشہ کے لئے حاصل ہو تو ہو۔

۱۴۔ روشناسی ..... باریابی ۔ پایہ ..... رتبہ ۔ ماہ صیام .....، ماہ رمضان لیکن تجھ کو اس کی بارگاہ میں روشناسی کا رتبہ سوائے عید رمضان کی تقریب کے کبھی حاصل نہیں ہوتا۔

۱۵۔ میں یہ بات خوب جانتا ہوں اور تجھ کو بتلائے دیتا ہوں کہ اب تو اس کے فیض سے بھرپور اچاند بننا چاہتا ہے ۔ مہ نو کی رازداری حاصل کرنے کے لئے اس کو یہ بات بتلائی ہے۔

۱۶۔ تو نادر بن ۔ مہتاب بن میں کون ہوں ۔ مجھے تو کچھ انعام تھوڑا ہی دے گا ۔ بڑا بے تکلف شعر ہے ۔ عید کے انعام کی طرف کس خوبصورتی سے اشارہ کیا ہے۔

۔ کہیں یہ خیال کرنا کہ مجھ کو تجھ پر رشک آتا ہے ۔ کیونکہ میں اب انعام سے محروم رہ جاؤں گا نہیں یہ بات نہیں ۔ تیرے انعام سے مجھے کیا کام ہے یہ اُدوران کا جدا معاملہ ہے میں محروم نہیں ہوں ۔ کہ اس قسم کے خیالات کو اپنے دل میں جگہ دوں۔

۱۸۔ اگر تجھے ممدوح سے رحمتِ عام کی امید ہے ۔ تو مجھے اس سے بخشش خاص کی آرزو ہے ۔ لفظ خاص کو استعمال کر کے اپنا رتبہ بڑھایا ہے۔

۱۹۔ وہ ممدوح جو تجھے عالم کو منور کرنے کی قوت عطا کرے گا ۔ کیا وہ مجھے ۔ مئے گل رنگ نہ دے گا ۔ مطلب یہ ہے ۔ کہ ضرور میری مراد بھی پوری ہو دیگا۔

۲۰۔ جب تجھ تیری تیز رفتاری آسمان کے چودہ منازل طے کر چکے یعنی تو ہلال سے بدر بن جائے۔

۲۱۔ اور نہری چاندنی سے ہر گلی کوچہ۔ محل۔ صحن اور در و دیوار منور ہو جائیں۔

۲۲۔ تو اس وقت میرے ہاتھ میں اپنی جیسی شکل کا چمکتا دمکتا ایک بلوری جام دیکھنا۔

۲۳۔ کہتے ہیں شراب اور شبِ مہتاب کا نام آتے ہی میں قصیدہ لکھتے لکھتے غزل لکھنے لگا۔ اس موقع پر توسنِ طبع کو روکنے کی ضرورت تھی۔ لیکن ذکرِ شراب نے چابک کا کام کیا۔ اب بھلا کہاں رُکتا ہے۔

۲۴۔ میں ویسے ہی مر جاتا۔ تو نے مفت ہی میرے قتل کا الزام اپنے سر لیا۔ اور اپنے آپ کو بدنام کیا۔

۲۵۔ شراب بھی حرام ہے۔ اور زندگی بھی حرام ہے۔ کہتے ہیں جب غم سے زندگی حرام ہو گئی تو پھر میں کیوں نہ ہر وقت شراب پئے جاؤں۔ کیونکہ شراب سے غم غلط ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے۔ جب یوں طرح زندگی حرام ہو رہی ہے۔ تو پھر آسان راستہ کیوں نہ اختیار کر دوں۔ جوازِ شراب کا بہترین شاعرانہ استدلال ہے۔ اور مضمون نہایت شوخ اور لطیف۔

۲۶۔ بوسے کا تو ذکر ہی نہ کرو۔ وہ ہمیں کب ملتا ہے۔ بس یہی غنیمت ہے کہ ان کو یہ بات معلوم نہیں۔ کہ ہمیں گالیاں کھانے میں بھی لطف آتا ہے خدا کرے انہیں یہ بات معلوم نہ ہو ورنہ وہ ہمیں اس لذت سے بھی محروم کر دیں گے۔

۲۷۔ احرام کعبے میں باندھتے ہیں۔ کہتے ہیں جس طرح اب ہم نے

بجائے کعبہ کے دیر میں احرام باندھا ہے۔ اسی طرح ہم بجائے دیر کے کعبہ میں جاکر ناقوس بجائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ جب ہمارا کچھ مذہب نہیں۔ تو پھر ہم ہر مذہب کے خلاف ہی چلیں گے۔

۲۸۔ مجھے وہ جامِ عرفان میسّر ہے جس سے چرخ نے گردش مستعار لی ہے۔ یعنی اس جام کی شراب سے مست ہو کر آسمان رقص و گردش کر رہا ہے۔

۲۹۔ ابرام.... ضد۔ تعجب ہے۔ جن کو دل لینے کی ضد تھی۔ یعنی کہتے تھے۔ کہ ہم ضرور تمہارا دل لیں گے۔ اب اُن کو بوسہ دینے میں انکار ہے۔

۳۰۔ فرماتے ہیں میں نے اپنا نام غالب اس وجہ سے رکھا ہے۔ کہ اِن کو مجھ پر غصہ آئے۔ اور وہ کہیں کہ او ہو یہ بھی غالب ہو گیا حقیقتاً میں غالب نہیں بلکہ مغلوب ہوں۔ غالب نام رکھنا۔ اِن سے ایک چھیڑ ہے مطلب یہ ہے کہ ان کے غصہ میں بھی ایک لطف ہے۔

۳۱۔ یہاں سے پھر قصیدہ شروع ہوتا ہے۔ اور شاعر ماہ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔ اے پری چہرہ اور تیز رفتار قاصد میں تو سب کچھ کہہ چکا۔ اب تو کیا کہتا ہے۔ بوجہ حسن کے پری اور بسبب تیز رفتاری کے چاند کو پیک تیز خرام کہا ہے۔

۳۲۔ مریخ کو بہرام فلک کہتے ہیں۔ وہ کون ہے۔ جس کے در پر چاند سورج زہرہ اور مریخ جبیں سائی کر گئے ہیں؟

۳۳۔ اگر تو نہیں جانتا۔ تو میری زبانی اس شہنشاہ بلند مرتبت کا نام سن۔

۳۴۔ یعنی بہادر شاہ بادشاہ جو چشم و دل کے قبلہ ہیں اور جلال واکرام کے مظہر ہیں۔ کیونکہ چشم امید۔ انہی کی طرف لگی ہوئی ہے اور دل ان کی طرف رجوع ہے۔

۳۵۔ حدیقہ ۔۔۔ باغ ۔ طریقہ ۔۔۔ طریق ۔ راستہ ۔ وہ طریقۂ انصاف کے شہسوار اور باغِ اسلام کے نوبہار ہیں۔

۳۶۔ جس کا ہر فعل ایک معجزہ ہے۔ اور جس کا ہر قول الہام۔

۳۷۔ قیصر و جم ۔۔۔۔ وہ جلیل القدر بادشاہ۔ رستم و سام ۔۔۔۔ ایران کے دو مشہور پہلوان ۔۔۔ بزم میں قیصر و جم اس کے مہمان ہیں اور وہ ان کا میزبان ہے۔ گویا اس کی شان یہ ہے۔ کہ قیصر وجم جیسے بادشاہ اس کے دسترخوان سے کھانا کھاتے ہیں۔ اور رزم میں رستم و سام جیسے مشہور پہلوانوں کا وہ استاد ہے۔ گویا رستم و سام ممدوح سے طریقہ ہائے جنگ سیکھتے ہیں ۔۔۔

۳۸۔ یہاں سے گریز شروع ہے کہتے ہیں۔ اے شہنشاہ تیرے لطف و کرم زندگی بڑھانے والے ہیں۔ اور تیرا دورِ حکومت مبارک زمانہ ہے۔

۳۹۔ خدا تجھ کو نظرِ بد سے بچائے۔ تیرا شاہانہ دبدبہ ہے۔ اور ماشاء اللہ تیرا کلام عارفانہ کلام ہے۔

۴۰۔ قیصر و روم جیسے عالیشان بادشاہ تیرے جاں نثاروں میں ہیں اور جام کے مرشد یعنی جمشید جیسے لوگ تیرے جرعہ خواروں میں ہیں۔ یعنی تجھ سے فیض حاصل کرتے ہیں۔

سعید۔ آسی اور طباطبائی نے مرشدِ جام سے مولانا جامی مراد لیے ہیں قیصر کے مقابلے میں جمشید ہونا چاہیے۔ نہ کہ غریب جامی۔

۴۱۔ ایرج اور تور (فریدوں شاہ فارس کے بیٹے) خسرو (نوشیرواں کا بیٹا) اور بہرام بادشاہ عراق تجھ کو اپنے اپنے ملک کا وارث جانتے ہیں۔

۴۲۔ سب مشہور پہلوان تیرے زورِ بازو کا لوہا مانتے ہیں۔

۴۳۔ موشگافی ... بال کو چیرنا۔ ناوک ... تیر صمصام ... تلوار سبحان اللہ، تیرے تیر کی موشگافی کے کیا کہنے ہیں، اور تیری تلوار کی آبداری کی کیا بات ہے۔

۴۴۔ ہدف ... نشانہ۔ تیرا تیر دشمن کے تیر کو اپنا نشانہ بناتا ہے تیری تلوار دشمن کی تلوار میں اس طرح گھس جاتی ہے جس طرح نیام میں گھستی ہے۔

۴۵۔ ۴۶۔ دونوں شعروں میں لف و نشر مرتب ہے۔ تیرے کوہ پیکر ہاتھی کی چنگھاڑ نے بجلی کی کڑک کا دم بند کر دیا ہے۔ اور تیرے سبک رفتار گھوڑے کی چال برق کو کیسا الزام دے رہی ہے یعنی کہتی ہے۔ کہ اے برق تو میرے ساتھ چل بھی نہیں سکتی۔ پیچھے رہی جاتی ہے۔

۴۷۔ ۴۸۔ صورت گری ... تصویر کشی۔ دستگاہ ... مہارت۔ اگر فن مصوری میں تیرا گرز پوری پوری مہارت نہ رکھتا ہو تو پھر مضروب کے سر و جسم سے ادغام کی تصویر کیونکر بنے۔ مطلب یہ ہے کہ تیرا گرز زخم خوردہ کے سر و تن کو ایک کر دیتا ہے۔ اور اس طرح سے ادغام کی صورت

پیدا ہو جاتی ہے۔

۴۹۔ رقم پذیر ہوئے ...... لکھے گئے۔ لیالی ... لیل کی جمع، رات۔ ایام ...... دن۔ جب ازل میں دن اور رات کے صفحات لکھے گئے یعنی دن اور رات کی تخلیق ہوئی۔

۵۰۔ تو ان صفحوں پر قضا کے قلم نے مفصل نہیں بلکہ اجمال کے ساتھ احکام خداوندی تحریر فرمائے۔

۵۱۔ شاہد ...... معشوق۔ دشمن کام ...... وہ شخص جو دشمنوں کی مراد کے موافق تباہ حال ہو۔ تو معشوق کو عاشق کش اور عاشقوں کو دشمنوں کی مراد کے مطابق تباہ و برباد لکھ دیا۔ یعنی معشوق عاشقوں کو قتل کیا کریں گے۔ اور عاشق ہمیشہ برباد اور تباہ حال رہیں گے۔

۵۲۔ آسمان کے متعلق یہ حکم ہوا۔ کہ اس کو سب لوگ جلدی جلدی گھومنے والا نیلا گنبد کہیں۔

۵۳۔ اس کے بعد یہ حکم دیا گیا۔ کہ معشوق کے خال کو دانہ اور زلف کو دام لکھا جائے۔

۵۴۔ لطف دلنشیں مرتب ہے۔ پھر آگ کو سوز۔ پانی کو نمی۔ ہوا کو بھاگنے پھرنے کی قوت اور خاک کو آرام کی خاصیت عطا کی گئی۔ ہوید کے معنی بھاگنا۔

۵۵۔ خسرو ...... بادشاہ۔ شحنہ ...... کوتوال۔ سورج کو دن کے بادشاہ کا لقب عطا ہوا۔ اور ماہ تاباں کو کوتوال شام کا۔

۵۶۔ توقیع سلطنت ...... فرمان شاہی۔ ارقام ...... تحریر۔ اسی طرح تیرے فرمان سلطنت کے لیے بھی حسب ضابطہ حکم نافذ ہوا۔

۵۷۔ حکم خداوندی سے کاتب حکم نے تیرے فرمانِ سلطنت پر ہمیشگی کا طغرا اپنا دیا ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ تیری سلطنت کو ہمیشہ قائم رہنے کا حکم ہوا۔

۵۸۔ یہ تیری سلطنت ازل سے جاری ہے۔ خدا کرے۔ اس کے انجام کی ابد تک رسائی ہو۔ یعنے تیری سلطنت ازل سے ابد تک جاری رہے۔

قصیدہ نمبر ۴

صبحدم دروازۂ خاور کھلا	۱	مہرِ عالمتاب کا منظر کھلا
خسروِ انجم کے آیا صرف میں	۲	شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا
وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود	۳	صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا
ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ	۴	دیتے ہیں دھوکا یہ بازیگر کھلا
سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو	۵	موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا
صبح آیا جانبِ مشرق نظر	۶	اک نگارِ آتشیں رخ سر کھلا
تھی نظر بندی کیا جب ردِ سحر	۷	بادۂ گل رنگ کا ساغر کھلا
لا کے ساقی نے صبوحی کے لئے	۸	رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھلا
بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ	۹	کعبۂ امن و اماں کا در کھلا۔
تاجِ زریں مہرِ تاباں سے سوا	۱۰	خسروِ آفاق کے منہ پر کھلا
شاہِ روشن دل بہادر شہ کہ ہے	۱۱	رازِ ہستی اس پہ سر تا سر کھلا۔
وہ کہ جس کی صورتِ تکوین میں	۱۲	مقصدِ نہ چرخ و ہفت اختر کھلا

وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے ۱۳ عقدۂ احکامِ پیغمبر کھلا

پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام ۱۴ اس کے سرہنگوں کا جب دفتر کھلا

روشناسوں کی جہاں فہرست ہے ۱۵ واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کھلا

توسنِ شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب ۱۶ تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھلا

نقشِ پا کی صورتیں وہ دلفریب ۱۷ تو کہے بتخانۂ آزر کھلا

مجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کی ۱۸ منصبِ مہر و مہ و محور کھلا

لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک ۱۹ میری حدِ وسع سے باہر کھلا

تھا دلِ وابستہ قفلِ بے کلید ۲۰ کس نے کھولا کب کھلا کیونکر کھلا

باغِ معنی کی دکھاؤں گا بہار ۲۱ مجھ سے گر شاہِ سخن گستر کھلا

ہو جہاں گرمِ غزل خوانی نفس ۲۲ لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھلا

غزل

کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا ۲۳ کاش کے ہوتا قفس کا در کھلا

ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے ۲۴ یار کا دروازہ پاویں گر کھلا

ہم کو ہے اس رازداری پر گھمنڈ ۲۵ دوست کا ہے راز دشمن پر کھلا

واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ ۲۶ زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا

ہاتھ سے رکھ دی کب ابرو نے کماں ۲۷ کب کمر سے غمزہ کے خنجر کھلا

مفت کا کس کو برا ہے بدرقہ ۲۸ رہروی میں پردۂ رہبر کھلا

سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک ۲۹ آگ بھڑکی مینہ اگر دم بھر کھلا

نامہ کے ساتھ آ گیا پیغامِ مرگ ۳۰ رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا

۳۱ دیکھیو غالب سے گر الجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

۳۲ پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال / پھر مہ و خورشید کا دفتر کھلا
۳۳ خامہ نے پائی طبیعت سے مدد / بادباں کے اٹھتے ہی لنگر کھلا
۳۴ مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ / یاں عرض سے رتبۂ جوہر کھلا
۳۵ مہر کانپا چرخ چکر کھا گیا / بادشاہ کا رایت لشکر کھلا
۳۶ بادشاہ کا نام لیتا ہے خطیب / اب علوئے پایۂ منبر کھلا
۳۷ سکۂ شہ کا ہوا ہے روشناس / اب عیارِ آبروئے زر کھلا
۳۸ شاہ کے آگے دھرا ہے آئینہ / اب مآلِ سعئ اسکندر کھلا
۳۹ ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے / اب فریب طغرل و سنجر کھلا
۴۰ ہو سکے کیا مدح ہاں اک نام ہے / دفتر مدح جہاں داور کھلا
۴۱ فکر اچھی پر ستائش نا تمام / عجزِ اعجازِ ستائش گر کھلا
۴۲ جانتا ہوں ہے خطِ لوحِ ازل / تم پہ اے خاقانِ نام آور کھلا

۴۳ تم کرو صاحبقرانی جب تلک
ہے طلسم روز و شب کا در کھلا

۱- خاور.... مشرق۔ صبحدم مشرق کا دروازہ کھل گیا۔ اس دروازے سے آفتاب عالم تاب کا جلوہ نظر آیا۔

۲- رات کو موتیوں کا خزانہ کھلا ہوا تھا یعنی ہر طرف ستارے چمک رہے تھے۔ ان موتیوں کو ستاروں کے بادشاہ (آفتاب) نے صرف کر ڈالا۔ مطلب یہ ہے آفتاب طلوع ہونے سے تارے چھپ گئے۔

۳- علم سیمیا ایک علم ہے۔ جس کے زور سے ایسی چیزیں نظر آتی ہیں جن کا

حقیقتاً کوئی وجود نہیں فرماتے ہیں۔ رات کے وقت جو چاند اور ستارے ہمیں نظر آرہے تھے حقیقتاً کچھ نہ تھے۔ بلکہ وہ سیمیا کا کرشمہ تھے۔ اگر وہ کچھ ہوتے تو صبح کو بھی نظر آتے۔ چاند اور ستاروں کا یہ راز ہمیں صبح کو معلوم ہوا۔ رات کو ہم دھوکے ہی میں رہے۔

۴۔ کواکب..... ستارے۔ ستارے اصل میں کچھ ہیں۔ اور نظر کچھ اور آتے ہیں۔ گویا یہ بازی گر ہیں۔ جو ہمیں کھُلا دھوکا دیتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ ستارے ایک دوسرے سے بہت دُور ہیں۔ لیکن ہمیں قریب نظر آتے ہیں۔ اکثر ستارے بے نور ہیں۔ لیکن سورج کی چمک سے منوّر ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ سیّارے ستارے معلوم ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ بس یہی کھُلا ہوُا دھوکا ہے۔

۵۔ رات کے وقت ان ستاروں کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آسمان پر ہر طرف موتیوں کا زیور کھُلا پڑا ہے۔

۶۔ صبح کو مشرق کی جانب ایک آتشیں چہرہ معشوق کھُلے سر نظر آیا۔ گویا صبح کا منظر تبدیل ہو گیا۔ (سورج نکل آیا)

۷۔ جب ہم نے جادو کو توڑا۔ تو معلوم ہوا۔ کہ وہ آتشیں چہرہ معشوق نہیں بلکہ بادۂ گل رنگ کا ساغر ہے۔

۸۔ صبوحی..... وہ شراب جو خمار دور کرنے کے لئے صبح کو پی جاتی ہے اس ساغر کو ساقی نے صبوحی کے لئے لا کر رکھ دیا ہے۔ اور یہ ایک سونے کا پیالہ ہے جس پر سرپوش نہیں ہے۔

۹۔ یہاں سے گریز شروع ہے۔ کہتے ہیں۔ اس وقت بزمِ سلطانی آراستہ ہوئی۔ گویا امن و امان کے کعبے کا دروازہ کھُل گیا۔

۱۰۔ بادشاہ عالم کے سر پر سونے کا تاج آفتاب عالمتاب سے بھی زیادہ خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔ مطلب یہ ہے۔ اس کے تاج زریں کے سامنے آفتاب ماند پڑ گیا۔

۱۱۔ وہ بادشاہ روشن دل بہادر شاہ ہے جس کے روشن دل پر راز ہستی سرتاسر ظاہر ہے۔

۱۲۔ تکوین .... تخلیق۔ پیدا ہونا۔ اور وہ ایسا بادشاہ ہے کہ جس کے پیدا ہونے کے سبب سے نو آسمان اور سات ستاروں کے پیدا ہونے کا مقصد ظاہر ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے۔ نو آسمانوں اور سات ستارے اسی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔

۱۳۔ وہ ایسا بادشاہ ہے۔ کہ اس کے تاویل کے ناخن سے احکام پیمبر کی گتھیاں کھلتی ہیں۔ مطلب یہ ہے۔ کہ مسائل شرعی کو حل کرنے کی پوری پوری قابلیت رکھتا ہے۔

۱۴۔ دارا .... ایک عالی مرتبہ بادشاہ۔ سرہنگ .. معمولی سپاہی دفتر .... رجسٹر۔ جب اس کے لشکریوں کا رجسٹر کھولا گیا تو اس میں سب سے پہلے دارا کا نام نکل آیا۔ گویا دارا اس کی فوج کا ایک ادنٰے سپاہی ہے۔

۱۵۔ روشناس .... جان پہچان۔ قیصر .... ایک عالی مرتبہ بادشاہ جہاں اس کے روشناسوں کی فہرست ہے۔ وہاں صاف صاف قیصر کا حلیہ درج ہے۔ گویا قیصر جیسا بلند مرتبہ بادشاہ اس کے معمولی روشناسوں میں ہے۔

۱۶-۱۷۔ نقطان .... صطبل۔ غیرتِ صرصر .... جس کی تیزی کو دیکھ کر

صرصر غیرت کھائے ۔ آذر ..... حضرت ابراہیمؑ کے چچا اور اعلےٰ درجے کے بت تراش تھے۔ بادشاہ کے گھوڑے میں وہ خوبی ہے۔ کہ جب تھان سے وہ غیرت صرصر کھلا تو اس کے نقش پا سے ایسی ایسی عجیب صورتیں پیدا ہوئیں گویا آذر بت تراش کا بت خانہ نظر آنے لگا۔

۱۸ - بادشاہ کی تربیت کے فیض سے مجھے چاند سورج اور محور کی حقیقت معلوم ہوگئی۔ محور اس فرضی خط کو کہتے ہیں۔ جو ماہرین ارض نے قطب شمالی سے قطب جنوبی تک کھینچا ہے خیال ہے اس کے گرد زمین گردش کرتی ہے۔

۱۹ - میرے دل میں لاکھوں گتھیاں تھیں اور جو میری طاقت سے کسی طرح کھل نہ سکتی تھیں۔ لیکن بادشاہ کے فیض تربیت سے ہر ایک گتھی کھل گئی۔

۲۰ - میرا بند دل ایک ایسا بند قفل تھا جس کی کوئی کنجی نہ تھی۔ لیکن بادشاہ کے فیض سے وہ اس طرح کھلا کہ میں نہیں جانتا۔ اسے کس نے کھولا کب کھولا اور کیونکر کھولا۔

۲۱ - کھلا یعنی بے تکلف ہوا۔ کہتے ہیں اگر بادشاہِ سخن گستر مجھ سے بے تکلفانہ پیش آئے۔ تو پھر میں تمہیں باغ معنی کی بہار دکھاؤں گا یعنی پھر میری شاعری کا لطف دیکھنا۔

۲۲ - طبلہ ..... پٹاری۔ ڈبہ جس وقت میں نے غزلخوانی شروع کی۔ تو لوگوں کو ایسا معلوم ہوگا۔ جیسے عنبر کا ڈبہ کھل گیا۔ یعنی میرے ہر سانس کے ساتھ عنبر کی خوشبو نکلے گی۔

۲۳ - افسوس ہے۔ کہ میں کنج قفس میں اس طرح سے پر کھلا بیٹھا

رہوں اور اُڑ نہ سکوں۔ کاش کے اس وقت قفس کی کھڑکی کھلی ہوتی تاکہ میں پھر سے اُڑ جاتا۔

۲۴-(۱) کہتے ہیں ہماری خودداری کا تقاضا ہے۔ کہ ہم جا کر یار کے دروازے پر آوازیں دیں اور یار کا دروازہ محض ہمارے لئے کھلے اس طرح جانے میں کیا لطف ہے۔ کہ دروازہ کھلا ہو۔ اور ہم اس کے مکان میں داخل ہو جائیں۔ چاہتے ہیں کہ یار کا گھر محض ان کے اپنے لئے مخصوص ہو اور کسی دوسرے کو وہاں بار نہ ہو۔ (۲) اس طرح سے یار کے گھر جانے کو جی نہیں چاہتا۔ کہ ہم آواز دیں پھر کہیں دروازہ کھلے۔ لطف اس میں ہے کہ دروازہ کھلا ہو۔ اور ہم بلا تکلف ان کے گھر میں داخل ہو جائیں۔ پہلے معنے بہتر ہیں۔ اس سے شاعر کی خودداری کا ثبوت ملتا ہے۔

۲۵ ہمیں دوست کی رازداری پر گھمنڈ ہے۔ کیونکہ ہم یہ سمجھتے ہیں۔ کہ وہ اپنے دل کی باتیں سوائے ہمارے کسی اور سے نہیں کہتا۔ لیکن درحقیقت ہمارے دوست کے راز رقیب کو اچھی طرح معلوم ہیں۔ گویا وہ بھی اس کے رازدار ہیں۔ اپنی سادہ لوحی اور خود فریبی کا اظہار کیا ہے۔

۲۶- واقعی ہمارے دل کا داغ بہت ہی کھلا معلوم ہوتا تھا۔ اور ہم بہت خوش تھے لیکن زخم لگنے پر معلوم ہوا۔ کہ زخم داغ سے بہت بڑھ کر ہے۔ اس قصیدے میں کھلنا زیب دینے کے معنوں میں متعدد بار استعمال کیا ہے لیکن زخم کے ساتھ کھلنا استعمال کرنے سے کچھ اور ہی لطف پیدا ہو گیا ہے۔

۲۷۔ عام شعرا ابرو کو کمان سے اور غمزے کو خنجر سے تشبیہہ دیا کرتے ہیں لیکن مرزا صاحب نے ابرو کو کمان دار اور غمزے کو خنجر گداز کہہ کر نیا لطف پیدا کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے ابرو صرف کمان ہی نہیں ہیں بلکہ کمان دار بھی ہیں۔ اور اس کا غمزہ خنجر ہی نہیں بلکہ خنجر گداز بھی ہے۔ وہ دونوں ہر وقت ہمارے قتل کے درپے ہیں۔ اور کبھی اپنے فرض سے غافل نہیں ہوتے۔

۲۸۔ بدرقہ۔۔۔۔ رہنما۔ جب ہمیں رہبر سے سابقہ پڑا۔ تو معلوم ہو گیا۔ کہ وہ خود منزل سے واقف نہیں۔ لیکن مفت کا رہنما کب بُرا ہے اور کچھ نہیں تو ایک ساتھی تو ہے۔

۲۹۔ رونے سے دل کی سوزش دُور نہیں ہوتی۔ جب اشکوں کی بارش ہوتی ہے۔ تو تھوڑی دیر کے لئے دل کی تپش دب جاتی ہے۔ لیکن جونہی اشکباری دم بھر کے لئے بند ہوتی ہے۔ سینے میں پھر آگ بھڑک اٹھتی ہے برسات میں مینہ برسنے کے بعد یہی کیفیت پیش آتی ہے۔

۳۰۔ اس شعر میں شاعر نے دلی حسرت کا اظہار کیا ہے۔ کہتا ہے۔ خدا خدا کر کے یار کا خط آیا لیکن پیغام مرگ بھی ساتھ آیا۔ خط کھول کر پڑھنا چاہا تھا۔ کہ روح پرواز کر گئی اور خط چھاتی پر دھرا رہ گیا۔

بیخود اور طباطبائی لکھتے ہیں۔ کہ اس شعر میں شادی مرگ کی کیفیت دکھائی ہے۔

۳۱۔ دیکھنا غالب سے نہ اُلجھنا۔ وہ ظاہر میں کافر دکھائی دیتا ہے لیکن درحقیقت وہ ولی ہے۔ اگر وہ بگڑ بیٹھا۔ تو پھر تمہاری خیر نہیں۔

۳۲۔ غزل لکھتے لکھتے پھر مدح سرائی کا خیال آگیا۔ اور مدح بادشاہ میں ایسے شعر قلم سے نکلنے لگے۔ جو چاند اور سورج کا مقابلہ کرتے ہیں۔ گویا مہ و خورشید کا دفتر کھل گیا۔

۳۳۔ گویا قلم بادبان اور طبیعت لنگر ہے۔ قلم اٹھاتے ہی طبیعت اس کی مدد کرنے لگی۔ جس وقت قلم رواں ہوا۔ اسی وقت طبیعت بھی کھل گئی یعنی خود بخود شعر موزوں ہونے لگے۔

۳۴۔ مدح عرض ہے۔ اور ممدوح جوہر۔ مدح سے ممدوح کی شان و شکوہ ظاہر ہوتی ہے۔ گویا عرض سے جوہر کا رتبہ معلوم ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے عرض جوہر سے بڑھ گیا ہے۔

۳۵۔ رایت...... نشان لشکر۔ جھنڈا۔ جس وقت بادشاہ کا نشان لشکر کھلا۔ اس کو دیکھ کر آفتاب کانپ اٹھا اور آسمان چکرا گیا۔ آسمان کا چکر کھانا اور آفتاب کا کانپنا ایک مسلّمہ ہے۔ شاعر نے اس کا سبب نشانِ لشکر کو قرار دیا ہے

۳۶۔ اب ہمیں معلوم ہوا۔ کہ منبر کا رتبہ کیوں بلند ہے۔ اس کا سبب یہ ہے۔ کہ خطیب اس پر کھڑے ہو کر بادشاہ کے نام کا خطبہ پڑھتا ہے۔

۳۷۔ سونے کی آبرو کا سبب یہ ہے۔ کہ اس پر بادشاہ کے نام کا سکہ ہے۔

۳۸۔ آئینہ سکندر نے ایجاد کیا تھا۔ کہتے ہیں۔ آتنی مدت بعد یہ بات معلوم ہوئی۔ کہ سکندر نے آئینہ ایجاد کرنے میں اتنی کوشش کیوں کی تھیں۔ اس کا مطلب یہ تھا۔ کہ اس کے آئینے کو میر الممدوح اپنے

سامنے رکھے۔

۳۹۔ طغرل اور سنجر فریب سے ملک کے وارث بن بیٹھے تھے۔ اب جبکہ سلطنت ممدوح کے ہاتھ میں آئی تو ان کا یہ فریب ظاہر ہو گیا۔ اور لوگوں نے دیکھ لیا۔ کہ ممدوح ہی ملک کا حقیقی وارث ہے۔

۴۰۔ جہاں داور..... بادشاہِ عالم۔ میں اس کی کیا تعریف کر سکتا ہوں ہاں میرا نام اس کے مدح خوانوں میں مشہور ہو گیا ہے۔ کہ میں نے اس کی مدح میں دفتر کے دفتر لکھ ڈالے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جیسی مدح ہونی چاہیئے تھی نہیں ہو سکی۔

۴۱۔ فکر تو اچھی ہے لیکن مدح ناتمام رہی۔ اس سے شاعر کے اعجاز کا عجز ظاہر ہو گیا۔ معجز بیانی کا دعوے لیکن پھر اعجاز میں عجز ثابت کرنا مرزا صاحب ہی کا حصہ ہے۔

۴۲۔ خاقان..... بادشاہ۔ اے نام آور بادشاہ میں جانتا ہوں کہ تم لوحِ ازل کی تحریر سے خوب واقف ہو۔ اس لئے مجھے اپنا حال بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

۴۳۔ صاحبِ قران اس بادشاہ کو کہتے ہیں جس کی ولادت کے وقت زحل اور مشتری کا قرانِ عظمے ہو۔ ایسا بادشاہ بڑا فاتح اور جلیل القدر ہوتا ہے۔ کہتے ہیں۔ تم اس وقت تک صاحبِ قرانی کرو۔ جب تک روز و شب کے طلسم کا دروازہ کھلا ہے۔ یعنی ابد تک۔

در صفتِ انبہ

ہاں دلِ دردمند زمزمہ ساز ۱ کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز
خامہ کا صفحہ پر رواں ہونا ۲ شاخِ گل کا ہے گلفشاں ہونا
مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھیے ۳ نکتہ ہائے خرد فزا لکھیے
بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے ۴ خامہ نخلِ رطب فشاں ہو جائے
آم کا کون مردِ میداں ہے ۵ ثمر و شاخ گوئے و چوگاں ہے
تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں ۶ آئے یہ گوئے اور یہ میداں
آم کے آگے پیش جاوے خاک ۷ پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک
نہ چلا جب کسی طرح مقدور ۸ بادۂ ناب بن گیا انگور
یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے ۹ شرم سے پانی پانی ہونا ہے
مجھ سے پوچھو تمہیں خبر کیا ہے ۱۰ آم کے آگے نیشکر کیا ہے
نہ گل اس میں نہ شاخ و برگ نہ بار ۱۱ جب خزاں آئے تب ہو اس کی بہار
اور دوڑائیے قیاس کہاں ۱۲ جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں
جان میں ہوتی گر یہ شیرینی ۱۳ کوہکن باوجودِ غمگینی
جان دینے میں اس کو یکتا جان ۱۴ پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان
نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر ۱۵ کہ دواخانۂ ازل میں مگر
آتشِ گل پہ قند کا ہے قوام ۱۶ شیرہ کے تار کا ہے ریشہ نام
یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے ۱۷ باغبانوں نے باغِ جنت سے
انگبیں کے بحکمِ رب الناس ۱۸ بھر کے بھیجے ہیں سربمہر گلاس

یا لگا کر خضر نے شاخِ نبات ۱۹ مدتوں تک دیا ہے آبِ حیات
تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل ۲۰ ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل
تھا ترنجِ زر ایک خسرو پاس ۲۱ رنگ کا زرد پر کہاں بو باس
آم کو دیکھتا اگر اک بار ۲۲ پھینک دیتا طلائے دست فشار
رونقِ کارگاہِ برگ و نوا ۲۳ نازشِ دودمانِ آب و ہوا
رہروِ راہِ خلد کا توشہ ۲۴ طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ
صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے آم ۲۵ ناز پروردۂ بہار ہے آم
خاص وہ آم جو نہ ارزاں ہو ۲۶ نو برِ نخلِ باغِ سلطاں ہو
وہ کہ ہے والیِ ولایتِ عہد ۲۷ عدل سے اس کے ہے حمایتِ عہد
فخرِ دین عزِ شانِ جاہ و جلال ۲۸ زینتِ طینت و جمالِ کمال
کار فرمائے دین و دولت و بخت ۲۹ چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت
سایہ اس کا ہما کا سایہ ہے ۳۰ خلق پر وہ خدا کا سایہ ہے
اے مفیضِ وجودِ سایہ و نور ۳۱ جب تلک ہے نمودِ سایہ و نور
اس خداوند بندہ پرور کو ۳۲ وارثِ گنج و تخت و افسر کو

شاد و دل شاد و شادماں رکھیو
اور غالب پہ مہرباں رکھیو

۱۔ ہاں اے دلِ دردمند زمزمہ ساز تو خزانۂ راز کا دروازہ کیوں نہیں کھولتا۔ مطلب یہ ہے۔ ضرور کھول۔

۲۔ جس وقت طبیعت میں آمد ہوتی ہے اور قلم کاغذ پر چلتا ہے تو اس کا کاغذ پر رواں ہونا بالکل ایسا ہی ہے۔ جیسے شاخ گل سے پھول جھڑتے ہیں۔

۳۔ اے دل تو مجھ سے کیا پوچھتا ہے۔ کہ کیا لکھیے۔ تو عقل بڑھانے والے نسخے لکھ اور کیا لکھے گا۔

۴۔ رطب۔۔۔ خرما، کھجور۔ اچھا اس وقت تو آموں کے متعلق کچھ لکھ لیکن اس طرح کہ قلم نخل رطب افشاں ہو جائے۔ مطلب یہ ہے۔ قلم سے بہت ہی شیریں مضامین ٹپکیں۔

۵۔ مرد میداں۔۔۔۔ ہدِ مقابل۔ ثمر کو گیند اور شاخ کو چوگان سے تشبیہہ دی ہے۔ کہتے ہیں۔ آم کا کوئی ہدِ مقابل نہیں۔ اس کا ثمر گیند ہے اور شاخ چوگان ہے۔

۶۔ تاک۔۔۔۔ انگور کی بیل۔ انگور کی بیل کے دل میں یہ ارمان کیوں ہے کہ اس نے آم سے مقابلہ نہیں کیا۔ میدان میں آئے اور مقابلہ کرلے "ہمیں گو وہیں میدان"۔ یہ چوگان ہے اور یہ گیند موجود ہے۔

۷۔ آم کے آگے انگور کی بیل کیا خاک پیش جا سکتی ہے۔ بس اسی جلن میں وہ پڑی اپنے جی کے پھپھولے پھوڑتی ہے۔ انگوروں کو پھپھولوں سے تشبیہہ دی ہے۔

۸۔ جب آم کے سامنے انگور کی کچھ پیش نہ گئی۔ تو وہ ہار کر شراب ناب بن گیا۔ گویا اس طرح اس نے اپنے جلے پھپھولے پھوڑے۔

۹۔ ۱۰۔ کہتے ہیں۔ شراب ناب بننے میں بھی کوئی خوبی نہیں۔ یہ تو مجبور ہو کر اپنے جی کو کھوتا ہے۔ اور شرم سے پانی پانی ہوتا ہے۔

۱۱۔ نیشکر۔۔۔ گنا۔ تم مجھ سے پوچھو تمہیں معلوم نہیں۔ میں تمہیں بتاتا ہوں۔ آم کے آگے نیشکر بھی کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔

۱۱۔ نہ تو اس میں پھول ہیں نہ شاخیں ہیں نہ پتے ہیں نہ پھل ہیں، پھر سب سے زیادہ خرابی یہ ہے کہ جب خزاں کا موسم آتا ہے تو اس کی بہار آتی ہے۔ گنا سردی میں ہوتا ہے۔

۱۳۔ آم کی تعریف اس سے زیادہ کیا کی جائے۔ اور کہاں کہاں قیاس کو دوڑایا جائے۔ یوں سمجھ لو کہ جان بہت ہی شیریں ہے لیکن آم جیسی مٹھاس اس میں بھی نہیں۔ مطلب یہ ہے۔ کہ آم جان سے بھی زیادہ بہتر ہیں۔

۱۴۔۱۵۔ اگر جان میں آم جیسی شیرینی ہوتی۔ تو کوہکن باوجود غمگینی کے اس آسانی سے جان نہ دیتا۔ اگرچہ وہ جان قربان کرنے میں یکتائے روزگار تھا۔ شیرینی اور کوہکن کی رعایت خوب آئی ہے۔

۱۶۔۱۷۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ شاید یہ ثمر دواخانۂ ازل میں تیار ہوا ہے۔ وہاں آتشِ گل کی آنچ پر قند کا قوام تیار کیا ہے۔ اور پھر اس شیرے کے تار کا نام ریشہ کہلایا ہے۔

۱۸۔۱۹۔ رافت ۔۔۔۔ مہربانی، محبت ۔ یا یہ بات ہو گی۔ کہ باغِ جنت کے باغبانوں نے جوشِ محبت میں جنت سے خداوند تعالٰی کے حکم سے شہد کو گلاسوں میں بھر بھر کے ان پر مہریں لگا کر بھیج دیا ہے۔

۲۰۔ یا یہ بات ہے۔ کہ خضر علیہ السلام نے شاخ نبات کو زمین میں لگا کر اس کو مدتوں تک آبِ حیات پانی کے آبجیات دیا ہے۔

۲۱۔ پھر کہیں جا کر یہ درخت پھل لایا ہے۔ ورنہ کہاں ہم اور کہاں یہ درخت۔

۲۲-۲۳۔ کہتے ہیں۔ خسرو کے پاس اس قسم کا کندا تھا کہ ہاتھ

سے دبا کر اس کی جو چیز چاہتے تھے بنا لیتے تھے۔ پرویز نے اس کا ترنج بنا لیا تھا۔ وہ ترنج اس کے دستر خوان پر رکھا رہتا تھا۔ پھر کسریٰ نے اس کا سونے کا ساگ بنوایا اور اس سے اپنے دستر خوان کو زینت دی۔ مرزا صاحب نے اس سونے کو طلائے دست فشار اس لئے کہا ہے۔ کہ موم کی طرح ہاتھ سے دب جاتا تھا۔

خسرو کے پاس ایک سونے کا ترنج تھا۔ اس کا رنگ آم کی طرح زرد تھا۔ لیکن اس میں آم جیسی خوشبو نہیں تھی۔ اگر وہ کہیں آم کو دیکھ پاتا تو اس خالص سونے کو پھینک دیتا۔

۲۴۔ برگ و نوا سے مراد درخت اور طائران خوش الحان ہے کارگاہ کے معنے کارخانے کے ہیں۔ یہاں چمن مراد ہے کہتے ہیں۔ آم پُر بہار چمن کی رونق ہے۔ اور خاندانِ آب و ہوا یعنی بہار کے لئے باعثِ ناز۔ دودمان آب و ہوا سے باغ بھی مراد لے سکتے ہیں۔

۲۵۔ طوبےٰ ..... جنت میں ایک درخت ہے۔ جس کی ایک ایک شاخ بہشت میں جانے والوں کے مکانوں میں ہو گی۔ اس شاخ سے طرح طرح کے میوے اور خوشبوئیں پیدا ہوں گی۔ سدرہ ..... ساتویں آسمان پر ایک درخت ہے ۔۔۔ آم جنت میں جانے والوں کا توشہ ہے اور طوبےٰ اور سدرہ کا جگر گوشہ ہے۔ بقولِ بیخود مراد یہ ہے۔ کہ اگر آم کھاتے کھاتے کوئی مر جائے۔ تو وہ سیدھا جنت میں جاتا ہے خوب توضیح ہے۔

۲۶۔ آم کا درخت خوب لدا پھندا اور پھولا پھلا ہے۔ گویا آم کو بہار نے بڑے ناز و نعم سے پالا ہے۔

۲۷۔نوبر۔۔۔۔نیا پھل ـــــ خاص کردہ آم جو آسانی سے دستیاب نہ نہ ہوتا ہو۔اور باغِ سلطان کا نیا پھل۔

۲۸۔اور بادشاہ بھی وہ بادشاہ جو عہد و پیمان کی ولایت کا والی ہے اور جس کا عدل و انصاف زمانے کا حامی ہے۔

۲۹۔میرا بادشاہ دین کے لئے باعثِ فخر ہے۔اور جاہ و جلال کی عزت و شان اس سے قایم ہے۔اس کی ذات طینت جمال اور کمال کے لئے زینت کا باعث ہے۔

۳۰۔کارفرما۔۔۔حاکم، بادشاہ ـــــ وہ دین و دولت اور بخت کا بادشاہ ہے۔اور تاج و مسند و تخت کو اس کی ذات سے آرائش حاصل ہے۔

۳۱۔اس کا سایہ ہما کا سایہ ہے۔گویا جس پر وہ اپنا سایہ ڈالتا ہے۔وہ بادشاہ ہے۔اور مخلوق کے سر پر اس کا سایہ خدا کا سایہ ہے یعنی وہ ظل اللہ ہے۔

۳۲۔مفیض۔۔۔فیض پہنچانے والا یعنی خدا ـــ اے نور اور سائے کے فیض رساں جب تک سایہ اور نور کا وجود ہے۔

۳۳۔اس وقت تک اس بندہ پرور بادشاہ کو جو خزانوں کا مالک ہے اور تخت و تاج کا وارث ہے۔

۳۴۔شاد۔دلشاد۔اور شادمان رکھیو۔اور اس کے ساتھ ہی اسے غالب پر بھی مہربان رکھیو۔

قطعات

(۱)

اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر ۱ اے جہاندارِ کرم شیوۂ بے شبہ و عدیل

پانوں سے تیرے ملے فرقِ ارادت اورنگ ۲ فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اکلیل

تیرا اندازِ سخن شانۂ زلفِ الہام ۳ تیری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل

تجھ سے عالم پہ کھلا رابطۂ قربِ کلیم ۴ تجھ سے دنیا میں بچھا مائدۂ بذلِ خلیل

بہ سخن اوج دہِ مرتبۂ معنے و لفظ ۵ بہ کرم داغ نہِ ناصیۂ قلزم و نیل

تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توفیر ۶ تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل

ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر ۷ زہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا تحویل

تیری دانش مری اصلاحِ مفاسد کی رہین ۸ تیری بخشش مرے انجاحِ مقاصد کی کفیل

تیرا اقبالِ ترحم مرے جینے کی نوید ۹ تیرا اندازِ تغافل مرے مرنے کی دلیل

بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں ۱۰ چرخِ کجباز نے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل

پیچھے ڈالی ہے سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ ۱۱ پہلے ٹھونکی ہے بنِ ناخنِ تدبیر میں کیل

تپشِ دل نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم ۱۲ کششِ دم نہیں بے ضابطۂ جرِ ثقیل

درِ معنی سے مرا صفحہ لقا کی داڑھی ۱۳ غمِ گیتی سے مرا سینہ عمر کی زنبیل

فکر میری گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر ۱۴ کلک میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح ۱۵ میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

نیک ہوتی مری حالت تو نہ دیتا تکلیف ۱۶ جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تعجیل

قبلۂ کون و مکاں خستہ نوازی میں یہ دیر ۱۷ کعبۂ امن و اماں عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

۱۔ فلک منظر۔۔۔ آسمان مرتبت، یعنی آسمان جیسے مرتبے والا بے عدیل۔۔ بے مثل بے شبہ۔۔۔۔ بے مشبہ جس کا کوئی ثانی نہ ہو۔ اے آسمان جیسے مرتبے والے اور بے مثل و بے نظیر شہنشاہ اور اے گرم گستر جہاندار تو کرم گستری میں بے مثال اور لاثانی ہے۔

۲۔ فرق۔۔۔۔ مانگ، سر۔ اورنگ۔۔۔ تخت۔ اکلیل۔۔۔۔ تاج
تخت تیرے پاؤں سے اپنے سر ارادت کو ملتا ہے اور تاج تیرے سر سے سعادت حاصل کرتا ہے۔

۳۔ شانہ۔۔۔۔ کنگھی۔ تیرا اندازِ سخن زلف الہام کے لئے شانہ ہے یعنی وہ الہامی باتوں کو سلجھاتا ہے۔ اور تیرے قلم کی رفتار جبرئیل علیہ السلام کے پروں کی جنبش ہے یعنی اس سے الہامی باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔

۴۔ کلیم اللہ کو جو خداوند کریم سے قرب حاصل تھا وہ سنی سنائی بات تھی۔ لیکن تیرے قرب خداوندی کو دیکھ کر لوگوں نے اس بات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ کلیم کو قرب خداوندی کیونکر حاصل ہوا تھا اسی طرح تیرے دسترخوان کو دیکھ کر اہل دنیا کو سخاوت خلیل اللہ حضرت ابراہیم کا اندازہ ہوگیا مطلب یہ ہے کہ دونوں خصوصیات تجھ میں موجود ہیں۔

۵۔ اپنی سخنوری سے تو معنے ولفظ کا رتبہ بلند کرتا ہے اور اپنی سخاوت سے تو بحر قلزم اور دریائے نیل کی پیشانی پر داغ لگاتا ہے یعنی تیری سخاوت کے سامنے قلزم و نیل بھی شرمندہ ہیں۔

۶ و ۷۔ اس لئے تاکہ تیرے عہد میں عیش و مسرت کی کثرت ہو۔ نیز اس لئے کہ تیرے عہد میں رنج والم کی قلت ہو۔ ماہ نے برجِ ثور سے باہر

جانا چھوڑ دیا۔ اور زہرہ نے بُرجِ حوت سے نکلنا ترک کر دیا جب یہ سیارے ان بُرجوں میں ہوتے ہیں۔ تو زمانہ کثرت سے عیش کرتا ہے۔

۸۔ انجاحِ مقاصد۔۔۔ مقاصد کو پورا کرنا۔ تیری عقل و دانش میری کوتاہیوں اور غلطیوں کی اصلاح کرتی ہے۔ اور تیری بخشش میرے مقاصد کو پورا کرنے والی ہے۔

۹۔ اقبال بمعنی التفات۔ تیرے رحم وکرم کا میری جانب ملتفت ہونا۔ میرے جینے کی خوشخبری ہے۔ اور تیرا اندازِ تغافل میرے مرنے کی دلیل ہے۔ یعنی تیرے رحم سے میں جی سکتا ہوں۔ اور تیرا تغافل میرے لئے موت ہے۔

۱۰۔ میرے ناموافق مقدر نے چاہا تھا۔ کہ مجھ کو پناہ نہ دے، اور فلکِ کج رفتار کا ارادہ تھا کہ مجھ کو ذلیل وخوار کر دے۔

۱۱۔ فلکِ کج رفتار نے پہلے میرے ناخنِ تدبیر میں کیل ٹھونک دی۔ اس کے بعد میرے سر رشتۂ اوقات (کاروبار) میں گرہ ڈال دی۔ تاکہ ناخنِ تدبیر عقدہ کشائی نہ کر سکے۔

۱۲۔ جرِّ ثقیل۔۔۔ ایک علم ہے جس میں بھاری چیزوں کو اٹھانے کے قاعدے بتلائے جاتے ہیں۔ تپشِ دل میرے لئے خوفِ عظیم کا باعث ہے۔ اور سانس لینا بغیر جرِّ ثقیل کی امداد کے ممکن نہیں۔

طباطبائی لکھتے ہیں۔ دل کی تپش خوفِ عظیم سے خالی نہیں اور سانس لینا جرِّ ثقیل سے کم نہیں۔

۱۳۔ لقا کی داڑھی۔۔۔ داستانِ امیر حمزہ میں مرقوم ہے کہ لقا

کی داڑھی کے ہر ایک بال میں موتی پروئے جاتے تھے۔ عمرو کی زنبیل ...... عمر عیار کی زنبیل میں ایک دنیا آباد تھی، عمرو عیار ہر چیز کو اس میں ڈال دیتا تھا لیکن وہ کسی طرح پُر نہ ہوتی تھی۔ کہتے ہیں میرا دہ کاغذ جس پر میں نے اشعار لکھے ہیں۔ معانی کے موتیوں سے اس طرح بھرا ہوا ہے۔ جیسے لقا کی داڑھی اور دنیا زمانے کے غم میرے سینے میں اس طرح سمائے ہیں۔ کہ اسے عمرو عیار کی زنبیل کہنا چاہیئے۔ کہ وہ کسی طرح خالی ہی نہیں ہوتا۔

۱۴۔ میری فکر میں اشارات کثیر ہیں۔ اگرچہ میرا قلم کم عبارت لکھنے کا عادی ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ میری عبارت کم ہے لیکن اس میں معانی بہت ہیں۔

۱۵۔ ابہام ...... کسی بات کو نہایت مبہم طور پر بیان کرنا۔ توضیح ...... کسی بات کو وضاحت سے کھول کر بیان کرنا۔ میرا مبہم بیان بھی ایسا صاف ہوتا ہے۔ کہ توضیح و تشریح اس پر قربان ہوتی ہے۔ اور میری مجمل اور مختصر بات سے تفصیل ٹپکتی ہے۔ مطلب یہ ہے۔ تو میرے اشاروں کنایوں کو بالتفصیل سمجھتا ہے۔

۱۶۔ نیک حالت یعنی خوش حالی۔ اگر میں تکلیف میں نہ ہوتا۔ گویا خوشحال ہوتا۔ تو اے ممدوح میں آپ کو تکلیف نہ دیتا۔ نیز اگر میری طبیعت پریشان نہ ہوتی۔ تو میں اپنے مقصد وصلہ و انعام کو حاصل کرنے کے لئے اتنی جلدی نہ کرتا۔

۱۷۔ اے قبلہ دو عالم غریب نوازی میں اتنی دیر نہیں ہونی چاہیئے۔ اور اے کعبۂ امن و امان عقدہ کشائی میں اس قدر ڈھیل مناسب نہیں

سارے قطعہ کا نچوڑ یہی شعر ہے۔ بقول طبا طبائی عقدہ کشائی سے ڈھیل دینے کو جس قدر مشابہت ہے۔ اس کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ یعنی یہ سچ ہے۔ کہ بے ڈھیل دیئے گرہ نہیں کھل سکتی۔ لیکن اتنی ڈھیل کوئی نہیں دیتا ہے۔

قطعہ نمبر ۲

گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری ۱ کیا کرتے تھے تم تقریر ہم خاموش رہتے تھے
بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی جانے دو مل جاؤ ۲ قسم لو ہم سے گر یہ بھی کہیں کیوں ہم نہ کہتے تھے

۱۔ غیروں کی وفاداری تقریر کرتے تھے۔ یعنی بیان کیا کرتے تھے۔ یہ فارسی محاورے کا ترجمہ ہے۔ کہتے ہیں وہ دن گئے۔ جب تم بغیر سوچے سمجھے غیروں کی وفاداری کی تعریف کیا کرتے تھے۔ اور ہم خاموش بیٹھے سنا کرتے تھے۔

۲۔ اب جبکہ غیروں سے آپ کی بگڑ گئی ہے۔ تو اب آپ شرمندہ کیوں ہوتے ہیں۔ اور اس شرمندگی کے باعث ہم سے ملنا جلنا کیوں چھوڑ دیا ہے۔ اس شرمندگی کو چھوڑو اور ہم سے مل جاؤ۔ ہم سے قسم لے لو جو کبھی ہم یہ بھی کہیں۔ کیوں ہم نہ کہتے تھے۔ "کیوں ہم نہ کہتے تھے" میں جو لطف ہے وہ بیان میں نہیں آسکتا۔ ایسے موقع پر صرف اسی قدر کہا جاتا ہے۔ اور اس سے مطلب یہ ہے۔ کہ ہم نہ کہتے تھے۔ یہ لوگ بے وفا ہیں۔

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں ۱ اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرّا کہ ہے غضب ۲ وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر ۳ طاقت رُبا وہ اُن کا اشارہ کہ ہائے ہائے
وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ وا
وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

۱- ہائے ہائے اے ہمنشین تو نے کلکتہ کا ذکر کر کے میرے دل پر ایک تیر چلا دیا - یعنی کلکتہ یاد آنے سے میرا دل تڑپ گیا۔

۲- مطرا - شاداب — ہائے ہائے کلکتہ کا نام سُنتے ہی وہاں کے وہ ہرے بھرے صاف ستھرے سبزہ زار اور طرحدار معشوق یاد آ گئے۔

۳- حف نظر ... چشم بد دور — ہائے ہائے وہ ان کی صبر آزما نگاہیں خدا ان کو نظر بد سے بچائے - اور ان کے وہ طاقت رُبا اشارے یاد آ گئے۔

۴- سبحان اللہ کلکتہ کے وہ تازہ اور شیریں میوے اور ہائے وہاں کی وہ خالص اور خوشگوار شرابیں۔

چکنی ڈلی

(۴)

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی ۱ زیب دیتا ہے اسے جسقدر اچھا کہیئے

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے ۲ ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

مہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیے ۳ حرزِ بازوئے شگرفانِ خود آرا کہیے

مسی آلودہ سرِ انگشتِ حسیناں لکھیے ۴ داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے

خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھیے ۵ سرِ پستانِ پریزاد سے مانا کہیے

اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجے ۶ خالِ مشکینِ رخِ دلکشِ لیلےٰ کہیے

حجر الاسودِ دیوارِ حرم کیجے فرض ۷ نافہ آہوئے بیابانِ ختن کا کہیے

وضع میں اسکو سمجھ لیجئے قافِ تریاق ۸ رنگ میں سبزۂ نوخیزِ مسیحا کہیے

صومعے میں اُسے ٹھہرائیے گر مُہرِ نماز ۹ میکدے میں اُسے خشتِ خمِ صہبا کہیے

کیوں اسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیے ۱۰ کیوں اُسے نقطۂ پرکارِ تمنا کہیے

کیوں اُسے گوہرِ نایاب تصور کیجے ۱۱ کیوں اُسے مردمکِ دیدۂ عنقا کہیے

کیوں اسے تکمۂ پیراہنِ لیلےٰ لکھیے ۱۲ کیوں اسے نقشِ پئے ناقۂ سلمیٰ کہیے

۱۳ بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجے فرض
اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے

از یادگار غالب سنہ ۱۸۶۱ء میں جبکہ نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم کلکتہ گئے ہوئے تھے۔ مولوی محمد عالم مرحوم نے جو کلکتہ کے ایک دیرینہ سال فاضل تھے نواب صاحب سے بیان کیا۔ کہ جس زمانے میں مرزا صاحب یہاں آئے ہوئے تھے۔ ایک مجلس میں جہاں مرزا صاحب بھی موجود تھے۔ اور میں بھی حاضر تھا۔ شعرا کا ذکر ہو رہا تھا۔ اثنائے گفتگو میں ایک صاحب نے فیضی کی بہت تعریف کی۔ مرزا نے کہا فیضی کو جیسا لوگ سمجھتے ہیں ویسا نہیں اس پر بات بڑھی۔ اس شخص نے کہا فیضی جب پہلی بار اکبر کے روبرو گیا تھا۔ اس نے ڈھائی سو

شعر دل کا قصیدہ اسی وقت کہہ کر پڑھا تھا۔ مرزا بولے عجب کیا اللہ کے بندے ایسے موجود ہیں۔ کہ دو چار سو نہیں۔ تو دو چار شعر مرتفع پر کہہ سکتے ہیں مخاطب نے جیب میں سے ایک چکنی ڈلی نکال ہتھیلی پر رکھی اور مرزا سے درخواست کی۔ کہ اس ڈلی پر کچھ ارشاد ہو۔ مرزا نے یہ گیارہ شعر کا قطعہ اسی وقت موزوں کر کے پڑھ دیا۔

۱۔ کف دست ۔۔۔ ہتھیلی۔ آپ کی ہتھیلی پر جو چکنی ڈلی ہے۔ اس کی جس قدر تعریف کریں درست ہے۔ یہ چکنی ڈلی بھی اس سبب سے ہے کہ آپ کے ہاتھ پر رکھی ہے۔

۲۔ انگشت بدنداں ۔۔۔ حیرانی کی کیفیت۔ سر بگریباں ۔۔۔ فکر کی حالت۔ قلم حیران ہے۔ کہ میں اسے کیا لکھوں۔ اور قوت گویائی فکر میں ڈوب گئی ہے کہ میں اسے کیا کہوں۔

۳۔ حرز ۔۔۔ تعویذ۔ اس کو عزیزانِ گرامی کے خط کی مہر لکھ جائے یا طرحدار اور سرخ و سپید معشوقوں کے بازو کا تعویذ کہا جائے۔

۴۔ اس کو حسینوں کی مستی بھری انگلی کی پور لکھئے یا عاشق شیدا کے جگر کا داغ کہیئے۔

۵۔ خاتم ۔۔۔۔۔ انگوٹھی۔ مانا ۔۔۔۔ مشابہ۔ پرستان ۔۔۔ بھٹنی ۔۔ اس کو حضرت سلیمان کے ہاتھ کی انگوٹھی کا مشابہ لکھا جائے یا پریزاد کے پستان کی بھٹنی کہا جائے۔

۶۔ اس کو قیس کے اخترِ سوختہ سے نسبت دینی چاہیئے یا لیلیٰ کے دلکش چہرے کا سیاہ تل کہنا چاہیئے۔ اخترِ سوختہ کہہ کر چکنی سے تشبیہہ تام

پیدا کر دی ہے۔

۷۔ یا تو اسے دیوارِ حرم کا حجر الاسود فرض کیجئے یا بیابان ختن کے ہرن کا نافہ لکھئے۔ حجرِ الاسود ایک سیاہ پتھر ہے۔ جو خانہ کعبہ کی دیوار میں نصب ہے۔ حجاج اس کو بوسہ دیتے ہیں۔ اعتقاد یہ ہے کہ اس کو بوسہ دینے سے گناہ دور ہو جاتے ہیں۔

۸۔ اگر اس کو وضع میں تریاق کا قاف سمجھئے تو رنگ میں مسیحا کا سبزۂ نوخیز کہیئے۔ طباطبائی لکھتے ہیں۔ "سمجھئے" میں میم ساکن اور جیم متحرک نظم ہوا ہے۔ اس طرح کسی استاد نے نہیں باندھا۔ خلافِ محاورہ ہے۔

۹۔ صومعہ .... عبادت خانہ۔ مُہرِ نماز ... سجدہ گاہ۔ جس پر اہلِ تشیع سجدہ کرتے ہیں۔ خشتِ خمِ صہبا ..... شراب کے مٹکے کے منہ پر ایک اینٹ رکھ دیتے ہیں۔ کہ شراب اُڑنے نہ پائے۔ اگر اس چکنی ڈلی کو عبادت خانے میں مُہرِ نماز ٹھہرائیے تو میکدے میں اسے خشتِ خمِ صہبا کہیئے۔ مطلب یہ ہے عبادت خانوں میں اس پر زاہد اور مے خانوں میں اس پر مست سجدہ کرتے ہیں۔

۱۰۔ اس چکنی ڈلی کو گنجِ محبت کے دروازے کا قفل کیوں لکھئے اور کیوں اسے تمنائے ہر کار کا مرکز کہیئے۔ اس لئے کہ تمنا پرکار کی طرح اس کے گرد گھومتی ہے۔

۱۱۔ کیوں اسے گوہرِ نایاب تصور کیا جائے۔ اور کیوں اسے عنقا کی آنکھ کی پتلی کہا جائے۔

۱۲۔ سلمہ ..... عرب کی ایک حسینہ کا نام ہے۔ کیوں اسے لیلے کے پیراہن کا تکمہ لکھیں۔ اور کیوں اسے سلمہ کی اونٹنی کا نقش قدم کہیں۔

۱۳۔ ان سب تشبیہوں سے بہتر یہ تشبیہہ ہے کہ بندۂ پرور کے کف دست کو دل فرض کر لیجئے۔ اور اس چکنی ڈلی کو اس دل کا خالِ سویدا لکھئے۔

(۵)

نہ پوچھ اس کی حقیقت حضور والا نے ۱ مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر ۲ جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی۔

یادگارِ غالب "جب بادشاہ کوئی عمدہ چیز پکواتے تھے۔ تو اکثر مصاحبین اور اہل دربار کے لئے بطور ادلوش کے بھیجا کرتے تھے اس کے شکریئے میں کبھی کبھی مرزا کوئی قطعہ یا رباعی بادشاہ کے حضور میں گذرانتے تھے۔ یہ قطعہ بھی اسی قبیل کا ہے جس وقت بادشاہی چوب دار یہ ادلوش لے کر آیا۔ ایک باہر کا رہنے والا طالب علم جو مرزا سے کچھ پڑھا کرتا تھا موجود تھا۔ چوبدار کے بعد اس نے متعجب ہو کر پوچھا کہ بیسنی روٹی ایسی کیا نادر چیز ہے کہ بادشاہ کی سرکار سے بطور ادلوش کے تقسیم ہوتی ہے۔ مرزا نے کہا۔ ارے احمق چنا وہ چیز ہے۔ کہ اس نے ایک دفعہ جناب باری میں فریاد کی۔ کہ دنیا میں مجھ پر بڑے ظلم ہوتے ہیں۔ مجھے دلتے ہیں۔ پیستے ہیں۔ بھونتے ہیں۔ پکاتے ہیں اور مجھ سے سینکڑوں چیزیں بنا کر کھاتے ہیں۔ جیسا مجھ پر ظلم ہوتا ہے

ایسا کسی پر نہیں ہوتا۔ وہاں سے حکم ہوا۔ اے چنے تیری خیر اسی میں ہے کہ ہمارے سامنے سے چلا جائے۔ ورنہ ہمارا بھی جی یہی چاہتا ہے کہ تجھ کو کھا جائیں۔"

اور حضور والا نے جو مجھے بیسن کی روغنی روٹی بھیجی ہے۔ اس کی حقیقت مجھ سے نہ پوچھ۔ یہیں یہ سمجھ لے کہ اگر حضرت آدم یہ بیسنی روٹی کھاتے۔ تو بہشت سے ہرگز باہر نہ نکالے جاتے۔

سہرا

(۱)

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا ۱ باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا
کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے ۲ ہے ترے حسن دل افروز کا زیور سہرا
سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرف کلاہ ۳ مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا
ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی ۴ ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا
رخ پہ دولہا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا ۵ ہے رگ ابر گہر بار سراسر سہرا
یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے ۶ رہ گیا آن کے دامن کے برابر سہرا
جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز ۷ چاہیے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا
جب کہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے ۸ گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا
رخ روشن کی دمک گوہر غلطاں کی چمک ۹ کیوں نہ دکھلائے فروغ مہ و اختر سہرا
تار ریشم کا نہیں ہے یہ رگ ابر بہار ۱۰ لائے گا تاب گرانباری گوہر سہرا

"ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

بادشاہ کے چھوٹے بیٹے مرزا جواں بخت کی شادی کے موقع پر مرزا نے یہ سہرا لکھا اور ایک سونے کی کشتی میں رکھ کر بڑے تکلف کے ساتھ بادشاہ کے حضور میں گذارا تھا۔ اس سے پہلے اردو میں سہرے لکھنے کا دستور نہ تھا۔ گویا مرزا غالب سہرے کے موجد ہیں۔

۱۔ اے نصیب خوش ہو کہ آج تیرے سر سہرا ہے اب تو شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا باندھ۔ افسوس ہے مرزا صاحب پورا محاورہ نظم نہیں کر سکے۔ محاورہ میں خالی سہرا نہیں بولا جاتا ظاہر کرنا چاہیئے تھا۔ کہ کس چیز کے سر سہرا ہے۔ شعر کے الفاظ سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس سے اصلی سہرا مراد ہے حالانکہ مصنف کا مفہوم یہ نہیں ہے۔ استاد ذوق نے اپنے مطلع میں یہ کمی پوری کر دی ہے۔

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

۲۔ تیرے اس چاند سے مکھڑے پر سہرا بہت ہی بھلا معلوم دیتا ہے۔ گویا سہرا تیرے حسن دل افروز کا زیور ہے۔

۳۔ لمبر۔۔۔ نمبر۔ درجہ۔ گذشتہ صدی میں لمبر ہی مستعمل تھا۔ طرف کلاہ۔۔۔۔۔ گوشہ کلاہ ۔۔۔ اے گوشہ کلاہ تجھے شہزادہ کے سر پر چڑھنا سچ مچ زیب دیتا ہے۔ لیکن مجھے ڈر یہ ہے۔ کہ کہیں تیرا درجہ سہرا نہ چھین لے۔ یعنی سہرا باندھنے سے کہیں تو نیچے نہ

دب جائے۔

۴۔ مرزا صاحب نے کشتی کے لفظ سے فائدہ اٹھایا ہے۔ کہتے ہیں۔ اس سہرے کو گوندھنے میں ایک ناؤ موتی پروئے گئے ہوں گے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو پھر سہرے کو کشتی میں لگا کر کیوں لاتے۔ ذوق کا یہ شعر غالب کے اس شعر سے بہت بڑھا ہوا ہے

آج وہ دن ہے کہ لائے دُرِ انجم سے فلک کشتیٔ زر میں مہِ نَو کی لگا کر سہرا

۵۔ دریا بمعنی سمندر۔ سات سمندروں کے موتی جمع کیے ہوں گے پھر کہیں جا کر اس انداز کا گز بھر سہرا بنا ہوگا۔ بنا کا لفظ خوب ہے۔

۶۔ دولہا کے چہرے سے گرمی کی وجہ سے پسینے کے قطرے ٹپک رہے ہیں۔ ان کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سہرے کی لڑیاں نہیں ہیں۔ بلکہ ابرِ گہر بار کی رگیں ہیں۔ گرمی سے گرمیٔ حسن مراد ہے۔

۷۔ یہ ایک بے ادبی تھی کہ سہرا قبا سے آگے بڑھ جاتا۔ یہی وجہ ہے وہ قبا کے برابر آ کر رک گیا اور آگے نہ بڑھا۔

۸۔ تاکہ شہزادے کے سہرے میں گندھ کر موتی اس بات پر نہ اترائیں۔ کہ ہم ہی سب کچھ ہیں۔ اس لئے پھولوں کے سہرے کی بھی ضرورت ہے۔

۹۔ جب خوشی کے مارے پھول اپنے میں نہیں سماتے۔ تو پھر کوئی پھولوں کا کیونکر سہرا گوندھ سکتا ہے۔

بیخود نکھتے ہیں۔ کلیوں کا کھلنا گویا قبائے گل کا جوشِ مسرت سے

چاک ہوجاتا ہے۔ ایسی صورت میں سہرے کا گوندھا جانا دشوار ہوگیا ہے۔

۱۰- ادھر رُخِ روشن کی دمک ہے۔ اُدھر گوہر غلطان کی چمک ہے پھر بھلا سہرا مہ واختر کی چمک دمک کیوں نہ دکھلائے۔

۱۱- اس سہرے میں ریشم کا تار نہیں ہے بلکہ رگِ ابر بہار ہے اس لئے وہ موتیوں کے بھاری وزن کو بخوبی اُٹھا لے گا۔ مطلب یہ ہے۔ کہ ریشم کا تار اس قدر موتیوں کے بوجھ کو نہیں اُٹھا سکتا۔

۱۲- ہم سخن فہم ہیں، غالب کے طرفدار نہیں کہ اس کی رو رعایت کریں بھلا دیکھیں۔ اس سہرے سے بڑھ کر کوئی سہرا کہہ دے مطلب یہ ہے کہ اس سے بہتر سہرا لکھنا ناممکن ہے۔ یہ غالب ہی کا حق ہے۔

آبحیات: - جہاں پناہ نے جب سہرے کو ملاحظہ فرمایا۔ تو مقطع کو دیکھ کر حضور کو بھی خیال بلکہ ملال ہوا۔ استاد ذوقؔ مرحوم جو حسبِ معمول حضور رہیں گئے۔ تو یہ سہرا دیا۔ اور کہا۔ استاد اِسے تو دیکھو انہوں نے پڑھا اور بموجب عادت کے عرض کی پیر و مرشد درست۔ بادشاہ نے فرمایا۔ تم بھی ایک سہرا لکھ دو۔ عرض کی بہت خوب۔ پھر فرمایا۔ کہ ابھی لکھ دو۔ اور کہا۔ کہ مقطع کو بھی دیکھا۔ عرض کی حضور دیکھا غرض وہیں بیٹھ گئے اور عرض کیا۔

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا ۱ آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

آج وہ دن ہے کہ لائے دُرِ انجم سے فلک ۲ کشتیٔ زر میں مہ نو کی لگا کر سہرا

تابشِ حسن سے مانند شعاع خورشید ۳ رُخِ پُر نور پہ ہے تیرے منور سہرا

وہ کہے صلِ علیٰ یہ کہے سبحان اللہ ۴ دیکھے مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا

تانے اور بنتی میں رہے اخلاص بہم ۵ گوندھیے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا

دھوم ہے گلشنِ آفاق میں اس سہرے کی ۶ گائیں مرغانِ نواسنج نہ کیوں کر سہرا

روئے فرخ پہ جو ہیں تیرے برستے انوار ۷ تارِ بارش سے بنا ایک سراسر سہرا

ایک کو ایک پہ تزئیں ہے دمِ آرائش ۸ سر پہ دستار ہے دستار کے اوپر سہرا

اک گہر بھی نہیں صد کانِ گہر میں چھوڑا ۹ تیرے بنوایا ہے لے لے کے جو گوہر سہرا

پھر تو خوشبو سے ہے اترائی ہوئی بادِ بہار ۱۰ اللہ اللہ رے پھولوں کا معطر سہرا

سر پہ طرّے ہے مزیّن تو گلے میں بدّھی ۱۱ کنگنا ہاتھ میں زیبا ہے تو سر پر سہرا

رونمائی میں تجھے دے مہِ خورشید فلک ۱۲ کھول دے منہ کو جو تو منہ سے اٹھا کر سہرا

کثرتِ تارِ نظر سے ہے تماشائیوں کے ۱۳ دمِ نظارہ ترے روئے نکو پر سہرا

دُرِ خوش آب مضامیں سے بنا کر لایا ۱۴ واسطے تیرے ترا ذوق ثنا گر سہرا

۱۵ جس کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سنا دو اس کو
دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

اربابِ نشاط حضور میں ملازم تھیں۔ اسی وقت انہیں ملا اور شہر کی گلی گلی کوچے کوچے میں پھیل گیا۔ مرزا بڑے ادا شناس تھے۔ سمجھے کہ کیا تھا کچھ اور ہو گیا کچھ اور۔ اسی وقت یہ قطعہ لکھ کر حضور میں گذرانا۔ سب طرف تعریفیں ہوئیں۔

معذرت

(۷)

منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی ۱ اپنا بیانِ حسنِ طبیعت نہیں مجھے

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری ۲ کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلح کل ۳ ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں ۴ مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

استاد شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال ۵ یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

جام جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر ۶ سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں کون اور ریختہ ہاں اس سے مدعا ۷ جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا ز رہِ امتثالِ امر ۸ دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے

مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات ۹ مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ ۱۰ سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے

قسمت بری سہی پہ طبیعت بری نہیں ۱۱ ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

۱۲ صادق ہوں اپنے قول میں غالبؔ خدا گواہ

کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

۱۔ مجھے اپنا واقعی حال عرض کرنا مقصود ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مجھے اپنے حسنِ طبیعت کا بیان منظور نہیں۔

۲۔ میرے آباؤ اجداد کا پیشہ سو سال سے سپاہ گری ہے۔ اور یہی پیشہ میرے لئے باعث فخر ہے۔ میں شاعری کو ذریعہ عزت نہیں سمجھتا۔ مطلب یہ ہے کہ اہلِ سیف اہلِ قلم سے زیادہ عزت رکھتے ہیں۔

۳۔ آزادہ رو ۔۔۔۔ آزاد روش۔ مسلک ۔۔۔۔ طریقہ، راستہ میں ایک آزادہ رو انسان ہوں۔ اور میرا طریقہ صلح کل ہے میں کسی کا دل نہیں دکھاتا۔ اور میں ہرگز کسی سے عداوت و بغض نہیں رکھتا

۴ - یہ سچ ہے۔ کہ مجھے عزت، مرتبہ اور دولت مندی حاصل نہیں لیکن یہ کیا کچھ کم اعزاز ہے۔ کہ میں ابوظفر بہادر شاہ بادشاہ کا غلام ہوں۔

۵ - بادشاہ کا غلام ہوتے ہوئے مجھے بادشاہ کے استاد سے پرخاش ہو توبہ۔ توبہ۔ یہ تاب۔ یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے۔

۶ - بادشاہ کا دل جام جہاں نما ہے۔ اس میں وہ ہر ایک چیز کی حقیقت کو دیکھ سکتا ہے۔ اس لئے مجھے اپنی بریت کے لئے قسم کھانے اور گواہ پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ مطلب یہ ہے۔ بادشاہ کو حقیقتِ امر معلوم ہے۔

۷ - بھلا مجھے ریختہ گوئی سے کیا واسطہ۔ کہاں میں کہاں ریختہ گوئی۔ میں تو فارسی کا شاعر ہوں۔ ہاں صرف حضرت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اردو میں کہہ لیتا ہوں۔

۸ - امتثالِ امر...... تعمیل حکم۔ محض حضور کے حکم سے یہ سہرا لکھا گیا تھا۔ اور وہ بھی اس وقت جب میں نے دیکھا۔ کہ سوائے تعمیل حکم کے مجھے کچھ چارہ کار نہیں۔

۹ - سہرے کے مقطع میں محض ایک شاعرانہ اور سخن گسترانہ بات آپڑی ہے۔ ورنہ اس سے میرا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ میں محبت کے راہ و رسم منقطع کر دوں۔

۱۰ - اگر میں نے اس مقطع میں کسی پر چوٹ کی ہو۔ تو کالا منہ ہو۔ میں کوئی دیوانہ نہیں۔ مجنوں نہیں۔ وحشی نہیں۔ کہ ایسی قبیح حرکت کرتا۔

۱۱۔ مانا کہ میری قسمت بری ہے۔ لیکن میری طبیعت بری نہیں۔ یہ شکر کا مقام ہے۔ کہ مجھ کو کسی سے اس بات کی شکایت نہیں۔

۱۲۔ خدا گواہ ہے۔ کہ میں اپنے قول کا سچا ہوں۔ اور میں سچ کہتا ہوں کہ مجھے جھوٹ بولنے کی عادت قطعی نہیں۔

مدح

(۸)

نصرت الملک بہادر مجھے بتلا کہ مجھے ۱ تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات سے ہے
گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے ۲ رونقِ بزمِ مہ و مہر تری ذات سے ہے
اور میں وہ ہوں کہ گر جی میں کبھی غور کروں ۳ غیر کیا خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے
خستگی کا ہو بھلا جس کے سبب سے سرِ دست ۴ نسبت اک گونہ مرے دل کو ترے ہات سے ہے
ہاتھ میں تیرے رہے توسنِ دولت کی عناں ۵ یہ دعا شام و سحر قاضیِ حاجات سے ہے
تو سکندر ہے مرا فخر ہے ملنا تیرا ۶ گو شرف خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے

۷ اس پہ گذرے نہ گماں ریو و ریا کا زنہار
غالب خاک نشیں اہلِ خرابات سے ہے

۱۔ اے نصرت الملک بہادر آپ مجھے یہ بتلائیں کہ مجھے جو آپ سے اتنی عقیدت اور محبت ہے۔ وہ کس وجہ سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسی ارادت انعام و اکرام کی وجہ سے نہیں ہو سکتی۔ بلکہ کچھ روحانی اور قلبی تعلق ہے۔ استفہام اور استعجاب نے

بلاغت پیدا کر دی ہے۔

۲۔ تو وہ ہستی ہے۔ کہ اگر تو اپنی محفل آراستہ کرے تو بزم مہ و مہر کو بھی تیری ذات سے رونق حاصل ہو جائے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ تیری ذات باصفات سے بزم مہ و مہر کو رونق حاصل ہے۔

۳۔ تیرے مقابلے میں میں وہ ہوں۔ کہ اگر میں اپنے پر غور کرتا ہوں تو غیر تو دور رہے۔ مجھے خود اپنے آپ سے نفرت ہوتی ہے

۴۔ خدا اس خستگی یعنی خستہ دلی کا بھلا کرے۔ کہ جس کے سبب سے میرے دل کو تیرے ہاتھ سے ایک گونہ نسبت حاصل ہے مطلب یہ ہے۔ کہ میں مفلس ہوں۔ اس لئے تیرا دست کرم مجھ تک پہنچتا ہے۔

۵۔ تیرے ہاتھ میں ہمیشہ توسن دولت و حکومت کی باگ رہے۔ بس قاضیٔ حاجات سے شام و سحر میری یہی دعا ہے۔

۶۔ اس شعر میں ایہام ہے۔ خضر سلطان بہادر شاہ بادشاہ کے ایک فرزند کا بھی نام تھا۔ یہاں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ پہلے لکھ چکے ہیں۔

خضر سلطاں کو رکھے خالق اکبر سرسبز شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

۷۔ ریو و ریا ..... مکاری ریاکاری۔ غالب پر ریاکاری اور مکاری کا شبہ نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ وہ ایک خاک نشین فقیر ہے۔ اور اہلِ خرابات سے ہے۔ مطلب یہ ہے۔ زاہد لوگ ریاکار ہو سکتے ہیں۔ رند نہیں ہوتے۔

آخری چہار شنبہ

(۹)

ہے چار شنبہ آخرِ ماہِ صفر چلو ۱ رکھ دیں چمن میں بھر کے مئے مشکبو کی ناند
جو آئے جام بھر کے پئے اور ہو کے مست ۲ سبزے کو روندتا پھرے پھولوں کو جائے پھاند
غالب یہ کیا بیاں ہے بجز مدحِ بادشاہ ۳ بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشت و خواند
بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلے حضور میں ۴ ہے جن کے آگے سیم و زر مہر و ماہ ماند
یوں سمجھئے کہ بیچ سے خالی کئے ہوئے ۵ لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بے شمار چاند

۱- آج آخری چہار شنبہ ہے۔ چلو ہم بھی چمن میں مئے مشکبو کی ناند بھر کر رکھ دیں۔ کیونکہ آج کے دن احباب سبزہ روندنے کے لئے چمن میں آئیں گے۔ گلگشت باغ کے ساتھ مے نوشی کا بھی لطف رہے گا۔ ماہ صفر کے آخری چہار شنبے کو جو رسولِ خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کا یوم صحت ہوتا ہے۔ لال قلعہ میں بھی اس روز روشنی کی جاتی تھی۔ اور سونے چاندی کے چھلے تقسیم ہوتے تھے۔ آسی لکھتے ہیں ممکن ہے۔ محرم کی حرمت کی وجہ سے آخر ماہِ صفر تک غالب بادہ نوشی نہ کرتے ہوں۔ اور اسی وجہ سے کہا ہو۔ کہ اس دن صفر کا مہینہ ختم ہو جائے گا۔ چلو باغ میں شراب کی ناند بھر کر رکھ دیں۔ یہ مفہوم قرینِ قیاس نہیں ہے۔

۲- تاکہ جو باغ میں آئے۔ وہ شراب بھر کے جام پئے اور پھر مستی کے عالم میں سبزے کو روندتا پھرے اور پھولوں کے پودوں کو پھاند جائے۔

۳- غالب تم یہ کیا فضول باتیں لکھ رہے ہو- اب مجھے بادشاہ کی مدح کے سوا دوسری کوئی بات لکھنی اچھی معلوم نہیں ہوتی. مطلب یہ ہے. تشبیب کو چھوڑو اور مدح شروع کرو-

۴- آج بادشاہ کے محل میں سونے چاندی کے چھلّے تقسیم ہو رہے ہیں۔ ان چھلّوں کی چمک دمک کے سامنے مہر و ماہ کا سیم و زر بھی ماند ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ یہ چھلّے مہر و ماہ سے زیادہ چمکدار ہیں۔ ان چھلّوں کو دم کئے ہوئے پانی میں بجھا کر بانٹا کرتے تھے-

۵- یوں سمجھ لیجیے- کہ یہ چھلّے نہیں ہیں- بلکہ لاکھوں چاندوں اور بیشمار سورجوں کو بیچ میں سے خالی کر دیا ہے-

---

در مدح شاہ

(۱۰)

اے شاہِ جہانگیر جہاں بخش جہاندار	۱	ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت
جو عقدۂ دشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو	۲	تو وا کرے اُس عقدے کو سو بھی بہ اشارت
ممکن ہے کرے خضر سکندر سے ترا ذکر	۳	گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت
آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا	۴	ہے فخرِ سلیماں جو کرے تیری وزارت
ہے نقشِ مریدی ترا فرمانِ الٰہی	۵	ہے داغِ غلامی ترا توقیعِ امارت
تو آب سے گر سلب کرے طاقتِ سیلاں	۶	تو آگ سے گر دفع کرے تابِ شرارت
ڈھونڈھے نہ ملے موجۂ دریا میں روانی	۷	باقی نہ رہے آتشِ سوزاں میں حرارت
ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغّل	۸	ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت

کیونکر نہ کروں مدح کو میں ختم دعا پر ۹ قاصر ہے شکایت سے تری میری عبارت

نوروز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں ۱۰ نظارگیٔ صنعتِ حق اہلِ بصارت

۱۱ تجھ کو شرفِ مہر جہانتاب مبارک

غالبؔ کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

۱- اے بادشاہِ جہانگیر۔ اے بادشاہِ جہاں بخش اور اے بادشاہِ جہاندار تجھ کو غیب سے سو طرح کی بشارتیں حاصل ہیں۔ یہ جو دیکھتے ہیں کہ مت ذکرہ صفات تجھ کو اس وجہ سے حاصل ہیں کہ تجھے ہر کام کے لئے پہلے سے بشارت ہوجاتی ہے۔

۲- وہ عقدۂ دشوار جو باوجود کوششوں کے وا نہیں ہوتا۔ وہ تیرے اشارے سے کھل جاتا ہے۔

۳- اس وقت تک حضرت خضر تیرا ذکر خیر سکندر سے نہیں کر سکتے جب تک وہ آب حیات سے اپنے منہ کو پاک نہ کرلیں پہلے مصرعہ میں استفہام انکاری ہے۔

۴- آصف برخیا حضرت سلیمان کے وزیر تھے۔ ان کو حضرت سلیمان کی وزارت سے فخر حاصل تھا۔ اگرچہ حضرت سلیمان تیری وزارت کریں۔ تو ان کے لئے تیری وزارت باعث فخر ہو گی۔ دوسرا مفہوم یہ ہے جو شخص تیری وزارت کرے وہ سلیمان کے لئے باعثِ فخر ہے

۵- جس کو تو نے اپنا مرید کرکے مریدی کی سند دے دی۔ اس کو فرمان الٰہی مل گیا۔ اور جس کو تیرا داغِ غلامی نصیب ہو گیا۔ گویا اس کو امیری کی سند مل گئی۔ مطلب یہ ہے۔ تیری غلامی امیری سے بڑھ کر ہے۔

۶-۷- لف ونشر مرتب ہے۔ اگر تو پانی کے بہنے کی طاقت کو دفع کر دے تو دریا کی موجوں میں روانی ڈھونڈے نہ ملے۔ اور اگر تو آگ کی حرارت کو سلب کر دے تو جلا دینے والی آگ میں حرارت نام کو باقی نہ رہے۔

۸- توغل ...... مہارت کامل۔ سحر طرازی ..... فن شاعری۔ اگرچہ میں شاعری میں مہارت کامل رکھتا ہوں۔ اور اگرچہ میں سحر طرازی میں مشاق ہوں۔

۹- میرا ارادہ تھا۔ کہ میں تجھ سے کچھ تیری شکایتیں کروں۔ لیکن کیا کروں مجبور ہوں میری عبارت تیری شکایت میں قاصر ہے۔ میں تیری شکایت نہیں لکھ سکتا۔ اس لئے مجبوراً مدح کو دعا پر ختم کرتا ہوں۔

۱۰- نظارگی ..... دیکھنے والے، اسم فاعل۔ آج نوروز ہے گویا آج وہ دن ہے۔ کہ اہلِ نظر خدا کی قدرت دیکھ رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے۔ کہ اہلِ بصیرت آج تجھے دیکھ رہے ہیں۔

۱۱- نوروز کے دن آفتاب برجِ حمل میں ہوتا ہے اور یہ صورت شادمانیٔ خلق کا باعث ہے۔ اس کو شرفِ آفتاب کہتے ہیں۔ تجھ کو شرفِ آفتاب جہانتاب مبارک ہو۔ اور مجھ کو تیرے عتبۂ عالیہ (آستانِ بلند) کی زیارت۔ دوسرا مفہوم یہ ہے۔ کہ تجھ کو آفتاب کا شرف دو مرتبہ مبارک ہو۔

قطعہ

(۱۱)

افطارِ صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو ۱ اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے
جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو ۲ روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

اس قطعہ کے متعلق مرزا نے اپنے ایک خط میں لکھا ہے۔ یہ قطعہ بھی رمضان کے مہینے میں بادشاہ کے حضور میں پڑھا تھا۔ اس کو سن کر تمام حاضرین بے اختیار ہنس پڑے تھے۔

دستگاہ یعنی قدرت و مقدور۔ روزہ کھانے سے مراد روزہ نہ رکھنا ہے۔ جس شخص کو روزہ کھولنے کا تھوڑا بہت مقدور ہے۔ اس کو روزہ ضرور رکھنا چاہیئے۔ لیکن جس شخص کے پاس روزہ کھولنے کے بعد کھانے کے لئے کچھ نہ ہو۔ وہ غریب اگر روزہ نہ کھائے۔ تو کیا کرے گا

گذارشِ مصنف بحضورِ شاہ

(۱۲)

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ ۱ اے جہاندارِ آفتاب آثار
تھا میں اک بے نوائے گوشہ نشین ۲ تھا میں اک دردمند سینہ فگار
تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی ۳ ہوئی وہ میری گرمیٔ بازار
کہ ہوا مجھ سا ذرۂ ناچیز ۴ روشناس ثوابت و سیار

گرچہ از روئے ننگِ بے ہنری ۵ ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار

کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی ۶ جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار

شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں ۷ بادشہ کا غلامِ کار گزار

خانہ زاد اور مرید اور مداح ۸ تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار

بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر ۹ نسبتیں ہو گئیں مشخص چار

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں ۱۰ مدعائے ضروری الاظہار

پیر و مرشد اگرچہ مجھ کو نہیں ۱۱ ذوقِ آرائشِ سر و دستار

کچھ تو جاڑے میں چاہیئے آخر ۱۲ تا نہ دے بادِ زمہریر آزار

کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش ۱۳ جسم رکھتا ہوں ہے اگرچہ نزار

کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال ۱۴ کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار

رات کو آگ اور دن کو دھوپ ۱۵ بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار

آگ تاپے کہاں تلک انسان ۱۶ دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار

دھوپ کی تابش آگ کی گرمی ۱۷ رَبَّنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّار

میری تنخواہ جو مقرر ہے ۱۸ اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار

رسم ہے مردہ کی چھ ماہی ایک ۱۹ خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار

مجھ کو دیکھو تو ہوں بقیدِ حیات ۲۰ اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض ۲۱ اور رہتی ہے سود کی تکرار

میری تنخواہ میں تہائی کا ۲۲ ہو گیا ہے شریک ساہوکار

آج مجھ سا نہیں زمانے میں ۲۳ شاعرِ نغز گوئے خوش گفتار

رزم کی داستان گر سنیئے ۲۴ ہے زباں میری تیغِ جوہر دار

بزم کا التزام گر کیجئے ۲۵ ہے قلم میرا ابرِ گوہر بار

ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد ۲۶ قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا ۲۷ آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار
میری تنخواہ کیجئے ماہ بماہ ۲۸ تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار
ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام ۲۹ شاعری سے نہیں مجھے سروکار

۳۰ تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

یادگار غالب :- یہ وہ قطعہ ہے۔ جو مرزا نے بادشاہ کے حضور میں اس درخواست کے ساتھ گذارا تھا۔ کہ ان کی تنخواہ جو ششماہی گذرنے پر انکھی چھ مہینے ملا کرتی ہے۔ وہ ماہ بماہ ملا کرے۔ چنانچہ اس درخواست کے موافق تنخواہ ماہ بماہ ملنے لگی تھی۔

۱۔ اے وہ شہنشاہ کہ تیرا تخت آسمان ہے اور اے وہ جہانبان کہ تیری حکومت آفتاب کی طرح کل جہان پر ہے۔ اس شعر میں مصنف نے صنعت براعت الاستہلال صرف کی ہے۔ ممدوح کو آفتاب آثار لکھ کر مطلع ہی میں ظاہر کر دیا ہے۔ کہ موسم سرما کی شکایت کریں گے۔

۲۔ میں ایک محتاج گوشہ نشین فقیر اور مصیبت زدہ خستہ دل شخص تھا۔

۳۔ تمہارے آبرو بخشنے سے مجھے وہ عزت و شہرت حاصل ہوئی

۴۔ گویا تمہاری ذرہ نوازی سے مرتبہ اس قدر بلند ہوا کہ مجھ سے ذرہ بے مقدار کو سیارے اور ستارے جاننے اور پہچاننے لگے۔

۶۰۵۔ اگرچہ میں اپنی بے ہنری کی وجہ سے۔ خود اپنی نظروں میں اتنا حقیر و ذلیل ہوں۔ کہ اگر میں اپنے آپ کو خاک کہوں تو یہ شکر خاک کو بھی شرم آجائے۔

۷۔ لیکن پھر بھی میں اپنے دل میں خوش ہوں۔ کہ میں بادشاہ کا ایک کارگذار غلام ہوں۔

۸۔ یہ خانہ زاد غلام مرید۔ اور مداح ہمیشہ سے عرائض نویسی کی خدمت انجام دیتا تھا۔

۹۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ کہ آخرکار میں نوکر بھی ہو گیا اور حضور سے مجھ کو مذکورہ بالا چار نسبتیں ہو گئیں۔ یعنی خانہ زاد مرید۔ مداح اور وظیفہ نگار ہو گیا۔

۱۰۔ اگر اتنا ضروری مدعا آپ سے نہ کہوں تو کس سے کہوں۔

۱۱۔ اے پیر و مرشد (بادشاہ) اگرچہ مجھے سر اور دستار کو آرائش دینے کا شوق نہیں یعنی عمدہ لباس پہننے کا شوق نہیں۔

۱۲۔ لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ لباس تو جاڑے میں ہونا چاہیئے: تاکہ موسم سرما کی بہت ٹھنڈی ہوا تکلیف نہ دے۔

۱۳۔ اگرچہ میرا جسم لاغر اور کمزور ہے لیکن پھر بھی مجھے لباس کی تو ضرورت ہے۔

۱۴۔ میں نے اس سال بالکل کپڑے وغیرہ نہیں خریدے اور اس بار کچھ نہیں بنایا۔

۱۵۔ رات کو آگ سینک کر گزارا کرتا ہوں اور دن کو دھوپ تاپ کر ایسے دن رات بھاڑ میں جائیں۔ جن میں میری یہ حالت ہو۔

۱۶- انسان آخر کہاں تک آگ تاپے اور کب تک دھوپ کھائے

۱۷- دھوپ کی تپش اور آگ کی حرارت سے بس خدا ہی بچائے۔ وقِنا عذاب النار۔ خدا ہم کو آگ (دوزخ) کی گرمی سے بچائے۔

۱۸- ہنجار..... طریقہ۔ قلعہ سے جو میری تنخواہ مقرر ہے اس کے ملنے کا عجب ڈھنگ ہے۔

۱۹- دنیا کا دستور ہے۔ کہ مُردے کی چھ ماہی سال میں ایک بار ہوتی ہے۔

۲۰- لیکن مجھ کو دیکھئے کہ میں زندہ ہوں۔ مگر میری چھ ماہی سال میں دو بار ہوتی ہے۔ چھ مہینے کے بعد تنخواہ ملنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں زندہ ہوں مگر مردوں سے بدتر۔

۲۱- سُود کی تکرار یعنی سود در سود۔ میں ہر مہینے قرض لیتا ہوں۔ اور اس طرح سے سود بڑھتا چلا جاتا ہے۔

۲۲- ان حالات میں ساہوکار میری تنخواہ میں ایک تہائی کا شریک ہو گیا ہے۔ یعنی ایک تہائی سُود میں لگ جاتی ہے۔

۲۳- نغز گو...... خوش گو۔ موجودہ دور میں مجھ جیسا خوشگو اور معنی آفریں شاعر نہیں۔

۲۴- اگر میری زبانی جنگ و جدل کا بیان سُنیں تو آپ کو ایسا معلوم ہوگا۔ کہ میری زبان ہی شمشیر جوہر دار ہے۔

۲۵- اگر آپ مجھ سے بزم کا نقشہ کھچوائیں تو آپ محسوس کریں گے۔ کہ میرا قلم ابرِ گوہر بار ہے یعنی ہر طرف موتی برسائیگا۔ غالب قلم کو مذکر لکھتے ہیں اہل دہلی ہمیشہ سے مؤنث کہتے ہیں۔

۲۶۔ جب مجھ میں ایسا جوہر قابلیت موجود ہے۔ تو ظلم ہوگا۔ کہ آپ میرے کلام کی داد نہ دیں۔ اور غضب ہوگا۔ اگر آپ میری قدر نہ کریں۔

۲۷۔ غضب ہے۔ کہ میں آپ کا غلام ہوتے ہوئے ننگا پھروں۔ اور آپ کا نوکر ہو کر قرض کھاؤں۔ گویا یہ آپ کی شان کے خلاف ہے۔

۲۸۔ مہربانی فرما کر میری تنخواہ بجائے چھ ماہی کے ماہ بماہ کر دیجیے تاکہ میں آرام سے زندگی بسر سکوں۔

۲۹۔ بس اپنے کلام کو اب دعا پر ختم کرتا ہوں۔ چونکہ یہ قطعہ مرزا صاحب نے اپنی خاص طرز کے خلاف بہت سیدھا سادہ لکھا ہے نیز قصیدہ کے قوانین کو بھی مدِ نظر نہیں رکھا۔ اس لئے کہتے ہیں۔ کہ مجھے شاعری سے کوئی سروکار نہیں۔ گویا شاعری سے یہاں صنعتِ شاعرانہ مراد ہے۔ اور مطلب یہ ہے۔ کہ اس قطعہ میں کسی قسم کی صنعت شاعرانہ نہیں ہے

۳۰۔ آپ ہزار برس زندہ سلامت رہیں۔ اور ہر برس کے دن پچاس ہزار ہوں یعنی آپ کا اقبال و دولت ابد تک رہے۔

(۱۴۲)

سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے ۱ جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
ہوا نہ غلبہ میسّر کبھی کسی پہ مجھے ۲ کہ جو شریک ہو میرا شریکِ غالب ہے

۱۔ سیہ گلیم.... سیاہ پوش.... سیاہ بخت۔ چونکہ میں بدنصیب و بدبخت ہوں۔ اس لئے دنیا میں جو شخص فتح و ظفر کا طلبگار ہے۔ اس کو چاہیئے۔ کہ میرا نام نہ لے۔ مطلب یہ ہے۔ اگر وہ میرا نام لے گا۔ تو کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکے گا۔

۲۔ میں وہ بدنصیب ہوں۔ کہ آج تک مجھے کسی پر غلبہ حاصل

نہیں ہوا ہے جو شخص میرا شریک ہوتا ہے۔ اس کا حصہ ہمیشہ مجھ سے زیادہ ہوتا ہے۔ شریک غالب اس کو کہتے ہیں۔ جس کا حصہ دوسرے شریکوں سے زیادہ ہو۔ غالب کے لفظ نے ایک عجیب لطف اور معنی پیدا کر دیئے ہیں۔

(۱۴)

سہل تھا مسہل ولے یہ سخت مشکل آپڑی ۱ مجھ پر کیا گذرے گی اتنے روز حاضر بن ہوئے
تین دن مسہل سے پہلے تین دن مسہل کے بعد ۲ تین مسہل تین تبریدیں یہ سب کے دن ہوئے

سہل.... جلاب۔ تبرید..... ٹھنڈائی۔ جو جلاب کی گرمی دور کرنے کیلئے پی جاتی ہے۔ مسہل لینا تو آسان تھا۔ لیکن سخت مشکل یہ آپڑی ہے۔ کہ بادشاہ کے دربار سے غیر حاضر رہنے سے میری کیا حالت ہوگی مسہل لینے سے پہلے تین دن میں منضج پیوں گا۔ اس کے بعد تین دن مسہل ہوں گے اور پھر تین دن تبریدیں ہوں گی۔ گویا اس طرح سے میں بارہ دن غیر حاضر رہوں گا۔ مولانا حالی لکھتے ہیں۔ ایک شعر میں مسہل کے ان تمام دنوں کی تفصیل جن میں حکیم چلنے پھرنے کو منع کرتے ہیں کس عمدگی سے بیان کی ہے یہ قطعہ دربار کی غیر حاضری کے عذر میں لکھا ہے۔ (یادگار غالب)

قطعہ تاریخ

(۱۵)

خجستہ انجمن طوئے میرزا جعفر ۱ کہ جس کے دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی محظوظ
ہوئی ہے ایسے ہی فرخندہ سال میں غالب ۲ نہ کیوں ہو مادۂ سال عیسوی محظوظ
۱۸۵۴

خجستہ ۔۔۔ مبارک - طوے ۔۔۔۔ جشنِ عروسی - محظوظ ۔۔۔ خوش سرور
فرخندہ ۔۔۔ مبارک محظوظ سے سنہ عروسی نکلتا ہے۔

---

(۱۶)

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی | ہوا بزمِ طرب میں رقصِ ناہید
کہا غالبؔ سے تاریخ اس کی کیا ہے | تو بولا انشراحِ جشنِ جمشید
۱۲۷۰ھ

ناہید ۔۔۔ زہرہ - اس ستارے کو رقاصۂ فلک بھی کہتے ہیں۔

---

(۱۷)

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں | دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں
کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام | اس سے ہے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

یادگارِ غالبؔ :- بادشاہ کے دربار کے یہ آداب تھے کہ آپس میں جو اہل دربار دار ایک دوسرے کو سلام کرتے تھے ۔ تو ملتے پر ہاتھ رکھنے کی جگہ دایاں ہاتھ دائیں کان پر رکھ لیتے تھے ۔ چونکہ اردو محاورے میں کانوں پر ہاتھ دھرنے کے یہ معنی ہیں ۔ کہ ہم آشنا نہیں ۔ اس لئے میرزا نے اس کو اس پیرائے میں بیان کیا ہے۔

رباعیات

(۱)

بعد از اتمام بزمِ عیدِ اطفال | ایامِ جوانی رہے ساغر کش حال
آپہنچے ہیں تا سوادِ اقلیمِ عدم | اے عمرِ گذشتہ یک قدم استقبال

اتمام .... ختم کرنا۔ انجام کو پہنچانا۔ بچپن کی خوشیوں کا زمانہ ختم کرنے کے بعد مست الست جوانی آئی۔ جوانی کے دن غفلت میں گذرے اب ہم ملک عدم کے گرد و نواح میں پہنچ گئے۔ یعنی بڈھے ہو گئے ہیں۔ اے عمر گذشتہ چونکہ تو عدم میں ہے۔ اس لئے ہمارے استقبال کے لئے ایک قدم تو آگے آ۔ مطلب یہ ہے۔ جوانی کے ایک قدم آگے آجانے سے شباب رفتہ بھی چند دن کے لئے واپس آ جائے گا۔ ایام شباب کے واپس آنے کی آرزو ظاہر کی ہے۔

---

(۲)

شب زلف و رخ عرق فشاں کا غم تھا　　کیا شرح کروں کہ طرفہ تر عالم تھا
رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک　　ہر قطرۂ اشک دیدۂ پُر نم تھا

رات کو مجھے اس محبوب کی زلف اور اس کے عرق فشاں چہرے کا غم تھا۔ میں اپنی کیفیت کیا بیان کروں۔ بس یوں سمجھ لیجئے۔ میری کچھ عجیب حالت تھی۔ اسی عالم میں صبح تک میں ہزار آنکھ سے روتا رہا۔ اور وہ اس طرح سے کہ میرا ہر قطرۂ اشک یک چشم اشک ریز تھا زلف و رخ کے تصور میں چونکہ ہزار آنسو بہائے۔ اس لئے ان آنسوؤں نے زلف یار کی سیاہی اور رخ یار کی سفیدی پیدا کر لی اور اس سیاہی اور سفیدی کی وجہ سے ہر آنسو ایک آنکھ بن گیا ظاہر ہے۔ آنکھ میں سفیدی اور سیاہی ہوتی ہے۔ اس لئے میں ہزار آنکھ سے رویا۔

---

(۳)

آتشبازی ہے جیسے شغلِ اطفال ۔۔۔ ہے سوزِ جگر کا بھی اسی طور کا حال
تھا موجدِ عشق بھی قیامت کوئی ۔۔۔ لڑکوں کے لئے گیا ہے کیا کھیل نکال

جیسے آتشبازی بچوں کا کھیل ہے ۔ بس سوزِ دل کی بھی بالکل یہی کیفیت ہے ۔ معلوم ہوتا ہے ۔ موجدِ عشق بھی کوئی قیامت کا پتلا تھا جو ان طفلان پری چہرہ کے لئے یہ کھیل ایجاد کر گیا ہے ۔ مطلب یہ ہے یہ ستم پیشہ لوگ عاشقوں کے سوزِ جگر کا آتشبازی کے طور پر تماشہ دیکھتے ہیں اور خوب خوش ہوتے ہیں ۔

---

(۴)

دل تھا کہ جو جانِ دردِ تمہید سہی ۔۔۔ بیتابیٔ رشک و حسرتِ دید سہی
ہم اور فسردن اے تجلّی افسوس ۔۔۔ تکرار روا نہیں تو تجدید سہی

جانِ دردِ تمہید ۔۔۔۔ وہ جان جس کا آغاز درد سے ہوا ہو ۔ سہی ۔۔۔ پہلے دو مصرعوں میں برداشت کرنا کے معنوں میں ہے ۔ فردن ۔۔۔۔ افسردہ ہونا ۔ تجلّی سے تجلّیٔ یار مراد ہے ۔ تجدید ۔۔۔۔ از سرِ نو پیدا کرنا ۔ پہلے ہمارے پہلو میں دل تھا ۔ جو ہم نے پُر درد زندگی بیتابیٔ رشک اور حسرتِ دیدار کی تلخ غموں کو برداشت کر لیا ۔ لیکن اب ہم ہیں اور افسردگی ۔ اس حالت میں اے تجلّیٔ یار اگر مذکورہ بالا کیفیتوں کا اعادہ ممکن نہیں ۔ تو پھر انہیں از سرِ نو ہی پیدا کر دے ۔ ظاہر ہے تکرار معدوم کی محال ہے ۔ لیکن تجدید ممکن ہے ۔ مطلب یہ ہے افسردگی بے دلی ۔ بے تابی اور رشک و حسرت کی آرزو ہے ۔ کیونکہ

ان کے بغیر زندگی بے لطف ہو گئی ہے۔

(۵)

ہے خلق حسد قماش لڑنے کے لئے | وحشت کدۂ تلاش لڑنے کے لئے
یعنی ہر بار صورت کاغذ باد | ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لئے

حسد قماش... حسد شعار۔ وحشت کدۂ تلاش.... دنیا مراد ہے۔ کاغذ باد...... پتنگ۔ فرماتے ہیں۔ دنیا کے رہنے والے حسد شعار ہیں۔ اور یہ دنیا جو وحشت کدۂ تلاشِ معاش ہے لڑنے کے واسطے ہے۔ اس دنیا میں دو شخصوں کا ملنا ایسا ہے جیسے پتنگ کا ملنا۔ جب آپس میں ملتے ہیں لڑتے ہیں۔ گویا انسان کا انسان سے ملنا جنگ و جدل کا مرادف ہے۔

---

(۶)

دل سخت نژند ہو گیا ہے گویا | اس سے گلہ مند ہو گیا ہے گویا
پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں | غالب منہ بند ہو گیا ہے گویا

نژند..... غمگین۔ میرا دل بہت زیادہ غمگین اور افسردہ ہو گیا ہے گویا یار سے کچھ شکایتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ لیکن یار سے رنجیدہ اور گلہ مند ہونے کے باوجود ہم اس کے سامنے کچھ شکوہ شکایت کر ہی نہیں سکتے۔ گویا اس کے سامنے منہ ہی بند ہو گیا ہے مصرعۂ آخر کے گویا کے لفظ میں ایہام ہے۔

---

(۷)

دُکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالبؔ
دل رُک رُک کر بند ہو گیا ہے غالبؔ
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا سوگند ہو گیا ہے غالبؔ

سوگند..... قسم یعنی معدوم۔ غالبؔ میرے دِل کو دُکھ پسند آ گیا ہے اور غم کی وجہ سے میں اتنا گرفتہ خاطر ہوا ہوں۔ کہ دل کی حرکت ہی بند ہو گئی ہے۔ خدا کی قسم مجھے رات کو بالکل نیند نہیں آتی ہے گویا نیند آنا قسم کے برابر ہے۔ اکثر دیوانوں میں اس رباعی کا دوسرا مصرعہ غلط لکھا ہے۔ طباطبائی لکھتے ہیں۔ غالبؔ کے خود صحیح کئے ہوئے دیوان میں بھی یہ مصرعہ اسی طرح لکھا ہے۔ بہرحال مصرعہ کو رباعی کے وزن میں رکھنے کے لئے "رک" ایک مرتبہ ہونا چاہیئے۔

---

(۸)

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

چونکہ میرا کلام بہت ہی زیادہ مشکل ہے۔ اس لئے سخنورانِ کامل اسے سُن سُن کر مجھ سے آسان کہنے کی فرمائش کرتے ہیں۔

یادگارِ غالبؔ:۔ آخر کے مصرعہ میں دو معنی پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک تو کہ اگر میں ان کی فرمائش پوری کروں اور آسان شعر کہوں۔ تو یہ مشکل ہے کہ اپنی طبیعت کے اقتضا کے خلاف ہے۔ اور اگر آسان نہ کہوں تو یہ مشکل ہے کہ وہ برا مانتے ہیں۔ اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں۔ کہ اس باب میں صاف صاف بات کہتا ہوں۔ تو سخندانِ کامل کی نافہمی اور کند ذہنی ظاہر

کرنی پڑتی ہے۔ اور اگر صاف صاف بات نہ کہوں۔ تو آپ ملزم ٹھہرتا ہوں۔ پس ہر طرح مشکل ہے۔

---

(۹)

بھیجی ہے جو مجھ کو شہِ جمجاہ نے دال ∗ ہے لطف و عنایاتِ شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال ∗ ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

شاہ جمجاہ ..... جمشید جیسے مرتبے والا جلیل القدر بادشاہ۔ دوسرے مصرعہ میں دال کے معنی "دلالت کرنے والی"۔

بادشاہ کے ہاں اکثر مونگ کی دال پکا کرتی تھی اور وہ شاہ پسند دال کہلاتی تھی۔ کہیں بادشاہ نے یہ دال میرزا کو بھیجی ہے۔ اور میرزا نے یہ رباعی اس کے شکریے میں لکھی ہے۔

جلیل القدر بادشاہ نے مجھ کو دال بھیجی ہے۔ یہ شہنشاہ کے لطف و عنایات پر دلالت کرتی ہے۔ یہ شاہ پسند دال بے شک و شبہ دولت دین۔ دانش اور عدل کی دال ہے۔

---

(۱۰)

ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم ∗ آثارِ جلالی و جمالی باہم۔
ہوں شاد نہ کیوں سافل و عالی باہم ∗ ہے اب کی شبِ قدر و دوالی باہم

سافل و عالی ..... ادنےٰ و اعلےٰ۔ ہمارے بادشاہ میں جلال و جمال کی صفات دونوں موجود ہیں۔ ہر طبقے کے لوگ اس سے کیوں نہ خوش ہوں کہ اب کی مرتبہ شبِ قدر اور دیوالی دونوں ایک ہی دن ہیں۔ اس رباعی کے

الفاظ نہایت مناسب واقع ہوئے ہیں۔ شب قدر علوی اور دیوالی سفلی حیثیت رکھتی ہے

---

(۱۱)

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے   تا شاہ شیوع دانش و داد کرے
یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ   ہے صفر کہ افزائش اعداد کرے

شیوع ... پھیلانا ۔ رواج دینا ۔ رشتۂ عمر ... ایک ڈوری ہوتی ہے جس میں ہر سال ولادت کے دن گرہ لگائی جاتی ہے ۔ یہ رباعی بادشاہ کی سالگرہ کے موقع پر لکھی ہے ۔ کہتے ہیں خدائے تعالیٰ بادشاہ کو زندہ سلامت رکھے ۔ اور اس کی بقا سے رعایا کو شاد و آباد رکھے ۔ دانش و عدل بادشاہ کے دم قدم سے جاری ہیں ۔ وہ زندہ رہیں گے تو دانش و عدل جاری و ساری رہیں گے ۔ اس سالگرہ کی تقریب پر جو رشتۂ عمر میں گرہ لگائی گئی ہے وہ اصل میں صفر ہے جو عدد کے سامنے لگایا ہے ۔ تاکہ اعداد عمر میں اضافہ ہو جائے مثلاً اگر بادشاہ کی عمر ۶۰ سال کی ہے تو صفر لگنے سے ۶۰۰ سال کی ہو گئی ۔

---

(۱۲)

اس رشتے میں لاکھ تار ہوں بلکہ سوا   اتنے ہی برس شمار ہوں بلکہ سوا
ہر سیکڑے کو ایک گرہ فرض کریں   ایسی گرہیں ہزار ہوں بلکہ سوا

یہ رباعی سالگرہ کے موقع کی ہے ۔ اس رشتۂ عمر میں لاکھ تار ہوں ۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ ہوں اور پھر اتنے ہی برس گنے جائیں ۔ نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ شمار ہوں ۔ شاعر کی محبت اس پر بھی اکتفا نہیں کرتی ۔ وہ کہتا ہے یوں بھی نہیں ۔ بہتر یہ ہے ۔ کہ ہر سال کی بجائے ہر سو سال کے بعد رشتۂ

عمر میں ایسی گرہ لگانی فرض کی جائے۔ اور ایسی گرہیں ہزار ہوں۔ نہیں نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ ہو۔ مطلب یہ ہے۔ کہ بادشاہ لاکھوں برس کی عمر پائیں۔ اہل لکھنؤ سینکڑہ میں نونِ غنہ نہیں بولتے۔ دلی والے ہمیشہ سینکڑہ کہتے ہیں

---

(۱۳)

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں عشاق کی پرسش سے اُسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اٹھایا ہوگا کیونکر مانوں کہ اس میں تلوار نہیں

لوگ کہتے ہیں۔ کہ اب اس نے مردم آزاری ترک کر دی ہے پہلے وہ عشاق کا حالِ زار دریافت کرنا عیب کی بات سمجھتا تھا لیکن اب بے تکلف انکی کیفیت دریافت کرتا ہے لیکن میں یہ بات ہرگز نہیں مانتا۔ کیونکہ جو ہاتھ اُس نے ظلم سے روکا ہوگا اس میں ضرور بالضرور تلوار ہوگی تیسرے مصرعہ میں ہاتھ اٹھانا ذومعنی ہے (۱) کسی کام سے ہاتھ اٹھانا گویا اس سے دست بردار ہونا۔ (۲) مارنے کے ہاتھ اٹھانا اس محاورے کے استعمال سے ایک نیا لطف پیدا ہوگیا ہے۔

---

(۱۴)

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے
کہتے ہیں کہیں خدا سے اللہ اللہ وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

یادگار غالب:۔ اس رباعی میں مرزا نے غایت درجہ کی شوخی برتی ہے جو بالکل اچھوتی اور نئی طرح کی ہے۔ کہتا ہے کہ ہم ہرچند دربار کے ہاتھ نیاز لوگوں کو جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔ مگر وہ ہماری کارروائی میں درنگ اور لیت و لعل کرتے ہیں۔ ہم اپنے دل میں کہتے ہیں۔ کہ آؤ خدا ہی سے کہیں پھر

یہ خیال آتا ہے کہ اللہ اللہ کرو۔ وہ تو آپ ہی صبح و شام کرنے والے ہیں صبح و شام کرنا لیت و لعل کرنے کو کہتے ہیں۔ چونکہ صبح کو شام کرنا اور شام کو صبح کرنا خدا کا کام ہے۔ تو خدا کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ وہ صبح و شام کرنے والے ہیں۔ مگر شاعر کا اصلی مقصود یہی ہے۔ کہ کارردائی خلق میں جیسی لیت و لعل وہاں ہوتی ہے ایسی کہیں نہیں ہوتی۔ اکثر ساری عمر امید ہی میں گزر جاتی ہے اور مطلب حاصل نہیں ہوتا۔

---

(۱۵)

سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے غالبؔ لیکن خسخانہ و برفاب کہاں سے لاؤں

یہ رباعی بھی اس قطعہ کے ساتھ جس میں روزے کا مضمون نظم کیا ہے بادشاہ کے حضور میں پیش کی گئی تھی۔ کہتے ہیں میں کھانے اور سونے کے سامان اور آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں۔ روزہ رکھنا میرا ایمان ہے لیکن روزہ گذارنے کے لئے خس کی ٹٹیوں اور برفاب کی ضرورت ہے میں غریب آدمی وہ کہاں سے مہیا کروں۔ مطلب یہ ہے روزہ رکھنے کے سامان بہم پہنچ سکتے تو میں ضرور روزہ رکھتا +

تمام شد

دسمبر ۱۹۳۸ء لاہور

شیخ مبارک علی تاجر کتب لوہاری دروازہ لاہور نے عالمگیر الیکٹرک پریس میں باہتمام حافظ محمد عالم پرنٹر چھپوا کر شائع کیا۔